ـــے — پتہ: مکتبہ جامعہ دہلی، [illegible]، علیگڑھ

کمپوزنگ: رہبر کمپیوٹرز، ۲۹۳۶۔ ترکمان گیٹ، دہلی۔۶ فون: 3230453

طباعت Dr.ZAKIR HUSAIN LIBRARY مسجد، ترکمان گیٹ، دہلی۔6

سہ ماہی **انتساب** سرونج

خالد محمود نمبر

شخصیت

خالد محمود کا فن

بحیثیت شاعر

بحیثیت نثر نگار

سمندر آشنا: دو تبصرے

تعلیمات

انٹرویو

خالد محمود کے نام

خالد محمود کی تحریر کے رنگ

انشائیے

خاکے

تجزئے

مضامین

انتخاب کلام

اعتراف

قارئین کرام السلام علیکم

"خالد محمود نمبر" آپ کے سامنے ہے یقین نہیں آتا کہ ہندوستان کے اتنے اور ایسے معتبر اہل قلم نے میری تحریروں کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ اس قابل بھی سمجھا کہ انھیں کلمات خیر سے نوازا جائے۔ یہاں اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی نہ پہلے تھی نہ آج ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ادب کا ایک ایسا (ادنی) طالب علم ہوں جو طالب علمی کا حق ادا کرنے سے بھی قاصر ہے۔ محبت اور شفقت سے لبریز تعریفی کلمات جو بزرگوں نے میرے یا میری شاعری کے حق میں تحریر فرمائے ہیں۔ میں انھیں حوصلہ افزائی اور خالد نوازی پر محمول کرتا ہوں اور جو مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں ان کی اور احباب کی تعریفیں ان کے خلوص کی غماز ہیں پیش نظر نمبر سے اتنا ضرور ہوا کہ اس بہانے میری کچھ تحریریں جو خصوصی شمارے میں یکجا ہو گئی ہیں ادب کے قاری کو کوئی رائے قائم کرنے میں تعاون دے سکتی ہیں۔

"انتساب" کے مدیر ڈاکٹر سیفی سرونجی جو میرے ہم وطن ہیں اور اپنے آپ کو میرا شاگرد بھی کہتے ہیں گذشتہ تین سال سے مصر تھے کہ میں انھیں اس نمبر کے لیے اپنی تخلیقات اور اشاعت کی اجازت دیدوں مگر میرے نزدیک میں اس کا اہل نہ تھا (نہ ہوں) اس لیے یہ عمل قبل از وقت معلوم ہوا پھر جب میں نے دیکھا کہ وہ انتہائی خلوص کے ساتھ مجھے رسوا کرنے پر کمر بستہ ہیں تو اس خیال سے اجازت دیدی کہ چند احباب کے سوا جب کوئی لکھنے لکھانے پر آمادہ نہ ہو گا تو ان کے شوق کا ابال اپنے آپ بیٹھ جائے گا۔ انھوں نے لوگوں سے

درخواست کی اور کچھ حضرات سے میں نے بھی عرض کیا۔ اب (جب) یہ نمبر دیکھتا ہوں تو آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور اپنی خوش بختی پر رشک آتا ہے کہ اس عہد ناپرساں میں بھی اتنے پرسان حال و قال موجود ہیں۔

اس شمارے میں اساتذہ اور احباب کے علاوہ کچھ ایسے دانشوروں نے بھی میرے اشعار و افکار پر اظہار خیال فرمایا ہے جن کی چند سطریں بھی میرے لیے سعادت کا درجہ رکھتی ہیں ان کے ساتھ کئی اور صاحب علم و کمال ادیب و شاعر اور ناقدین فن ہیں جنھوں نے مجھے اپنی تحریر کے لائق سمجھا ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جنھیں میں رسائل کے وسیلے سے پہچانتا ہوں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے اور میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں حالانکہ میں جانتا ہوں کہ شکریے کے یہ رسمی الفاظ ان کی نگارشات کا بدل نہیں ہو سکتے۔

خیر اندیش

خالد محمود

اداریہ

ڈاکٹر خالد محمود نمبر کے لئے میں نے اداریہ کے تحت جو مختصر تحریر لکھی تھی وہ سہواً انتساب کے عام شمارے میں پیشگی شائع ہوگئی اس لئے اب مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے اس نمبر کے تعلق سے اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ اس کے مشمولات کے پیش نظر یہ نمبر نئی نسل کے ممتاز شاعر ڈاکٹر خالد محمود کی شخصیت اور ان کے ادبی کارناموں پر ایک دستاویز کی شکل اختیار کر چکا ہے وہ اس لئے کہ نئی نسل میں ابھی تک کوئی ایسا اہم شاعر نظر نہیں آتا جو بیک وقت ایک بہترین انشائیہ نگار نقاد محقق مترجم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا شاعر بھی ہو ادب کی مختلف اضاف پر اتنا کام کر چکا ہو اچھا استاد ہو اور پھر درسی کتب کی تیاری میں بھی پیش پیش رہا ہو اس نمبر میں ڈاکٹر خالد محمود کے تمام کاموں کا نہ صرف احاطہ کیا گیا ہے بلکہ اردو ادب کے مشہور لکھنے والوں نے ان کی ادبی حیثیت اور مرتبہ کا تعین بھی کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ میری خوش نصیبی اور خالد محمود کی صاحب کی ہر دل عزیز شخصیت کا کرشمہ ہے کہ میری گذارش پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے علاوہ ہندوستان کے بیشتر اہم لکھنے والوں نے نہ صرف اپنے مضامین اور تاثرات سے نوازا بلکہ میرے اس اقدام پر مسرت کا اظہار بھی کیا اس نمبر کی اشاعت میں جن مشکلات کا سامنا تھا انہیں حل کرنے میں ڈاکٹر خالد محمود کے دوست ڈاکٹر محمد نعمان خاں، اقبال مسعود رشید انجم، نسیم انصاری، محمد میاں عزیز اور عشرت قادری صاحبان نے بڑا تعاون دیا میں ان تمام حضرات کا بے حد شکر گزار ہوں۔

سیفی سرونجی

ڈاکٹر خالد محمود
تصویروں کے آئینہ خانے میں



ڈاکٹر خالد محمود اپنے پسندیدہ لباس میں



٧

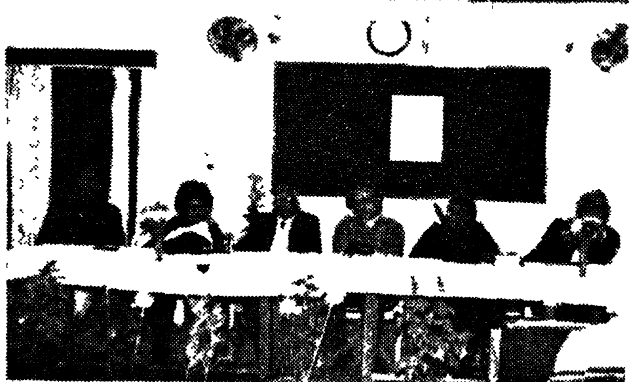
سابق صدر جمہوریہ ہند عالی مرتبت جناب آر وینکٹ رمن کے ساتھ ڈاکٹر خالد محمود،
عالیجناب خورشید عالم خاں گورنر مہاراشٹر اور جناب عبداللہ ولی بخش قادری



ڈاکٹر خالد محمود صدر جمہوریہ ہند عالی جناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما سے مصافحہ کرتے ہوئے
(ایک یادگار تصویر) ساتھ میں جناب کوثر چاندپوری، پروفیسر ظفر احمد نظامی اور نسیم کوثر چاندپوری کھڑے ہیں۔



ڈاکٹر خالد محمود
عظیم ناول نگار
محترمہ قرۃ العین حیدر
کے ساتھ۔
ایک یادگار تصویر



ڈاکٹر خالد محمود،
محترمہ قرۃ العین حیدر،
عبداللہ ولی بخش قادری،
پروفیسر شمیم حنفی اور
پروفیسر صغرا مہدی
کے ساتھ۔
ایک ادبی جلسے میں



ڈاکٹر خالد محمود
ایک جلسے کو
خطاب
کرتے ہوئے

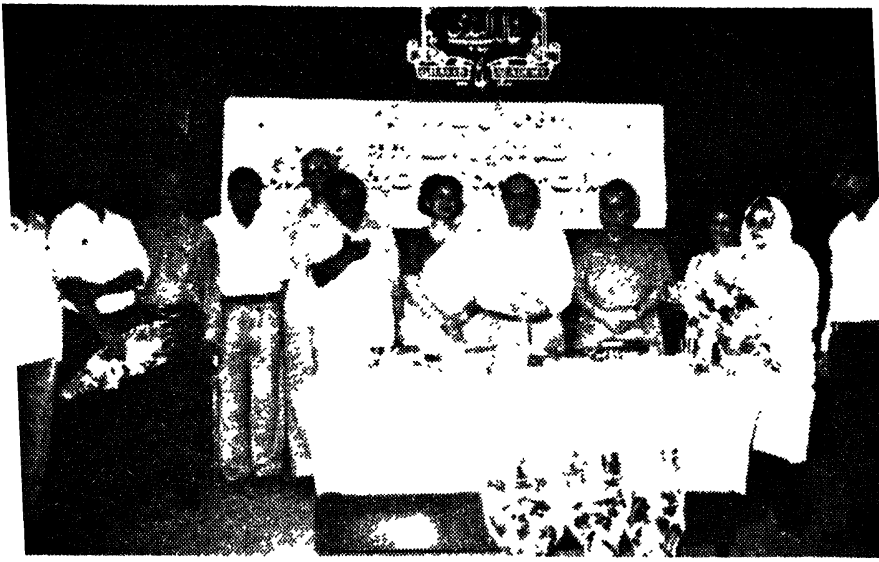


جناب علی سردار جعفری، ڈاکٹر خالد محمود، پروفیسر ظفر احمد نظامی، جناب بشیر الدین احمد خاں (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ) پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر وہاج الدین علوی۔

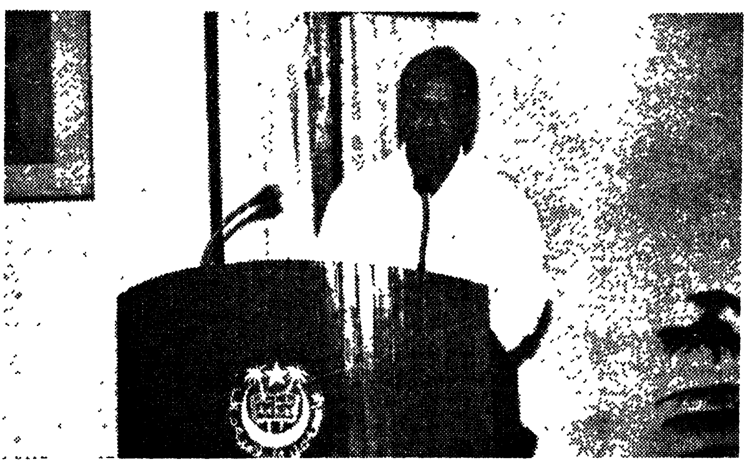


خالد محمود جناب ممنون حسن خاں کے ساتھ

خالد محمود جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے ساتھ



خالد محمود پروفیسر شارب ردولوی، جناب رفعت سروش، ڈاکٹر شبانہ نذیر، پروفیسر گوپی چند نارنگ،
ڈاکٹر رضیہ حامد پروفیسر امیر عارفی اور اقبال انصاری۔



ڈاکٹر خالد محمود۔ ایک سیمینار میں مقالہ پڑھتے ہوئے۔



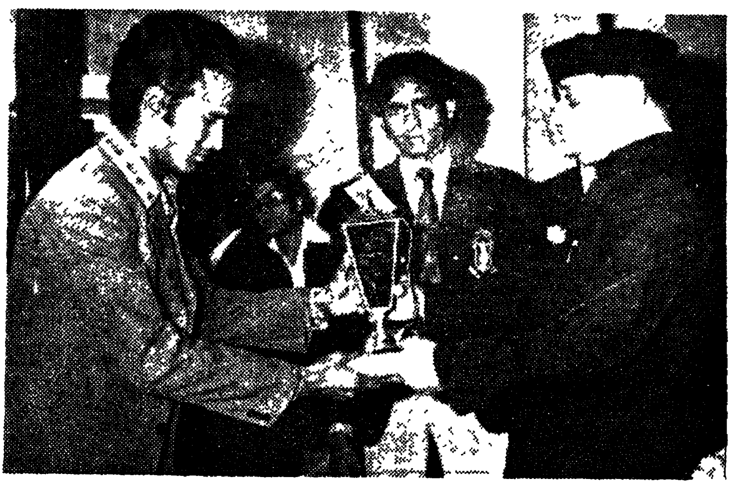
خالد محمود ۱۹۷۵ء کے ایک مشاعرے میں اپنا کلام سناتے ہوئے ڈائس پر عزت مآب جناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما، جناب عزیز قریشی، جناب اختر سعید خاں جاں نثار اختر، شعری بھوپالی، وکیل بھوپالی اور شاہد بھوپالی تشریف فرما ہیں۔



سرونج کے اساتذہ اور احباب کی ایک یادگار تصویر (کرسیوں پر بائیں سے) اسمٰعیل ذبیح، دانش مالوی، میر عرفانی
(کھڑے ہوئے دائیں سے) وقار فاطمی، شاہد میر، مختار شمیم اور خالد محمود



سیفیہ کالج بھوپال کے شعبۂ اردو میں، بہ زمانۂ طالب علمی، محمد نسیم خالد محمود، آفاق حسین صدیقی،
حلیمہ صلاح الدین، گوہر جلالی، پروفیسر عبد القوی دسنوی، محمد نعمان خاں اور خورشید اختر



خالد محمود بہ زمانۂ طالب علمی مدھیہ پردیش کے گورنر عالی جناب ستیہ نرائن سنہا
سے انعام حاصل کرتے ہوئے۔ درمیان میں ظہیر قریشی کھڑے ہیں۔



بھوپال کے ایک مشاعرے میں خالد محمود اپنا کلام سناتے اور داد وصول کرتے ہوئے اسٹیج پر اختر سعید خاں، عشرت قادری، بشیر بدر، مرتضیٰ علی شاد، وفا صدیقی، پروفیسر عبدالقوی دسنوی، فضل تابش، وحید پرواز اور ملک زادہ منظور احمد تشریف فرما ہیں۔



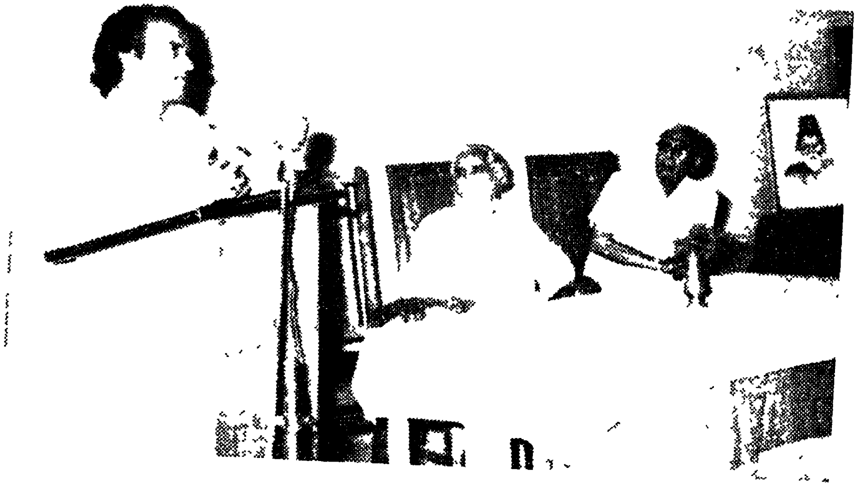
خالد محمود اپنے کلام سے سامعین کو محفوظ کرتے ہوئے



شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال میں خالد محمود کے ساتھ ایک شام کا منظر۔ پروفیسر مرتضی علی شاد،
پروفیسر شکور خاں، اقبال مجید، وقار فاطمی فضل تابش پروفیسر حامد حسین، خالد محمود
شفیقہ فرحت خالدہ بلگرامی اور مائک پر پروفیسر عبد القوی دسنوی



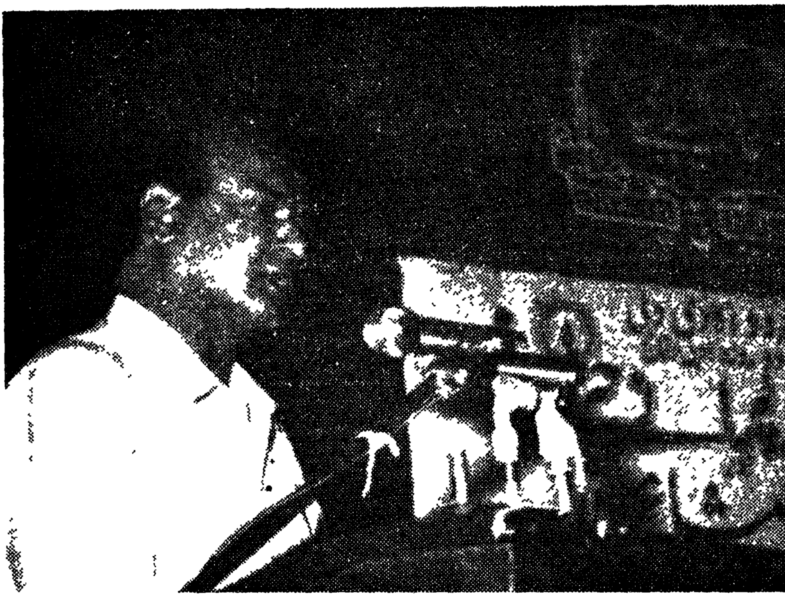
پروفیسر حامد حسین، فضل تابش، مرتضی علی شاد اور خالد محمود



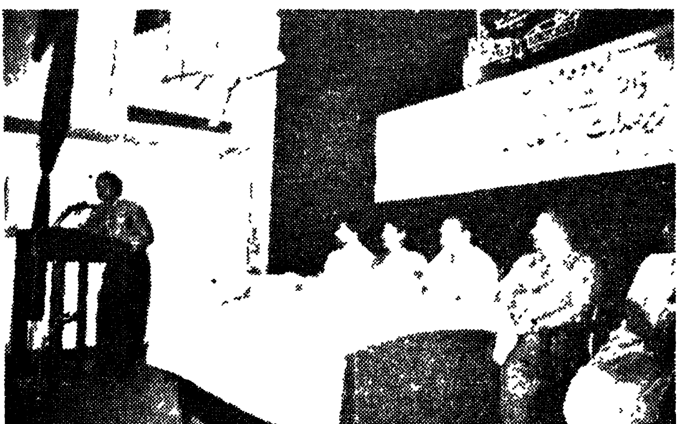
خالد محمود ایک ادبی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے



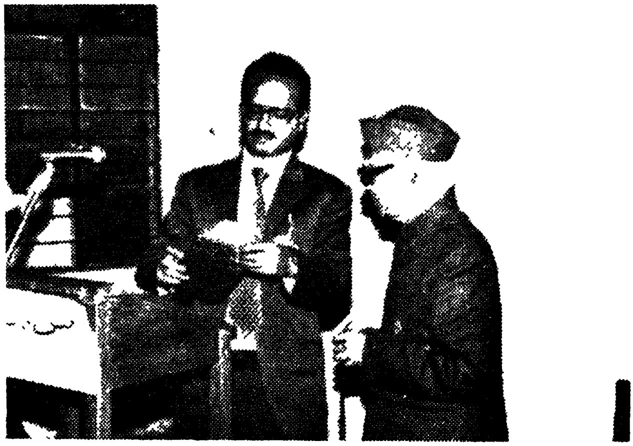
طلبائے جامعہ کے ایک جلسے میں خالد محمود، مشہور صحافی خوشونت سنگھ کا تعارف کراتے ہوئے خوشونت سنگھ مائک کے نزدیک کھڑے ہیں۔ اسٹیج پر پروفیسر ضیاالحسن فاروقی اور ہونہار طالب علم عقیل الغروی بیٹھے ہیں۔



ڈاکٹر خالد محمود۔ دہلی اردو اکیڈمی کے ایک سیمینار میں اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے



ایک جلسے کی نظامت کے دوران مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے خالد محمود۔ اسٹیج پر پروفیسر محمد میاں،
ڈاکٹر شبانہ نذیر اور پروفیسر گوپی چند نارنگ تشریف فرما ہیں۔



دہلی میں "جشن درمیان لطیف" کے موقع پر خالد محمود مکتبہ جامعہ کی خصوصی پیشکش "عبداللطیف اعظمی۔ حیات وخدمات" کو رونمائی کے لیے تیار کرتے ہوئے۔ عبداللطیف اعظمی اپنی کتاب کے دیدار کے لیے ہمہ تن اشتیاق ہیں



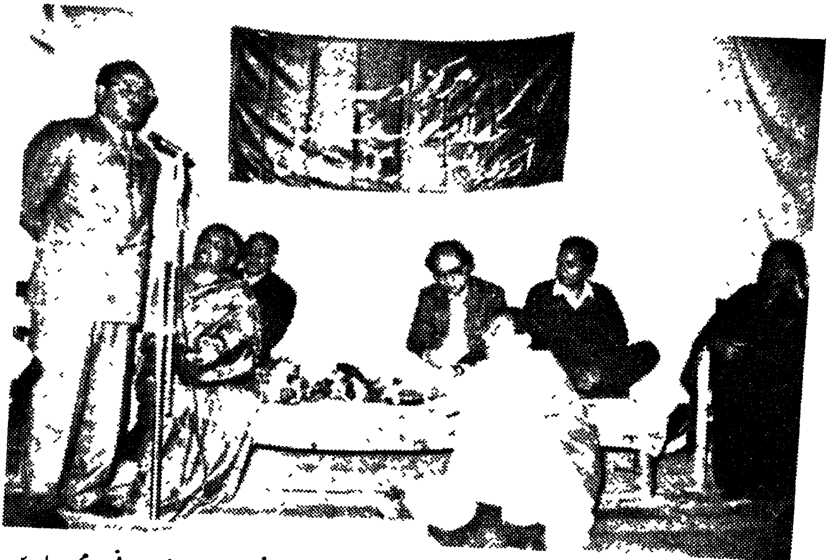
خالد محمود۔ عبداللطیف اعظمی کو پیش کیا جانے والا سپاسنامہ ناظرین کو دکھاتے ہوئے۔ بائیں جانب پروفیسر مشیر الحق
(سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی) کھڑے ہیں۔ کرسیوں پر بائیں سے کرنل بشیر حسین زیدی
(سابق وائس چانسلر علی مسلم یونیورسٹی) پروفیسر ضیاالحسن فاروقی اور عبداللطیف اعظمی تشریف فرما ہیں۔



خالد محمود۔ عبداللطیف اعظمی پر خاکہ سناتے ہوئے



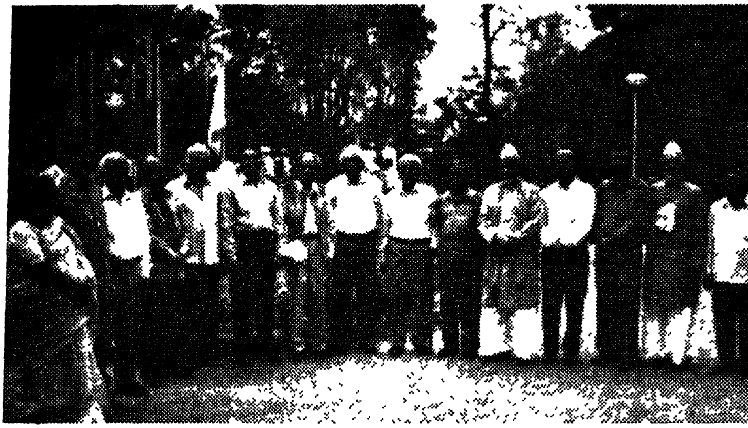
"جشن در بیان لطیف کمیٹی" کے ارکان۔ دائیں سے پروفیسر شمیم حنفی، جناب عبدالحق خاں، جناب معظم جیراجپوری
پروفیسر انور صدیقی (صدر جشن کمیٹی) پروفیسر ضیاالحسن فاروقی عبداللطیف اعظمی، پروفیسر مظفر حنفی،
پروفیسر مشیرالحق، جناب شاہد علی خاں، محمد انس اور ڈاکٹر خالد محمود (سیکریٹری دکنوینر جشن کمیٹی)



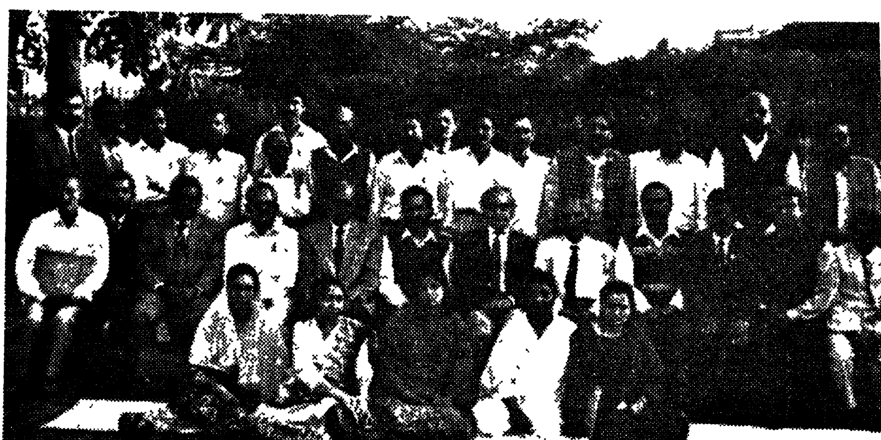
ڈاکٹر خالد محمود مرکز ادب بھوپال کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے پروفیسر صغرا مہدی، پروفیسر محمد صابرین،
پروفیسر شمیم حنفی پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، بیگم صاحبہ محمد گڑھ اور اقبال مجید ہمہ تن گوش ہیں۔



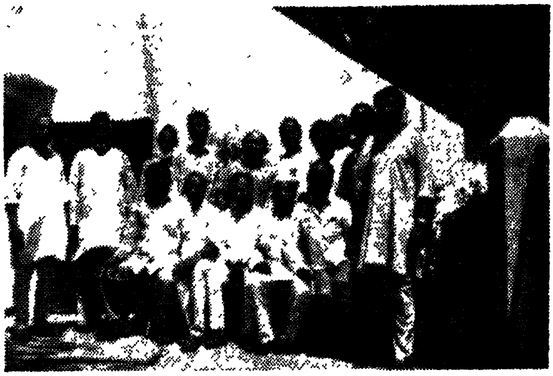
ڈاکٹر محمد نعمان خاں۔ ڈاکٹر خالد محمود کو پھولوں کا گلدستہ پیش کر رہے ہیں۔



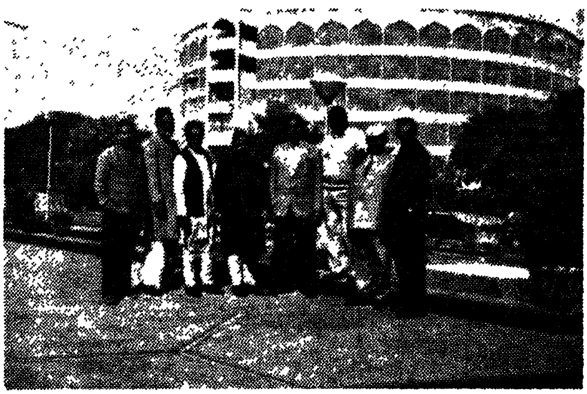
(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، جناب مہدی نظامی ڈاکٹر اقتدار محمد خاں، ڈاکٹر خالد محمود، خواجہ حسن ثانی نظامی ڈاکٹر اکرام احمد خاں، جناب بشیر الدین احمد خاں (سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ) علی سردار جعفری، خالد کمال فاروقی، جناب شاہد علی خاں، پروفیسر شمیم حنفی، مسعود الحق، خواجہ محمد شاہد (سابق رجسٹرار جامعہ ملیہ اسلامیہ) اور پروفیسر صغرا مہدی



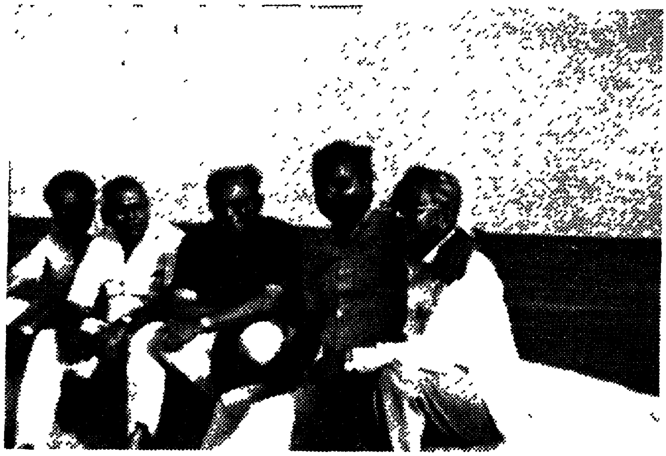
(کرسیوں پر دائیں سے بائیں) انور ظہیر خاں، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر محمد اسلم ڈاکٹر شاہد اشرف، پروفیسر آفاق احمد، جناب سید حامد (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی، پروفیسر محمد صابرین پروفیسر ضیا الحسن ندوی، پروفیسر اختر الواسع (کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں) ڈاکٹر شمس الحق عثمانی اور (درمیان میں) ڈاکٹر وہاج الدین علوی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر محمد عارف اور ڈاکٹر اقتدار محمد خاں (بیٹھے ہوئے) ڈاکٹر شہناز انجم اور



ڈاکٹر خالد محمود اپنے وطن سرونج میں۔ احباب کے ساتھ ایک یادگار تصویر (بیٹھے ہوئے دائیں سے بائیں) محمد سلیم، محمد انیس، ڈاکٹر فرید اقبال زبیری، ڈاکٹر شان فخری عبدالحفیظ عارف۔ (کھڑے ہوئے دائیں سے بائیں) مرزا ذکاءاللہ بیگ، محمد میاں عزیز رؤف شاہ، محی الدین انجم، خالد محمود، شاہد میر، ماسٹر عبدالحمید ماسٹر شکیل احمد اور ڈاکٹر مختار شمیم



(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر خالد محمود اور ان کے احباب ڈاکٹر شاہد میر عبدالحفیظ عارف، محمد عمر خاں، ڈاکٹر عزیزالدین ندوی، محی الدین انجم، مرزا فصیح اللہ بیگ اور تصرف حسین صدیقی ہمدرد یونیورسٹی دلی کے احاطے میں



کنیا کماری کے ساحل سمندر پر (دائیں سے بائیں) پروفیسر حنیف کیفی، ڈاکٹر خالد محمود، جناب عبدالحق خاں،
پروفیسر گوپی چند نارنگ اور پروفیسر محمد صابرین سمندری ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے



(دائیں سے بائیں) سکندر اقبال، نسیم انصاری، خالد محمود، محمد نعمان خاں اور اقبال مسعود

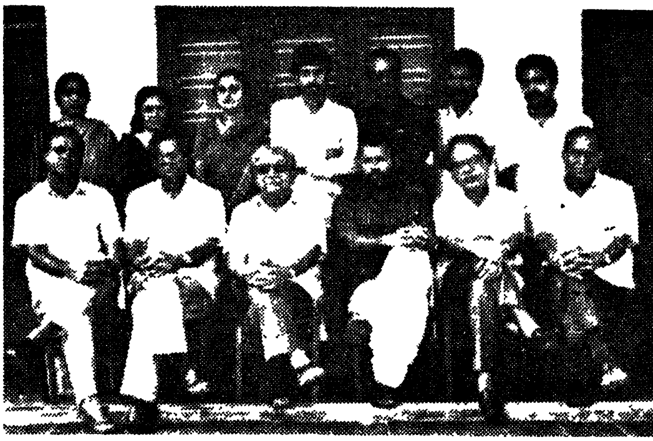


ڈاکٹر خالد محمود جناب شاہد علی خاں (جنرل منیجر مکتبۂ جامعہ) اور رشید انجم ایک یادگار تصویر



ڈاکٹر خالد محمود۔ انتساب کے ایڈیٹر ڈاکٹر سیفی سرونجی اور اپنے چھوٹے بھائی آصف محمود کے۔

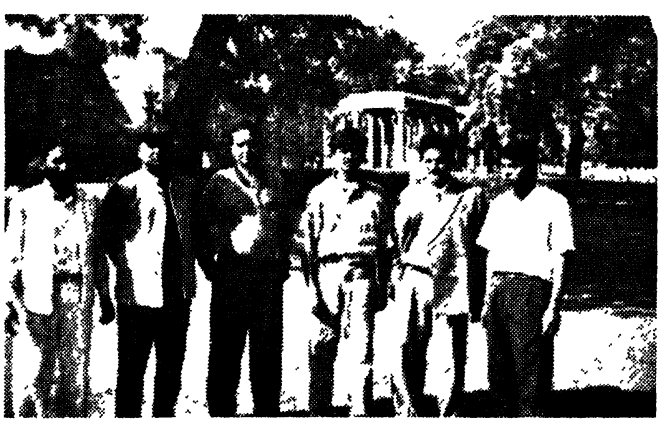
کالی کٹ (کیرالہ) میں این سی ای آر ٹی کی ایک ورکشاپ کے موقع پر بائیں سے دائیں (کرسی



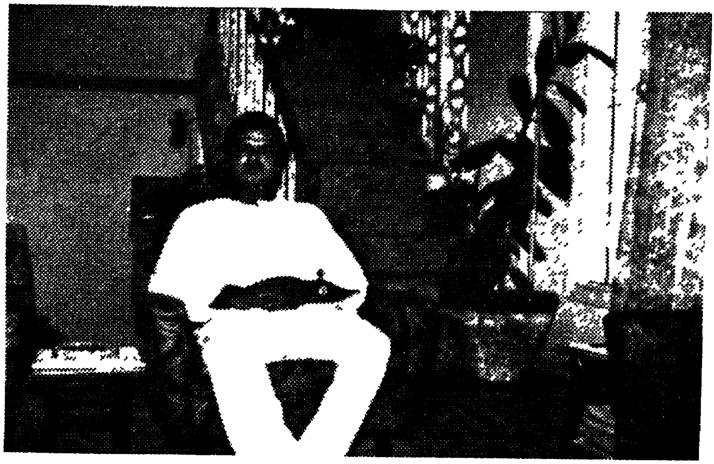
ڈاکٹر خالد محمود، ڈ
الدین، پروفیسر
الرحمٰن قدوائی،
کے ایک اردو دو
زبیر، پروفیسر شب
پروفیسر محمد
(کھڑے ہوئے
دائیں) ڈاکٹر قد
ڈاکٹر صادق،
فرحت رضوی
کے اردو ا



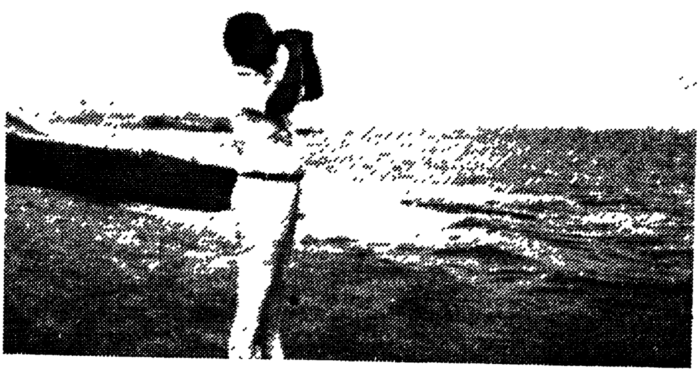
ڈاکٹر خالد محمود،
ڈاکٹر صادق اور
ڈاکٹر وہاج الدین علوی



ڈاکٹر خالد محمود
پروفیسر قاضی عبیدا
ہاشمی اور ڈاکٹر شہیر
اردو طلبا کے ساتھ
ایک پارک میں



کراچی میں قیام کے دوران خالد محمود اپنے میزبان ہاکی کے اولمپین گولڈ میڈلسٹ کھلاڑی جناب انوار خاں کے دولت کدے پر۔



ڈاکٹر خالد محمود ۱۹۸۲ء میں کراچی کے ساحل سمندر کا لطف لیتے ہوئے



(دائیں سے بائیں) پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر خالد محمود، شمیم جے پوری پروفیسر ابوالکلام قاسمی،
پروفیسر انیس الرحمٰن، مرزا فصیح اللہ بیگ اور پروفیسر زبیر احمد فاروقی جامعہ ملیہ کی ایک شعری نشست میں



بھوپال کے ایک اعزازی جلسے میں (دائیں سے بائیں) اقبال مسعود، ڈاکٹر خالد محمود، پروفیسر محمد صابرین،
پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر حامد جعفری اور جناب عشرت قادری



ڈاکٹر خالد محمود، جناب سید حامد (سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سر ٹیفکیٹ لیتے ہوئے



ڈاکٹر خالد محمود، پروفیسر علی محمد خسرو (سابق چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے سر ٹیفکیٹ حاصل کرتے ہوئے





خالد محمود اور ان کے احباب ڈاکٹر مختار شمیم، ڈاکٹر شاہد میر اور
جناب ویر نرائن ایڈوکیٹ کتابوں کی نمائش دیکھتے ہوئے

اکٹر خالد محمود سرونج کے ایک سیمینار
میں اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے



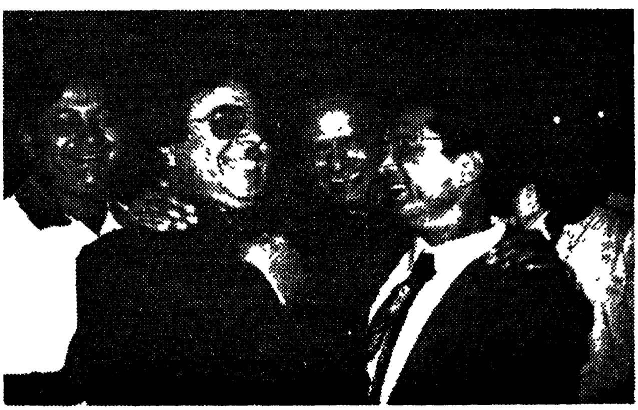


ڈاکٹر خالد محمود بھوپال کے ایک سیمینار میں اپنا مقالہ سناتے ہوئے

ڈاکٹر خالد محمود اور ڈاکٹر شاہ عبد السلام



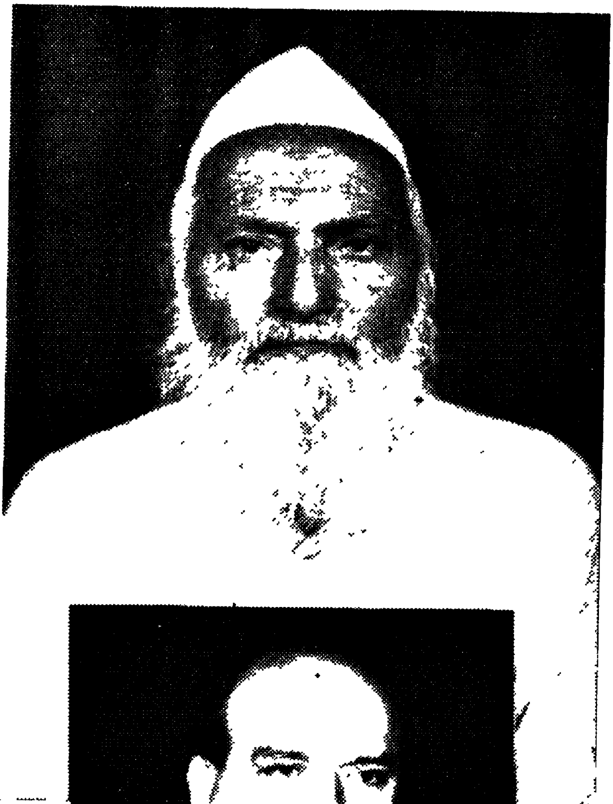
رشید انجم، خالد محمود اور مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے چیرمین جناب عزیز قریشی



ڈاکٹر خالد محمود اور ان کے بھوپال کے احباب ڈاکٹر محمد نعمان خاں، اقبال مسعود،
رشید انجم اور عشرت قادری خوشگوار موڈ میں



ڈاکٹر خالد محمود مختلف موڈ۔۔۔ متفرق انداز

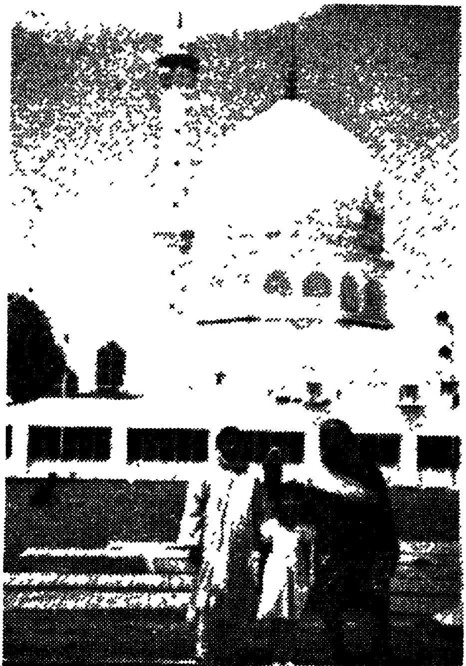




ڈاکٹر خالد محمود
کے والد
محترم جناب منشی
محمد عبید خاں
مرحوم تاریخ
وفات
۶؍دسمبر ۱۹۹۳ء
(بھوپال)

اور

ڈاکٹر خالد محمود



خالد محمود کی والدہ محترمہ
سلطان جہاں بیگم،
اہلیہ مرحومہ جمیلہ خالد
اور بیٹی فوزیہ آفرین
سری نگر (کشمیر)
کی مشہور مسجد
"حضرت بل" میں





خالد محمود کی اہلیہ مرحومہ جمیلہ خالد اور خالد محمود



خالد محمود کی اہلیہ مرحومہ جمیلہ خالد، بیٹی فوزیہ آفرین جمیلہ خالد کی بھیجی فائزہ نعمانی



خالد محمود۔۔۔ اپنے بھائی آصف محمود، بیٹی فوزیہ آفرین اور فائزہ نعمانی کے ساتھ





خالد محمود کی اکلوتی بیٹی

فوزیہ آفرین



ڈاکٹر خالد محمود اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر تسنیم فاطمہ



سابق صدر جمہوریۂ ہند عزت مآب جناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما، ڈاکٹر خالد محمود
اور بیگم خالد محمود، ڈاکٹر تسنیم فاطمہ

شخصیت

پروفیسر ظفر احمد نظامی
شعبۂ سیاسیات،
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر خالد محمود

(قلمی چہرہ)

چہرہ کتاب نما، تبسم ماہتاب نما۔ دراز قد، دلکش خال و خد۔ صحت مند جسم، دلربا طلسم۔ ستواں ناک، زبان بے باک۔ آنکھوں میں چمک، رخ پر دمک۔ تاحد نظر پیشانی، دلیل خوش بختی و جانفشانی یہ ہیں ممتاز شاعر و ادیب، زبان و ادب کے نقیب، رہرو منزل تحقیق، خارزار تنقید کے رفیق۔ ایک کامیاب استاد، مجسم اعتبار و پیکر اعتماد۔ بے نیاز زیان و سود، یعنی ڈاکٹر خالد محمود "

خالد پندرہ جنوری انیس سو اڑتالیس کو اس جہان آب و گل سے متعارف ہوئے سرونج کی جانفزا فضاؤں کے عارف ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسے میں پائی، اپنی دنیا آپ بنائی۔ اردو میں ایم اے کی سند لی، پھر اپنی روش بدلی۔ درجن بھر ڈگریوں کا بوجھ اٹھایا، خود کو پی. ایچ. ڈی سے سجایا۔ درس و تدریس کو پیشے میں ڈھالا، قلم کو تیشے میں ڈھالا، جامعہ ملیہ سے وابستگی اختیار کی، اردو کی خدمت شعار کی۔ ورک شاپس کی رونق بڑھائی، محنت و ریاضت کی داد پائی۔ مگر بے چارے طلبہ پر غضب کیا، بے شمار نصابی کتابوں کو مرتب کیا۔ اب تک اس کام کے لئے معروف ہیں، تصنیف و تالیف میں مصروف ہیں۔

انہوں نے "سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ" کیا، "سعی حاصل" سے باب تنقید کو وا کیا۔ کرہ ارض پر "سمندر آشنا" ہوئے، "شعر چراغ" کے نور پر فدا ہوئے۔ "شگفتگی دل" سے "تحریر کے رنگ" دکھائے، "کتنے ہی خوبصورت پھول" کھلائے۔ "ماحول کے ذریعہ تعلیم" کو سنوارا، گوری کی سندرتا کو نکھارا۔ تبصروں کو بے لاگ کیا، اداریوں کو آگ کیا، انشائیوں کے گیسوں سنوارے، قلمی چہروں کے نقوش ابھارے۔ داد تحسین کا جام پایا، ہر

تخلیق پر انعام پایا۔

خالد کانفرنس میں بولتے ہیں، سیمیناروں میں لب کھولتے ہیں۔ نشستوں کا اہتمام کرتے ہیں، شاعروں کا انتظام کرتے ہیں۔ انجمنوں کے روح رواں ہیں، تنظیموں کے میر کارواں ہیں۔ ادبی محفلوں کی جان ہیں، ثقافتی مجلسوں کی شان ہیں۔ اردو ان کا ایمان ہے، ادب ان کی جان ہے۔ اردو کی ترویج و تبلیغ میں آگے بڑھتے ہیں، کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ صلہ کی پروا کے بغیر اردو پڑھاتے ہیں، اردو خواندگان کی تعداد بڑھاتے ہیں۔ غیروں کے غم میں تڑپتے ہیں، معیاری رسائل میں چھپتے ہیں۔ ان کے اشعار ذہن و دل کو گدگداتے ہیں، خلوت و جلوت میں یاد آتے ہیں۔ میر و غالب پر جان چھڑکتے ہیں، ان کے ایک ایک شعر کو پہروں تکتے ہیں۔

بھوپال سے انہیں عشق ہے، جو ادب کا شیرازہ، تہذیب کا دمشق ہے۔ بار بار اس کا طواف کرتے ہیں اس کی یاد میں آہیں بھرتے ہیں، وہ دلی میں بھوپال کے غیر سرکاری نمائندہ ہیں، لگتا ہے بھوپال والوں کے لئے ہی زندہ ہیں۔ ان کا گھر بھوپال ہی کی ایک شاخ ہے، بھوپال تال کی طرح ان کی دل بھی فراخ ہے۔

وہ بڑے مہمان نواز ہیں، مدھیہ پردیش کے لئے وجہ عز و ناز ہیں۔ کبھی سنبھلتے ہیں کبھی گرتے ہیں، اپنی کار لئے لئے پھرتے ہیں، تاکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لوگوں کو لا سکیں، انہیں ہمہ وقتی مہمان بنا سکیں۔ ان کی مدارات کرتے ہیں، محبتوں کی برسات کرتے ہیں۔ جب پہلے مہمان سے بچھڑتے ہیں تو دوسرے کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ انہیں کھانسی ہو یا بخار، نبض تیز ہو یا سست رفتار، وہ دوستوں سے دامن نہیں بچاتے۔ کسی بھی حال میں ہوں انہیں نہیں بھلاتے۔ ہر معاملہ میں وفا شعار ہیں، بے پناہ وضع دار ہیں۔ دعوتیں کرنا انہیں پسند ہے، ان کا معیار شکم پروری بلند ہے۔ خلوص کے زیر دام آتے ہیں اپنے پرایوں کے کام آتے ہیں۔

وہ زندگی کے احوال پر کاربند ہیں، مگر بڑے ہی عجلت پسند ہیں۔ انہیں کھیل کود سے رغبت نہیں، فٹ بال، کرکٹ سے کوئی محبت نہیں۔ البتہ دماغی ورزش خوب کرتے ہیں، ذہنی کثرت کو مرعوب کرتے ہیں۔ ادبی جلسوں میں باجماعت شریک ہوتے ہیں، داد کے ڈھوبرے بھر بھر کر ڈوھتے ہیں۔

خالد پابند رسم و رواج ہیں، بڑے منکسر المزاج ہیں۔ سب سے جھک کر ملتے ہیں، پھول کی طرح کھلتے ہیں۔ ان کا ہر انداز معصوم ہے، ان کے خلوص کی ہر جگہ دھوم ہے۔ وہ ہر شخص پر اعتبار کر لیتے ہیں، کام آنے کی ہر حد پار کر لیتے ہیں۔ دوستوں کو قرض دینا انہیں مرغوب ہے، قرض دے کر واپس نہ لینا محبوب ہے، دراصل وہ اپنے خود ساختہ اصولوں کی دنیا میں رہتے ہیں اپنے بارے میں خود کہتے ہیں ؎

ہر کس و ناکس پہ کر لیتا ہے فوراً اعتبار
بے خبر کتنا ہے خالد باخبر ہوتے ہوئے

○

پروفیسر عبدالقوی دسنوی
۲۔ پرنس کالونی، عید گاہ ہلس بھوپال

خالد محمود

میں آج سے تقریباً اکیس سال پہلے ۱۹۶۱ء میں بھوپال آیا اور یہاں کی ایک ایسی تعلیم گاہ سے اپنا رشتہ جوڑ لیا، جس کی بنیاد اس شہر کی ایک انسان دوست صاحب دل شخصیت مُلّا سجاد حسین نے اپنی ساری خواہشوں کو قربان گاہ پر چڑھا کر عام انسانی بھلائی کی آرزوؤں کے چراغ کو روشن کرنے کے لئے ڈالی تھی اور جس کی نگرانی انہیں کے نیک دل صاحبزادے اور اس شہر کے ہر دلعزیز فرزند ملا فخر الدین صاحب کر رہے تھے اور آج تک اس پر آشوب دور میں بھی نہایت ہوش مندی کے ساتھ اس کی دیکھ ریکھ فرما رہے ہیں۔ میری مراد سیفیہ کالج سے ہے۔ جس کے مستقبل کے بارے میں اس زمانے میں بعض حضرات مشکوک تھے اس لیے اس خیال کے اکثر اساتذہ وقتی ضرورت کے تحت اس سے تعلق پیدا کرتے اور جوں ہی کسی بہتر جگہ کے حاصل کرنے کی انہیں امید بندھتی اسے چھوڑ کر اس طرف بڑھ جاتے البتہ کچھ ایسے اساتذہ بھی اس زمانے میں اس ادارے سے متعلق ہوتے تھے جنہوں نے بغیر کسی بڑے دنیاوی یا مادی فائدے کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کی خدمت کو جزو زندگی قرار دیا تھا، ایسے اساتذہ، اچھے، ذہین، باصلاحیت اور پڑھنے لکھنے والے طلبہ کی تلاش میں رہتے تھے اور انہیں پاکر خوش رہتے تھے اور ان کو تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانے، آگے بڑھانے، صحیح رہنمائی کرنے اور ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے تھے اور ان سے مستقبل کے لئے بڑی بڑی امیدیں بھی قائم کر لیتے تھے۔

سیفیہ کالج میں خالد محمود کا ایسے ہی طلبہ میں شمار ہوا، ۱۹۶۵ء میں جب انہوں نے یہاں داخلہ لیا تو بہت جلد اپنے ساتھی طلبہ اور اساتذہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہوگئے، یہ پہلی ہی نظر میں، سیدھے سادے، متوسط مسلمان گھرانے کے نمائندے، مہذب،

خوش اخلاق، نیک عادات کے حامل دکھائی دیے، پھر کچھ ہی دنوں میں وہ اپنی ذہانت، ذکاوت اور صلاحیت کا سکہ دلوں پر بٹھانے میں کامیاب ہوتے نظر آئے اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ کسی اچھے ادارے کو ایسے ہی طالب علم کی تلاش رہتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں، کسی ادارے کو اگر ایسے طالب علم مل جائیں تو پھر اس کی نیک نامی کا ایک دنیا میں شہرہ ہو جائے اور ایک زمانہ اس ادارے کی عظمتوں کا معترف ہو جائے۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا خالد محمود اپنی جماعت کے ساتھیوں کی حدود سے نکل کر کالج کی وسعتوں میں نہ صرف اپنی پہچان کرانے میں کامیاب ہونے لگے، بلکہ ان کی مقبولیت روز بروز بڑھتی نظر آنے لگی۔ یہاں تک کہ اس شہر کے ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے، پھر وہ سیفیہ سے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہندوستان کے دل یعنی دلّی کی ایک عظیم دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہو گئے اور وہاں کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں ایسے لگے کہ اچھے مدرس کی حیثیت سے نیک نام اور مقبول ہوئے۔ مجھے کئی بار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں محض ان کی وجہ سے ٹھہرنے کا موقع ملا، جہاں یہ دیکھ کر بے انتہا مسرت ہوئی کہ وہ اپنے طلبہ کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے ہیں اور ان کی ذہنی تعمیر و تربیت میں مصروف رہتے ہیں، یہ جان کر اور زیادہ خوشی ہوئی کہ وہ اپنے طلبہ میں نہایت مقبول اور ساتھی اساتذہ میں ہر دلعزیز ہیں۔

جیسا کہ لکھ چکا ہوں سیفیہ میں جب انہوں نے بی اے میں داخلہ لیا تھا تو ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے اپنے آپ کو متعارف کرانے میں انہیں کامیابی ہوئی تھی، لیکن ایم اے تک پہنچتے پہنچتے ان کی ادبی صلاحیتیں نکھرتی دکھائی دیں، چنانچہ سب نے دیکھا اور خوشی محسوس کی کہ کبھی انہوں نے شاعری کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے اور اپنی نظم گوئی کی صلاحیت سے متعارف کرایا اور سب کو اپنا معترف بنایا، کبھی غزل کے پیچ و خم سے کامیابی کے ساتھ گزرے جس سے ان کے ساتھی اور اساتذہ متحیر بھی ہوئے اور قدرداں بھی بنے اور کبھی اپنے انشائیوں سے کاروان سیفیہ کی محفلوں، شعبے کی ادبی مجلسوں کو مسکرانے، ہنسنے اور زور سے قہقہہ لگانے پر مجبور کیا وہ صاف ستھرا تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں اور تحقیق کی طہارت سے بھی آگاہ ہیں، لیکن ان دونوں میدانوں میں باضابطہ اترنے کا انہوں نے ابھی اعلان نہیں کیا ہے شاید تنقید کی بے مروتی اور تحقیق کی دیدہ ریزی نوجوان شاعر کو اس طرف آنے سے

روکتی ہے۔ لیکن ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر یقین ہے کہ اگر انہوں نے اس طرف بھی توجہ کی تو ادب کے ان میدانوں میں اپنے نام کا اضافہ کرنے میں انہیں دیر نہیں لگے گی۔[1]

خالد محمود ایک ایسے سیدھے، سچے، کھرے اور کھدرے پٹھان خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو بھوپال سے تقریباً ڈیڑھ سو کیلو میٹر دور ایک مردم خیز، اسلامی روایات کی حامل سرزمین سرونج سے تعلق رکھتا ہے سرونج کے متعلق مجھے آج یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ زبان و ادب سے اور خاص طور سے شعر و شاعری سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والے حضرات کی یہاں نہ صرف بڑی اچھی تعداد ہے بلکہ وہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں، لیکن شہرت سے بے نیاز اپنی تخلیقات اپنوں ہی تک محدود رکھ کر مطمئن نظر آتے ہیں۔ میں یہ باتیں نہایت اعتماد کے ساتھ اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے وہاں کے اکثر باصلاحیت لیکن نہایت سادہ مزاج طلبہ سے واسطہ رہا ہے، میں نے انہیں نہایت مہذب، مسلمان طبیعت، خوش اخلاق اور خوش مزاج پایا اور ان کی ذہانت اور ادبی صلاحیتوں سے متاثر ہوا، خالد محمود انہیں میں سے ایک ہیں جو اپنے پٹھان ہونے کی وجہ سے سادہ دل، سادہ مزاج، نیک سیرت اور پر خلوص طبیعت کے مالک ہیں، وہ اپنے ساتھیوں سے ٹوٹ کر محبت اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا دل سے احترام ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی بڑھ چڑھ کر دل سے خدمت بھی کرتے ہیں اور اپنے اس عمل سے خوش بھی رہتے ہیں اور اسے حاصل بھی جانتے ہیں۔ مہمانوں اور دوستوں کے ساتھ اس طرح کا حسن سلوک روا رکھتے ہیں کہ کبھی کبھی ان کی حالت پر ترس آنے لگتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو اپنوں پر بے دریغ خرچ کر کے اس حد تک خوش ہوتے ہوں جس طرح خالد محمود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر ان کو عزیز رکھنے والے ان کے یہاں مہمان بن کر آنے میں گھبراتے ہیں کہ ان کا خلوص اور جذبہ مہمان نوازی خود ان کے لئے پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔

ان کی سادہ لوحی، جذبہ کی شدت، خیالات کی پاکیزگی، کردار کی سچائی اور ان کے رنگا رنگ اچھے برے تجربات ان کی شاعری کی جان ہیں جو اپنی طرف صاحب ذوق کو متوجہ بھی کرتے ہیں اور ایک اچھے شاعر کی دنیائے اردو میں آمد آمد کی بشارت بھی دیتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ کیجئے۔

---

[1] یہ ۱۹۸۲ء کی تحریر ہے جب سے اب تک خالد محمود نے تحقیق و تنقید کی کئی منزلیں طے کرلی ہیں۔ (ادارہ)

خوبیٔ قسمت سے ہیں اتنے میسر آشنا　　گھر کے سب شیشے ہوئے جاتے ہیں پتھر آشنا
کوٹھیوں سے معذرت کے ساتھ، کیا معلوم تھا　　دھوپ میں جھلسے ہوئے بھی آدمی کہلائیں گے
ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی　　کہ دیوار دیوار چلنے لگا
ہر اک زخم پردل نے آواز دی　　مرے محترم، مہرباں، آشنا
دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی　　اک دست نازیاد کا شانہ دبا گیا

یہ اشعار خالد محمود کی جس طرح پہچان کراتے ہیں وہ مستقبل کے ایک منفرد لہجے اور مقبول شاعر کی طرف اشارہ کرتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ خالد محمود ہمیں ایک دن اس شاعر سے ملانے میں کامیاب ہوں گے، ہم سب کو جو ان کو عزیز جانتے ہیں اس مسرت اور کامیابی کے دن کا شدید انتظار ہے۔

○

پروفیسر صغرا مہدی
عابد ولا۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

خالد محمود------ایک تاثر نہ کہ تجزیہ

سنہ تو یاد نہیں بیس بائیس سال ہوئے اکتوبر یا نومبر کا مہینہ تھا میں اپنی بڑی بہن کے ساتھ اپنے گھر کے لان میں بیٹھی تھی میری بہن ملنے آئی ہوئی تھیں ممانی جان کہیں گئی ہوئی تھیں اور ہم دونوں باتوں میں محو تھے کہ ایک آواز آئی السلام علیکم ہم لوگ چونکے ایک نوجوان خاصے اسمارٹ کھڑے تھے۔ انہوں نے اپنا نام خالد محمود بتایا اور کہا کہ وہ بھوپال سے آئے ہیں۔ بھوپال کے نام پر میں اور بجیا دونوں چونکے اور میں نے اٹھ کر کچھ زیادہ ہی اپنائیت سے ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے ایک خط دیا جو ہمارے کسی بھوپالی عزیز کا تھا جس میں ان نووارد نوجوان کی تعریفیں کی گئی تھیں اور ساتھ میں ان کی سفارش کی فرمائش تھی کہ عزیزی جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول میں انٹرویو دینے آرہے ہیں ان کی مدد کی جائے۔

ہم دونوں کو خالد محمود کی نوکری سے زیادہ اس بات سے دلچسپی تھی کہ وہ بھوپال سے آئے ہیں جو ہماری جنم بھومی ہے جو ہمارے بزرگوں کا وطنِ ثانی ہے اور اب ہمارا اس سے کوئی ناتا نہیں تھا۔ ہم دونوں ان سے بھوپال کا احوال معلوم کرنے میں لگ گئے۔ میری یادیں تو دھندلی اور گڈمڈ تھیں مگر بجیا کی بہت صاف اور واضح۔ قاعدہ سے تو خالد محمود کو ہم سے کبیدہ خاطر ہونا چاہئے تھا کہ وہ جس کام کے لئے آئے تھے اس کا تو ذکر فکر نہیں دونوں کی دونوں بھوپال -- بھوپال کررہی ہیں مگر وہ خوش تھے کہ چلو وطن سے دور کچھ اپنے ہم وطنوں کا پتہ معلوم ہوا۔ اور وہ شام کافی دلچسپ گزری۔

جہاں تک ہمیں علم ہے انہیں بغیر کسی سفارش کے (گو کہ آج کے حالات میں یہ بات خاصی ناقابل یقین ہے) نوکری مل گئی کم از کم ہمارے خاندان کا اس میں کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ مگر پھر بھی ان سے دوستی کا رشتہ استوار سے استوار تر ہوتا گیا۔ پھر دیکھتے دیکھتے خالد محمود

جامعہ میں رہلے مہلے ہوگئے۔ ثانوی اسکول کے (اس زمانے تک اسے ثانوی مدرسہ ہی کہا جاتا تھا) ہر دلعزیز استاد اور وہاں کے استادوں کے دوست ہوگئے ان کا حلقہ یاراں ثانوی کے حدود سے باہر بھی تھا۔ وہ وارڈن بھی تھے اسی بورڈنگ کے جس کے وارڈن کبھی ہمارے محبوب استاد مجاہد حسین زیدی ہوا کرتے تھے اور ہمارے بہت سینئر ساتھی رہتے تھے ہم نے وہاں چاندبی بی ڈرامے کی ریہرسلیں کی تھیں خالد محمود اسی بورڈنگ میں ہمیں کبھی بحیثیت مہمان خصوصی کے مدعو کرتے کبھی بیت بازی کا جج بنادیتے تھے۔ اس طرح ہم ان سے بہت قربت محسوس کرنے لگے کہ یہ جامعہ اسکول کی پرانی روایات سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کو برقرار رکھنے میں کوشاں ہیں۔

خالد کو اچھا کھانا بہت پسند ہے اور کھلانا اس سے بھی زیادہ۔ دعوتیں دینا اور دعوتیں قبول کرنا انہیں بہت اچھا لگتا ہے یہ ایسے لوگوں کو بھی اپنے گھر میں دعوت میں بلا نے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جو دعوتیں کھانے سے گھبراتے اور کتراتے ہیں جیسے ہماری ممانی جان مرحومہ (صالحہ عابد حسین) اور شاہد علی خاں مکتبہ جامعہ کے منیجر۔ ایک دفعہ کیا ہوا ہماری غیر حاضری میں خالد نے نہ جانے کب اور کیسے ممانی جان کو اپنے گھر آنے اور کھانا کھانے پر مدعو کرلیا۔ ممانی جان بھول گئیں کہ کب کھانے پر جانا ہے شاہد صاحب کو فون کیا "بھئی شاہد خالد محمود کے گھر کب کھانے پر جانا ہے؟ موصوف بولے شاید آج ہی جانا ہے میں ابھی گاڑی لے کر آتا ہوں چنانچہ ٹھیک ساڑھے سات بجے ہم تینوں پہنچ گئے اور خالد کے چہرے پر جو ہوائیاں تھیں اسے صرف خاکسار نے تاڑا۔ مگر بھئی کمال ہے ان کی مرحومہ بیوی جمیلہ نے گھر میں خالد نے باہری امداد سے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے دعوتی کھانا دستر خوان پر چن دیا۔ میں نے چپکے سے ممانی جان سے کہا آپ لوگ ایک دن پہلے آگئے ہیں دعوت میں۔ مگر انہوں نے جواب دیا "بکومت" ان لوگوں کی کارگزاری تھی ان کو یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ آج وہ لوگ ان کے یہاں بن بلائے مہمان ہیں۔

شعبہ اردو میں اکثر یہ آتے مظفر حنفی صاحب سے ملتے کبھی کبھی حنیف کیفی صاحب سے بھی چہلیں ہوتی تھیں ان کے ہنسنے ہنسانے کی عادت اور فقرے بازی نے ہمیں بہت جلد اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ان کا اصرار شروع ہوا کہ بھوپال چلئے۔ "بھئی آپ کیسی بھوپالن ہیں کہ اپنے وطن ہی کو بھلا بیٹھی ہیں جا کر دیکھئے تو کہ کیسے لوگ ہیں آپ کی طبیعت

خوش ہو جائے گی" غرض کہ ان کا اصرار اس قدر بڑھا کہ ہم نے ممانی جان کو تیار کر لیا کہ ۱۹۸۲ کے جون کے دس دن بھوپال میں گزاریں گے۔ ہمارے ماموں بھی تیار ہو گئے کہ ان کا بہت وقت بھوپال میں گزرا تھا۔ اپنی چھوٹی بہن نزہت نے جب یہ خبر خالد کو دی تو معلوم ہوا موصوف عازمِ سری نگر ہیں این سی ای آر ٹی کی ورکشاپ میں۔ تو کہا کیا ہوا ہمارا انتظام کسی گیسٹ ہاؤس میں کرادو بس۔

خالد بولے ہم اپنے مہمانوں کو گیسٹ ہاؤس میں نہیں ٹھہراتے اور یہیں بیٹھ کر ایسے انتظام کر ڈالے کہ ہمیں ان کی ذرا کمی محسوس نہ ہوئی اور پھر تو بھوپال ہمارے لئے گھر آنگن ہو گیا اور وہاں اتنے اچھے دوست ملے جن سے دوستی کا رشتہ ہموار ہو گیا ہے اور میں تو یہ کہوں گی کہ خالد محمود ہی ہیں جنہوں نے بھوپال سے ہمارے ٹوٹے رشتے کو پھر سے جوڑ دیا۔ ہم نے بھوپال کے اس سفر کا سفر نامہ بھی لکھا جسے خالد نے سب سے زیادہ سراہا اور لکھت میں بھی اس کا ثبوت فراہم کیا۔

خالد محمود کی شخصیت کا تجزیہ کیا جائے تو جو صفت ان میں نمایاں نظر آئے گی وہ ان کا خلوص اور وضع داری ہے۔ جو لوگ انہیں جانتے ہیں وہ یقیناً میری اس رائے سے پورا اتفاق کریں گے۔

مہمان نوازی کا تو انہیں اس قدر شوق ہے کہ ان کے لئے ذرا سے تصرف کے ساتھ یہ مصرعہ پڑھا جا سکتا ہے۔

نہ مہماں ہو تو فاقہ ہے خالد اللہ کے گھر میں

بڑے شہروں کی طرح کچھ یہاں کی آب و ہوا کے اثر سے کچھ مجبوریوں کی وجہ سے دہلی والوں کا تو یہ حال ہے کہ کوشش کرتے ہیں کہ مہمان نہ آئیں تو اچھا ہے اور اگر آ بھی جائیں تو زیادہ ٹھہریں نا۔ خالد ڈھونڈ ڈھونڈ کر مہمانوں کو اپنے گھر لے آتے ہیں دوسروں کے مہمانوں کو بھی اپنا لیتے ہیں۔ اور جب ہم جیسے بزعم خود عقلمند لوگ ان کے مہمان داری کے اس شوق پر اعتراض کرتے ہیں خالد ہنس کر چپ ہو جاتے ہیں کچھ اس طرح کہ ارے تم لوگ ان وضعداریوں کو کیا سمجھو گے جب وہ وارڈن تھے اور ان کے پاس دو کمرے تھے تب بھی ان کے گھر مہمان آتے تھے جب وہ وارڈن نہیں رہے اور ان کو بہت ہی چھوٹا مکان رہنے کو ملا اس میں بھی مہمان آتے تھے اور اب یونیورسٹی کی طرف سے کافی بڑ

مکان ملا ہے تب بھی مہمان آتے ہیں۔

خالد کو اپنا خاندان اپنی برادری اور اپنا وطن بہت عزیز ہے جس کے حدود سرونج سے بھوپال اور بھوپال سے دہلی اور اس کے آگے بڑھتے ہی جاتے ہیں یہ جہاں جاتے ہیں اپنے دوست بنا آتے ہیں۔ ایک اچھے استاد ہیں ایسے استاد جو طالب علموں سے محبت کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ رعب بھی۔ ان کو پڑھانا اچھا لگتا ہے اور پڑھاتے بھی اچھا ہیں۔ جب تک اسکول میں پڑھاتے رہے تب بھی اور اب جب یونیورسٹی میں آگئے تب بھی ان کا یہی وطیرہ ہے۔ ان میں ایک اور عجیب بات ہے کہ یہ لوگوں کی مدد کو دامے درمے اور سخنے تیار رہتے ہیں جو دوسروں کے ساتھ کرتے ہیں اس کا حساب نہیں رکھتے مگر دوسرے ان کے ساتھ جو کریں اس کا حساب رکھتے ہیں اور موقعہ ملتے ہی اس کو چکا دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاموں میں سیمی کولن، کولن اور فل اسٹاپ کے قائل نہیں نہ گفتگو میں۔ دوست نواز اس قدر ہیں کہ دوستوں کی فرمائش پر ہر جگہ جانے کو تیار چاہے دعوتیں ہوں یا مزاروں کے عرس، شادی بیاہ ہو یا ادبی سمینار اور جلسے جلوس۔ مگر بیمار پرسی اور ماتم پرسی میں یہ اکیلے ہی پہنچ جاتے ہیں اور اس کی کوشش کرتے ہیں کہ دوسروں کو بھی وہاں لے جائیں اس کے لئے سواری اور رہبری دونوں کے فرض ادا کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ وہ اکثر لوگوں کو ادھر ادھر چھوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اس لئے کہ ان کے پاس سواری ہے! یہ لوگوں کی دلداری بھی کرتے ہیں اور پاسداری بھی لیکن اگر کوئی غلط بات کرے تو یہ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور اپنی ''پٹھنولی'' دکھانے لگتے ہیں۔

خالد، صاحبِ اقتدار بلکہ صاحبِ اختیار لوگوں سے نہ بھاگتے ہیں نہ ان کے پیچھے لگتے ہیں ان سے صاحب سلامت اور یاد اللہ رکھتے ہیں ان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ وہ ان کے رتبہ و مقام دونوں سے واقف ہیں اور اس کا پورا احترام ہے مگر یہ لوگ ''اکڑ فوں'' کرنے لگیں تو پھر یہ کسی ''خاں'' کی پرواہ نہیں کرتے۔

خالد محمود اچھے شاعر اور بہت اچھے انشائیہ نگار ہیں ان میں ایک قسم کا لاابالی پن ہے ورنہ یہ اب تک کئی کتابوں کے مصنف ہوتے۔ مگر ان کو سیاحی، دوست نوازی، مہمان داری اور تیرے میرے کاموں سے فرصت ملے تب نا۔ اگر ان سے اس مسئلے پر گفتگو کرو تو بولیں گے آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں صغرا آپا۔ دیکھئے اب آپ دیکھئے گا اب لگ کر کام

کروں گا'' مگر یہ سدھرنے والے نہیں ہیں ہر انسان کا ایک ٹائپ ہوتا ہے خالد کا بھی ایک اپنا ٹائپ ہے طاعت وزہد کا ثواب جانتے ہوئے بھی طبیعت ادھر نہیں آتی۔ہاں طاعت وزہد پر یاد آیا کہ خالد مذہبی آدمی ہیں مگر خدا کا شکر ہے کہ ان میں خشونت ہے نہ اپنے مذہبی ہونے کا بکھان کرتے ہیں تبلیغ بھی کرتے ہیں مگر ادبی زبان سے جارحانہ انداز نہیں ہوتا حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں سے واقف ہیں یہ بھی جانتے ہیں کہ ان میں کس کا پلڑا بھاری ہے مگر وہ اس پر ہر کس و ناکس سے گفتگو نہیں کرتے ان موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے ناصحانہ اور واعظانہ انداز سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں اور کامیاب بھی ہوتے ہیں۔

خالد محمود اس نسل کے نوجوان نہ سہی ایسے جوان ہیں جن میں پرانی نسل والی وضعداری ہے اور دہلی جیسے شہر میں انہوں نے بودوباش اختیار کرلی ہے مگر اپنی قصباتی تہذیب جو ہندوستان کی نمائندہ تہذیب ہے اس کو فراموش نہیں کیا ہے اور اس کا عکس ان کی شخصیت ان کے رہن سہن اور ان کی بات چیت سب میں نظر آتا ہے۔

خالد محمود اور میرا رشتہ بھائی بہن کا ہے میں ان کے بارے میں جو بھی لکھوں مجھے ان کی طرفداری کا شبہ ہوتا ہے اور خالد فہمی مشتبہ لگنے لگتی ہے۔

آخر میں یہ ضرور کہوں گی کہ خالد بہت اچھے ہیں اور مجھے بہت عزیز ہیں۔

○

ڈاکٹر شاہ عبد السلام
شعبہ عربی، لکھنؤ یونیورسٹی

خالدِ خوش خصال ہے شاعرِ خوش بیان بھی

ملاقات، ربط، تعلق، دوستی اور یاری یہ سب ربط باہم کے مختلف مراحل ہیں جن سے گذرنے کے بعد ہم کسی شخص کو اچھی طرح سمجھ اور پرکھ سکتے ہیں اس کے معائب و محاسن کا بھرپور جائزہ لے سکتے ہیں اور اس کے ذوق و شوق، مذاق و مزاج، افتاد طبع اور اس کے ظاہر و باطن کا محاسبہ بھی کر سکتے ہیں۔

کچھ شخصیتیں تو ایسی ہوتی ہیں کہ ایک دو ملاقاتوں میں ہی کھلی کتاب کی طرح واضح اور عیاں ہو جاتی ہیں مگر کچھ شخصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جن کو جاننے پہچاننے اور سمجھنے کے لئے مندرجہ بالا سبھی مراحل سے گذرنا لازم ہوتا ہے۔ اگر کوئی مردم شناس اور صاحب فہم ہے تو یہ سارے مراحل کم سے کم وقت میں طے کر کے مقصد کو پہنچتا ہے ورنہ حصول مقصد کے لئے اسے عرصہ یا زمانہ لگ سکتا ہے۔

راقم الحروف کو سردست جس شخصیت کا تعارف مقصود ہے وہ حقیقتاً ایک کھلی کتاب ہی کی طرح واضح اور عیاں ہے۔ اس ہمہ جہت اور ہمہ رنگ شخصیت کی خوبیوں ادبی صلاحیتوں، اخلاقی بلندیوں دوستانہ کرم فرمائیوں علمی فضیلت اور فکری بصیرت کا ایک مختصر سے مضمون میں احاطہ کرنا کارے دارد ہے۔ میری مراد عزیز دوست ڈاکٹر خالد محمود سے ہے جن کی شوخ مسکراہٹوں اور لطائف و ظرائف سے معمور انداز تکلم نے مجھے پہلی ملاقات میں ہی اپنا گرویدہ بنالیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے یہ تعلق دوستی کے حدود میں داخل ہوا اور ان کی محبت و خلوص اور صاف گوئی و بیباکی نے میرے دل میں اپنی ایک خاص جگہ بنالی بلکہ یوں سمجھئے کہ

"ہو گیا ان کے میں انداز تکلم کا اسیر"

پھر تو ربط باہم کے مختلف مراحل سے گذر کر ہم ایک دوسرے کے بہت قریب ہوگئے اور شاید ایک دوسرے کی مزاجی یکسانیت اور ہم ذوقی نے ایک دوسرے کے اور قریب ہونے اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی مدد کی۔ ان کی تحریروں نے خاص طور پر مجھے اپنی طرف راغب اور متاثر کیا ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود پر کچھ لکھتے وقت مشکل یہ درپیش تھی کہ کہاں سے شروع کیا جائے کہ یہ شخصیت ہمہ جہت بھی ہے اور ہمہ رنگ بھی۔ خالد محمود بہ یک وقت ایک ممتاز نثر نگار بھی ہیں اور خوش بیان شاعر بھی ایک معتبر محقق بھی ہیں اور مقبول مدرس بھی۔ بزم آرائیوں کا محور بھی ہیں اور لطائف و ظرائف کا مرکز بھی ایسی شخصیت کی جملہ خوبیوں اور محاسن کا ذکر کچھ آسان کام نہیں ہے پھر بھی کوشش شرط ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود سرونجی ٹونکی (بھوپالی) ثم دہلوی اپنے سینے میں نہ معلوم کتنے راز کتنے افسانے کتنے زخم اور کتنے فرحت افزا لمحات کی گدگدیاں سنجوئے ہوئے جب احباب کی صحبتوں اور ادبی محفلوں میں لب کشا ہوتے ہیں تو پوری محفل قہقہہ زار بن جاتی ہے۔ اور خالد محمود بزم آرائی کا محور قرار پاتے ہیں مگر جب وہ سیمینار میں کسی سنجیدہ موضوع پر اپنا کوئی تحقیقی مقالہ پیش کرتے ہیں تو موضوع پر ان کی گرفت ان کی عمیق نگاہی اور تحقیق کے اعلیٰ اصولوں کی پابندی کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے وہ اپنے مقالے میں متوازن اور معقول نتائج اخذ کرتے ہوئے تحقیق کے نئے گوشوں اور امکانات کی طرف نشاندہی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی کتاب "اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ" (مطبوعہ مکتبہ جامعہ) ان کی تحقیقی صلاحیت اور ان کی غواصی کا بہترین ثبوت ہے کہ اس موضوع پر تحقیق و تفصیل کے ساتھ معتبر تحقیقی کام مکمل کیا ہے اس کتاب کی اہل علم حضرات میں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔ خالد محمود کا دوسرا انثری مجموعہ "شگفتگی دل کی" زیر طبع ہے یہ خاکوں اور انشائیوں کا مجموعہ ہے جو جلد ہی شائع ہو کر منظر عام پر آنے والا ہے۔ تیسرا انثری مجموعہ "تحریر کے رنگ" شائع ہو چکا ہے خالد محمود کے خاکے الفاظ کے پیراہن میں شخصیتوں کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ان کے انشائیے بھی ان کی ظریفانہ حس کی نشاندہی کرتے ہیں اور قاری کو اس کے ادبی ذوق کی تسکین کے لئے پورا پورا مواد فراہم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر خالد محمود نثر کے مرد میدان تو ہیں ہی ساتھ ہی ساتھ وہ ایک بہت ہی

صاف ستھرا اور معیاری شعری ذوق بھی رکھتے ہیں۔ شعر فہمی کے ساتھ شعر گوئی کا بھی انھیں خاص ملکہ ہے ان کے دو شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن کی شعر و شاعری کی دنیا میں کافی پذیرائی ہوئی ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "سمندر آشنا" تھا اور دوسرا مجموعہ "شعر چراغ" ہے ان مجموعوں کی ورق گردانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ خالد محمود بھی دیگر کہنہ مشق شعراء کی طرح ایک نازک اور حساس دل رکھتے ہیں ان کا یہ دل دھڑکتا بھی ہے اور شدت احساس سے مغلوب بھی ہوتا ہے۔ مچلتا بھی ہے اور روٹھتا بھی ہے اور گرد و پیش کے حادثات سے متاثر اور پژمردہ بھی ہوتا ہے کہ یہی زندہ دلی اور متحرک زندگی کی علامت ہے۔ اور یہ علامت خالد محمود کے اشعار میں صاف طور پر واضح اور عیاں ہے ۔

دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
اک دستِ نازیاد کا شانہ دبا گیا

یہ کس خیال کا محشر بپا سا رہتا ہے
تمہارا رنگ ادھر کچھ اڑا سا رہتا ہے

ہر ایک پھول کو چومے لب تصور سے
درونِ دل کوئی شیطاں بھلا سا رہتا ہے

رگوں میں خون شوخی کررہا ہے
ستارہ سی وہ پیشانی نہیں ہے

چاند کی دنیا میں کیا اندھیر ہے پتھر ملے
ہم نے سوچا تھا وہاں سے روشنی بھر لائیں گے

ان کو آنا ہی کب تھا جو آئے نہیں چاند نکلا نہیں تھا تو کیا دیکھتے
کان سُن ہو گئے آہٹوں پر دھرے آنکھیں پتھرا گئیں راستہ دیکھتے

وہ سدا سے مل رہا تھا ٹوٹ کر
آج بچھڑا ہے تو بچھڑا ٹوٹ کر

خالدِ بینا کی بینائی گئی
گر گیا آنکھوں سے چشمہ ٹوٹ کر

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے

چونکہ خالد محمود خوش گو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک باصلاحیت اور تجربہ کار مدرس بھی ہیں اس لئے الفاظ و معنی کی مزاج شناسی اور فکر و فن کی غوّاصی انھیں حاصل ہے وہ اپنے منتخب الفاظ و تراکیب سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اشعار میں ایسی نغمگی اور موسیقیت پیدا کرتے ہیں جو دلوں کو مسحور اور دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اشعار ملاحظہ ہوں ۔

رنگ و رامش زمزمے گل ہائے تر ہوتے ہوئے
دل اکیلا اور اتنے ہم سفر ہوتے ہوئے

نصف دنیا بھوک سے اور پیاس سے مغلوب ہے
دست و بازو ذہن و دل ، لعل و گہر ہوتے ہوئے

"رنگ و رامش" "گل ہائے تر" "زمزمے" "ذہن و دل" "لعل و گہر" یہ سب الفاظ و تراکیب اپنے مخصوص صوتیاتی آہنگ کیساتھ شعر میں ایک خاص غنائیت پیدا کر رہے ہیں جس سے شعر کی دلکشی اور تاثیر میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔

زندگی کی تگ و دو اور منزل کے حصول کی جدوجہد انسان کو مزید حوصلہ عطا کرتی ہے اور یہی حوصلہ وہ نسخہ کیمیا بن جاتا ہے جس کے سہارے خوب سے خوب تر کی تلاش میں شاعر میدانِ زبان و بیان میں رواں دواں نظر آتا ہے اور اس کی پرواز فکر اپنا ایک الگ اور منفرد مقام متعین کر لیتی ہے۔ خالد کے کلام میں بھی ہمیں جستجوئے پیہم، سخت کوش جدوجہد اور پختہ عزم و حوصلہ کے وہ خدو خال نظر آتے ہیں کہ جن کے سہارے شاعر فن کی بلندیوں کی طرف رواں دواں ہے اور قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔

شکستہ سفینہ مسافر نڈھال
تلاطم، شب تار، بارش، ہوا

میں گنجان شہروں کا مارا ہوا
نوازش، نوازش، نوازش ہوا

سیلاب کی آمد پہ نہ حیرت ہے نہ ڈر ہے
خالد کا تو دریا کی گذر گاہ میں گھر ہے

جو تو نہیں تو لہو سرد ہوتا جاتا ہے
مرے وجود کی دھڑکن بتا کہاں ہے تو

ہر ایک سمت ہیں پختہ بلند دیواریں
سنہری دھوپ کے آنگن بتا کہاں ہے تو

تلاش ذات نے بھٹکا دیا ہے
اب اک ذہنی خلا ہے اور میں ہوں

ستارے چھونے کی خواہش جوان رہنے دے
ہمارے سر پہ ابھی آسمان رہنے دے

ذاتی تجربات و محسوسات کو الفاظ کے پیراہن سے سجا سنوار کر خالد محمود جب قرطاس و قلم کی نذر کرتے ہیں تو بڑی حسین تصویریں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور قاری الفاظ کے اس کینوس پر ابھری ہوئی تصویروں سے دیر تک کے لئے مسحور ہو جاتا ہے۔ یہی خالد کا کمال ہے۔

ہر چہرہ اک سوال ہے یاروں کی بزم میں
شاید میں امتحان کے کمرے میں آگیا

شاید کہ مر گیا مرے اندر کا آدمی
آنکھیں دکھا رہا ہے برابر کا آدمی

آواز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھئے
پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی

میں جس خیال سے دامن کشیدہ رہتا ہوں
وہی خیال میرا انتظار کرتا ہے

کسی نے زخم پہ میرے کب اعتبار کیا
جب اِن کو دیکھ کے اُن کی کلائیاں دیکھیں

اندازِ میرؔ ایک ایسا سدا بہار اسلوب ہے کہ جسے ہر دور میں پسند کیا گیا اور اس کی پذیرائی ہوئی۔ ہر دو میں شعراء نے اس رنگ میں اشعار کہے ہیں اور داد و تحسین حاصل کی ہے۔ میرؔ کے رنگ میں خالد محمود کے جو اشعار ہیں وہ بہت ہی سادے مگر شوخ اور تیکھے ہیں کہ سنتے ہی دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں اور ان کا تاثر بہت ہی دیر تک قائم رہتا ہے۔ اور قاری اس مخصوص لہجے اور اسلوب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

کبھی روشن سیہ راتیں کرو ہو
کبھی اشکوں کی برساتیں کرو ہو

ابھی کل تک تو تم اچھے بھلے تھے
یہ کس لہجے میں اب باتیں کرو ہو

تمہیں بھی ڈپلومیسی آگئی ہے
رقیبوں سے ملاقاتیں کرو ہو

راستہ پر خار دلی دور ہے
سچ کہا ہے یار دلی دور ہے

کام دلی کے سوا ہوتے نہیں
اور نا ہنجار دلی دور ہے

"صبح گزری شام ہونے آئی میر"
تیز کر رفتار دلی دور ہے

چھوٹی بحروں اور بالکل آسان لفظوں میں خالد بڑے ہی معنی خیز نکات بیان کر جاتے ہیں اور قاری ایک ایک شعر کی معانی آفرینی پر سر دھننے لگتا ہے۔ سلاست و سادگی بھی ان کا ایک مخصوص رنگ ہے جو انھیں انفرادی شناخت عطا کرتا ہے۔

قطرہ قطرہ بنا سمندر
انسانوں کا گھنا سمندر

آگ ہے منبع جو کچھ بھی ہو
شبنم آنسو گھٹا سمندر

کتنی ندیاں کتنے دریا
پی کر پیاسا رہا سمندر

جھوٹوں کا دربار نہیں ہوں	سرکاری اخبار نہیں ہوں
اکثر وہ بھی چبھ جاتا ہے	جو کہتا ہے خار نہیں ہوں
دل بناکر بھیج دو	بات بھی سوغات بھی
شکستہ حویلی غلاموں کی ہے	بڑا مرتبہ شہریاروں میں تھا
لہو کی کھنک سب کے چہروں پہ تھی	چمن زندگی کا بہاروں میں تھا
روز اخبار ہم سے کہتا ہے	جھوٹ کو سچ کے باب میں رکھئے

غرض کہ خالد محمود کے کلام میں پر اثر نغمگی بھی ہے اور لفظیات کی سادگی و پرکاری بھی۔ شدتِ احساس کا سوز بھی ہے اور زور بیان کی بہتات بھی۔ انکے یہاں صوری حسن اور شعری نغمگی فکر کے تابع ہے جس سے اشعار میں بلند خیالی قائم رہتی ہے۔ یہی ان کے فن کی انفرادیت بھی ہے اور ان کے اشعار کا حسن بھی۔ ابھی تو خالد محمود کو بہت سی منزلیں طے کرنی ہیں۔ بقول جگر "اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے" خدا کرے کہ ہر ہر منزل پر انھیں سرخروئی اور کامرانی نصیب ہو۔ (آمین)

O

شفیقہ فرحت
بھوپال

خالد محمود ---- ایک تاثر

پچھلے دور کے دیوانے حاتم طائیوں کی قسم کے لوگوں کے متعلق سنا ہے کہ دستر خوان بچھائے دیر رات تک انتظار کیا کرتے رہتے تھے کہ کوئی مہمان آجائے تو ماحضر نوش فرمائیں۔ خالد محمود غالباً اسی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی بھوپالی دلی گیا نہیں کہ خالد محمود اسے پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور بہ اصرار کھانا کھلایا۔ اور اگر وہ راضی ہو گیا تو اسے اپنے ساتھ ہی ٹھہرا لیا۔ اس کے آرام کا پورا پورا خیال رکھا۔ اس سے دلی کے تمام دوستوں کو فون کرنے کی درخواست کی۔ اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود اسے نمبر تلاش کر کر کے دیا۔ اس کے اعزاز میں ایک آدھ نشست ایک آدھ بڑی دعوت بھی کر دی۔ اس مہمان نوازی کے لئے شخص مذکورہ کا بھوپالی ہونا ضروری نہیں ملک یا بیرون ملک کسی بھی حصے سے آیا ہو بس اردو سے ایک تعلق ہو (رفیقانہ یا رقیبانہ !) پھر خالد محمود کا

"جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہئے۔"

ہماری خاطر تو انہوں نے ملک چین تک کی زادہ راہ کے طور پر اتنا قیمہ اور پوریاں ساتھ کیں کہ دس بارہ خوش خوراک خواتین بھی کھاتیں تو ناشتہ کم نہ پڑتا۔ افسوس صد افسوس کہ ساماں گم ہو جانے کی وجہ سے ناشتے سے لطف اندوز ہونا نصیب نہ ہوا لیکن خالد محمود اور ان کی بیگم (مرحومہ جمیلہ) کا خلوص اس میں اس درجے شامل تھا کہ دس دن بعد جو سامان ملا تو ناشتے کا پیکٹ جوں کا توں موجود تھا۔

ایسا شخص کس درجہ مقبول و مشہور ہوگا اس کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے جہاں جایئے خالد محمود ہی خالد محمود ہیں۔ ان کی شہرت و مقبولیت اور ہر دلعزیزی کی محض "پاس نمک" کی بنا پر نہیں۔ خوش مزاج، خوش اطوار، خوش گفتار بھی ہیں اور سنجیدہ

بھی۔ پھر باوقار اور باعلم بھی۔

مطالعہ وسیع ہے۔ ہر اچھی اور معیاری تصنیف خواہ وہ تخلیقی ہو یا تحقیقی تنقید وہ اپنی ذاتی لائبریری کے لئے قیمتاً حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور انہیں بغور پڑھتے بھی ہیں۔ ان سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ سیمینار کے مقالوں کی تیاری بہت محنت سے کرتے ہیں لہٰذا اکثر یونیورسٹیز اور اکادمیوں میں منعقد ہونے والے سیمیناروں میں خصوصیت سے مدعو کئے جاتے ہیں۔ شاعر بھی ہیں۔ دوگنی داد ملتی ہیں۔ اور N.C.E.R.T. کا کوئی Work shop ان کے بغیر ہوتا نہیں۔ کیونکہ یہ نصابی کتب کی ترتیب اور تدوین میں مہارت حاصل کر چکے ہیں۔

شاگرد تو محنتی تھے ہی استاد بھی اچھے ہیں۔ ورنہ جامعہ ملیہ جیسے معیاری اور شہرت یافتہ یونیورسٹی ان کی اتنی قدر و منزلت کیوں کرتی۔

دوستی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایک طرف عینی آپا ہیں۔ جن سے اچھے اچھے زیادہ دیر بات کرنے سے گھبراتے ہیں کہ پتہ نہیں کب کون سا لفظ زبان سے ایسا نکل جائے جس سے عینی آپا کی تیوریوں پر بل پڑ جائیں تو دوسری طرف کالج اسٹاف اور طلباء گرلز ہوسٹل کی طالبات، محلے پڑوس کے اکثر گھرانے۔ ہر ایک سے تو دوستی ہے۔ سب کی خبر گیری کرتے ہیں۔ ہوسٹل کی لڑکیاں وارڈن سے زیادہ انہیں اپنا گارجین سمجھتی ہیں۔

مکتبہ جامعہ کے شاہد خاں سے زبردست یارانہ ہے۔ روز نہ ملیں تو کھانا ہضم نہ ہو اور دونوں مل کے ایسے قہقہے لگاتے ہیں کہ حیرت ہے اب تک مکتبہ جامعہ کی عمارت کی چھت سلامت کیسے ہے۔

کھلے ذہن، کھلے دل کے پر خلوص انسان ہیں۔ سفر اپنے دم اور قدم پر کرتے ہیں۔ بلندیاں اپنی صلاحیتوں سے سر کرتے ہیں۔ دوڑ میں کسی کو ٹنگڑی مارتے۔ دھکا دیتے میں نے تو دیکھا نہیں۔ عیب غیب کا علم نہیں۔ ویسے بھی اعمال نامے رقم کرنے کے لیے دو کندھوں پہ دو فرشتے تعینات کئے گئے ہیں۔ ہم اس وقت دایاں بازو سنبھالے ہیں کہ قلم بھی ہمیشہ ہمارے سیدھے ہی ہاتھ میں ہوتا ہے۔ بائیں کاندھے کے فرشتے کے پاس لکھنے کے لئے کوئی Matter ہوگا تو وہ لکھے گا۔ اس کی فکر ہم کیوں کریں۔ اسے بھی تو ہاتھ پیر چلانے چاہئیں۔ ”بیکار مباش“ کا مشورہ دیئے دیتے ہیں باقی وہ جانے۔

ڈاکٹر عزیز اندوری
اندور۔(ایم. پی)

خالد محمود...... شخص اور دوست

ہنستا ہوا چہرہ۔ شگفتگی کی غمازی کرتے ہوئے ہونٹ۔ چوڑی چکلی پیشانی جس پر غصہ کی کوئی شکن نہیں ابھرتی۔ جسم کی ساخت مضبوط ستونوں کی طرح۔ کہ جنہیں حالات کی آندھیاں ہلا نہیں سکتیں۔ اسی لئے بڑے سے بڑے طوفانوں کو جھیل جانے والا سرونج کا یہ البیلا شخص۔ بھوپال سے گزرتا ہوا دہلی پہنچ کر تعلیمی اور ادبی حلقوں کا چہیتا بن گیا۔ اس کے خلوص نے اسے دوستوں اور ارباب فکر و نظر کی چاہتوں کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ اتنا کہ یہی چاہتیں اس کی شخصیت کو روز بروز نکھارتی اور سنوارتی ہیں۔ اور آج وہ چاہتوں کے ان دائروں میں جیسے مقید سا ہو گیا ہے۔ کوئی ان دائروں کو توڑنا بھی چاہے تو اسے سر سے ایڑی تک کا زور لگانا پڑے گا مگر سو فیصد وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ (یہ میرا دعویٰ ہے)

اس شخص کو میں نے سب سے پہلے دہلی میں دیکھا تھا۔ اب سے تقریباً ۲۵ سال قبل۔ نکھری نکھری شخصیت نے بہت متاثر کیا۔ پھر مظفر حنفی کے ساتھ اس کی آمد میرے گھر میں بھی ہونے لگی۔ وہ مجھ سے زیادہ اپنی "بھابھی" کا بہت جلد چہیتا بن گیا۔ بے تکلفانہ تعلقات نے اسے جیسے گھر کا ایک رکن بنا دیا۔

دنیا بھر کی باتیں ہوتی تھیں ان دنوں۔ اچھی اچھی، میٹھی میٹھی باتیں۔ شکر خدا کبھی کڑواہٹ ابھری ہی نہیں (دلوں کا حال اللہ ہی جانے) مگر میں نے خالد کے دل کو بھی ٹٹول کر دیکھا۔ بہت صاف اور ستھرا پایا۔ بس پھر کیا تھا۔ عمر کا فرق بھی رفتہ رفتہ مٹ گیا اور میں نے حسب فطرت اسے اپنے "یار غار" کی ٹولی میں شامل ہوتا دیکھ کر ہمیشہ خوشی کا اظہار کیا (کہ وہ بھی تو مجھ سے مل کر خوش ہوتا تھا)

میں دتی چھوڑ کر اندور واپس آ گیا۔ بہت سے احباب کی یادوں کو سینے میں دبائے۔

ان میں خالد محمود کی یاد بھی ذہن و دل پر اس طرح مرتسم رہی کہ آج تک اسے بھلا نہیں پایا۔ اور اس کے بارے میں ادھر ادھر سے جو خبریں ملتی رہیں ان سے اس کی ذہنی تازگی اور عملی ترقیوں کا پتہ چلتا رہا۔ ایمان دارانہ بات تو یہ ہے کہ یہ خبریں سن سن کر ہم دونوں (یعنی میں اور خالد کی بھابھی) خوش ہوتے رہے۔

مگر اس وقت اس کی طرف سے پہلی بار رنجیدہ ہونا پڑا۔ جب اس پر میری بھاوج یعنی اس کی بیوی کی موت کا جیسے پہاڑ ٹوٹ گیا، میری آنکھوں کے سامنے اب بھی وہ منظر ابھر رہا ہے۔ ڈاکٹر کشور سلطان (بیگم شمیم) ڈاکٹر مختار شمیم کی چاہتوں کو تڑپتا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ کشور کا غم مجھے بھی بہت ہوا۔ کہ شمیم سے زیادہ ان سے ''چونچیں لڑا کرتی تھیں۔ دیور جو ٹھہرا۔ (حالانکہ جیٹھ تھا مگر یہ لفظ موسمی شدت کی وجہ سے مجھے کبھی پسند نہیں تھا)

ایک طرف شمیم کا تازہ تازہ زخم دوسرے طرف خالد محمود کا رنجیدہ دل دونوں دوست شمیم اور کشور کی بیٹی صبا کی شادی میں ملے۔ بالکل اس مصرعہ کے مصداق

''آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں''

میرا دل بھی بھر آیا۔ دو دوستوں کو تڑپتا، بلبلاتا دیکھ کر۔ دونوں کو رسماً دلاسا دیا۔ مگر میں ان کی دلی کیفیت کو خوب سمجھ رہا تھا۔ خیر۔

اور اب حال ہی میں اس کی ازدواجی زندگی میں دوبارہ آنے والی ''بہار'' کی خبر نے بڑی حد تک مطمئن کر دیا۔ ہمارے چند ایک شعرا کی زندگی میں ایسے لمحات آتے رہے اور وہ پرانے زخموں کو بہتر ڈھنگ سے مندمل بھی کرتے رہے۔ خالد محمود کا پرانا زخم مندمل ہو سکے اس کے لئے صرف دعا کی جا سکتی ہے جو یقین ہے شرف قبولیت ضرور پائے گی۔ اور خالد اپنی سابقہ خوشیوں کو پا کر اپنی دل کشش شخصیت کو بہاروں کی طرح پھر سے معطر کرے گا۔

دو ماہ پہلے اندور میں ایک ''سرکاری دورہ'' پر خالد محمود کی آمد ہوئی۔ اس کام سے میرا بھی ''تعلق'' تھا۔ خالد نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ اس سے زیادہ ہم دونوں کی ملاقات ہماری خوشی کا باعث بنی۔ دنیا بھر کی باتیں ہوئیں۔ مجھے ایک شکایت تھی ''شاخیں'' کے عزیز اندوری نمبر میں اس کی عدم شرکت۔ فوراً بریف کیس کھولا۔ دو تین صفحات نکالے۔ اور کہا یہ رہا میرا آدھا ادھورا مضمون۔ مگر میں یہاں نہیں دوں گا۔ پہلے اسے اپنی بھابھی کو سناؤں

گا پھر تمہارے حوالے کروں گا۔ اور رات میں وہ گھر آیا ہنس ہنس کر اپنا ادھورا مضمون اپنی بھابھی کو سنایا جس میں مجھ سے زیادہ اپنی بھابھی کی تعریف کر ڈالی۔ میں نے وہ کاغذات اس کے ہاتھوں سے چھین لئے۔ چاہتا تھا کہ انہیں پھاڑ کر پھینک دوں یا بھاڑ میں جھونک دوں۔ کیسا انسان ہے مضمون مجھ پر لکھا اور تعریفیں بگھار دیں اپنی بھابھی کی لیکن اس کے خلوص کی داد دینی پڑی کہ چلو کسی طرح تو مجھ سے تعلق رکھتا ہے میرا دوست مضمون ادھورا سہی مگر خالد محمود کی یاری اور دوستی تو پوری پوری ہے۔ اس کے سہارے ہی اس سے نباہ رہا ہوں۔ اور اپنا یہ آدھا ادھورا مضمون مدیر "انتساب" کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ اس میں خالد محمود کی جاذب شخصیت کا ذکر تو اجمالاً کر دیا مگر اس کے فن پر ایک حرف بھی میرا قلم نہیں "اگل" سکا۔ یہ قلم کا قصور نہیں میری عدیم الفرصتی کا رونا ہے اللہ نے چاہا اور زندگی رہی تو اس کے فن کی بنیادی صورتوں پر بہت کھل کر لکھوں گا۔ اتنا کھل کر کہ حلقہ ادب و شاعری اس کے بلند مقام سے مکمل طور پر آشنا ہو سکے۔

O

پروفیسر آفاق حسین صدیقی
صدر شعبہ اردو۔مادھو کالج
اجین(مدھیہ پردیش)

خالد محمود شخص اور شاعر

دو مشہور تاریخی ہستیوں کے ناموں سے مرکب نام کی شخصیت خالد محمود کا تعلق نہ سرزمین عرب سے ہے نہ ہی غزنی سے مگر وہ دو تاریخی بستیوں سے ضرور تعلق رکھتے ہیں۔اور اسی کے ساتھ ایک بڑی تاریخی بستی میں اپنی ہستی سے متعلقہ بستیوں کی آبرو بنائے ہوئے ہیں۔بستیوں سے میری مراد خالد محمود کے وطن مولود سرونج وطن مالوف بھوپال اور موجودہ مستقر دہلی سے ہے جہاں وہ شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں درس و تدریس کی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں اور اپنی قابل قدر علمی و ادبی سرگرمیوں سے اردو شعر و ادب کی خدمت کا فرض بھی ادا کر رہے ہیں۔

خالد محمود سے میرے تعلقات شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال کی علمی و ادبی سرگرمیوں اور استاد محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کی شفقتوں کا نتیجہ ہیں۔خالد محمود کو ان کے بچپن میں خالص مشرقی تہذیب و تمدن کا ماحول ملا اور انہوں نے شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور قدیم تہذیبی اقدار سے عقیدت و محبت کرنے والے بزرگوں کے سائے میں بچپن کا سفر طے کیا ابھی انہوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ نئے حالات کے نئے تقاضوں نے شفیق بزرگوں کی شفقت کا لطیف سایہ اور قصباتی فضا کی ٹھنڈی چھاؤں چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔تعلیمی سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لئے وہ بھوپال آ گئے۔بھوپال میں قدروں کی آب و تاب بر قرار تھی۔خالد محمود کو یہ بستی اپنی سی لگی۔ویسے بھی سرونج اور بھوپال میں زمانہ قدیم سے گہرے روابط تھے اور تہذیبی لحاظ سے دونوں میں بڑی ہم آہنگی تھی۔خالد محمود کو اجنبیت کا احساس ہی نہیں ہوا انہوں نے سیفیہ کالج میں اعلیٰ تعلیم کا سفر شروع کیا اور سب میں گھل مل گئے اسی دوران میں اس درس گاہ نے ان کے لئے اپنے آغوش

کو اور واکیا! انہیں کالج کے انتظامی عملے میں شامل کر لیا گیا۔ تعلیم کا مشغلہ بھی جاری رہا اور روزگار کا سلسلہ بھی۔ حصول علم اور عمل کا مرکز ایک ہو گیا تو خالد محمود کو اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع ملا۔ میں نے انہیں اسی درس گاہ کے طلبہ کے مشاعرہ میں پہلی دفعہ سنا۔ روز نامہ الحمراء بھوپال کے مدیر سید محمود الحسینی مرحوم مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے خالد محمود نے اپنی مشہور نظم "پتھر" سنانا شروع کی۔ سامعین طلبہ نے ہوٹنگ کے پتھر چلانا شروع کر دیئے مگر خالد محمود چٹان کی طرح جمے رہے۔ بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ انہوں نے نظم سنائی۔ شریر طلبہ کی شرارت جلد ہی سرنگوں ہو گئی اور ہوٹنگ داد میں تبدیل ہوتی چلی گئی جب نظم مکمل ہوئی تو سامعین اور اسٹیج پر بیٹھے اساتذہ نے صدائے تحسین بلند کی۔ مشاعرے کے اختتام کے بعد جب میں محمود صاحب کے ہمراہ گھر آرہا تھا انہوں نے مشاعرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے خالد محمود کی نظم کو حاصل مشاعرہ قرار دیا اور پیشین گوئی کی "یہ ایک دن بڑا شاعر بنے گا۔" بعد میں محمود صاحب نے اپنے پرچے میں یہ نظم بڑے اہتمام سے شائع کی۔

مجھے ایسا کوئی حادثہ یاد نہیں ہے جس کے نتیجہ میں خالد محمود سے میری دوستی کا رشتہ وجود میں آیا ہو۔ ویسے بھی حادثات خالد محمود سے دوستی کے بعد ہی رونما ہوتے ہیں اور یہ ایسے عجیب و غریب ہوتے ہیں کہ زندگی بھر کے تمام تجربات، مشاہدات اور عام تصورات اور اخلاق و اخلاص کے سلسلہ میں قائم شدہ نظریات کو خاک میں ملا دیتے ہیں ہمارے اپنے زمانے کے مادیت پرست دور میں اور آج کی خود غرضی، خود پرستی، خود نمائی اور مفاد پرستی جیسی جبلتوں کی سرگرمیوں سے معمور دنیا میں جنم لینے والی ساری توقعات اور تمام امیدوں پر یہ حادثات پانی پھیر دیتے ہیں۔ جن لوگوں کا خالد محمود سے کبھی سابقہ پڑا ہے یا جن حضرات کو خالد محمود کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا ہے یا سفر کے دوران میں ان کے ساتھ قیام کرنا پڑا ہے یا کبھی ان کا مہمان بننے پر مجبور ہونا پڑا ہے یا ان کی میزبانی سے فیض حاصل کیا ہے یا کبھی ان کیساتھ شاپنگ کی ہے یا ان سے کبھی کسی قسم کی مدد اور تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی ہے وغیرہ وغیرہ ایسے تمام لوگ ان غیر متوقع حادثات سے بخوبی واقف ہوں گے۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے خالد محمود آج کل دہلی میں رہتے ہیں حالانکہ سچ یہ ہے کہ وہ سارے ہندوستان میں رہتے ہیں۔ بہر حال دہلی ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ حضرت دہلی کی، عظمت، اہمیت و قعت اور شان و شوکت سب تسلیم! لیکن ان تمام خصوصیات کے باوجود دہلی ایک

ایسے صحرا کی طرح ہے جہاں بڑے بڑے کارواں آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ وقت کی تند و تیز ہوائیں ان کے قدموں کے نشانات بھی باقی نہیں رہنے دیتیں۔ یہاں جو ٹھہر جاتے ہیں یا جو ٹھہر گئے ہیں وہ گویا مشین بن گئے ہیں یہاں انہیں اپنے قدم جمانے اور اپنے وجود کو بر قرار رکھنے کے لئے شب و روز تند و تیز ہواؤں سے اور پیروں کے نیچے کی پھسلتی ہوئی ریت سے واسطہ ہے۔ ان حالات میں کون کسے پوچھے؟ اور کیسے؟ کوئی پرسان حال نہیں۔ مگر اس سب کے باوجود بھی دہلی کے صحرا میں خلوص، محبت، مروت، بے غرض دوستی اور مہمان داری کے بہت سے نخلستان بھی ہیں ان میں سے ایک نخلستان کا نام خالد محمود ہے۔

انکساری، عاجزی، مروت، خوش اخلاقی اور مہمان نوازی ہماری مشرقی تہذیب کی اہم خصوصیات ہیں ان میں سے مہمان نوازی کا شوق خالد محمود کو اس قدر زیادہ ہے کہ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ بہت سی اخلاقی اور اقتصادی حدود کو پھلانگ جاتے ہیں اور اکثر خاطر تواضع میں میزبانی کے حدود اور مہمان کے ظرف کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔

خوش اخلاقی کو میں انسان اور انسانیت کی بڑی خوبی تسلیم کرتا ہوں اور اسے خالد محمود کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت کا بڑا سبب جانتا ہوں۔ خالد محمود کی سیرت کی ایک اور اہم خوبی ان کی زندہ دلی ہے۔ زندہ دلی عموماً شگفتہ مزاجی، وسیع ذوق اور حسن لطیف کے امتزاج سے وجود میں آتی ہے لیکن اس کی تہذیب وسعت النظری، ہمدردی مروت، اخلاص اور ذکاوت احساس سے ہوتی ہے۔ خالد محمود کی شخصیت میں ان خوبیوں کی بھی کمی نہیں ہے لیکن ان کی بڑھی ہوئی ذکی الحسی نے انہیں نہایت جذباتی اور بڑا نازک مزاج بنادیا ہے جس سے انہیں اکثر تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اور کبھی کبھی دوسروں کو بھی۔ حالانکہ دوسروں کے معاملہ میں خالد محمود زیادہ تر صبر ضبط اور تحمل کے رویے کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے ذیل کے اشعار اسی رویّہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔

بخش دیجے مسرتیں ان کو درد میرے حساب میں رکھیئے
آنسوؤں کے سوال نامے پر اک تبسم جواب میں رکھیئے

شعر و ادب سے خالد محمود کی دلچسپی کا رجحان فطری ہے۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور سرونج کی فضا نے ان کے اس رجحان کی نشو و نما میں بڑا حصہ لیا ہے۔ جب وہ سرونج

سے بھوپال آئے تو سیفیہ کالج ے علمی وادبی ماحول میں ان کے رجحان کو پھلنے پھولنے کے لئے سازگار مواقع ملے۔ پھر خوش قسمتی سے انہیں ذریعہ معاش بھی ایسا ملا جس میں ان کے شوق کی تکمیل اور ذوق کی آسودگی کے بڑے سامان تھے۔ اس کے علاوہ جامعہ ملیہ کا سرسبز و شاداب میدان تھا۔ وہاں کے علمی وادبی ماحول اور وہاں کی بلند پایہ علمی وادبی ہستیوں کے فیض نے خالد محمود کے طبعی رجحان کی تہذیب میں نمایاں رول انجام دیا۔ اپنی غیر معمولی منصبی ذمے داریوں اور خانگی ذمہ داریوں کے علاوہ بعض نامساعد حالات کے باوجود خالد محمود نے مواقع کو ضائع نہیں ہونے دیا جس کی بنا پر انہیں اپنا مقام بنانے میں بہت دیر نہیں لگی۔

خالد محمود نے علم وادب کے مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ درس و تدریس کے ساتھ انہوں نے شاعری، تحقیق، تنقید، انشاپردازی اور طنز و مزاح وغیرہ میں اپنے جوہر دکھائے ہیں لیکن ان کی خاص جولاں گاہیں درس و تدریس اور شاعری ہیں ان میں محفل آرائی اور یارباشی کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے ان سب میں ان کی طبیعت کی جولانی کھل کر سامنے آتی ہے اور نت نئے گل بوٹے کھلاتی ہے۔

خالد محمود ایک طویل مدت سے شعر کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے شعر گوئی کے رجحان کو سختی کیساتھ نظم و ضبط کا پابند رکھا ہے اور انتخاب کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ مختلف رسائل اور شعری انتخابات میں شامل کلام کے علاوہ ان کا شعری مجموعہ ''سمندر آشنا'' ایک طرح سے ان کی غزلیات کا انتخاب ہے۔

خالد محمود نے اپنے شعری سفر کا آغاز روایتی انداز اور کلاسیکی قدروں کے سائے میں کیا تھا، ان کی شاعری نے نشو و نما کی منزلیں جدید شعری رجحانات و فکری میدانات کے زیر اثر بے رحم حقیقتوں کی تیز دھوپ اور زندگی کی سنگلاخ راہوں سے گزر کر طے کی ہیں چنانچہ ان کی شاعری میں ان تمام کا امتزاج ہے۔ ان کی شاعری کی سنجیدہ اور متین فضا اگر کلاسیکی اقدار کی پاسداری کا نتیجہ ہے تو اس میں گہری بصیرت عہد کی سچائیوں کے گہرے شعور اور کارزار حیات کے وسیع تجربات سے حاصل آگہی کا ثمر ہے۔ انہوں نے زندگی کا شعور اور اپنے عہد کا عرفان چوں کہ خود زندگی میں شامل ہو کر اور قیامت خیز حالات کے بے رحم تھپیڑوں سے گزر کر حاصل کیا ہے اس لئے ان کے یہاں بصیرت میں بڑی توانائی، بڑی وسعت اور گہرائی ملتی ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

برائے تشنہ لب پانی نہیں ہے
سمندر کا کوئی ثانی نہیں ہے

میں تجھ سے بڑھ کر سیاسی شعور رکھتا ہوں
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

جن راستوں پہ دھوپ تھی اب دھوپ بھی نہیں
سورج نے اپنا سایہ بھی سر سے اٹھا لیا

آواز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھئے
پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی

کوہِ گراں کے سامنے تیشہ کی کیا بساط
عہد جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی

رفاقتوں کے نئے رنگ خوب ہیں لیکن
کہیں تو سرخ لہو کا نشان رہنے دے

ہر چہرہ اک سوال ہے یاروں کی بزم میں
شاید میں امتحان کے کمرے میں آگیا

تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

خالد محمود طبعاً جذباتی انسان ہیں لیکن ان کی شاعری میں جذبہ ہمیشہ فکر میں تحلیل ہو کر اور جان کا جزو بن کر نمودار ہوتا ہے جس سے اس میں بڑا ٹھہراؤ، گہرائی اور اثر انگیزی پیدا ہو جاتی ہے۔

ان کا خیال آتے ہی اک روشنی ہوئی
اس روشنی میں ذہن کا کمرہ نہا گیا

کتنے زندہ بچے ہیں مرنے کو
لاشیں اٹھ جائیں تو شمار لگے

بڑا دشمن مرا یہ آئینہ ہے
مری آنکھوں سے مجھ کو دیکھتا ہے

چہرے ہیں پر خلوص تو رنجش دلوں میں ہے
جو بات دشمنوں میں نہیں دوستوں میں ہے

خالد محمود اپنی غزلوں میں نرم اور دھیما لب و لہجہ اختیار کرنے والے شاعر نہیں ہیں ان کے یہاں زندگی کے زہر کو امرت سمجھ کر خاموشی کے ساتھ پی جانے والی بے بسی کی کیفیت بھی نہیں ملتی وہ بلند آہنگ اور بے باک لب و لہجہ کے شاعر ہیں، عموماً لہجہ کی بلند آہنگی غزل کے نازک آبگینے پر خراشیں ڈال دیتی ہے اور بے باکی آداب غزل گوئی کے منافی تصور کی جاتی ہے خالد محمود نے اپنے لب و لہجہ کی بلند آہنگی کو کلاسیکی رچاؤ سے رچا کر غزل کی نازک مزاجی کے مطابق بنایا ہے اور بے باکی اور کھرے پن کو طنزیہ انداز میں ڈھال کر غزل گوئی کے آداب پر قابو پایا ہے مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے

شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا مری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

اس فرد سے پھر آج میں ہنس کر ملا کہ جو
موقع ملے تو پشت میں خنجر اتار دے

ہر ایک اپنی خوشی کے لئے پریشاں ہے
ہمارا روزِ مسرت بھی روزِ محشر ہے

میں سنگِ راہ کا ممنون ہوں گو پتھر ہے
مجھے سنبھالا ہے جس نے اسی کی ٹھوکر ہے

کچھ نشیمن پھونک ڈالو کچھ رکھو آباد بھی
باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

ہر ایک سنگ ملامت اٹھائے پھرتا ہے
تمہارا شہر ہے خالد مجھے وطن کی طرح

حسرت ہے آرزو ہے تمنا ہے یاس ہے
ہر دولت زمان و مکاں میرے پاس ہے

خالد محمود کے یہاں تجربات کی گرمی، احساس کی شدت، جذبے کی فراوانی اور فکر و نظر کی تازگی و توانائی نے کلاسیکیت کے رچاؤ میں رچ بس کر اور طنز کی ترشی میں تحلیل ہو کر اور زبان و بیان پر ان کی فن کارانہ گرفت میں ڈھل کر ان کی شاعری کو صرف تازگی، نیا پن یا انفرادیت ہی عطا نہیں کی ہے بلکہ نئی نسل کے ممتاز شعراء میں ان کو ایک ایسی پہچان عطا کر دی ہے جو ان کی شخصیت کی طرح جانی پہچانی ہوتے ہوئے بھی جانی پہچانی نہیں لگتی۔

O

ڈاکٹر شان فخری
نیا علاج گھر، سرونج

خالد محمود کا سفر زندگی

ادب اور آداب کے آئینہ خانے میں

خالد محمود سرونج کے انتہائی معزز خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پردادا صاحبزادہ نادر شاہ خان ۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۴ء تک سرونج کے عامل رہے ان سے بانی ریاست ٹونک نواب امیر الدولہ (امیر خاں) کی دختر منسوب تھیں (جو لا دلد رہیں) دوسری زوجہ سے ان کے پردادا حیدر شاہ خان ہ پیدا ہوئے ان کے دادا حضرت شاہ خاں سرونج کے نامور لوگوں میں سے تھے، ان کے نانا صاحبزادہ کپتان محمد الیاس خان مرحوم بھی سرونج کے معززین میں تھے اور ولی صفت بزرگ تھے۔

خالد محمود کے والد احمد شاہ خاں صاحب (عبید میاں) بھی بزرگ اور صوفی مشرب تھے۔ چنانچہ خالد محمود کی تعلیمی زندگی کی ابتداء بھی مدرسہ ریاض المدارس سے ہوئی۔ ۱۹۶۵ء میں ہائر سیکنڈری کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے بھوپال منتقل ہو گئے۔ کم و بیش دس سال پہلے ''حصار'' میں ابھرتا فنکار کے زیر عنوان ان کا جو تعارف پیش کیا گیا تھا وہ ملاحظہ فرمائیں:۔

> ''خالد محمود سرونج کے ان چند خوش قسمت نوجوانوں میں سے ہے جو زمانے کے بے رحم سیلاب، مصائب کی تند و تیز آندھی مخالفتوں کے بے پناہ طوفان اور معاشی پریشانیوں کے ہولناک زلزلوں سے سرخرو ہو کر نکلا ہے۔ اس کے سفر زندگی کی ابتداء بالکل عام سی تھی۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ مکتب کا یہ سادہ لوح لڑکا مستقبل میں ایک بڑا آدمی بن سکے گا۔ مکتب کی مروجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ جامعہ ریاض المدارس سرونج میں

ابتدائی عربی و فارسی پڑھی اور نابینا حافظ صابر علی صاحب سے قرآن حفظ کرنے لگا۔ ایسے لڑکے کے سلسلے میں یہی پیش گوئی کی جاسکتی تھی کہ کسی مکتب کا مدرس یا مسجد کا امام بن کر پیٹ بھر لے گا۔ لیکن قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا کاتب تقدیر نے ازل میں ہی اس کے لئے کچھ اور لکھ دیا تھا۔“

۱۹۶۳ء میں مختار شمیم کے ساتھ مل کر سرونج سے اپنے استاد محترم حضرت زبیر احمد راہیؔ قاسمی سے عقیدت کی بنا پر ”راہیؔ“ نام سے قلمی رسالہ نکالا۔ رسالہ کی کتابت یہ دونوں خود ہی کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب خالدؔ سرونج میں ایک مبتدی شاعر کی حیثیت سے متعارف ہو رہا تھا۔ راہی کی ہمراہی نے اس کو نثر نگار بھی بنا دیا۔ بد قسمتی سے راہی کے آٹھ دس شمارے ہی نکل سکے اور پھر وہ بھی گردش حالات کے ہاتھوں منزل طباعت تک پہنچنے سے قبل داغِ مفارقت دے گیا۔

۱۹۶۵ء میں ہائر سکینڈری کا امتحان پاس کیا کچھ عرصہ جامعہ ریاض الاسلام سرونج میں مدرسی کے فرائض انجام دیئے لیکن وہ کسی مکتب کی مدرسی کے لئے تو پیدا ہوا نہیں تھا۔ چنانچہ اہل خاندان کی مخالفت کے باوجود اس نے سیفیہ کالج بھوپال میں داخلہ لے لیا۔ انتہائی مشکلات، شب و روز کی محنت اور لگن کے ساتھ ہر قسم کے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کر کے اس نے انگلش لٹریچر کے ساتھ بی اے کرلیا معاشی پریشانیوں سے مجبور ہو کر کچھ عرصہ حبیبیہ میڈل اسکول سرونج میں بحیثیت ٹیچر کام کیا لیکن اس کی ترقی پسند فطرت کو یہ جمود پسند نہ آیا چنانچہ ملازمت چھوڑ کر سب کے منع کرنے کے باوجود دوبارہ بھوپال چلا گیا۔ اردو میں ایم اے کیا پھر بی ایڈ کی ڈگری لی، کچھ عرصے شعبہ سائنس میں اسٹور کیپر رہا۔ اعزازی طور پر بی۔ اے بی ایڈ اور ایم اے کی اردو کلاسیں لیں۔ تقریباً ایک سال وہ سیفیہ کالج میں اعزازی لیکچرر بھی رہا۔ شعبہ اردو کے روح رواں اور ملک کے مشہور نقاد و محقق پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کی رہبری نے اس کی صلاحیتوں کو بے انتہا جلا بخشی۔ دسنوی صاحب کے زیر سایہ خالد کے حوصلے اور جوان ہوگئے چنانچہ اس نے پی ایچ ڈی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جن دنوں ریسرچ کے لئے اس کی اسکالر شپ منظور ہوئی قدرت نے اس کی ترقی کے راستے مزید کھول دئے یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ملک کی اہم ترین اور قدیم یونیورسٹی جامعہ ملیہ دہلی میں اس کا تقرر ہو گیا۔ اس طرح وہ معمولی لڑکا جو ماضی میں مکتب کا

ایک سادہ لوح طالب علم تھا اپنی محنت، شوق، لگن اور بے پناہ جدوجہد کی بدولت تبدریج ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ خالد کے سامنے ابھی ترقی کی بہت سی منازل ہیں اور مجھے پورا یقین ہے انشاء اللہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری منزلیں طے کر لے گا۔ اور ایک دن وہ آئیگا جب وہ ترقی کی بام عروج پر ہو گا۔

خالد کو بحیثیت ادیب اور شاعر ابھی بہت آگے جانا ہے۔ اس کے فن کا تجزیہ فی الحال بہت مشکل ہے روز بروز اس کا فن نکھر رہا ہے۔ اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ خالد ان نوجوانوں میں سے ہے جنہیں زمانے کے سرد و گرم نہیں بدلتے بلکہ وہ زمانے کے بیرحم اور اندھے سیلاب کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ گذشتہ دس برس میں اس نے جتنی تیزی سے ادب میں اپنا مقام بنایا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ بہت جلد وہ وقت آنیوالا ہے جب اہل سرونج اس بات پر فخر محسوس کریں گے کہ ان میں کا ایک شخص ملک گیر شہرت کا حامل ہے۔

خالد دن بدن ترقی کر رہا ہے لیکن آج بھی مزاج میں اتنی ہی انکساری اور سادگی ہے، آج بھی اتنا ہی ملنسار اور متواضع ہے جتنا دس سال قبل تھا۔ چھوٹوں کے لئے مشفق و مہربان، بڑوں کے لئے سعادت مند جو اس سے ملتا ہے بے ساختہ اس کے دل سے خالد کے لئے دعائیں نکلتی ہیں۔ چنانچہ میں بھی بارگاہ رب العزت میں دعاگو ہوں کہ وہ خالد کو دن دوگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین!"

خالد کی اولوالعزم اور سیماب صفت شخصیت سرونج کے ادبی افق پر ایک ایسے درخشاں ستارے کی مانند ابھری جس کے سامنے سب کی چمک دمک ماند پڑ گئی خالد محمود کی ابتدا خالصتاً روایتی انداز میں ہوئی چونکہ اس کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے تھا لہٰذا دینی تعلیم کے ساتھ ہی حفظ قرآن کی مشقت نے اسے آغاز سے ہی محنت اور مسلسل محنت کا عادی بنا دیا۔

خالد محمود کا شمار نئی نسل کے ان ممتاز شعراء میں ہوتا ہے جنہوں نے خلاقانہ بصیرت اور اجتہادی پیرایہ بیان میں فکر و نظر کے انگنت چراغ جلائے ہیں۔ خالد محمود کا لہجہ، اس کا رنگ سخن اور اسلوب جداگانہ اور اپنے مخصوص انداز کی بنا پر اپنے ساتھیوں سے منفرد اور مختلف ہے۔ خالد محمود نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا راہی صاحب کی رہنمائی میں غزل کے میدان میں روایتی انداز سے کی، لیکن اپنی جدت پسند فطرت کی بنا

پر جلد ہی وہ جدید حلقے میں شامل ہو گیا۔

۱۹۸۲ء میں خالد کا پہلا مجموعہ کلام ''سمندر آشنا'' کے نام سے مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کی تعاون سے مکتبہ جامعہ دہلی کے زیر اہتمام شائع ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔ ''سمندر آشنا'' میں ''خالد محمود'' کے عنوان سے پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کا تحریر کردہ تعارف شامل ہے جو نہ صرف مجموعے کی ادبی وقعت میں اضافہ کا سبب ہے، بلکہ خالد محمود کی زندگی کے بعض گوشوں سے پردے بھی اٹھاتا ہے اور ان کے فن پر کسی قدر روشنی بھی ڈالتا ہے۔ دو اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

''سیفیہ کالج میں جب انہوں نے بی اے میں داخلہ لیا تھا تو ایک اچھے طالب علم کی حیثیت سے اپنے آپ کو متعارف کرانے میں انہیں کامیابی ہوئی تھی، لیکن ایم۔اے تک پہنچتے پہنچتے ان کی ادبی صلاحیتیں نکھرتی دکھائی دیں چنانچہ سب نے دیکھا اور خوشی محسوس کی کہ کبھی انہوں نے شاعری کے میدان میں اپنے جوہر دکھائے اور اپنی نظم گوئی کی صلاحیت سے متعارف کرایا اور سب کو اپنا معترف بنایا، کبھی غزل کہ پیچ و خم سے کامیابی کیساتھ گزرے جس سے ان کے ساتھی اور اساتذہ متحیر بھی ہوئے اور قدرداں بھی بنے اور کبھی کبھی اپنے انشائیوں سے کاروانِ سیفیہ کی محفلوں، شعبے کی ادبی مجلسوں کو مسکرانے، ہنسنے اور زور سے قہقہہ لگانے پر مجبور کیا، وہ صاف ستھرا تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں اور تحقیق کی مشقت سے بھی آگاہ ہیں، لیکن ان دونوں میدنوں میں باضابطہ اترنے کا انہون نے ابھی اعلان نہیں کیا۔ شاید تنقید کی بے مروتی اور تحقیق کی دیدہ ریزیاں جواں سال شاعر کو اس طرف آنے سے روکتی ہے۔ لیکن ان کی صلاحیتوں کے پیش نظر یقین ہے کہ اگر انہوں نے اس طرف بھی توجہ کی تو ادب کے ان میدانوں میں بھی اپنے نام کا اضافہ کرنے میں انہیں دیر نہیں لگے گی۔

خالد محمود ایک ایسے سیدھے، سچے، کھرے اور کھدرے پٹھان خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو بھوپال سے تقریباً ڈیڑھ سو کلو میٹر دور ایک مردم خیز، اسلامی روایات کی حامل سرزمین سرونج سے تعلق رکھتا ہے۔ جس کے متعلق مجھے آج یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ زبان و ادب سے اور خاص طور سے شعر و شاعری سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والے حضرات کی یہاں نہ صرف بڑی اچھی تعداد ہے بلکہ وہ اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں، لیکن شہرت سے بے نیاز اپنی تخلیقات اپنوں ہی تک محدود رکھ کر مطمئن نظر آتے ہیں۔ میں

یہ باتیں نہایت اعتماد کے ساتھ اس لئے بھی کہہ رہا ہوں کہ مجھے وہاں کے اکثر باصلاحیت، لیکن نہایت سادہ مزاج طلبہ سے واسطہ رہا ہے، میں نے انہیں نہایت مہذب، مسلمان طبیعت، خوش اخلاق اور خوش مزاج پایا اور ان کی ذہانت اور ادبی صلاحیتوں سے متاثر ہوا، خالد محمود انہیں میں سے ایک ہیں جو اپنے پٹھان ہونے کی وجہ سے سادہ دل، سادہ مزاج، نیک سیرت اور پر خلوص طبیعت کے مالک ہیں، وہ اپنے ساتھیوں سے ٹوٹ کر محبت اور اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا دل سے احترام ہی نہیں کرتے بلکہ ان کی بڑھ چڑھ کر دل سے خدمت بھی کرتے ہیں اور اپنے اس عمل سے خوش بھی رہتے ہیں اور اسے حاصل بھی جانتے ہیں۔ مہمانوں اور دوستوں کے ساتھ اس طرح کا حسن سلوک روا رکھتے ہیں کہ کبھی کبھی ان کی حالت پر ترس آنے لگتا ہے میں نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جو اپنوں پر بے دریغ خرچ کر کے اس حد تک خوش ہوتے ہوں جس طرح خالد محمود ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اکثر ان کو عزیز رکھنے والے ان کے یہاں مہمان بن کر آنے میں گھبراتے ہیں کہ ان کا خلوص اور جذبہ مہمان نوازی خود ان کے لئے پریشانی کا باعث نہ بن جائے۔

”ان کی سادہ لوحی جذبہ کی شدت خیالات کی پاکیزگی کردار کی سچائی اور ان کے رنگا رنگ اچھے برے تجربات ان کی شاعری کی جان ہیں جو اپنی طرف صاحبِ ذوق کو متوجہ بھی کرتے ہیں اور ایک اچھے شاعر کی دنیائے اردو میں آمد آمد کی بشارت بھی دیتے ہیں۔“

(۱۹۸۲ء)

ممکن ہے مندرجہ بالا تجزیہ سے کسی کو اختلاف ہو، لیکن جن حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے ان سے انکار کی گنجائش نہیں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے خالد محمود کی زندگی کا وہ دور بھی دیکھا ہے جب دوسروں کو تو کیا خود ان کو بھی اپنے مستقبل کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں نے خالد محمود کی زندگی کا تقریباً ہر پہلو دیکھا ہے اور پورے اعتماد کیساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خالد محمود جیسے لوگ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ خالد محمود کے بارے میں کچھ لکھتے وقت میرا قلم آورد کا محتاج نہیں رہتا، بلکہ ذہن و قلم میں وہ تال میل پیدا ہو جاتا ہے کہ خیالات و الفاظ میں کبھی تصادم کی نوبت نہیں آتی۔ یعنی میں صرف حقائق پر نظر رکھتا ہوں اور مجھے خیال و خواب کی دنیا میں بھٹکنے کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔

زندگی کی نیرنگیوں اور فتنہ سامانیوں سے گھبرانا حالات کے سخت ترین دباؤ اور نت

نئے مسائل کی پیچیدگیوں سے ہراساں ہونا خالد محمود نے سیکھا ہی نہیں۔ لاشعوری عمر سے ہی محنت اور جدوجہد شعار رہا، لڑکپن میں حفظ قرآن کی ریاضت نے شدید اور مسلسل محنت کا عادی بنایا۔

سرونج کے ان نوجوانوں میں جنہوں نے اعلیٰ تعلیم کے مراحل اپنی محنت لگن اور قوت بازو کے سہارے طے کئے خالد محمود کو امتیازی مقام حاصل ہے۔ ان کا تعلق اس گھرانے سے ہے جس نے مہمان نوازی اور یار باشی میں سب کچھ لٹادیا پھر بھی آنکھ میلی نہیں ہوئی، بلکہ جتنا انہوں نے خرچ کیا اتنے ہی خوش ہوئے۔ خالد محمود کی دہلی کی زندگی مہمان نوازی کے سلسلہ میں اتنی زیادہ قابل ذکر نہیں (کہ اب وہ معاشی طور پر اس قابل ہیں) لیکن جب معاشی تنگ دستی تھی اور وہ چھوٹی موٹی ملازمتوں یا ٹیوشن کے ذریعہ زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے تھے اور اپنی تعلیم کا سنگلاخ میدان طے کر رہے تھے ان کی یار باشی، احباب نوازی اور مہمانوں کی خاطر تواضع عروج پر تھی۔ میں خود اس کا چشم دید گواہ ہوں۔ بھوپال اور دہلی دونوں جگہ میرا خالد محمود کے ساتھ ہفتوں نہیں مہینوں قیام رہا ہے مگر میں نے کبھی ان کے ماتھے پر شکن نہیں دیکھی۔

خالد محمود کو دوران گفتگو افہام و تفہیم اور بحث و مباحثہ میں اپنے وقت کی قیمت کا احساس نہیں رہتا۔ جو ان کے لئے نقصان دہ بھی ہو جاتا ہے۔ احباب کی دل جوئی اور مہمانوں کی تواضع میں حد سے گزر جانا ان کے لئے معمولی بات ہے۔ دوست احباب اور دیگر ضرورت مندوں کی مسلسل آمدورفت اور دخل اندازی کی بنا پر اکثر یکسوئی، توجہ اور انہماک میں خلل پڑتا ہے اور وہ دلجمعی کے ساتھ تخلیقی کام نہیں کرپاتے۔ انتہائی ذمے دار ہونے کی وجہ سے اکثر ایسی ذمہ داریاں بھی ان کے کاندھوں پر ڈال دی جاتی ہیں جو نجی مصروفیات اور دیگر فرائض پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔

دنیا میں ایسے لوگ تو یقیناً اور بھی ہیں جو دوسروں کو کھلا کر، دوسروں کی خدمت کر کے اور دوسروں کے کام آکر دلی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ لیکن خالد محمود تو دوسروں کی خاطر اپنا نقصان بھی ہنس ہنس کے برداشت کرتے ہیں لا تعداد افراد پر ان کے بے شمار احسانات ہیں لیکن کبھی زبان پر ان کا ذکر نہیں آتا۔ اسی طرح جن لوگوں نے ماضی میں کبھی ان کے ساتھ حسن سلوک کیا ہے آج بھی وہ انہیں فراموش نہیں کرتے اور انکے پسینہ کی

جگہ خون بہانے کو تیار رہتے ہیں، دوست تو پھر دوست ہیں غیروں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے وقت بھول کر بھی یہ نہیں سوچتے کہ کبھی اس کا بدلہ ملے گا۔

ایسا شخص جس کی شخصیت میں ایسی خصوصیات ہوں وہ اگر فنکار بھی ہو تو اس کا فن دوسروں کے تجربات و مشاہدات کا مرہون منت نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ خالد محمود کو جو کچھ حاصل ہوا بالواسطہ کم اور بلاواسطہ زیادہ ہے۔

خالد محمود کی حتی الامکان یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ بااصول زندگی گزار سکیں لیکن کامیابی حاصل نہیں ہوتی، اس راہ میں ان کی بے پناہ مروت، تواضع، اخلاق، ملنساری اور منکسر المزاجی حائل ہو جاتے ہیں انہیں اپنے بیش قیمت وقت کا بخوبی احساس ہے اور وقت کے ضیاع پر ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے لیکن سرشت میں داخل مہمان نوازی نا قابل تلافی نقصانات بھی خنداں پیشانی سے برداشت کرنے پر اکساتی ہے۔ دوستوں کی دلجوئی کے معاملے میں وہ ہو بہو انیسؔ کے اس شعر کے مصداق ہیں ؎

خیال خاطر احباب چاہئے ہر دم　　　انیس ٹھیس نہ لگ جائے آب گینوں کو

جہاں تک خالد محمود کے فن کا تعلق ہے تو آج وہ اس مقام پر ہیں جہاں شعور کی پختگی اور ایک طویل ریاضت نے انہیں اس قابل کر دیا ہے کہ وہ اپنے اساتذہ کو شرمندہ نہیں ہونے دیتے۔ پہلے شعر و سخن کو ان کی زندگی میں اولیت حاصل تھی لیکن اب نثر نگاری کا رجحان بڑھ گیا ہے۔

خالد محمود نے زندگی سے نو بہ نو تجربات نچوڑے ہیں اور وہ ہر آزمائش میں بھی سرخرو ہوئے ہیں۔ ان میں جہاں بے شمار خوبیاں ہیں وہ ابن آدم ہونے کے ناطے بشری خطاؤں سے بھی مبرا نہیں، لیکن ان کی ساری خامیاں، تمام کوتاہیاں اور بشری خطائیں ان کی خوبیوں کے سامنے اس طرح ختم ہو جاتی ہیں جس طرح پانی کے سامنے آگ اپنی تپش کھو بیٹھتی ہے۔ خالد محمود کے فن میں ان کی شخصیت کا پرتو اپنے بھرپور تجربات کیساتھ جھلکتا ہے اور ان کے کلام میں شعور کی پختگی اور فکر و نظر کی گہرائی ان کی شخصیت کی مرہون منت ہے۔ خالد محمود مشاعروں کے شاعر نہیں، لیکن مخصوص ادبی نشستوں میں وہ اپنا بھرپور تاثر چھوڑتے ہیں۔ ملک کے مقتدر جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے اور وہ ریڈیو ٹی وی

کے ذریعہ بھی منظر عام پر آرہے ہیں۔

"سمندر آشنا" کے پیش لفظ میں ملک کے مشہور شاعر و ادیب ڈاکٹر مظفر حنفی رقمطراز ہیں

"نئی شاعری کا سب سے بڑا مسئلہ اظہار ذات سے وابستہ تصور کر لیا گیا ہے اس لئے ۱۹۶۰ء کے بعد شاعری سے شوق فرمانے والے حضرات عام طور پر ابلاغ کے نام سے اسی طرح بدکتے ہیں جس طرح کسی زمانے میں ترقی پسند شعراء رجعت پرستی کے الزام سے خوف کھاتے تھے اور یہ تصور اس حد تک عام ہو گیا ہے کہ جدیدیت کی اصطلاح ہی بعضوں کے نزدیک اِبہام و تفہیم کی نفی کے مترادف ہو گئی ہے۔ایسے غبار آلود مطلعِ ادب سے پچھلے دس بارہ سال کے درمیان طلوع ہونے والے ستاروں میں سے ایک کا نام خالد محمود ہے۔ بلا شبہ ان کی غزلیں اسی آشوب آگہی اور کرب ذات کا اظہار ہیں جس میں پوری جدید نسل مبتلا نظر آتی ہے لیکن اشعار کی تعمیر و تشکیل میں آہنگ اور تاثر کے ساتھ ساتھ مفہوم پر جتنا زور صرف کیا گیا ہے، تشبیہات،استعارات اور لفظی تشکیلات میں جیسی معنی خیزی پیدا کی گئی ہے اسے اہمال سے دور کا بھی تعلق نہیں البتہ کہیں کہیں اس تخلیقی ابہام سے ضرور کام لیا گیا جو شعر کے مفہوم میں وسعت اور تاثر میں کئی پرتیں پیدا کرتا ہے:

ہر کمند ہوس سے باہر ہے طائرِ جاں قفس سے باہر ہے

کوہِ گراں کے سامنے تیشے کی کیا بساط عہد جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی

آواز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھئے پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی

زمیں پر گرا تو یہ روشن ہوا کہ خالد ترے راز داروں میں تھا

"پچھلے صفحات میں استاذی محترم قوی صاحب نے خالد محمود کی شخصیت اور کردار کے جن اساسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اپنے تجربے اور شاعر سے ذاتی تعلق کی بنا پر میں ان کی توثیق کرتا ہوں اور شہادت کے طور پر خالد کے یہ اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں:

تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

ہر اک زخم ہر دل نے آواز دی مرے محترم ، مہرباں، آشنا

شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا مری طرح سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں کسی شے کی فراوانی نہیں ہے
ترے ساتھ چلنے کی عادت نہیں ہماری نہ کر آزمائش ہوا

"طبیعت میں خلوص، جانسوزی، غم سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ، ایثار کا مادہ اور بے لوثی نہ ہو تو یقین کیجئے شاعر ایسے چبھتے ہوئے شعر کہہ ہی نہیں سکتا، خود پسند اور خود نما احباب کے ساتھ نباہ کرنا، انکی کج ادائیوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلنا، ان کے دکھ درد میں برابر کی شرکت رکھنا اور اس کے ساتھ ایک درویشانہ قناعت سے کام لیکر زمانہ سازی سے دور رہنا خالد محمود کی فطرت ہے اور اس فطرت کی عکاسی نہ صرف پیش کردہ اشعار میں نظر آتی ہے بلکہ اس مجموعے کے تقریباً ہر صفحے پر جھلک مارتی دکھائی دیگی۔ ہمارے اکثر نئے شعراء کی تخلیقات ان کی شخصیت کے لئے حجاب کا کام کرتی ہیں، خالد محمود کے اشعار ان کی ذات اور شخصیت کی آئینہ داری کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔"

خالد محمود کا مزاج خالص مشرقی ہے، اس لحاظ سے وہ روایات کا بے پناہ احترام کرتے ہیں، اس کے باوجود ان کے فکری آہنگ، تخیلاتی پیکر اور نظریاتی زاویوں میں جدت ہے۔ خالد محمود کے کلام میں جذبہ کی سچائی فکر کی آنچ پاکر جوان ہوئی ہے اور ان کے مشاہدات دوسروں کے مرہون منت نہیں۔ زندگی کو انہوں نے ہر رنگ میں دیکھا اور پرکھا ہے، چنانچہ ان کے تجربات میں زمانے کہ سرد و گرم شانہ بہ شانہ نظر آتے ہیں، وہ خیالی دنیا کے باسی اور خوابوں کے جزیروں میں مقید انسان نہیں، انہوں نے زندگی کے گنجان جنگل، بے آب و گیاہ صحرا اور بیکراں سمندر میں بہ نفس نفیس ایک عمر گزاری ہے۔

سنو! لوگ کترا کے چلنے لگے مجھے زندگی کا ہنر آگیا
ہر دم یہ سوچتا ہوں مری زندگی مجھے شاید کسی مقام پہ تھک کر اتار دے
برائے تشنہ لب پانی نہیں ہے سمندر کا کوئی ثانی نہیں ہے
اُس فرد سے پھر آج میں ہنس کر ملا کہ جو موقع ملے تو پشت میں خنجر اتار دے
زمیں سے دور نہ جا لوگ بھول جاتے ہیں فضا خراب ہے اونچی اڑان رہنے دے

جس طرح ہر شخص اپنا ایک مزاج رکھتا ہے اسی طرح الفاظ بھی اپنا ایک مزاج رکھتے ہیں خالد محمود کی فطرت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ہر لفظ کو اس کے مزاج کی مناسبت کے ساتھ استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

الفاظ کے مزاج سے واقف نہیں ہیں آپ
اکثر یہ اپنا بھیس بدل کر بھی آئیں گے

تھکنے لگے ہیں پانو مگر میر کارواں
پیچھے نہ رہ سکوں گا مرا سر اتار دے

دنیا سے درد و کرب کا رشتہ نبھا سکوں
اتنا لہو تو آج بھی میری رگوں میں ہے

راتوں کا درد بہہ کے اب آنکھوں میں آگیا
یہ کون میرے جسم کے اندر سما گیا

شاید کہ مر گیا مرے اندر کا آدمی
آنکھیں دکھا رہا ہے برابر کا آدمی

خالد محمود نے رنگ تغزل کو بھی اپنے اشعار میں جدید علامتی انداز میں سمویا ہے، عصری تقاضوں کے مطابق ان کے یہاں جدید پیکر تراشی کے نمونے بھی ملتے ہیں اور قدیم استعارے نئے مفاہیم کا جامہ پہن لیتے ہیں ۔

اک دست ِ نازیاد کا شانہ دبا گیا
دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کی کھلی ہوئی

تری خوش ادائی کی شوخیوں نے گلاب خط میں کھلا دیئے
جو نہ لفظ معنی میں آسکا وہ پیام دے گئے حاشئے

یک بیک کھل گئے کیوں عارض رنگیں کے گلاب
آپ نے دل میں کہیں مجھ کو پکارا تو نہ تھا

آنگن میں دھوپ تھی نہ فضا میں سرور تھا
تم آگئے تو گھر کا مقدر بدل گیا

پھر امید جانفزا نے بام و در مہکا دیئے
آرزو کی گود میں اک پھول تازہ دیکھ کر

رخسار و چشم و لب ،گل وصہبا، شفق،حنا
دنیائے رنگ و بو میں تجارت لہو کی ہے

نظر نیچی ،لبوں پر مسکراہٹ،ہاتھ میں خنجر
بھلا کیوں کر نہ ہو ہم کو مسرت آپ سے مل کر

خالد محمود کو چھوٹی بحروں کے استعمال کا بھی بھرپور سلیقہ آتا ہے۔کم سے کم الفاظ

ں زیادہ سے زیادہ مفہوم سمونا معمولی بات نہیں۔ آسان و سلیس اسلوب میں بڑی بات کہنا
ِکاری ہے اور خالد محمود اس سے بخوبی واقف ہیں۔

تلاشِ ذات نے بھٹکا دیا ہے　　اب اک ذہنی خلا ہے اور میں ہوں
ہراک زخم پر دل نے آواز دی　　مرے محترم! مہرباں! آشناں
میں نہ مجذوب نہ تجرید نگار　　کیوں میری بات نہ سمجھا کوئی
ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی　　کہ دیوار دیوار چلنے لگا
میں گنجان شہروں کا مارا ہوا　　نوازش، نوازش، نوازش ہوا
ہم فضاؤں میں کچھ اونچا اڑ کر　　بھول بیٹھے ہیں بسیرا اپنا

خالد محمود نے قدیم تلمیحات کو بھی نئے انداز اور نئے آہنگ میں پیش کیا ہے،
ت میں سے بات پیدا کرنا بھی ایک فن ہے اور خالد محمود کو یہ فن خوب آتا ہے۔

ۂِ گراں کے سامنے تیشے کی کیا بساط　　عہد جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی
واز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھئے　　پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی
ئی شیطان بڑھے دستِ زلیخا کی طرح　　جب کبھی غیرتِ یوسف سے کچھ انکار ہے

خالد محمود کے کلام میں طنز کی شمولیت نے اس میں وہ تیکھا پن پیدا کر دیا ہے کہ
ِھنے اور سننے والا اس کی کسک محسوس کئے بغیر نہیں رہتا۔ انہوں نے احباب سے شکایت
ں بھی معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کیا ہے لیکن معنویت کی تہہ داری نے شعر کے لطف
ِدو بالا کر دیا ہے، وہ دنیا کی نیرنگیوں کا بھی مخصوص انداز میں ذکر کرتے ہیں۔

ِلی قسمت سے ہیں اتنے میر آشنا　　گھر کے سب شیشے ہوئے جاتے ہیں پتھر آشنا
فاقتوں کے نئے رنگ خوب ہیں لیکن　　کہیں تو سرخ لہو کا نشان رہنے دے
ھے شہرت سے اپنی یہ گلا ہے　　کہ میرے دوستوں کا دل دکھا ہے
را اس بے بسی پر غور کیجئے!　　دل اوروں میں برائی ڈھونڈتا ہے
ن راستوں پہ دھوپ تھی اب دھوپ بھی نہیں　　سورج نے اپنا سایہ بھی سر سے اٹھا لیا

ہائے وہ احباب جن کے سینہ شفاف میں داغ پڑ جاتے ہیں دامن میرا اجلا دیکھ کر

میں یہ آج تک نہ سمجھ سکا کہاں لوگ میرے شریک ہیں
کہ میں ہنس دیا تو وہ ہنس دیے جو میں رو دیا تو وہ ہنس دیے

رشتے ناطے سب باقی تھے جب تک دستر خواں لگا
اپنے لہو کے قطروں کو بھی پھر تو میں انجان لگا

بہ فیضِ صحبتِ ارباب گلستاں یارو
بدن کے داغ ہیں نسرین و نسترن کی طرح

خالد محمود نے بہت سے اشعار بالکل نئے ڈھنگ سے کہے ہیں، جن میں ان کے گہرے مشاہدہ کا اظہار اور ان کے تلخ تجربات کی کارفرمائی بھی ہے۔ ساتھ ہی جدید تہذیب اور مغربی افکار کی بے راہ روی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

لڑکوں کو نقل کرنے سے ہے روکنا مجھے پھر آگیا ہے وقت میرے امتحان کا
اس گھر کا ٹیلیفون ابھی جاگ جائے گا صاحب کو لے کے چل دیا دفتر کا آدمی
تبسم، تکلم، جواں ہو گئے مبارک ہو! گھر بار چلنے لگا
میں صرف ٹیلیفون کا احسان مند ہوں ان کا پیام بادِ صبا نے نہیں دیا

خالد محمود میں سیاسی سوجھ بوجھ کی بھی کمی نہیں ہے اور ان کے بعض اشعار ان کی سیاسی بالغ نظری کا ثبوت ہیں۔ آج کی سیاست پر کتنی گہری چوٹ ہے اس کا انداز ان اشعار سے بخوبی ہو جاتا ہے۔

میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے
کوٹھیوں سے معذرت کے ساتھ، کیا معلوم تھا دھوپ میں جھلسے ہوئے بھی آدمی کہلائیں گے
سر پہ نہیں اٹھایا کبھی ہم نے آسماں ہم بھی اسی زمین پہ صدیوں جواں رہے
تفریق مٹ گئی ہے مرے گلستاں سے اب صیاد، باغباں کا یہاں ہم لباس ہے

رکھے امریکہ و روس کو میاں اپنا اخبار چلنے لگا

ان کے علاوہ بھی خالد محمود نے مختلف انداز کے بہترین شعر کہے ہیں، جدید لب و اور منفرد اسلوب میں کہے ہوئے اشعار جن میں خلاقانہ بصیرت بھی کار فرما ہے اور فکر و نظر ند پروازی بھی ہے نئی نئی علامتوں اور دلکش پیکر تراشی کے فنکارانہ نمونے بھی ملتے ہیں۔

کی اندھیری کوکھ سے نکلا مری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دے

ری نگاہ دھوپ نے منظر بدل گیا
سورج زمیں کے جسم کی چادر بدل گیا

دشمن مرا یہ آئینہ ہے
مری آنکھوں سے مجھ کو دیکھتا ہے

سوچتا تھا آئینہ ہی داغدار ہے
داغ آئینے کے دھو لئے چہرا وہی رہا

اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شے کی فراوانی نہیں ہے

خالد محمود، غزل کے ساتھ ساتھ بہترین نظم گو بھی ہیں، ابتداء میں ان کی وں پر جوش ملیح آبادی کے اثرات بہت غالب تھے لیکن رفتہ رفتہ انداز بدلتا گیا اور آج وہ کے میدان میں بھی اپنے مخصوص اسلوب اور منفرد لہجہ کے مالک ہیں۔ نظم کی مختلف ف پر بھی انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی جو نظمیں کافی مشہور ہیں، ان میں ''وجود کا ب'' زاوئے، صیاد کے ہم نفس، معلم، زندگی کیا ہے اگر موت اسے کہتے ہیں فاصلہ مر''اور نذر سیفیہ قابل ذکر ہیں۔

نثر نگاری میں خالد محمود کو انشائیوں سے فطری مناسبت ہے۔ مکتبہ جامعہ کے ادبی بے کتاب نما اور اس سے پہلے شگوفہ (حیدر آباد) قومی آواز، الحمرا اور بیسویں صدی وغیرہ ان کے خوبصورت انشائیے اور خاکے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے انشائیوں میں آخری ر، جب اچانک میکے سے بیوی آجائے، مہمان گرامی، اور سٹی بس کا سفر بہت مقبول ہیں۔ وہ جو بھوپال اور دہلی کی سٹی بسوں میں سفر کرتے ہیں اس سے بے پناہ لطف اندوز ہوں گے۔ پال اور دہلی کی سٹی بسوں کے سفر کی معمولی سے معمولی جزئیات پر بھی اتنے فنکارانہ انداز روشنی ڈالی ہے کہ انسان خود کو سٹی بس کا مارا مسافر تصور کرنے لگتا ہے۔

سرونج جیسی اسلامی تہذیب کا پروردہ اور بھوپال جیسے شہر میں زندگی گزارا ہوا نوجوان دہلی پہنچ کر وہاں کی سٹی بسوں میں سفر کرتا ہے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔؟ خالد محمود نے اپنے ایک شعر میں اسے انتہائی خوبصورتی کیساتھ پیش کیا ہے اور یہ شعر جدید تخلیقی تجربات، فنکارانہ ابلاغ اور منفرد علامتی شاعری کا شاہکار ہے۔

سٹی بس نے جواں حس چھین لی ہے   ہمارا جسم اب باقی نہیں ہے

شاعری کے علاوہ خالد محمود نے متعدد انشائیے خاکے تبصرے، تجزیے اور ادبی مضامین بھی سپرد قلم کئے ہیں۔ مگر ابھی اسے شعر و ادب میں کئی معرکے سر کرنا ہیں اس نے جو منزلیں طے کی ہیں خود اس کے خیال میں بھی وہ ناکافی ہیں ابھی کئی منازل اس کی منتظر ہیں اور مجھے پورا یقین ہے کہ انشاء اللہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کامیابی و کامرانی کی ساری منزلیں طے کرلے گا اور ایک دن وہ آئے گا جب وہ ترقی کی بام عروج پر ہوگا۔[۱]

○

---

[۱] مندرجہ بالا مضمون تقریباً دس برس پہلے لکھا گیا تھا۔

ڈاکٹر شاہد میر
ڈائریکٹر کے وی کے (K.V.K.)
سرونج

یہ آدمی تو سمندر دکھائی دیتا ہے

(خالد محمود کا سفرنامہ پیدل سے ماروتی کار تک)

یوں تو سرونج کی سماجی، تہذیبی اور ادبی میراث کا ذکر کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ سرونج دو بڑی ریاستوں بھوپال اور ٹونک سے نزدیک رہا ہے گویا دو تناور درخت تھے جنھوں نے سرونج پر شاہانہ نوازشوں کے سائے ڈالنے کی سعی کی ہے مگر سرونج نے مذکورہ دونوں ریاستوں سے مستفید ہوتے ہوئے بھی اپنی الگ پہچان بنائے رکھنے پر اکتفا کیا ہے یہی وجہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں سرونج کی اپنی الگ شناخت کل بھی تھی اور آج بھی موجود ہے اور اس شناخت کو دائم و قائم رکھنے والے جو ادیب و شاعر سرگرم عمل ہیں ان میں ڈاکٹر خالد محمود کا نام نمایاں طور سے شامل ہے۔ یہ شناخت انہیں ورثے میں نہیں ملی بلکہ ان کی محنت، جانفشانی اور عرق ریزیوں کا نتیجہ ہے کہ جوان کے سر پر شہرت اور عزت کا تاج بن کر چمک رہا ہے۔

مضمون کا عنوان دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ خالد محمود کی حالیہ اشاعت ''سفر نامے'' پر اظہار خیال کیا جا رہا ہے مگر ان کی تھیس کے نتائج سے زیادہ مجھے ان دنوں ان لمحوں کی باتوں کا ذکر کرنا ہے جب خالد محمود پاپیادہ پہروں میلوں اسی بانکپن کے ساتھ پیدل چلتے تھے جس بانکپن کے ساتھ آج وہ ماروتی ۸۰۰ کے اسٹیرنگ پر بیٹھتے ہیں۔

بھوپال میں میری آمد ۱۹۶۵ء میں ہوئی، بی۔ ایس۔ سی فرسٹ ائیر کرنے کے لئے سیفیہ کالج میں میں نے داخلہ لیا۔ حمیدیہ اسپتال کے چوراہے سے مغرب کی جانب ایک ''اندھی گلی'' بالائی پورہ محلے میں جا کر نکلتی ہے۔ اس گلی میں بھوپال کے مشہور استاد شاعر دکیل بھوپالی اور شاہد بھوپالی بھی رہتے تھے۔ اس گلی میں ایک کمرہ تیس روپے ماہانہ کرایہ سے

لیا گیا اور ۱۹۶۵ء میں میرے ساتھ ڈاکٹر فرید اقبال زبیری اور ڈاکٹر شہاب الدین سکونت پذیر ہوئے۔ یہی وہ یادگار کمرہ ہے جس میں میرے کرم فرما اور سرونج کے صاحب طرز شاعر وقار فاطمی مرحوم کچھ دنوں کے لئے آکر رکے تھے یہی وہ کمرہ ہے جس میں سرونج کے باوقار شاعر و ادیب جناب شانؔ فخری اور شاہد فخری کاروباری سلسلے کے طفیل قیام کرتے تھے بہر حال ۱۹۶۶ء میں خالدؔ محمود نے حمیدہ کالج میں آرٹس فیکلٹی کے پہلے سال میں داخلہ لیا اور میرے کمرہ میں فرید اور شہاب کی جگہ آکر میرے روم پارٹنر بن گئے بالائی پورہ کی گلی حمیدہ چوراہے پر کھلتی تھی اور یہیں سے حمیدہ کالج کے لئے بس پکڑنی ہوتی تھی۔ خالد محمود اپنی کاپیاں کتابیں سنبھالے ہوئے بس اسٹاپ تک آتے تھے اور اکثر اوقات بنا بس پکڑے ہوئے پیدل ہی کالج تک کا سفر طے کرتے تھے جو کم و بیش ۳ کلو میٹر کی مسافت پر محیط ہے۔ اس زمانہ میں بس کا کرایہ پانچ نئے پیسے ہوا کرتا تھا اور یہ کرایہ ادا کرنے کے لئے خالد محمود کی جیب یکسر خالی ہوتی تھی ۔ خالد محمود کی پیدل مسافتوں کا یہ سلسلہ فی الحال "ماروتی ۸۰۰" تک آگیا ہے اور پیدل اور "ماروتی ۸۰۰" کے بیچ تلخ تند ترش یادیں خالد محمود کے ساتھ ہم سب "سرونجی" ہم سفروں ہم مشرب دوستوں کی زندگی کا عزیز ترین سرمایہ ہیں۔ خالد ماروتی کا مالکانہ حق حاصل کرنے کے بعد بھی پانچ نئے پیسے کے نہ ہونے کے سبب پیدل سفر کی بات آج بھی اتنی شان سے بیان کرتے ہیں جیسے انہیں وہ دن "فوروہیلر" کی رفاقت سے زیادہ عزیز ہوں۔ "پیدل سے ماروتی تک" کے اس سفر میں خالد محمود کو اتنی رفاقتیں، اتنی محبتیں اتنی دعائیں حاصل ہوئی ہیں کہ محسوس ہوتا ہے خواجہ حیدر علی آتش نے یہ شعر خاص خالدؔ محمود کے لئے ہی کہا ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

"مسافر نوازیوں" کا یہ منظر اگر دیکھنا ہو تو گرمیوں یا سردیوں کی چھٹیوں میں خالد محمود کی سرونج آمد کا منظر دیکھ لیجئے! جیسے جیسے خالد کے آنے کے دن قریب آتے جاتے ہیں دوست احباب اعزا بچے بزرگ سب ہمہ تن انتظار ہو جاتے ہیں دلی کے سلطان، سے لے کر دلی کے نہ جانے کیا کیا کچھ کہے جانے والے خالد کار کشا جب سرونج کے بازار سے گزرتا ہے تو گویا محسوس ہوتا ہے کہ "بسنت بہار" کا موسم ہے جو چمن کی ہر روش کو خوشگوار بناتا ہوا

آگے بڑھ رہا ہے۔ خود خالد بھی احباب سے ملنے کے لئے ایسے بے قرار اس قدر "اتاولے" نظر آتے ہیں کہ بعض اوقات رکشے کو مع ساز و سامان گھر روانہ کر دیتے ہیں اور خود دوستوں کی محفل میں اتر پڑتے ہیں اور اگر خدانخواستہ خالد گھر پہنچ بھی گئے تو گھنٹے آدھ گھنٹے میں گھر سے واپسی ہو جاتی ہے اور پھر کئی گھر اپنے بیٹوں شوہروں اور بھائیوں کو ترسنے لگتے ہیں بیویاں بطور خاص شوہروں کی گھر سے عدم موجودگی کا سراغ لگانے کے بجائے خود نتیجہ اخذ کر لیتی ہیں کہ "خالد بھائی آ چکے ہیں" اور اب کچھ ہی دنوں میں نعمت خانوں اور گھر کے توشہ خانوں کے خالی ہونے کی نوبت آ جائے گی!

من و سلویٰ تو کبھی دیکھا نہیں مگر آسمانوں سے اترنے والے خصوصی رزق کی شکل خالد محمود کی کی جانے والی دعوتوں ضیافتوں کے کھانوں کی شکل سے زیادہ مختلف نہ ہو گی۔ سرونج کے ایک بزرگ نے ایک بار جل کر کہا تھا کہ یہ شخص (خالد محمود) تمام دلی کی بھوک اپنے ساتھ باندھ کر لاتا ہے۔ دراصل یہ دلی کی بھوک نہیں بلکہ سرونج کی مہمان نوازیوں کی خوبصورت روایتوں کی وہ کڑی ہے جو اپنے مخلص باوقار پیارے مہمان کو دیکھ کر ایک سے ایک جڑتی چلی جاتی ہے! تیتر بٹیر، مرغ مسلم دال باٹی کباب سموسے یہ سب سیرابیوں کا مرکز نہیں سیرابیاں تو اس ملاقات میں چھپی ہوئی ہیں جسے خالد محمود کی موجودگی مبارک اور مستحکم بناتی ہے! اور سرونج ہی کیا دلی، بھوپال بمبئی اور لکھنؤ میں خالد محمود کے ساتھ رہ کر دیکھ لیجئے "واللہ خیر الرازقین" پر آپ کا یقین حشر تک متزلزل نہیں ہونے پائے گا۔

سرونج کی محفل خورد و نوش میں اگر آپ خالد محمود کے ساتھ شریک ہوں تو کھانے کا ذائقہ کئی درجہ بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ مرغ پکنے کے بعد بجائے ڈش میں آنے کے سیدھے پلیٹوں یا کٹوروں میں نکالا جاتا ہے۔ کٹوروں اور رکابیوں میں رکھی ہوئی بوٹی بقول وزیر آغا "گول بوٹی رکابی کی دلہن" نظر آتی ہے اب ان حصوں کی تقسیم کے لئے ایک شخص آنکھوں پر پٹی باندھ کر تمام شرکا کے نام پکارتا ہے عدل و مساوات کے ساتھ . بلند بانگ قہقہوں اور چبھتے ہوئے جملوں کے ساتھ . کبھی نمک میں کمی کبھی مصالحہ بھوننے میں زیادتی کبھی میٹھے میں مٹھاس کی زیادتی کے ساتھ یہ محفل آراستہ رہتی ہے اس محفل میں کبھی کبھی علم و ادب کی ایسی ایسی باتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں جو پرانی نہیں ہونے پاتیں انہیں محفلوں

میں محمد عمر خاں کی شعر کی تشریحات یا بھائی عظیم کی ندا فاضلی کے شعر کی پیروڈی یا، ناطق مالوی ذکر میر عرفانی خوش گفتاری وقار فاطمی فیاض فاطمی کی ذہانت فقیر سرونجی کی نعت گوئی۔ غرض سرونج کے علم وادب کا کون سا ایسا رنگ ہے جو ابھر کر سامنے نہیں آتا! خالد اکثر ان محفلوں میں نئے نئے لطیفوں میں اضافہ کرتے رہتے ہیں محفلیں کیا ہیں زعفران کا کھیت ہیں جنہیں دیکھتے ہی ہنسی پھوٹ پڑتی ہے۔ خالد محمود کے دوست ذائقوں کا دائرہ صرف سرونج تک محدود نہ رکھتے ہوئے .. دلی کی سرحدوں تک بھی پہنچا دیتے ہیں اور جناب شاہد علی خاں صاحب پروفیسر شمیم حنفی بڑے بابو (عارف بھائی) کی روغنی روٹیوں اور ڈاکٹر عزیزالدین کی بٹیروں کا تحفہ بہ حد سامان نشاط قبول کرتے ہیں۔ نہیں یہ "پیٹ پوجا سمیتی" نہیں ہے یہ تو وہ محفل ہے جو خالد محمود اور خالد کے دوستوں کو بطور مہمان پا کر ان کے راستے میں بچھ جانا چاہتی ہے۔ سراپا محبت! سراپا خلوص! ریاکاری سے پاک بے لوث و بے باک! جیسا خلوص خالد محمود کو اپنے دوستوں سے ملتا ہے ویسا ہی وہ Reciprucate کرنا چاہتے ہیں! کوئی خط کوئی لفافہ کوئی ٹیلی فون کوئی زبانی پیغام ایسا نہیں جس میں وہ دوست احباب کو دلی آنے کی دعوت نہ دیتے ہوں! اور یہ بھی سچ ہے کہ کوئی موسم ایسا نہیں جب خالد محمود کا گھر مہمانوں سے خالی نظر آتا ہو! موسمی پرندے گرتے ہوئے درجہ حرارت کی تاب نہ لا کر محفوظ ٹھکانوں کی طرف اڑ جاتے ہیں۔ موسم کے بدلتے ہی واپسی کا سفر شروع ہوتا ہے مگر خالد کا گھر .. موسم بے موسم۔ آباد رہتا ہے دل شناسوں سے لے کر چہرہ شناس تک بے خوف تکلف خالد کے گھر قیام پذیر ہو کر مہمان داریوں کا لطف اٹھاتے ہیں قدر ناشناسی ہوگی اگر خالد کی زندگی کے ان سنہرے اوراق میں ان کی شریک حیات کا نام نہ جوڑا جائے! دراصل جمیلہ خالد وہ شخصیت تھیں جن کے بغیر خالد محمود کی زندگی کامیابیوں سے سرفراز نہیں ہو سکتی تھی! اگر کسی شخص کو فرماں بردار اور نیک بیوی مل جائے تو وہ دنیا کا خوش قسمت آدمی ہوتا ہے اس اعتبار سے شاید خالد محمود دنیا کے خوش نصیب ترین آدمی ثابت کئے جائیں! حضور اکرم کا ارشاد ہے کہ اگر انسان کو انسان کے آگے سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو میں بیوی سے کہتا کہ اپنے خاوند کو سجدہ کرے" یہاں بھی شاید سب سے زیادہ سجدے جمیلہ بھابھی کے ہی نکلتے! خالد محمود اگر پورا ہندوستان گھوم سکے، سفر در سفر کے طفیل اپنے تجربات سفر نامے پر تحریر کردہ کتاب میں

سمو سکے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جمیلہ بھابھی نے زندگی کا ایک کنارہ اتنی مضبوطی اور مہارت سے تھامے رکھا کہ خالدؔ بے فکریوں کے ساتھ دنیا جہان میں گھومتے رہے تجربوں کی دھوپ میں حرارتیں حاصل کرتے رہے جمیلہ بھابھی کے لئے تو پروین شاکر کا یہ مصرع ہی کافی تھا۔

وہ کہیں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا

خالد محمود کے پہلے شعری مجموعے کا نام "سمندر آشنا" ہے اور اس کا جواز یوں تو ایک آدھ شعر کے ذریعہ بھی ظاہر ہو تا ہے ؎

ہر ایک بات خموشی سے پی گیا خالدؔ
یہ آدمی تو سمندر دکھائی دیتا ہے

مگر سمندر آشنا کی تصدیق اس وقت ہوئی جب گذشتہ سال ۱۹۹۷ء میں جمیلہ بھابی کا سفر حیات اچانک ختم ہو گیا! خالد ان دنوں سرونج میں تھے۔ بھابی کے انتقال کی خبر رات کے دو بجے سرونج پہنچی۔ خالدؔ اماں اور بہن کے ساتھ بھوپال پہنچے، دوسری گاڑی میں ہم سب احباب روانہ ہوئے! انصار بھائی کے نور محل والے مکان پر پہنچنے کے بعد جو منظر آنکھوں نے دیکھا وہ سات سمندروں کی روانی پر محیط تھا۔ خالدؔ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب مسلسل کئی گھنٹوں تک روانہ رہا! عزیزوں غمگساروں کی حالت ناقابل بیان تھی! اتنے آنسو خالد نے دو مسکراتی ہوئی آنکھوں میں کہاں چھپا کر رکھے تھے . سوچتا ہوں تو تصدیق ہو جاتی ہے ؎

یہ آدمی تو سمندر دکھائی دیتا ہے

O

انیس دہلوی
۲۹۳۶، ترکمان گیٹ، دہلی۔۶

جامعہ کے استاد، جامع صفات: خالد محمود

خوش شکل، خوش فکر، منکسر المزاج، شریف النفس، نہایت مخلص اور خلیق، تہذیب و تمدن سے بھرپور، ماہر تعلیم و نصاب تعلیم اعلیٰ محقق، بہترین ناقد باصلاحیت شائستہ معلم اور جینوئن شاعر کی صورت میں مجموعہ صفات کا نام ہے خالد محمود۔

خالد محمود جنہیں اپنی دیرینہ روایات کی پاسداری کا ہر لحظہ خیال رہتا ہے، موجودہ مشینی دور میں قدیمی احباب اور آبائی وطن "سرونج" کا بھی قدم بہ قدم لحاظ رکھتے ہیں۔

گذشتہ سال بزرگ شاعر شکیل گوالیاری اور معتبر نوجوان شاعر سلیم انصاری کی کتابوں کی رسم اجراء کی تقریب کا انعقاد "انتساب" نے سرونج میں کیا تھا رسم اجراء کے فرائض خادم کو ادا کرنا تھے۔ تقریب میں شعر و ادب کے متوالے جمع ہو چکے تھے۔ نظامت کے لئے ایک دوسرے سے درخواست کی جارہی تھی۔ لیکن کوئی بھی یہ ذمہ داری نبھانے کو تیار نہیں ہو رہا تھا۔ اچانک ڈاکٹر خالد محمود آگے بڑھے اور مائیک سنبھال کر تقریب کی شروعات کردی۔ آپ کی یہ جرأت اور حوصلہ مندی دل پر نقش ہو کر رہ گئی۔

خالد محمود بلاشبہ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ خالد محمود سے ملاقات کے بعد ان کی کتابیں پڑھیں اور شاعری بھی! شاعری میں انہوں نے اساتذہ سے استفادہ ضرور کیا ہے مگر ان کی تقلید نہیں کی اپنے تجربے اور مشاہدے کو شعری سانچے میں ڈھالا ہے۔ خالد محمود کی نثر ہو یا شاعری، دونوں میں جسم اور روح کا رشتہ دیکھا تو ادب کے اس زوال آمادہ دور میں زندہ رہنے کا حوصلہ پایا۔

زیر نظر شمارہ ان کی شخصیت اور فن پر "انتساب" کا خصوصی شمارہ ہے۔ اس میں جس کسی ادیب نے آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ سب کچھ خالد محمود میں دیکھ چکا ہوں بلاشبہ وہ سب سچ ہے بالکل سچ۔

محمد یوسف پاپا
182 غفار منزل ایکسٹینشن
جامعہ نگر، نئی دہلی25

خالد محمود تبوسط خالد محمود

خالد محمود صاحب ماشاء اللہ بالکل ٹھیک ہیں۔ آنکھ ٹھیک، ناک ٹھیک، کان ٹھیک، دانت ٹھیک، پیشانی ٹھیک، رخسار ٹھیک، ان سب کو ملا کر مجموعی طور پر دیکھا جائے یعنی سموچا چہرہ دیکھا جائے تو کہیں کہیں اصلاح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ قد آور آدمی ہیں۔ بدن سڈول ہے جسم سے ذرا کچھ پہلوانی رنگ بھی چھلکتا ہے۔ دل دماغ ذہانت، جبلت، سب صحیح ہیں۔ جب ان سب خوبیوں کا زور زیادہ ہوتا ہے تو اشعار بھی زور آور کہتے ہیں جنہیں پچھاڑنا مشکل ہے۔ ان میں ہمدردی کا جذبہ بھی بہت ہے۔ کوئی ضرورت مند شعری اصلاح یا ادبی اصلاح کے لئے غزل یا مضمون لے کر پہنچ جائے تو اس کی پر زور مدد کرتے ہیں۔ یوں آسانی سے نہیں چھوڑتے جب تک کہ پوری اصلاح نہ ہو جائے۔ خواتین و حضرات دونوں کی طرف توجہ رہتی ہے۔ حضرات تو خیر ٹھیک ہیں۔ لیکن خواتین کے عنایت کردہ کاموں کی تشریح خط کشیدہ الفاظ کی طرح کرتے ہیں۔ لوگ مطمئن ہو کر جاتے ہیں۔ بلکہ یہ گنگناتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں کہ

"ایک بار آئے ہیں دوبارہ آنے کی خواہش ہے"

مدتوں پی ایچ ڈی ان کے پیچھے پیچھے دوڑی اور یہ برسوں آگے آگے سرپٹ بھاگتے رہے پکڑ میں نہیں آئے۔ آخر کار لوگوں نے گھیر کر پکڑ لیا میں نے پوچھا خالد صاحب پھر کیا ہوا۔ بولے کیا کرتا مجبوراً پی ایچ ڈی کرنی پڑی۔ خالد محمود صاحب پی ایچ ڈی کے فوراً بعد سیدھے شعبہ اردو میں لکچرر ہو گئے پٹھان ہیں پٹھانوں کی ساری خصوصیات (طبعی اور کیمیاوی) ان میں پائی جاتی ہیں۔ دوستی ہے تو دوستی دشمنی ہے تو دشمنی دونوں کا پارہ ایک ہی لیول تک جاتا ہے۔ تفریحی پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیتے ہیں۔ ہاتھ کھلا ہوا ہے۔

پیسہ جیسے آتا ہے ویسے ہی خرچ ہو کر اپنا سامنہ لے کر چلا جاتا ہے۔ مہمانوں کی آمد ایسی ہے جیسے طبیعت موزوں ہونے پر اشعار کی آمد ہوتی ہے جسے کوئی روک نہیں سکتا۔ مہمانوں کے سلسلے میں اخراجات اچھے ہیں۔ جو سنتا ہے طبیعت خوش ہو جاتی ہے اور سوچتا ہے کہ وہ بھی ان کے گھر مہمان ہو جائے بقول شاعر

دشمنوں کی دشمنی میرے لئے آسان تھی
خرچ آیا دوستوں کی میزبانی میں بہت

لیکن اس کے باوجود "ھل من مزید" کا نعرہ لگاتے ہیں۔ خالد صاحب کو ان کے والد صاحب کی طرح سفر کا بہت شوق ہے۔ خاکسار بھی خالد صاحب کا ہم سفر رہ چکا ہے۔ سفر کے دوران ان کی یہ کیفیت رہتی ہے کہ کوئی بھی چیز کھانے کی دکھائی دے جائے۔ تو اسے چھوڑ نہیں سکتے ہیں۔ ضرور کھائیں گے اور دوسروں کو بھی کھلائیں گے۔ کھانے اور کھلانے کی حسرت پوری کرتے ہیں۔ وہ اس مصرعہ کے قایل نہیں کہ۔

"حسرتیں چند اپنے ذمے دھر چلے"

جہاں کوئی حسرت دل میں آئی اسے وہیں دبوچا اور فوراً پوری کر دی۔ ہر اک کے ساتھ مدد و امداد کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ پی ایچ ڈی کرنے والے بھی اپنی تھیسس (Thesis) کی زبان درست کرانے کے لئے خالد صاحب کے پاس آتے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی مصروفیت کو بالائے طاق رکھ کر درستی جمع بندی کر دیتے ہیں ایثار و مروّت کے پتلے وعدے کے پکے اور وقت کے پابند ہیں۔

خالد محمود صاحب سے میری ملاقات ہوئی۔ جب وہ جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول میں پی جی ٹی (اردو) کی حیثیت سے آئے۔ اس وقت سے ہی ہمارے تعلقات اب تک قائم ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی قائم رہیں گے۔ یہ اپنی بات کہتے بھی ہیں اور دوسروں کی بات سنتے بھی ہیں۔ اگر کوئی پہلوان ان کو چلتا ہوا دیکھے تو یہ سوچے گا اگر انہیں پچھاڑ دیا تو پہلوانی میں اپنا نام اونچا ہو جائے گا۔ جسم بالکل ٹھوس ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ابھی مگدر گھما کے آئے ہوں۔ جیسا بدن ویسی ہی خوراک مگر جتنا کھاتے ہیں اس سے زیادہ پر چار کرتے ہیں۔ مرغن کھانے کھاتے ہیں۔ گوشت کی طرف توجہ زیادہ ہے دالیں سبزیاں بیچاری پریشان رہتی ہیں کہ ہماری طرف دیکھتے بھی نہیں۔

خالد صاحب کے توسط سے نہ جانے کتنی جانکاریاں میسر آئیں۔ خالد صاحب نے مجھے اور مظفر حنفی صاحب کو سرونج کی نمائش کے مشاعرے میں شاعر کی حیثیت سے شامل ہونے کی دعوت دی۔ پہلی بار سرونج گئے۔ اور سرونج کی زیارت کی مشاعرے میں شریک ہوئے۔ مشاعرے کو ہم نے لوٹا یا سرونج نے ہمیں لوٹ لیا اس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں فرمانا ہے۔ فرمانا یہ ہے کہ خالد صاحب کے دوستوں سے خوب ملاقاتیں ہوئیں۔ جو ہمارے بھی دوست بن گئے۔ وہیں ایک عجیب شخص کو دیکھا۔ چھ فٹ لمبا قد شلوار اور قمیض پہنے ہوئے۔ قمیض پر ایک منقش صدری سر پر کلاہ دار صافہ۔ پیروں میں کامدار پٹھانی سینڈل ایسا محسوس ہوا کہ جیسے موصوف ایک پٹھان نہیں مجسم افغانستان ہوں۔ معلوم ہوا یہ خالد صاحب کے خالہ زاد بھائی حامد دادا ہیں۔ پوری نمائش پر ان کا رعب قائم تھا۔ شان فخری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ شدید سردی کا موسم جسم پر ایک ہلکا سا سوتی کرتہ وہ بھی بغیر بنیان۔ سردی کا ذرا سا بھی احساس نہیں۔ جیسے خلیفہ دوم کو دیکھ کر شیطان بھاگتا تھا اسی طرح شان فخری کو دیکھ کر سردی بھاگتی تھی مسیح خوش نفس صاحب کا نیاز حاصل ہوا جن کا نام میرا خیال ہے سرور علی خاں ہے حضرت خوش تو کم نظر آئے نفس زیادہ لگے۔ مجسم نفس ہی نفس ضیا اسدی صاحب سے اکثر ان کی جھڑپ ہوا کرتی تھی۔ ضیا اسدی صاحب اپنی نوعیت کے لگ ہی شخص ہیں۔ خوب آدمی ہیں۔ دور دور تک ان کا ثانی دکھائی نہیں دیتا۔ وہ خود ہی اپنے ثانی ہیں بلکہ ثالث بھی وہ خود ہی ہیں۔ شاہد میر صاحب سے ملاقات ہوئی جو ساز، آواز، اور شاعری تینوں کے مالک ہیں۔ یعنی تھری ان ون ہیں۔ شعر بہت اچھے کہتے ہیں وزن میں بیگم ہلکی ہیں اور خود بھاری اس سے آگے وہ جانیں اور ان کا کام مرحوم وقار قاسمی سے ملا۔ بہت اچھے شاعر اور بہت ہی نفیس انسان تھے۔ ڈاکٹر عزیز الدین صاحب اور ڈاکٹر فرید اقبال سے بھینٹ ہوئی۔ ایک یونانی ڈاکٹر ہیں۔ دوسرے انگریزی ڈاکٹر ہیں (گویا ہندوستانی کوئی نہیں) ڈاکٹروں کو دیکھ کر دل کو تقویت حاصل ہوتی ہے وہ یوں کہ اگر ان کی موجودگی میں بیمار پڑ جائیں اور قریب المرگ بھی ہو جائیں۔ تو بھی ان کی موجودگی باعث اطمنان و مسرت ہے کہ اگر مر بھی گئے تو ساری ذمہ داری ڈاکٹروں کے سر آئے گی۔ اللہ میاں اور مریض دونوں بچے رہیں گے۔ سہیل قیومی صاحب، عمر خاں صاحب، عارف صاحب، انجم صاحب، ولی اللہ صاحب اور عتیق صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ تمام صاحبان بھی خالد صاحب کے نہایت

مخلص دوست ہیں۔ یہ سب حضرات سرونج خاص کے احباب تھے۔

ذ قار فاطمی صاحب صاحب دل یعنی دل کے مریض تھے (اسی بیماری میں ان کا انتقال بھی ہوا) اپنی بیماری کے دوران آل انڈیا انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز دہلی میں چیک اپ کے لئے آئے تھے۔ خالد محمود صاحب کے پاس ٹھہرتے تھے۔ میں ان سے برابر ملتا تھا۔ وہ خود بھی شعر سناتے تھے اور مجھ سے بھی سنانے کی فرمائش کرتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ کہا "کچھ سنایئے پاپا" میں نے چار پانچ اشعار عرض کئے مثلاً

نہیں جب چڑھ سکا عاشق کا پارا　　حسینوں نے پکڑ کر خوب مارا
کچھ تو بے رنگ روایات سے ہٹ کر دیکھو　　اپنے محبوب کو اک بار پلٹ کر دیکھو
گھر گرانے کی شکایت پر یہ حاکم نے کہا　　ہم گرا دیتے ہیں گھر والی کو گھر کیا چیز ہے
اس اندھیرے میں، یہ کیسی کھڑ کھڑاہٹ ہے میاں　　چارپائی کے ادھر میں ہوں ادھر کیا چیز ہے
جب بھی والد کی جفا یاد آئی　　اپنے دادا کی خطا یاد آئی
ان کی کمر جدید تو میری نظر جدید　　آدھا ادھر جدید ہے آدھا ادھر جدید
یہ فائدہ ہوا ہے فقیرن سے عشق کا　　خیرات کھا رہے ہیں تو خیرات کیا کریں

بہت محفوظ ہوئے۔ کافی دیر تک ہنستے رہے۔ اس کے بعد پھر ان سے ملاقات نہیں ہوئی سرونج میں نمائش کے مشاعرے کے بعد دوسرے دن صبح میں اور مظفر حنفی صاحب خالد صاحب کے گھر پر بیٹھے تھے۔ کئی احباب جمع تھے۔ حامد دادا بھی موجود تھے۔ اتنے میں میونسپل کا کلرک ہمیں حق المحنت پیش کرنے کے لئے آیا۔ روپے پیش کرنے کے بعد اس نے ہم سے ایک کاغذ پر دستخط کرنے کے لے کہا۔ فوراً حامد دادا بولے۔ ابے کیا قرض دے رہا ہے جو دستخط کرائے گا چل بھاگ دستخط کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں نے سمجھایا کہ دستخط ضروری ہیں ورنہ یہ کلرک غریب بے موت مارا جائے گا۔

اسی دن سے دعوتیں اور شام سے شعری نشستیں شروع ہو گئیں۔ پہلی نشست ڈاکٹر فرید اقبال کے والد راہی قاسمی صاحب کے گھر پر تھی۔ دوسری نشست ڈاکٹر شاہد میر کے خسر وکیل سعید صاحب کے مکان پر ہوئی۔ بہت لطف آیا۔ نشستوں میں سامعین کی حیثیت سے متشرع لوگ بھی شامل تھے سب کے سب شعر و سخن کے قدردان سخن سنج اور

سخن فہم میرے کسی کسی شعر پر یہ حضرات آواز دبا کر عملی داد کے لئے پورے پورے جسم سے ہنستے تھے نشستیں دو دو تین تین بجے رات تک چلتی تھیں۔ سرونج کے لوگوں کو میں نے باوقار خوددار سخن سنج سخن فہم خوش خلق شگفتہ مزاج اور مہمان نواز پایا۔

دوسرے دن پکنک کا پروگرام بن گیا۔ چنے کے ہولے کھانے کے لئے بس پر سوار ہوئے گاؤں پہنچے۔ گاؤں والوں نے ہولا تیار کیا گاؤں میں اسی دن اک چھوٹے سے مندر میں مورتی کی استھاپنا ہوئی تھی۔ بھجن برابر چل رہا تھا۔ ادھر ہم لوگ ہولا کھا رہے تھے۔ بڑا لطف آرہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہولا نہیں بھنجولا کھا رہے ہوں۔ دوپہر کے کھانے کی دعوت خالد محمود صاحب کے تایا کے گھر تھی۔ ہماری بس گاؤں سے چلی اچھلتی کودتی چھ بجے سرونج پہنچ گئی سڑک ایسی تھی کہ بیچاری بس بغیر اچھلے کودے رہ نہیں سکتی تھی جب بس چلتی تو سواریاں اپنی مرکزی جگہ سے کبھی ادھر کبھی ادھر کھسکتی رہتی تھیں۔ بہر حال سکون سے بیٹھنا بڑا مشکل تھا۔ اور یہ مصرع صادق آرہا تھا۔

"سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں"

دوپہر ایک بجے کے بجائے ہم سب شام چھ بجے خالد محمود صاحب کے تایا کے گھر پہنچے اور تاخیر ہو جانے پر معذرت کی۔ بیچارے کیا کرتے مجبوراً معذرت قبول فرمائی اس پر سنہا صاحب کا ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ جسے وہ اکثر سناتے تھے۔ (میرے تقرر سے پہلے سنہا صاحب جامعہ میں ہسٹری کے لکچرر تھے) ایک طالب علم سنہا صاحب کے پاس آیا اس نے کہا "سنہا صاحب نمبر بڑھا دیجئے" سنہا صاحب نے جواب دیا "نہیں بڑھاؤں گا" یہ سن کر طالب علم نے لمبا سا چاقو نکال لیا میں نے پوچھا سنہا صاحب پھر کیا ہوا؟ بولے "بڑھا دیا کیا کرتا" اسی طرح تایا صاحب نے اجازت دے دی کیا کرتے اسی دن شب میں پھر نشست تھی۔ نشست بہت کامیاب رہی۔ لوگ بہت محظوظ ہوئے ہم نے بھی کافی داد اکٹھا کی۔ مظفر حنفی صاحب کا کلام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ جو بھی سنتا ہے سر دھنتا ہے یعنی متاثر ضرور ہوتا ہے۔ لیکن مظفر صاحب کی شخصیت اور کلام سے کسی پہلوان کو متاثر ہوتے ہوئے میں نے پہلی بار دیکھا۔ حالانکہ پہلوانوں کی ذہنی اور جسمانی طاقت میں تقریباً ایک بٹا سو کی مناسبت ہوتی ہے۔ اسے خدا کی قدرت ہی سمجھیں گے کہ پہلوان صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ مظفر حنفی صاحب سے ان کے نئے مجموعہ کلام کے طلب گار ہو گئے۔ اس طلب صادق پر

مظفر حنفی صاحب خوش ہوئے یا خوف زدہ یہ مجھے نہیں معلوم لیکن میں نے اتنا ضرور دیکھا کہ انہوں نے بہت ہی سنجیدگی متانت اور مسکینیت کے ساتھ پہلوان کی خدمت میں کتاب پیش کی۔ اور پہلوان صاحب نے خندہ پیشانی بلکہ خندہ پہلوانی کے ساتھ کتاب قبول کی۔ سب لوگ خوش ہوئے میں نے یہ تو سنا ہے کہ تان سین نے دیپک راگ گا کر چراغ جلا دیا۔ میگھ راگ گا کر پانی برسا دیا لیکن پہلی مرتبہ حنفی صاحب کی غزلوں کے راگ نے پہلوان ہلا دیا۔ یا یوں کہئے گرا دیا۔ کسی پہلوان کا ہلنا یا گرنا کسی دیوار کے ہلنے یا گرنے کے مترادف ہے۔ اسی نشست میں ضیا اسدی صاحب کے کسی شعر پر لوگوں نے بہت داد دی۔ ضیا صاحب اپنے اشعار کا مقابلہ میر و غالب کے اشعار سے کرتے ہیں۔ کسی صاحب نے کہا کہ یہ شعر تو میر سے کچھ پیچھے رہ گیا۔ ضیا صاحب نے فوراً تیور بدلے اور تڑاق سے بولے "یہاں میں آپ سے ہرگز اتفاق نہیں کر سکتا۔ میرا یہ شعر میر سے بہت آگے ہے" افسوس ہے کہ مجھے ان کے وہ اشعار یاد نہیں رہے مگر نشست بہت پر لطف رہی۔

دوسرے دن مغرب کی نماز کے بعد خاکسار جامع مسجد میں کچھ پڑھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہونگے۔ کہ ایک صاحب لحیم شحیم مست ہاتھی کی طرح جھولتے ہوئے میرے قریب آگئے اور سوال کیا کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے بیٹھنے کی نہیں۔ جب سوالوں کی بارش رکی تو میں نے جواب دیا "دلی سے آیا ہوں" یہ سن کر انہوں نے کہا کہ دلی میں میرے بھانجے خالد محمود بھی رہتے ہیں۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور فوراً بولا کہ میں انہیں کا ساتھی ہوں۔ یہ سن کر انہوں نے فرمایا کہ اچھا اچھا آپ بیٹھئے کوئی بات نہیں۔ میرے دم میں دم آیا۔ دو تین منٹ حواس درست ہونے میں لگ گئے اس طرح خالد محمود صاحب کے توسط سے مجھے اس دیو سے نجات ملی۔ مسجد میں معلوم ہوا کہ وہ عمر شاہ خاں تھے۔ ان کا ذہنی توازن ان دنوں ٹھیک نہیں تھا۔ عام طور پر یہ کیفیت ان پر طاری ہو جاتی ہے اور جب طاری ہو جاتی ہے تو دس بیس لوگ مل کر بھی انہیں قابو میں نہیں کر پاتے۔ ایک صاحب اور اسی اسٹائل کے ملے لیکن وہ دبلے پتلے اور نحیف تھے۔ یہ مست نحیف عام طور پر سرونج اور اس کے قرب و جوار کی مسجدوں میں صبح صادق سے پہلے ہی اذان دیا کرتے تھے۔ ایک رات ان کی ملاقات بابو (خالد محمود صاحب کے والد) سے ہو گئی۔ اتفاق سے وہ مسجد میں سو

رہے تھے۔ فوراً پاگل صاحب نے بابو کو جگایا۔ بابو نے کہا باہر جو زمین کے اندر لیٹے ہوئے ہیں انہیں جگاؤ۔ وہ تمہارا ساتھ دیں گے)(مسجد کے باہر کچھ قبریں تھیں بابو کا اشارہ اس طرف تھا) پاگل صاحب نے باہر خوب آوازیں دیں۔ اپنی بساط سے زیادہ چلائے ''چلو نماز پڑھو اٹھو نماز پڑھو'' تھوڑی دیر بعد بابو سے آکر کہا۔ کوئی نہیں آرہا ہے۔ بابو نے کہا وہ سب نماز پڑھنے والے نہیں ہیں۔ مجھے بھی انہیں میں سے سمجھو۔ اب جاؤ دوسری مسجدیں خالی پڑی تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔ وہاں ڈیوٹی دو۔

ایک دن مولیٰ علی نام کی پہاڑی پر پکنک کا پروگرام بنا۔ یہ نمائش گراونڈ کے نزدیک سروج سے ملحق کافی اونچا ایک ٹیلہ ہے جس پر پرانی عمارتیں بنی ہوئی ہیں اور ایک پرانی اسٹائل کا مضبوط گیٹ بھی ہے۔ یہ ٹیلہ اپنی عمارتوں کے ساتھ مولیٰ علی کے نام سے جانا جاتا ہے طے ہوا کہ وہاں دال باٹی خود بنائیں گے کھائیں گے اور موج اڑائیں گے۔ بعد میں وہیں شعری نشست ہوگی۔ سب احباب معہ سامان پکنک بارہ بجے دن کے قریب مولیٰ علی کی پہاڑی پر پہنچ گئے۔ فرش بچھ گیا۔ لوگ کاموں میں مصروف ہوگئے۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ظہر کی نماز پڑھی گئی۔ امامت کا فرض ڈاکٹر عزیزالدین صاحب نے ادا کیا اچھے امام ہیں۔ جہاں موقع ملا فوراً نماز پڑھادیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے پیچھے بہ امید مغفرت میں نے بھی نماز پڑھی۔ شام تک دال باٹی تیار ہوگئی اہتمام سے کھانا کھایا گیا۔ کھانے سے پہلے عصر کی نماز ادا کی گئی بعد میں مغرب کی نماز۔ اب فرصت تھی شعری بیٹھک شروع ہوئی بیٹھک اس لئے کے اس میں اٹھک بیٹھک دھر پکڑ زیادہ تھی۔ شعری مسئلہ کم تھا اس بیٹھک میں خاکسار تھا۔ مظفر حنفی صاحب تھے۔ وقار فاطمی صاحب، شاہد میر صاحب، شان فخری صاحب ڈاکٹر فرید صاحب ڈاکٹر عزیز صاحب مسیح خوش نفس صاحب ضیا اسدی صاحب عارف صاحب، انجم صاحب، بھوپال کے پروفیسر حامد حسین صاحب، ظفر صہبائی صاحب، عمر خاں صاحب اور کئی صاحبان شامل تھے۔ عمر خاں کا نام آیا تو یاد رہے کہ یہ وہ عمر خاں نہیں تھے۔ جنہوں نے مسجد میں میرا انٹرویو لیا تھا۔ شعر و شاعری تو ہوتی ہی رہتی ہے یہ کوئی خاص بات نہیں اس محفل میں صرف دو خاص باتیں تھیں۔ ایک ضیا اسدی صاحب اور شاہد میر صاحب کا ساز اور آواز کا مقابلہ، دوسری خاص بات مسیح خوش نفس صاحب کی تاریخی تقریر۔

لوگوں نے کہا شاہد میر صاحب راگ راگنی سر تال سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں۔

ضیا اسدی صاحب کا اصرار تھا کہ میری واقفیت بہت زیادہ ہے۔ شاہد میر صاحب کا خیال تھا کہ ان کی آواز زیادہ پرسوز اور پاٹ دار ہے۔ ضیا اسدی صاحب اپنی مبارک زبان سے فرماتے کہ ان کی آواز کہیں زیادہ سریلی اور ٹھاٹ دار ہے۔ دونوں حضرات نے کچھ دیر تک ساسا۔ ساسا۔ رے رے۔ رے رے۔ رے رے۔ گا گا۔ گا گا۔ ما ما۔ ماما کیا بھی۔ لیکن ہمیں نہ کہیں ماما دکھائی پڑے نہ بھانجے۔ مطلب یہ کہ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ کیا فیصلہ کرتے ہاں اگر کوئی استاد میراثی خاں صاحب ہوتے تو فیصلہ ہو جاتا۔ مجبوراً ان دونوں صاحبان کا مقابلہ بغیر فیصلے کے رہ گیا۔ عزت بچ گئی۔ اب مسیح خوش نفس صاحب کی تقریر شروع ہوئی۔ کہا گیا کہ کسی بھی موضوع پر فی البدیہہ تقریر کر سکتے ہیں بس موضوع دینا شرط ہے مسیح خوش نفس صاحب ایک مشرع اور معمر عالم دین ہیں۔ ضیا اسدی صاحب بھی ستر سے بہتر سے سفید داڑھی کے سرخ و سفید بزرگ ہیں دونوں میں خوب چونچیں چلتی ہیں۔ چنانچہ مسیح خوش نفس صاحب کو شرارت پر آمادہ لوگوں نے موضوع دیا ”میاں بھائی کی شاعری“ (میاں بھائی ضیا صاحب کو کہتے ہیں) مسیح خوش نفس صاحب فوراً شروع ہو گئے۔ اور ضیاء صاحب کو مخاطب کر کے با آواز بلند فرمایا ”ضیاء اسدی آپ شاعر واعر کچھ نہیں ہیں۔ شاعر تو بڑی چیز ہے شاعر کی دم بھی نہیں ہیں۔ آپ کا شاعری سے کیا واسطہ شاعری کی تو آپ کو ہوا بھی نہیں لگی۔ آپ ذرا اپنا چہرہ تو دیکھئے۔ آپ کا چہرہ سرخ سفید ایسا چہرہ کہیں اچھے شاعر کا ہوتا ہے۔ شاعری عشق کے بغیر نہیں ہوتی۔ عشق میں اندر سے دل جلتا ہے اور باہر سے شاعر دل کے ساتھ ساتھ اس کی جلن کے آثار باہر بھی نمودار ہوتے ہیں۔ ذرا مظفر حنفی صاحب کو دیکھئے۔ اچھا شاعر ایسا ہوتا ہے۔ آپ کو شاعری بالکل نہیں آتی۔ اس کے باوجود کتنی ڈھٹائی اور بے حیائی سے آپ شعر کہتے ہیں۔ آپ کے اشعار سن کر شرم آتی ہے ہر باشعور اور شعر فہم آدمی شرماتا ہے سارا سر ونج شرماتا ہے۔ آپ ایسے اشعار کیوں کہتے ہیں کہ لوگ واہ واہ کہنے کے بجائے ہائے ہائے کہنا شروع کر دیں۔ میری بہترین رائے یہ ہے کہ آپ شاعری ترک کر دیں اور کوئی دوسرا کام کریں۔ اور اگر غیرت دار ہیں تو گردن میں ایک بڑا پتھر باندھ کر مولا علی کی چوٹی سے نیچے کود پڑیں۔ تا کہ آپ کو ہم سے اور ہمیں آپ کی شاعری سے نجات حاصل ہو۔ پھر بولے ضیاء اللہ تیرا سر سام بگڑ گیا ہے، تو اپنا علاج کروا۔ بکرے کی اوجھڑی سر سے باندھ کر نیچے کود پڑ۔ مسیح خوش نفس تقریباً آدھے گھنٹے اس قسم کی باتیں کرتے رہے مجمع

کا براحال کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑے جاتے تھے۔ ہم لوگ خوف زدہ ہنسی ہنس رہے تھے کہ پٹھانوں کی بستی ہے معلوم نہیں اب کیا ہونے والا ہے مگر ضیاء صاحب کو بھی داد دینی پڑے گی کہ ساری تقریر صبر و سکون سے سنتے رہے کبھی کبھی یہ ضرور فرماتے تھے کہ پاگل ہے یہ پروگرام انتہائی یادگار، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش تھا۔

اسی شب راہی صاحب کے مکان پر شعری نشست بھی تھی۔ وقت نو بجے شب تھا۔ ہم سب مولا علی سے تقریباً ساڑھے دس بجے رات راہی صاحب کے مکان پر وارد ہوئے۔ دیکھا تو سناٹا راہی صاحب کے خاموش چہرے سے ناراضگی کے آثار ظاہر کسی نے کہا کیا سامعین ابھی تک نہیں آئے۔ راہی صاحب نے فرمایا۔

"آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا"

جی میں آیا کہ مصرعہ ثانی پڑھ دوں۔ لیکن کیا پڑھتا۔ اگر دوسروں کے وقت کا احساس کرنے والے لوگ ہوتے تو پڑھتا۔ ان کے پاس اس مصرعہ کے سننے اور سمجھنے کی گنجائش ضرور ہوتی۔ یہاں تو اس گروپ کی کیفیت "شاک پروف" کی سی تھی۔ ان پر کیا اثر لیٹ پہنچنا ان کے لئے اسٹیٹس سمبل تھا۔ کسی بھی پروگرام میں وقت پر پہنچے ہی نہیں۔ اگر وقت آٹھ کا ہے تو دس بجے پہنچتے۔ کمال یہ تھا کہ ہم سب کو ندامت بھی نہیں ہوتی تھی۔ ہم نادم وادم تو نہیں ہوئے لیکن اپنا سامنہ لے کر واپس آگئے۔ کچھ بھی نہیں سنا سکے۔ جس کے سبب سب کا پیٹ گڑبڑ ہو گیا۔ رات بھر بے چینی رہی۔ اس لئے کہ شاعروں کے لئے شعر سنانا چورن کا کام کرتا ہے۔ جو ہاضمے کے لئے ضروری ہے اور گیس کی بیماری ختم ہو جاتی ہے اگر دو چار دن تک کوئی شعر سننے والا نہ ملے تو پیٹ میں باد گولا بن جاتا ہے۔

اس کے بعد بھوپال گئے۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب سے ملاقات ہوئی جو خالد محمود صاحب اور مظفر حنفی صاحب کے استاد ہیں۔ یہ دونوں حضرات ان کے بہت عزیز شاگرد ہیں اور قوی صاحب کا بہت احترام کرتے ہیں۔ قوی صاحب علم و ادب، اخلاق اور خلوص میں از حد قوی ہیں یعنی اسم با مسمی ہیں اردو کی درسی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں سری نگر کشمیر میں ایک سیمینار ہوا۔ خالد محمود صاحب، مظفر حنفی صاحب، عبدالقوی دسنوی صاحب اور بھی کئی دانشور سیمینار میں شرکت کے لئے سری نگر روانہ ہوئے۔ خالد محمود صاحب کے بے حد اصرار پر خاکسار اور شکیل اللہ خاں صاحب بھی سری نگر گئے۔ صرف

تفریح میں شرکت کے لئے سیمینار کی شرکت سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔

سیمینار ختم ہونے کے بعد ہم چاروں دلی کے لئے روانہ ہوئے جموں میں رات گزارنے کا پروگرام تھا۔ عابد پیشاوری صاحب کی تلاش میں یونیورسٹی اولڈ کیمپس گئے۔ معلوم ہوا وہ ہماری تلاش میں نیو کیمپس تک گئے ہوئے ہیں۔ نیو کیمپس گئے تو ایک چوکیدار سے معلوم ہوا کہ عابد پیشاوری صاحب کچھ مہمانوں کی تلاش میں یہاں آئے تھے لیکن نامراد گھر واپس چلے گئے۔ ہم نے کہا کہ وہ کچھ مہمان لوگ ہم ہیں۔ لیکن آپ بتائیے ہم کیا کریں۔ چوکیدار صاحب نے فرمایا کہ بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ حضرات یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں ٹھہر جائیے۔ گیسٹ ہاؤس تک ہماری رہنمائی کی۔ گیسٹ ہاؤس تقریباً فل تھا۔ بڑی مشکل سے ایک چھوٹا سا کمرہ اور ایک برآمدہ ملا۔ مظفر حنفی صاحب اور خالد محمود صاحب برآمدے میں لیٹ گئے۔ مجھے اور قوی صاحب کو دی آئی پی ٹریٹمنٹ دینے کے لئے کمرے میں دھکیلا جس میں ایک مسہری تھی اور چارپائی کی سائز کا بچا ہوا خالی فرش تھا۔ میرا اصرار تھا میں فرش پر لیٹوں گا اور قوی صاحب مصر تھے کہ وہ فرش پر لیٹیں گے۔ بہر حال قوی صاحب کسی طرح بھی مسہری پر لیٹنے کو تیار نہیں ہوئے۔ مجبوراً مجھ داڑھی موچھوں والے خاردار انسان کو مسہری پر لیٹنا پڑا قوی صاحب کے اس ایثار اور اخلاق سے میں بہت متاثر ہوا۔ یہ واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ایسے ہی نہ جانے کتنے واقعات ہیں جو قوی صاحب کی شخصیت کو بالا سے بالاتر کرتے ہیں۔

خالد محمود صاحب کے توسط سے شکور خاں صاحب (پرنسپل سیفیہ کالج بھوپال) سے ملاقات ہوئی۔ شکور خاں صاحب ولی صفت انسان ہیں۔ بہت نیک بزرگ قابل اور با اخلاق شخص ہیں۔ ان کا مضمون کامرس ہے۔ میں ان سے بھی بہت متاثر ہوا اور اب بھی متاثر ہوں۔ میں اور مظفر حنفی صاحب خالد محمود کے ساتھ بھوپال گئے۔ شکور خاں صاحب سے کالج میں ملاقات ہوئی انہوں نے کھانے پر مدعو کیا ہم لوگ آٹھ بجے شب ان کے مکان پر پہنچ گئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چھوٹے سے کرایے کے مکان میں دو سیدھی سادی معمولی بنچیں۔ کتابوں کے ساتھ ایک اور ایک میز ہے فرش پر چٹائی بچھی ہوئی ہے اندر دو چارپائیاں کوئی سجاوٹ نہیں صوفہ سیٹ نہ ڈبل بیڈ نہ سنگار میز۔ کچھ بھی تو نہیں تھا فرش پر ہم نے کھانا کھایا کھانا ویجیٹیرین بنا تھا بہت مزیدار طبیعت خوش ہو گئی۔ اس سے کہیں زیادہ

میری طبیعت ان کے گھر کی سادگی دیکھ کر خوش ہوئی۔ درویشانہ سازوسامان درویشانہ زندگی۔ میں نے کسی بھی اس اسٹیٹس کے دانشور کو ایسی سادی زندگی گزارتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سمپل لونگ اینڈ ہائی تھنکنگ(Simple Living and high Thinking) کو عملی شکل میں دیکھا۔ ایک واقعہ یاد آتا ہے وہ یہ کہ شکور خاں صاحب سے سرونج میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ آپ حضرات جب بھوپال آئیں تو میرے ساتھ کھانا کھائیں۔ ہم لوگ بھوپال گئے۔ شکور صاحب کو بغیر مطلع کئے شام کو ان کے گھر کھانے کے لئے پہنچ گئے۔ پتہ چلا کہ گھر پہ موجود نہیں ہیں۔ پھر کھانے کا کیا سوال جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آ گئے۔ ہم نے سوچا کئی دن ہو گئے ہیں شکور صاحب کے ذہن سے دعوت کی بات نکل گئی ہو گی اور اس میں ہماری بھی غلطی ہے کہ ہم نے پہنچتے ہی انہیں اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی۔ یہ سوچ کر ہم مطمئن ہو گئے۔ لیکن حنیف کیفی صاحب کو اطمینان قلب حاصل نہیں ہوا۔ اس سانحہ میں زیادہ غلطی ہمیں لوگوں کی ہے ہمیں مطلع کرنا چاہئے تھا" لیکن کیفی صاحب پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ موصوف تھوڑے وقفہ کے بعد وہی بات دہراتے تھے یعنی شکور صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ان کی حالت اس پرانے ریکارڈ کی سی ہو گئی تھی جس میں دو ٹریک کے درمیان کی لائن کٹ جاتی ہے۔ اور سوئی بار بار پہلے ٹریک میں آتی ہے اور ریکارڈ ایک ہی لائن دہراتا رہتا ہے کیفی صاحب کیف میں پرانے ریکارڈ کی اسی کیفیت کو سینے سے لگائے آگے بڑھتے رہتے تھے اور آواز برابر آتی رہتی تھی "شکور صاحب کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا" مظفر حنفی صاحب بہت بگڑے اور سمجھایا کہ ایسے شریف انسان کے لے یہ بات بار بار مت دہرایئے لیکن کچھ اثر نہیں آخر مظفر صاحب سے گھٹ پٹ ہو گئی۔ خالد محمود صاحب کے اور بھی بہت سے خاص دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جیسے اقبال مسعود صاحب رشید انجم صاحب، ڈاکٹر نعمان صاحب، سہیل صاحب، ظفر اللہ خاں صاحب وغیرہ وغیرہ سب کے سب خوش وضع متواضع بامروت بااخلاق ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والے ہیں۔

خالد صاحب کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ سرونج سے بھوپال اور بھوپال سے دہلی تک اپنے دوستوں عزیزوں شاگردوں اور استادوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ دل کے صاف ہیں جس کسی سے شکایت ہوتی ہے اس کے منہ پر بلا جھجھک کھینچ مارتے ہیں۔ جب تک نہیں مارتے بے چین رہتے ہیں۔ دل کا غبار نکال کر مطمئن اور پرسکون ہو جاتے ہیں اور دل

صاف ہو جاتا ہے جس سے جتنا گہرا تعلق ہوتا ہے اس سے اتنی ہی شدید شکایت کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں چھوٹے بڑے کی تمیز بھی نہیں کرتے اس کے ساتھ اپنی غلطی کا احساس ہونے پر شرمندہ ہونے اور معذرت کرنے میں بھی دیر نہیں لگاتے۔

خالد محمود صاحب کی اولاد میں صرف ایک بیٹی ہے۔ ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے فوزیہ آفرین نام ہے۔ بارہویں کلاس میں فرسٹ پوزیشن آئی ہے پڑھنے لکھنے کے علاوہ تہذیب و شائستگی اور سلیقہ شعاری میں اپنی مثال آپ ہے۔

خالد محمود صاحب کی بیگم جامعہ میں ہماری کولیگ Colleague تھیں بہت ہی نیک باحیا اور کم سخن خاتون تھیں میں جب بھی ان کے کوارٹر پر جاتا بڑے اخلاق سے پیش آتیں۔ اور بغیر چائے پلائے آنے نہیں دیتی تھیں۔ خالد محمود صاحب کی دوست نوازی میں ان کی بیگم کا تعاون ہمیشہ حوصلہ افزا رہا، افسوس اب وہ اس دنیا میں نہیں۔ مرحومہ کا انتقال بھوپال میں ۸؍ فروری 1997ء کو ہوا۔ عید سے ایک دن پہلے اپنی بہن کے گھر سے تقریباً دس بجے رات میں واپس آئیں ذرا تکان محسوس ہوئی لیٹ گئیں۔ سر میں درد محسوس ہوا اور اچانک خون کا دباؤ بڑھنے سے برین ہمیرج ہو گیا دو گھنٹے کے اندر جاں بحق ہو گئیں۔ رمضان المبارک کے آخری جمعہ اور سنیچر کی درمیانی شب میں جو شب قدر تھی انتقال ہوا۔ اور عیدالفطر کے عین ایک روز قبل بعد نماز ظہر تجہیز و تکفین ہوئی۔ بہت ہی مبارک مہینہ اور مبارک دن پایا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

خالد محمود صاحب پر ان کی جدائی کا بہت اثر ہے اب تک جب بھی خیال آتا ہے مغموم ہو جاتے ہیں اس حادثے کے علاوہ ہر طرح کا آرام آسائش اور سکون میسر ہے بقول شاعر

ساری اقدار میسر ہیں غریبی کے سوا
سب کچھ اللہ نے دے رکھا ہے بیوی کے سوا

○

رہبر جونپوری
۴۲۴۔این تھری۔اے سیکٹر
گووندپورہ۔ بھیل۔ بھوپال

ایک سچا دوست ایک مخلص انسان

آج دنیا جس راہ پر گامزن ہے اور روز و شب کے حالات ہمارے سامنے جو منظر نامہ پیش کر رہے ہیں اسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ انسانی اقدار، تہذیب و شرافت، اخلاص و اخلاق ہمارے درمیان سے اٹھتے جارہے ہیں۔ اسکی جگہ مصلحت پسندی، خود غرضی، خود پرستی اور بے حسی نے لے لی ہے۔ ایسے ماحول میں اگر کوئی بے لوث، مخلص اور شریف النفس انسان مل جائے تو نہ صرف دلی خوشی محسوس ہوتی ہے بلکہ اس کی رفاقت اور قربت باعث فخر ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہے۔ ان سے میں کئی دہائیوں سے غائبانہ متعارف تھا اور ان کے افکار و خیالات سے نظم اور نثر دونوں شکلوں میں رسائل و تصنیفات کے ذریعہ واقف تھا نیز انہیں بطور ادیب و شاعر پسند کرتا تھا تاہم باقاعدہ ملاقات کا شرف تقریباً دس بارہ سال قبل سرونج کے ایک مشاعرے میں حاصل ہوا جہاں ان کی زبانی ان کے اشعار سننے کا موقع ملا۔ یہاں یہ کہنا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر خالد محمود کا متغیرانہ مزاج اپنی اختراعی روش پر بڑے پر لطف انداز میں کاربند ہے۔ نثر ہو یا نظم ان کے سوچنے اور اظہار کرنے کا ڈھنگ حیرت انگیز طور پر مختلف اور منفرد ہوتا ہے جو قاری یا سامع کو چونکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ان کے مخصوص زاویے کی نظموں اور غزلوں میں آج کے جذبات و احساسات نیز تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور بدلتے ہوئے رشتوں کی بہترین ترجمانی کی گئی ہے۔ ایک شاعر یا ادیب اپنا منفرد لہجہ اپنی الگ شناخت بڑی مشکل اور بڑی ریاضت کے بعد قائم کرپاتا ہے۔ ورنہ عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ لوگ دوسروں کی فکر اور اختراع سے ہی استفادہ کرتے ہیں اور تا عمر اپنا رنگ و آہنگ قائم کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود کی یہ

ذہانت اور ریاضت ہے کہ انہوں نے بہت جلد اس میدان کو سر کر لیا ہے۔ اور وہ نظم و نثر دونوں جگہ بھیڑ سے الگ کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کی تازہ تصنیف اردو سفر ناموں کا تنقیدی جائزہ اردو ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے اور میرے مندرجہ بالا خیالات کا مظہر ہے۔ یہ چند سطور جو میں نے ان کے شاعرانہ اور ادیبانہ رویئے کے سلسلے میں لکھی ہیں صرف مثال کے لئے لکھی ہیں ڈاکٹر خالد محمود کی شاعری اور نثر نگاری پر لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے میرا تو صرف ان کی باغ و بہار اور پر خلوص شخصیت کا ذکر ہی مقصد خاص ہے۔

سرونج کے مشاعرے کے بعد جسکا ذکر اوپر آچکا ہے تمام شعراء کا جہاں قیام تھا ڈاکٹر خالد محمود اور سرونج کے دوسرے شعراء و ادباء مثلاً جناب شاہد میر، ڈاکٹر سیفی سرونجی، آصف سرونجی اور محمود ملک وغیرہ تشریف لائے اور وہاں کافی دیر تک ادبی و شعری گفتگو ہوتی رہی۔ اس گفتگو کے دوران یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ ڈاکٹر خالد محمود ایک اچھے اور منفرد لب و لہجہ کے شاعر کے ساتھ ساتھ ایک بامروت اور پر خلوص انسان بھی ہیں۔ شرافت ذات اور بزلہ سنجی کے ساتھ ساتھ نرم گفتاری اور ادبی ذوق گویا انہیں ورثے میں ملا ہے۔ بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں سے محبت و شفقت ان کی جاذب نظر شخصیت کا حصہ ہے۔ یہی وہ اوصاف ہیں جنکی بنا پر وہ اپنے احباب میں بے حد مقبول ہیں اور قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ وہ جب بھی بھوپال تشریف لاتے ہیں اپنے تمام ملنے والوں اور دوستوں سے رابطہ قائم رکھتے ہیں نیز ادبی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں۔ دہلی میں خالد محمود کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ انہوں نے اپنی محنت و کاوش سے نہ صرف خود کو بہتر سے بہتر زیور تعلیم سے آراستہ کیا ہے بلکہ وہ دہلی کی ایک مرکزی یونیورسٹی میں شعبہ اردو سے وابستہ ہیں اور درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ادبی خدمات بھی انجام دے رہے ہیں۔ ان کی شعری و نثری کئی تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں۔

ڈاکٹر خالد محمود کے بھوپال کے دوستوں کا جب بھی دہلی جانا ہوتا ہے وہ ان سے ملنا اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ بھوپال میں جناب رشید انجم، اقبال مسعود، محمد نعمان خاں وغیرہ انکے بے تکلف دوستوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ یہ ان کی عالی ظرفی ہے کہ وہ مجھ احقر کو بھی اپنے مقربین میں شمار کرنے لگے ہیں۔

ڈاکٹر خالد محمود سے راہ و رسم کے بعد ایک مرتبہ جب میرا دہلی جانا ہوا تو میں،

ڈاکٹر بشیر بدر صاحب اور جناب اقبال بیدار ڈاکٹر خالد محمود سے ملنے ان کی رہائش گاہ پر گئے۔ ڈاکٹر خالد محمود نے اپنے شاندار سجے ہوئے ڈرائنگ ہال میں ہم لوگوں کا استقبال کیا اور اپنی پر لطف گفتگو سے محفل کو گرمائے رکھا۔ پھر دوپہر کے کھانے کا اہتمام بڑے خلوص سے کیا وہیں میری ملاقات ڈاکٹر سہیل فاروقی سے ہوئی۔ ڈاکٹر سہیل فاروقی بھی ضلع جونپور سے تعلق رکھتے ہیں اور میرے گاؤں کے قریب موضع صبر حد میں انکا آبائی مکان اور کاشت کی زمینیں وغیرہ ہیں۔ پہلی ملاقات ہی میں ان سے گہرے روابط کا احساس ہونے لگا۔ ڈاکٹر سہیل فاروقی سہ ماہی رسالہ جامعہ میں نائب مدیر کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور معروف شاعر وادیب بھی ہیں۔ ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ وہ نہایت منکسر مزاج اور ملنسار انسان ہیں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ اقبال بیدار کے دیرینہ دوستوں میں ہیں شام کو انہوں نے بھی اپنے یہاں دعوت کا اہتمام کیا اور بھوپال کے رفقاء کے علاوہ خالد محمود کے ساتھ دیگر مقامی دوستوں کو بھی مدعو کیا۔

ماہ ستمبر ۱۹۹۷ء کے اوائل میں ساون مشن دہلی کی جانب سے ایک طرحی کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس مشاعرے میں جناب عشرت قادری صاحب کو شرکت کرنی تھی۔ انہیں دنوں اپنے نئے شعری مجموعے "موج سراب" کی تقسیم کے سلسلے میں مجھے بھی دہلی جانا تھا۔ لہٰذا ہم لوگ دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔ ہم لوگوں کا قیام "مدیرہ فکرو آگہی" محترمہ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ کے یہاں نوئیڈا میں تھا۔ جب میری آمد کی خبر بھائی رفعت سروش صاحب کو ہوئی تو انہوں نے ازراہ خلوص مجھے بھی مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ لہٰذا مجھے اور عشرت بھائی کو مشاعرے میں شرکت کرنی تھی۔ اب طے یہ ہوا کہ ہم لوگ پہلے خالد محمود صاحب کے یہاں چلیں گے اور وہیں سے مشاعرے میں شرکت کے لئے روانہ ہونگے۔ لہٰذا میں اور عشرت بھائی خالد محمود صاحب کے یہاں جامعہ نگر پہنچے۔ دہلی آمد کی خبر انہیں کر دی گئی تھی اور ملاقات کا وقت بھی طے تھا۔ ہم لوگ جب ان کی رہائش گاہ پر پہنچے تو ڈاکٹر خالد محمود کی بیٹی فوزیہ آفرین نے ہمارا استقبال کیا اور بڑی عزت و احترام سے ہم لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مشروبات وغیرہ پیش کئے۔ برادرم ڈاکٹر سیفی سرونجی وہاں پہلے سے موجود تھے۔ اس مرتبہ اس بات کا شدت سے احساس ہوا اور دکھ ہوا کہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب کی اہلیہ محترمہ کی حیات میں جب ہم لوگ پہلی مرتبہ جامعہ نگر آئے تھے تو

اس گھر میں جو چہل پہل تھی وہ مفقود تھی گھر میں ایک عجیب سے سونے پن کا احساس ہو رہا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی ان کی شریک حیات کو موت نے اپنی آغوش میں لے لیا تھا اور وہ جنت نشیں ہو گئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈاکٹر خالد محمود بھی تشریف لے آئے اور بڑی بشاشت اور خندہ پیشانی سے ہم لوگوں سے مصافحہ کیا۔ انہوں نے ہر موقع پر اپنے دلی رنج و غم کو جو اہلیہ کی جدائی میں انہیں برداشت کرنے پڑے پس چشم چھپانے کی سعی ناکام کی اور محفل کو اپنی پر لطف باتوں سے قہقہہ زار بنائے رکھا تاہم ان کا اندرونی کرب دل کی گہرائیوں میں جھانکنے والی آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اور قدم قدم پر انکی شریک حیات کے نہ ہونے کا احساس دلاتا رہا۔ ہر مرتبہ کی طرح اس بار بھی ڈاکٹر خالد محمود نے بڑے اعلی پیمانے پر دوپہر کے کھانے کا اہتمام کیا جس میں بھوپال کے جناب عشرت قادری، منظر بھوپالی، ظفر صہبائی، ڈاکٹر سیفی سرونجی اور راقم الحروف کے علاوہ جامعہ کے بہت سے معروف و معتبر شعراء اور ادباء، دانشور اور صحافی شریک ہوے جن میں جناب شاہد علی خاں مدیر کتاب نما، ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، پروفیسر صغرا مہدی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر ظفر احمد نظامی، پروفیسر زبیر فاروقی، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، ڈاکٹر سہیل فاروقی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، پروفیسر شیث اعظمی وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مندرجہ بالا حضرات کی گفتگو سے ڈاکٹر خالد محمود سے ان کے تعلق خاطر اور بے پناہ محبت اور خلوص کا اندازہ ہو رہا تھا۔ دہلی کی یہ وہ قابل قدر ہستیاں تھیں جن کی کسی جلسے میں موجودگی جلسے کو باوقار بنانے کے لئے کافی ہوتی ہے۔

بہر حال کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ادبی شعری محفل کا آغاز ہوا جس کی صدارت جناب شاہد علی خاں نے فرمائی جس میں بھوپال و دہلی کے شعراء نے اپنی اپنی تخلیقات سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ اس محفل میں جن شعراء نے اپنا کلام پیش کیا انکے اسمائے گرامی ہیں۔ جناب عشرت قادری، پروفیسر ظفر احمد نظامی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر سہیل فاروقی، ڈاکٹر زبیر فاروقی، ڈاکٹر خالد محمود، جناب منظر بھوپالی، جناب ظفر صہبائی، ڈاکٹر سیفی سرونجی اور رقم الحروف رہبر جونپوری۔

اس موقع پر ڈاکٹر خالد محمود کی تجویز پر میرے شعری مجموعہ موج سراب کی رسم اجراء عالی جناب شاہد علی خانصاحب کے دست مبارک سے انجام پائی جو میرے لئے بڑی

خوشی اور فخر کی بات ہے۔ عام طور پر شعراء اپنی تصنیفات کی رسم اجراء کسی وزیر یا کسی سیاسی رہنما سے کراتے ہیں مگر میں نے ہمیشہ ادبی شخصیتوں کو ترجیح دی ہے۔ ''آوازۂ زنجیر'' کی رسم اجراء بھوپال میں جناب وقار فاطمی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی تھی۔ اور دہلی میں جناب شاہد علی خاں مدیر کتاب نما کے ہاتھوں موج سراب کی رسم اجراء کی تکمیل مجھے ہمیشہ محظوظ رکھے گی۔ اسی موقع پر سہ ماہی انتساب کے ظفر گورکھپوری نمبر کی رسم رونمائی پروفیسر اختر الواسع کے دست مبارک سے انجام پذیر ہوئی۔

ڈاکٹر خالد محمود کی رہائش گاہ، ۱۰۲۔ جامعہ انکلیو، جامعہ نگر میں یہ محفل تقریباً پانچ بجے شام تک آراستہ رہی۔ وہاں قیام کے دوران انہوں نے قدم قدم پر وہاں شریک تمام احباب و صاحبان کا بھرپور خیال رکھا اور خ... خواہ تواضع کی۔ ان کا یہ اخلاق، یہ شرافت، یہ تہذیبی اقدار اور ادب دوستی اور دوست نوازی انہیں ہمیشہ احباب کے دلوں میں آباد رکھے گی اور ان کی قدر و منزلت میں اضافہ کا باعث بنتی رہے گی انشاءاللہ۔

○

محمد توفیق خاں
تلیا۔ سرونج، ایم پی (۴۶۴۲۲۸)

خالد محمود کی شخصیت اور شاعری

کسی زمانے میں سرونج ایک اچھے خاصے شہر کی حیثیت رکھتا تھا اس کی تجارت اور زراعت کی شہرت پورے ہندوستان میں تھی صوبہ مالوہ کا ایک بڑا شہر مانا جاتا تھا۔ جس طرح آج ہندوستان کئی صوبوں میں منقسم ہے اسی طرح قدیم زمانے میں بھی صوبے بنے ہوئے تھے اس دور کے سرونج کی وسعت کا صرف پرانے کھنڈرات دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے یا کچھ باقی بچی ہوئی چند حویلیوں کو دیکھ کر جن کی بلندیاں آج بھی آسمان کو چھو رہی ہیں۔ یا ان پرانے مندروں، مسجدروں مقبروں اور ان کے کتبوں سے، لیکن نہ معلوم کیوں اس شہر کا زوال ہوتا چلا گیا۔ ۱۸۱۷ء میں ریاست ٹونک کے زیر نگیں آتے ہوئے بھی سرونج کی حیثیت ایک ضلع کی تھی مگر سنہ ۴۸۔۴۹ء تک آتے آتے یہ صرف نام کا ہی ضلع رہ گیا تھا جس کے آخری کلکٹر برج ناتھ پنچولی تھے جنہوں نے بحیثیت کلکٹر مجھے میری بنائی ہوئی ایک تصویر پر خوش ہو کر سرٹیفکیٹ عنایت کیا تھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے بعد یہ ضلع بھی ختم ہو گیا اور سرونج گمنامی میں چلا گیا جب شہر اتنا بڑا تھا تو ظاہر ہے کہ اس میں بڑے بڑے ادیب، فنکار، کوی، اور شاعر بھی پیدا ہوئے ہونگے لیکن چند کو چھوڑ کر کسی کا کلام بھی نہیں ملتا۔ سید مرتضیٰ صاحب نظرؔ نصیر آبادی نے جن کا وطن ثانی سرونج تھا وکالت کے ساتھ ساتھ ۱۹۳۶ء میں سرونج کی ایک تاریخ لکھ کر شائع کی تھی جس کا نام "آثار مالوہ" ہے نظر صاحب نے اپنی ان تھک کاوشوں سے سرونج سے متعلق تاریخی ریکارڈ یکجا کیا ہے جس میں سرونج کے جغرافیائی حالات اور کچھ پرانے خاندانوں، جاگیرداروں، حویلیوں، مندروں، مسجدوں، مقبروں یا نظام حکومت سے متعلق ذکر ہے لیکن کسی ادیب، کوی، یا شاعر سے متعلق کوئی الگ باب قائم نہیں ہے جبکہ وہ خود بھی شاعر تھے۔ ان کے کلام کا ایک قلمی نسخہ

جس کا نام ''تجلیات نظر'' ہے آج تک طباعت سے مزین ہو کر منظر عام پر نہیں آیا انہوں نے بڑے بڑے بزرگوں، صوفیوں، اور حاکموں کے مدفنوں اور مقبروں کی نشان دہی آثار مالوہ میں ضرور کی ہے کچھ سرونج کے شعرا اور کچھ باہر سے آئے ہوئے حاکموں کی شاعری اور مشاعروں کے ذوق کا کہیں کہیں تذکرہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس قسم کا ریکارڈ دستیاب ہی نہ ہو سکا ہوں اس زمانے میں سرونج میں کتابت اور طباعت کی کمی کی وجہ سے کوئی ریکارڈ کتابی شکل میں شائع نہ ہو سکا کچھ روز کی بات ہے مجھ سے سرونج کی ایک بزرگ خاتون نے کہا ''بہت پہلے میرے پاس کسی شاعر کی ایک بیاض تھی'' میں نے اسے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی کئی تقاضوں کہ بعد بھی نہ ملنے پر میں خود ان کی خدمت میں پہنچا تلاش کرنے پر پرانے کباڑے کے صندوق میں بیاض تو مل گئی لیکن چوہوں دیمکوں اور جھینگروں نے بالکل برادہ کر دیا تھا۔ افسوس کچھ حاصل نہیں ہوا۔ کچھ قلمی نسخے ضرور دیکھنے کو ملے لیکن وہ بھی زیادہ پرانے نہیں تھے پھر بھی سرونج کی ادبی تاریخ کے لئے کیمیا ہیں کچھ قلمی مجموعے جو مثنویوں اور نظموں سے بھرپور ہیں خواجہ محمدؐ صالح صاحب صدیقی جو مغلیہ دور حکومت میں وزارت مالوہ کے عہدے پر فائز تھے جن کا مقبرہ آج بھی محلہ رکاب گنج سرونج میں موجود ہے اور جس کا ذکر آثار مالوہ میں صفحہ ۳۳۳ پر ہے ان کی نسل کے پوتے میاں جی۔ مظہر الدین صاحب مظہرؔی نے لکھی ہیں یہ قلمی نسخے آج بھی انہی کے نسل کے حکیم صدیق صاحب کے پاس محفوظ ہیں جن کو میں نے خود دیکھا ہے۔ ڈاکٹر مختار شمیم نے بھی اپنی کتاب ''ریاست ٹونک اور اردو شاعری'' میں مظہرؔی کے کلام پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کو ابھی ۱۱۵ سال سے زیادہ کا عرصہ نہیں ہوا ہو گا۔ اسی طرح ایک قلمی مجموعہ کلام شیخ نذیر احمدؐ صاحب نذیر کا میری نظر سے گزرا جو موصوف کے صاحبزادے کے پاس ہے ایک گمنام شاعر مرمت خاں کا نام بھی لیا جاتا ہے جس کا ذکر میرؔ عرفانی نے ۶۲۔۱۹۶۱ء میں گورنمنٹ ہائر سیکنڈری اسکول سرونج کے میگزین میں تفصیل سے کیا ہے۔

سرونج کے ایک اور شاعر پنڈت جانکی پرشاد مصرا پیکاںؔ کی کتابیں (۱) ''ویدک دھرم'' (۲) ''ککڑوں کوں'' (۳) ''گانے گاؤ تو گول سے بچو'' اردو میں شائع ہوئیں ان کی آخر الذکر دو کتابیں ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکیں۔ پیکاںؔ اردو کے ساتھ فارسی کے بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کی کتاب ''ویدک دھرم'' جو اس وقت میرے سامنے ہے ''گیتا پرنٹنگ

ور کس دہلی"میں باہتمام جیوتی پرساد گپتا طبع ہوئی ہے۔

سرونج کے اور بھی ادیبوں اور شاعروں کے قلمی نسخے ضرور ہونگے لیکن ان کے ورثانے یا جن کو وہ دستیاب ہوئے ان کی حفاظت نہیں کی یا پھر دیمک کے نذر ہو گئے یا کم علمی اور غربت کے تھپیڑوں کے بیچ ضائع ہو گئے جو کچھ بھی ہوا ہو مگر عوام تک نہ پہنچ سکے۔

یہ سب تو ہوا لیکن کسی بھی جگہ کی زمین اپنا خواص نہیں چھوڑتی اس سرزمین میں شاعر اور ادیب نوضرور پیدا ہوتے رہے ہیں جن کے نام ابھر کر عوام کے سامنے نہ آ سکے۔ طباعت کے دشواری کی وجہ سے باہر کی دنیا بھی ان سے نا آشنا رہی۔ اب نئی نسل نے تحقیق شروع کی ہے تو کچھ پرانا اور نیا مواد زبانی یا کاغذی پرزوں پر ملتا جا رہا ہے اس کو ہی ہم سرونج کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں، نہ معلوم کتنے سرونج کے ستارے گمنامی میں ڈوب گئے، اب جب سے چھپائی کی سہولتیں، مہیا ہوئیں ہیں تو عوام تک ان کے کلام کی رسائی ہوتی جا رہی ہے۔ اس بحث کو میں زیادہ طول نہیں دینا چاہتا یہاں مجھے صرف سرونج کے روشن ستاروں میں سے ایک پر ہی اظہار خیال کرنا ہے اور وہ ہے ڈاکٹر خالد محمود۔

ایک چراغ کی معمولی لو بھی معمولی نہیں ہوتی ایک اندھیرا ہی نہیں کئی اندھیرے بھی جمع ہو کر اس لو کے اجالے پر غالب ہونا چاہیں تو بھی نہیں ہو سکتے وہ ان اندھیروں کے بیچ بڑی آن بان سے اجالا پھیلائے رہتی ہے۔ خالد محمود جس کا نام ہے اس نے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ اپنے وطن کی شان کو بھی بڑھایا ہے۔ یہ ان چند شمع فروزاں میں سے ہے جس کے دم سے سرونج کا ڈوبا ہوا نام ایک بار پھر ہند و پاک کی ادبی دنیا میں روشن ہو رہا ہے۔ یہ غربت سے نکلا ستارہ وطن سے دور بھی اپنے وطن سرونج کا نام روشن کئے ہوئے ہے۔

یہاں تھوڑا سا حوالہ خالد محمود کے آباؤ اجداد کا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے مفصل تحریری ریکارڈ تو دستیاب نہیں ہو سکا لیکن بزرگ لوگوں کی زبانی یا خالد محمود کے والد احمد شاہ خاں صاحب عرف عبید خاں مرحوم کی زبانی کچھ حالات علم میں آئے ہیں۔ یا آثار مالوہ میں جو سرونج کی ایک تاریخ ہے تھوڑے بہت حالات ملتے ہیں اس میں نادر شاہ خاں صاحب عامل (کلکٹر) سرونج کا ذکر ہے جو خالد محمود کے آباؤ اجداد میں سے تھے اور نواب امیر الدولہ والئی ریاست ٹونک کے معتمد خاص تھے اس زمانے میں جبکہ افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ عامل بنانے میں بہت ہی احتیاط کے ساتھ کام لیا جاتا تھا۔ صاحبزادہ نادر شاہ خاں شریف ایماندار اور بہادر

شخصیت کے مالک تھے کہ انہیں نواب صاحب نے نہ صرف سرونج پرگنہ کا عامل (کلکٹر) ہی بنادیا بلکہ اپنی صاحبزادی گلشن بیگم سے شادی کر کے داماد بھی بنالیا۔

وکیل احمد، مرتضے صاحب نظر نے "آثار مالوہ" کی فہرست ناظمان پرگنہ اے ۲ نمبر شمار (۷) میں تحریر فرمایا ہے۔

"صاحبزادے نادر شاہ ۱۸۴۱ء سے ۱۸۴۴ء تک ۴ سال سرونج کے عامل رہے گلشن بیگم صاحبہ دختر نواب امیر والدولہ بہادر انکو منسوب تھیں ان کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔دوسری زوجہ سے حیدر شاہ خاں ہوئے جن کے بیٹے حضرت شاہ خاں سرونج میں بقید حیات ہیں۔نادر شاہ خاں کا انتقال ۱۲۷۹ھ میں ہوا"

نادر شاہ خاں نے سرونج کے عامل ہونے کے زمانے میں اپنی زمین و جائیداد کچھ نہیں بنائی حالانکہ وہ کیا نہیں کر سکتے تھے لیکن ان کی صوفیانہ اور بزرگانہ شخصیت نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی۔اسی طرح ان کے صاحبزادہ حیدر شاہ خاں نے اپنی زندگی گزاری انہوں نے بھی کوئی جائداد نہیں چھوڑی بقول ان کے خاندان والوں کے حیدر شاہ کا انتقال ٹونک میں ہوا۔حیدر شاہ خاں کے ایک لڑکے حضرت شاہ خاں کو میں نے بھی اپنے بچپن میں دیکھا ہے وہ بھی اپنی حلال و جائز کمائی سے اپنی اور بچوں کی کفالت کرتے تھے ان کا انتقال ۱۹۴۱ء میں سرونج میں ہوا۔حضرت شاہ خاں کے دو لڑکے تھے ایک محمد شاہ خاں دوسرے احمد شاہ خاں عرف عبید میاں محمد شاہ خاں کا انتقال ۱۹۸۷ء میں سرونج میں ہوا اور احمد شاہ خاں کا انتقال ۶/ دسمبر ۱۹۹۳ء کو بھوپال میں ہوا۔احمد شاہ خاں مرحوم کے دو لڑکے ہیں ایک خالد جو آج ڈاکٹر خالد محمود کے نام سے جانا جاتا ہے دوسرا آصف محمود جوزیر تعلیم ہے احمد شاہ خاں عرف عبید میاں مرحوم صوفی صفت انسان تھے انہوں نے ساری زندگی بزرگوں، ولیوں اور خانقاہوں میں انکی صحبتوں میں رہ کر گزاری یہی وجہ تھی کہ وہ بہت رقیق القلب اور ولی صفت انسان تھے اور ولیوں جیسی خوبیوں کے مالک تھے۔مجھ پر بہت زیادہ شفقت فرماتے تھے کبھی کبھی غریب خانے پر تشریف لے آتے یہ ان کی مجھ پر والہانہ محبت کا ثبوت تھا۔دوران گفتگو اکثر بزرگوں کے واقعات سنایا کرتے تھے۔حضرت مفتی عبدالمجید صاحب مرحوم مغفور کی صحبت میں تو میں نے خود انہیں بارہا دیکھا ہے۔حضرت مفتی صاحب کی ان پر شفقت اور محبت کا یہی منظر میں نے دیکھا ہے۔اس کے علاوہ نہ معلوم

کن کن بزرگوں کے واقعات وہ مجھے سنایا کرتے تھے مگر افسوس میں نے اسی وقت ان سب واقعات کو قلمبند نہیں کیا جس کا آج پچھتاوا ہے۔ میں جہاں تک سمجھ سکا ہوں یہ سارا روحانی عکس حضرت قبلہ مفتی صاحب کی خدمت کا فیضان تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عبید میاں میں بھی درویش صفت بزرگوں کی خوبیاں پیدا ہو گئیں تھیں ان کا رشتہ دنیا سے کم اپنے مالک سے زیادہ تھا روحانی صفات نے ان کی شخصیت کو مزید پر کشش بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی جب کبھی خالد محمود کے پاس دہلی جاتے تو پورا جامعہ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتا کبھی یوسف پاپا ملنے چلے آرہے ہیں کبھی خلیل اور شریف کبھی وہاج الدین علوی کبھی کرمانی صاحب کبھی تصرف صاحب کبھی رشید صاحب کبھی مظفر حنفی صاحب غرض کہ ہر چھوٹا بڑا انکا ادب احترام کرتا۔ دہلی میں قیام کے دوران کچھ لوگ تو مستقل ان کے ساتھ رہتے تھے یہ لوگ ان کا احترام کرتے اور ان سے محبت بھی کرتے تھے عبید میاں اس نیک سیرت ہستی کا نام تھا جس نے اپنے عزیزوں دوستوں اور دوسرے لوگوں کو کبھی اس بات کا علم نہ ہونے دیا کہ وہ کس حال میں ہیں اور کس طرح اپنے گھر کی کفالت کر رہے ہیں اللہ پر مکمل اور پختہ یقین رکھتے تھے ان کا ایمان تھا کہ وہ جو کریگا اچھا کریگا ہمیشہ اور ہر حال میں صبر و شکر اس کی حضور میں بجالاتے رہے معاشی طور پر برے حالات میں بھی انہوں نے دوسروں کے ساتھ بھلائی اور مدد کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی ان کے پاس جو بھی ہوا وہ ضرورت مندوں کی نذر کر دیا اور سامنے والے کو کبھی یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ ہماری حالت تجھ سے بھی زیادہ بدتر ہے تواضع مہمان نوازی خدمت خلق اور ہمدردی میں وہ ہمیشہ پیش پیش ہے ان کے چہرے ہی سے بزرگی جھلکتی تھی ان کو دیکھ کر لوگ خود بخود متوجہ ہو جاتے تھے۔ عبید میاں کو یہ سب چیزیں ورثہ میں ہی ملی تھی۔ وہ اپنے ہونہار بچوں کے لئے کیا نہیں کرنا چاہتے تھے اور کون سا باپ ایسا ہوگا جو اپنی اولاد کے لئے اس کی پرورش اور تعلیم کے لئے کچھ نہیں کرنا چاہتا لیکن ان کے پاس بجز دعاؤں کے اور کچھ اثاثہ تھا ہی نہیں اس کے باوجود وہ دل کے غنی اور نہایت سخی انسان تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے رمضان کا مہینہ اور گرمی اپنے پورے شباب پر تھی سامنے سڑک پر ایک صاحب پسینے میں شرابور ماتھے سے پسینہ پوچھتے ہوئے ایک جھولا کاندھے پر لٹکائے اسی سمت جا رہے تھے جدھر میں جا رہا تھا غور سے دیکھا تو وہ سیفیہ کالج کے پرنسپل شکور صاحب تھے جن سے میرے دیرینہ

تعلقات ہیں میں نے حیرت سے ان سے پوچھا آپ اور یہاں ایسی گرمی میں انہوں فرمایا میں جامع مسجد جانا چاہتا ہوں میرا روزہ ہے اور کہیں نہیں جاؤنگا۔ یہاں آنے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا مجھے خالد محمود کے والد صاحب عبید میاں سے ملنا ہے۔ یہ تھی عبید میاں کی ہر دل عزیزی۔

جو دریا دلی فیاضی اور فقیرانہ صفت مرحوم عبید میاں کی فطرت میں تھی وہی فیاضی دریا دلی اور فراخ دلی ان کے دونوں بچوں ڈاکٹر خالد محمود اور آصف محمود میں بھی بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔

خالد محمود کا ددھیال جہاں صوفی صفت سید ھے سچے نیک اور ہمدرد پٹھانوں میں سے ہے تو وہیں ان کا ننہال بھی کپتان خاندان پٹھان خاندان سے تعلق رکھتا ہے ان کے پرنانا کپتان ایاز خاں صاحب کو راقم الحروف نے اپنے بچپن میں بہت ضعیفی حالت میں دیکھا تھا ان کے بڑے صاحبزادے کپتان الیاس خاں صاحب جو خالد محمود کے نانا تھے اور جن کا انتقال ۱۹۷۷ء میں سرونج میں ہوا سارے علاقے میں مشہور و مقبول تھے ان کی ہمدردیاں اور سخاوت کے چرچے لوگوں کی زبان سے آج بھی سنے جاتے ہیں۔ خالد محمود کو بھی دریادلی مہمان نوازی، سخاوت، اور دوست نوازی کا جذبہ ددھیال اور ننہال دونوں سے وراثت میں ملا ہے۔ اکثر لوگ دنیا میں ایسے ہوتے ہیں جو دعوتیں کھا کر خوش ہوتے ہیں لیکن خالد محمود کھلا کر خوش ہوتے ہیں جب تک ان کے دستر خوان پر دو چار دوست یا کوئی مہمان نہ ہو ان سے کھانا ہی نہیں کھایا جاتا۔

خالد محمود نے ہائر سیکنڈری تک پرائیویٹ طریقے سے تعلیم حاصل کی مگر سرونج کے مدرسہ ریاض المدارس میں باقاعدہ پڑھا ہے۔ ان کے زمانے میں یہ مدرسہ عربی فارسی اور علم دین کا گہوارہ تھا۔ خالد محمود کا بچپن میرے سامنے گزرا ہے اس نے اپنی تعلیم کے دوران جن صعوبتوں اور مصیبتوں کا سامنا کیا ہے وہ صرف اسی کا حوصلہ تھا ورنہ اچھے سے اچھا حوصلے مند انسان بھی ٹوٹ سکتا تھا بکھر سکتا تھا۔ خالد کا ہی حوصلہ تھا کہ اس نے اپنا حوصلہ برقرار رکھا اور مسلسل جدوجہد کرتا رہا۔ مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب خالد نے ۱۹۶۵ء میں ہائیر سیکنڈری کا امتحان دیا تھا میں اس زمانے میں ہائیر سیکنڈری اسکول سرونج کے اسٹاف میں ہی تھا اس وقت میری ڈیوٹی اسی روم میں لگی جہاں خالد محمود امتحان دے رہے تھے وہاں میں

نے یہی دیکھا کہ خالد محمود پرچہ دیتے وقت اتنے منہمک تھے کہ انہیں گرد و پیش کا کچھ ہوش نہ تھا۔ میں ان کی ہمت اور خود اعتمادی دیکھ کر دل ہی دل میں داد دیتا رہا۔ ۱۹۶۵ء میں ہی اس ہونہار طالب علم نے بھوپال پہنچ کر پہلے حمیدیہ گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے کر بی اے سال اول پاس کیا پھر سیفیہ کالج میں داخل ہو کر بی اے، ایم اے اور بی ایڈ کیا۔ سیفیہ کالج میں خالد محمود کا تعلق عبدالقوی دسنوی صاحب جیسے مثالی استاد سے قائم ہوا جو اپنے شاگردوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی کرتے تھے دسنوی صاحب نے اپنے ہونہار طالب علم خالد محمود کی بڑی حوصلہ افزائی کی وہ خالد سے خوش بھی تھے اور محبت بھی کرتے تھے اور شفقت بھی فرماتے تھے پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"۱۹۶۵ء میں جب انہوں نے (خالد محمود نے) یہاں داخلہ لیا تو بہت جلد اپنے ساتھی طلبہ اور اساتذہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو گئے یہ پہلی ہی نظر میں سیدھے سادے متوسط گھرانے کے نمائندہ، مہذب خوش اخلاق نیک عادات کے حامل دکھائی دیئے۔ پھر کچھ ہی دنوں میں وہ اپنی ذہانت، ذکاوت اور صلاحیت کا سکہ دلوں پر بٹھانے میں کامیاب ہوتے نظر آئے اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ کسی اچھے ادارے کو ایسے ہی طالب علم کی تلاش رہتی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں، کسی ادارے کو اگر ایسے طالب علم مل جائیں تو پھر اس کی نیک نامی کا ایک دنیا میں شہرہ ہو جائے اور ایک زمانہ اس ادارے کی عظمتوں کا معترف ہو جائے۔"

آج خالد محمود کے نام کی شہرت اور ان کی مقبولیت اس بات کا ثبوت ہے کہ ان میں ترقی کرنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہی جذبہ اور اسی ہمت کی وجہ سے وہ سیفیہ کالج کے ہر دل عزیز طالب علموں میں شمار کئے جاتے تھے یہیں سے ان کی شاعرانہ صلاحیتیں بھی اجاگر ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔

یوں تو ادبی ذوق خالد میں بچپن سے ہی تھا ۱۹۶۳ء میں ہی مختار شمیم اور خالد محمود ایک قلمی پرچے "راہی" کے کئی شمارے سرونج سے نکال چکے تھے۔ ان پرچوں کو پڑھ کر اور ان کے ادارئے اور تحریریں پڑھنے سے ہی ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ سیفیہ کالج میں خالد محمود نے اپنی شاعری اور اپنی ادبی صلاحیتوں سے بھوپال کے پورے ادبی حلقوں میں بہت جلد اپنی پہچان بنالی تھی اسی زمانے میں ان کی ایک نظم "نذر سیفیہ" بہت مشہور ہوئی ایک طویل نظم

تھی جس میں سیفیہ کالج اور اس کے اساتذہ اور خاص طلبہ کا دلچسپ اور معنی خیز انداز میں ذکر کیا گیا تھا۔ یہ نظم بھوپال کے اخبار "الحمراء" میں بار بار شائع ہوئی اسی زمانے میں ان کی ایک اور ـم "پتھر" بہت مشہور و مقبول ہوئی اس کے علاوہ رومانی نظمیں خاص طور سے پسند کی جاتی تھیں ان نظموں کے وسیلے سے خالد محمود بحیثیت شاعر متعارف ہوئے اور ان کی شاعری کی شہرت عوام و خواص میں اتنی ہوئی کہ جب بھی سیفیہ کالج میں کوئی جلسہ ہوتا تو خالد محمود کی تلاش ہوتی پھر ان سے نذر سیفیہ کی فرمائش ضرور کی جاتی یہ نظم سو اشعار پر مشتمل ہے۔ اسی نظم کی بدولت سیفیہ ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری فخر و بھائی اس قدر متاثر ہوئے کہ B . Ed. کے بعد فخر و بھائی نے اس ہونہار طالب علم خالد محمود کو حبیبیہ اسکول سرونج میں مدرس بنا کر بھیج دیا۔ بانی سیفیہ کالج و حبیبیہ اسکول ملا سجاد حسین اور ان کے فرزند فخر و بھائی سے میرے دیرینہ تعلقات رہے ہیں چنانچہ حبیبیہ اسکول میں خود میں بھی خالد محمود کی صلاحیتوں کا خاموشی سے جائزہ لیتا رہا۔ فخر و بھائی خالد محمود کے نام سے اور ان کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف تھے ان سے خوش بھی تھے۔ ایک مرتبہ فخر و بھائی نے جو مجھ سے حبیبیہ اسکول سرونج سے متعلق معلومات کیا کرتے تھے اس کا اظہار بھی کیا اور کہا کہ سرونج کے لڑکوں میں کیا خالد محمود جیسے باصلاحیت اور لڑکے بھی ہیں" یہ ایک بڑا Camplimnt تھا۔ خالد محمود فخر و بھائی کی پیشکش اور اپنے حالات سے مجبور ہو کر بھوپال سے سرونج آ تو گئے مگر انہیں پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک تھا اور ابھی ایم اے مکمل نہیں ہوا تھا چنانچہ ۱۹۷۴ء میں واپس بھوپال چلے گئے۔ فخر و بھائی نے اپنے باصلاحیت خالد محمود کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور سیفیہ کالج میں ہی سائنس کے شعبے میں اسٹور کیپر بنا دیا کالج میں ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے پرنسپل صاحب اور صدر شعبہ اردو دسنوی صاحب نے فخر و بھائی کی اجازت سے ایم اے (اردو) اور بی ایڈ کے کلاسیں بھی خالد محمود کو دلائیں۔ غرض یہ کہ خالد محمود دن بدن ترقی کی منزلیں طے کرتے رہے اب ان کی تخلیقات مقامی اخبارات کے علاوہ ملک کے دوسرے رسائل میں بھی شائع ہونے لگیں۔ پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب جسے استاد پرنسپل شکور صاحب جیسے مشفق بزرگ اور اقبال مسعود، محمد نعمان، رشید انجم، کلیم عباسی سکندر غالب، ماجد حسین، خالد کمال، اور حسام الدین فاروقی جیسے دوستوں کے درمیان ان کی ادبی صلاحیتوں کو نکھرنے کا خوب موقع ملا۔ انہیں دنوں مظفر حنفی صاحب بھی شعبہ اردو

کے طالب علم کی حیثیت سے شعبہ کا نام روشن کر رہے تھے۔ ۱۹۷۶ء میں خالد محمود اپنی صلاحیتوں اور قابلیت کی وجہ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے منسلک ہو گئے۔ خالد محمود اپنے اخلاق اور دوست نوازی کی عادت کی وجہ سے بہت جلد پورے جامعہ ملیہ میں ہر دل عزیز شخصیت کے طور پر پہچانے جانے لگے دہلی میں خالد محمود کا مظفر حنفی سے واسطہ رہا۔ جنہوں نے خالد محمود کو ایک دوست ہی نہیں بلکہ اپنے ایک چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا جامعہ میں پروفیسر شمیم نکہتی، پروفیسر گوپی چند نارنگ پروفیسر صغرا مہدی، پروفیسر ظفر احمد نظامی، پروفیسر قاضی عبدالرحمٰن ہاشمی، جناب شاہد علی خاں اور پروفیسر حنیف کیفی پروفیسر عنوان چشتی ڈاکٹر سہیل فاروقی، ڈاکٹر وہاج الدین علوی، پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر شہپر رسول، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، پروفیسر زبیر فاروقی، عبدالحق خاں، محسن علی کرمانی، تصرف حسین صدیقی، سید ارشد علی، عبدالرشید خاں، خالد سیف اللہ، رضی احمد کمال، محمد سلیم اسرائیلی، تحسین برنی، شکیل اللہ خاں اور محمد یوسف پاپا وغیرہ کا بھی ساتھ ملا۔ ان تمام حضرات کی شفقت دوستی خلوص اور محبت نے خالد محمود کو خالد محمود بنا دیا۔ یہ سب کچھ یوں ہی نہیں ہوا بلکہ اس کی وجہ خالد محمود کے وہ اخلاق و عادات دوستوں پر جان دینا اپنے بزرگوں کا احترام کرنا مہمانوں کی آؤ بھگت کرنا اپنے ہاتھوں سے کھانا بنانا بنا کر کھلانا اور اپنے پرائے سب کے کام آنا۔ ان سب خوبیوں کی وجہ سے ہی خالد محمود پر پورا جامعہ جان دیتا ہے یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر مظفر حنفی اور دوسرے احباب اپنی تمام تر مصروفیات کو چھوڑ خالد محمود کے ہمراہ سرونج آتے رہے آج بھی خالد محمود جامعہ ملیہ کی کسی شخصیت سے یہ درخواست کریں کہ آپ کو سرونج چلنا ہے تو وہ بہت سے کام چھوڑ کر خالد محمود کے ہمراہ ہو جائیں گے۔ یہ سب خالد محمود کے کردار اور حسن اخلاق و عمل کا اثر ہے۔

۱۹۸۹ء میں خالد محمود نے "اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ" کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پروفیسر مظفر حنفی صاحب کی نگرانی میں جامعہ سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اس مقالہ کو ۱۹۹۵ء میں مکتبہ جامعہ سے بڑے اہتمام کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا۔ سفر نامے سے خالد محمود کو بچپن سے ہی دلچسپی رہی ہے اور وہ خود بھی سفر کرتے رہے ہیں کشمیر سے کنیا کماری تک کئی سفر کیئے اس دوران اپنے ذہن میں سفر کی اہمیت اور سفر میں درپیش حالات کا گہری نظر سے مشاہدہ کرتے رہے یہی دلچسپ موضوع آگے چل کر پی ایچ ڈی کے

مقالے کی شکل میں سامنے آیا ہے۔ ۳۲۷ صفحات کی اس کتاب میں خالد محمود نے سفر اور اس کی اہمیت سفر کا فن، سفر نامے کی تعریف سفر نامے کی قسمیں اردو سفر نامے کے ابتدائی دور سے لیکر انیسویں صدی کے اختتام تک تمام باتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو دنیا میں اس کتاب کا ذکر بہت رہا اور اس کتاب پر دہلی اور یوپی اردو اکیڈمیوں سے انہیں انعامات بھی ملے۔ اور فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ سے اس کی اشاعت کے لے مالی تعاون ملا خالد محمود جیسی خوبصورت شاعری کرتے ہیں ویسی ہی اچھی وہ نثر بھی لکھتے ہیں اس بات کا ثبوت ان کے لکھے ہوئے وہ خوبصورت انشائے مضامین اور تبصرے ہیں جو ہندوستان سے شائع ہونے والے مختلف اخبارات اور رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔

خالد محمود کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۲ء میں ''سمندر آشنا'' کے نام سے مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔ شاعری میں وہ ہمیشہ محتاط رہے ہیں یعنی کم کہتے ہیں لیکن اچھا کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ''سمندر آشنا'' میں انہوں نے اپنی منتخب غزلیں شامل کیں ہیں۔ نئی نسل کے شعراء میں خالد محمود کا نام نمائندہ شعراء کی فہرست میں نمایاں ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی لکھتے ہیں۔

''نئی شاعری کا سب سے بڑا مسئلہ اظہار ذات سے وابستہ تصور کر لیا گیا ہے اس لئے ۱۹۶۰ء کے بعد شاعری سے شوق فرمانے والے حضرات عام طور پر ابلاغ کے نام سے اسی طرح بدکتے ہیں جس طرح کسی زمانے میں ترقی پسند شعراء رجعت پرستی کے الزام سے خوف کھاتے تھے اور یہ تصور اس حد تک عام ہو گیا ہے کہ جدیدیت کی اصطلاح ہی بعضوں کے نزدیک افہام و تفہیم کی نفی کے مترادف ہو گئی ہے۔ ایسے غبار آلود مطلع ادب سے پچھلے دس بارہ سال کے درمیان طلوع ہونیوالے ستاروں میں سے ایک کا نام خالد محمود ہے۔ بلا شبہ ان کی غزلیں اسی آشوب آگہی اور کرب ذات کا اظہار ہیں جس میں پوری جدید نسل مبتلا نظر آتی ہے لیکن اشعار کی تعمیر و تشکیل میں آہنگ اور تاثر کے ساتھ ساتھ مفہوم پر جتنا زور صرف کیا گیا ہے، تشبیہات استعارات اور لفظی تشکیلات میں جیسی معنی خیزی پیدا کی گئی ہے اسے ابہام سے دور کا بھی تعلق نہیں البتہ کہیں کہیں اس تخلیقی ابہام سے ضرور کام لیا گیا ہے جو شعر کے مفہوم میں وسعت اور تاثر میں کئی پرتیں پیدا کرتا ہے۔

ہر کمند ہوس سے باہر ہے
طائر جاں قفس سے باہر ہے

کوہ گراں کے سامنے تیشے کی کیا بساط
عہد جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی

آواز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھے
پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی

زمین پہ گرا تو یہ روشن ہوا
کہ خالدؔ ترے رازداروں میں تھا

آگے چل کر مظفر حنفی لکھتے ہیں۔

"پچھلے صفحات میں استاذی محترم قوی صاحب نے خالد محمود کی شخصیت اور کردار کے جن اساسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اپنے تجربے اور شاعر سے ذاتی تعلق کی بنا پر میں ان کی توثیق کرتا ہوں اور شہادت کے طور پر خالد کے یہ اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں۔

تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئنہ ہے اور میں ہوں

ہراک زخم پر دل نے آواز دی
مرے محترم مہرباں، آشنا

شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا مری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شے کی فراوانی نہیں ہے

ترے ساتھ چلنے کی عادت نہیں
ہماری نہ کر آزمائش ہوا

طبیعت میں خلوص، جانسوزی، غم سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ، ایثار کا مادہ اور بے

لوٹی نہ ہو تو یقین کیجئے شاعر ایسے چبھتے ہوئے شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ خود پسند اور خود نما احباب کے ساتھ نباہ کرنا، ان کی کج رویوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلنا ان کے دکھ درد میں برابر کی شرکت رکھنا اور اس کے ساتھ ایک درویشانہ قناعت سے کام لیکر زمانہ سازی سے دور رہنا خالد محمود کی فطرت ہے اور اس فطرت کی عکاسی نہ صرف پیش کردہ اشعار میں نظر آتی ہے بلکہ اس مجموعے کے تقریباً ہر صفحے پر جھلک مارتی دکھائی دے گی۔ ہمارے اکثر نئے شعراء کی تخلیقات ان کی شخصیت کے لئے حجاب کا کام کرتی ہیں، خالد محمود کے اشعار ان کی ذات اور شخصیت کی آئینہ داری کا فریضہ انجام دیتے ہیں"

جیسا کہ ڈاکٹر مظفر حنفی نے لکھا ہے کہ خالد محمود کی شاعری میں تشبیہات استعارات اور لفظی تشکیلات میں ایک معنی خیزی ملتی ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خالد محمود نے اپنی شاعری میں لفظوں کے انتخاب اور منفرد تشبیہات اور استعارات سے شعر کو ایک بلند درجہ عطا کر دیا ہے مثال کی طور پر کچھ شعر دیکھے۔

شکستہ سفینہ مسافر نڈھال
تلاطم، شب تار، بارش ہوا

رخسار و چشم و لب، گل و صہبا، حنا، شفق
دنیائے رنگ و بو میں تجارت لہو کی ہے

حسن کے کھیت جواں پھول شرابی جھیلیں
سینکڑوں عشق کے منظر سر کہسار ملے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر خالد محمود کی شخصیت اور ان کے مزاج میں ملن ساری، خوش اخلاقی، خودداری، انکساری، محبت، سخاوت اور مہمان نوازی کا جذبہ جو انہیں ورثہ میں ملا ہے بدرجہ اتم موجود ہے اور چونکہ شاعری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے اس لئے خالد محمود کی شاعری میں بھی ان کی پوری شخصیت واضح اور صاف دکھائی دیتی ہیں کچھ شعر ملاحظہ کیجئے۔

روٹھتا مجھ سے بھی لڑتا کوئی کاش ہوتا یہاں اپنا کوئی
جو بھی ہنس کر ملا اپنا سمجھا مجھ سا دیوانہ بھی ہوگا کوئی

سورج ہے سب کرتا دھرتا اس کا کوئی دوش نہیں اس پر مت الزام لگاؤ بے بس ہے بے چاری دھوپ
آنگن میں دھوپ تھی نہ فضا میں سرور تھا تم آگئے تو گھر کا مقدر بدل گیا

سوچتے ہیں سینکڑوں مالک بنا لینے کے بعد
ایک دامن سب کے آگے کس طرح پھیلائینگے
جیون تٹ پر ہار ملی ہے لیکن اس سے کیا گھبرائیں
آس کے پنچھی باندھ کے رکھیں آشاؤں کے دیپ جلائیں

فریب آرزو ہے باعث تسکین دل یارو اگر یہ بھی نہ ہو تو زندگی دشوار ہو جائے
میں اپنی شکستہ سی کشتی میں تھا مگر ہوگئے بدگماں آشنا

سیفی سرونجی کی کتاب ''روشن الاؤ'' کے دیباچے میں ڈاکٹر مختار شمیم لکھتے ہیں۔

''سرونج میں شعراء کی تعداد اقلیت در اقلیت میں ہے گوکہ علماء فضلا کی اکثریت ہے اور شعر و سخن سے ان کی دلچسپی ان کے مزاج کا خاصہ ہے۔ کیا یہ فضل ربانی نہیں ہے ناطق مالوی، اچھن میاں راز، دانش مالوی، راہی قاسمی، میر عرفانی کے بعد نئی نسل کے لئے یہ باور کیا جاتا تھا کہ اب شاید سرونج میں شعر و سخن کی سنگلاخ زمین میں مضامین نو کے انبار لگانے والے پیدا نہ ہونگے۔ لیکن وقار فاطمی، خالد محمود، مختار شمیم اور شاہد میر کی آواز سرونج کی فضاؤں میں گونجی اور ملک کے طول و عرض کو ناپنے لگی۔ سرونج کے مذکورہ سینئر شعرا نے حیرت و مسرت کا اظہار کیا اور ان نوجوانوں کی پذیرائی بھی کی یہی نہیں بزرگوں کی صف سے اسمٰعیل ذبیح اٹھے اور نئی نسل کے قدم بقدم چلنے لگے۔ اسی دوران دلکش ساگری نے بھوپال کو خیر باد کہا اور سرونج آکر بساط سخن جمائی کچھ تعمیری صورتوں نے دلکش اور روشن مستقبل کی خبر دی اور پہلی بار سرونج کے شعرا کے منتخب کلام کا مجموعہ شائع ہوا۔''

وقار فاطمی، مختار شمیم، خالد محمود، اور شاہد میر میں شاعرانہ صلاحیتیں تو بچپن سے ہی موجود تھیں اور اردو ادب سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا یہی جنون تھا کہ ۱۹۶۳ء میں مختار شمیم اور خالد محمود نے مل کر ایک قلمی رسالہ راہی کے نام سے جاری کیا جسکے شاید چھ سات شمارے ہی نکلے تھے کہ یہ لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے بھوپال چلے گئے ان شماروں کو دیکھ کر ہی ڈاکٹر خالد محمود اور ڈاکٹر مختار شمیم کی صلاحیتیں عیاں ہو چکیں تھیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ سرونج ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے اور سرونج میں ادبی سرگرمیاں ہمیشہ سے رہی ہیں۔ پریس کی آسانی نہ ہونے کے سبب یہاں کہ کئی شعراء اور ادیب گم نامی کی زندگی میں رہے یہی وجہ ہے کہ یہاں قلمی پرچے تو ضرور نکلے لیکن پریس سے شائع ہونے والا کوئی پرچہ نہیں نکلا۔ البتہ گورنمنٹ ہائیر سیکنڈری اسکول میگزین سرونج ۶۱۔۶۰ء میں دوسرا میگزین ۶۲۔۶۱ء میں پریس سے چھپ کر جاری ہوا جس میں میرا لکھا ہوا ایک مضمون "آج کا طالب علم" کے عنوان سے چھپا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۸۲ء تک سرونج سے کوئی پرچہ نہیں نکلا۔ "راہی" "حصار" اور تعمیر نو کی طرح قلمی پرچے نکلتے رہے حالانکہ ۱۹۷۴ء میں میں نے بھی ایک چار صفحے کا قلمی اخبار "اسکاوٴٹنگ سرونج" کے نام سے نکالا اس اخبار کی کوئی علمی ادبی حیثیت تو نہ تھی اس لئے کہ یہ ایک مخصوص اخبار اسکاوٴٹنگ پر مشتمل ہوتا تھا۔ جس کی کچھ بچی ہوئی کاپیاں مرے پاس آج بھی محفوظ ہیں۔ یہ تمام پرچے قلمی تھے سرونج سے شائع ہونے والا پہلا مطبوعہ رسالہ انتساب ہے جو ڈاکٹر سیفی سرونجی نے ۱۹۸۳ء میں جاری کیا۔

ڈاکٹر نعمان مدھیہ پردیش اردو صحافت کا ایک جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"علمی ادبی سرگرمیوں کے اعتبار سے سرونج کو ایک خاص مقام حاصل ہے پریس کی آسانی نہ ہونے کی سبب یہاں سے اگرچہ کوئی اخبار تو جاری نہ ہو سکا البتہ کئی معیاری قلمی رسالے ضرور نکالے گئے ۴۷ء میں اختصار ہاشمی نے ۵۲ء میں ت م جواد اور مجروح عرفانی نے تعمیر نو ۶۲ء میں خالد محمود اور مختار شمیم نے راہی ۷۷ء میں شان فخری نے حصار نکالا۔ یہ تمام قلمی رسائل تھے لیکن پریس میں طبع ہو کر شائع ہونے والا رسالہ "انتساب" سیفی سرونجی نے ۱۹۸۳ء سے سرونج سے جاری کیا تھا"

آج کل جنوری ۱۹۸۵ء کے مطابق سرونج میں سب سے پہلی نثری کتابیں رفیع الدین مرحوم کی "ریل کا سفر" اور "اصلاح الرسوم" کے نام سے لگ بھگ سو سال پہلے شائع ہوئی تھیں۔

مرتضٰی صاحب نظر کی کتابوں میں پہلے "صولت شیر شاہی" بعد میں ۱۹۳۶ء میں "آثار مالوہ" شائع ہوئی یہ وہ زمانہ تھا جب زیادہ تر شعراء اور ادیبوں کی کتابیں قلمی نسخوں تک ہی محدود رہا کرتیں تھیں (ان قلمی نسخوں کا تذکرہ انشاء اللہ پھر کبھی کسی تفصیلی مضمون

ں کرونگا) آزادی کے بعد چند سال تو ماحول میں بڑی ابتری رہی اور نشرو اشاعت کا سلسلہ بھی منقطع رہا لیکن جلد ہی ملک میں امن وامان قائم ہو گیا اور شعرو شاعری اور کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ پھر شروع ہوا اور ۱۹۷۰ء میں اچھن میاں راز مرحوم کا شعری مجموعہ "انکشاف راز" کے نام سے شائع ہوا۔ اسی زمانے میں دلکش ساگری نے سرونج میں آکر ایک نیا ادبی ماحول پیدا کر دیا اور پہلی بار "گمنام گوشے" کے نام سے سرونج کے شعراء کے کلام پر مشتمل ایک مجموعہ شائع کیا جس میں ناطق مالوی، دانش مالوی، راہی قاسمی، طالب عرفانی، اسمٰعیل ذبیح، کلیم سرونجی، دلکش ساگری، ضیاء اسدی، میر عرفانی، کے علاوہ نئی نسل کے ممتاز شاعر۔ وقار فاطمی، شان فخری، مختار شمیم، خالد محمود، شاہد میر، فرید اقبال، صفدر حامدی، جانکی پرشاد اشک کی غزلیں شامل تھیں۔ سرونج کی یہ پہلی کتاب تھی جس پر ہندوستان کے تمام ادبی رسائل میں بے شمار تبصرے شائع ہوئے "گمنام گوشے" پر جتنے بھی تبصرے شائع ہوئے ان میں وقار فاطمی، دلکش ساگری، مختار شمیم، شاہد میر خالد محمود کے اشعار ہی زیادہ کوٹ کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر خالد محمود پر ابھی چھ ماہ قبل ایک ایسا سانحہ گزر گیا جس سے ان کی زندگی ادھوری ہو گئی ان کی شریک حیات اچانک اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئیں۔ کچھ دن پہلے سیفی سرونجی نے ایک واقعہ سنایا کہ ان کی اہلیہ کے انتقال کو ۱۵ دن ہی ہوئے تھے کہ سیفی سرونجی اپنی اہلیہ اور ہمشیرہ کے ساتھ خالد محمود کے گھر جا پہنچے خالد محمود ان دنوں کس ذہنی پریشانی میں مبتلا ہوں گے اس کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا ہے لیکن اتنے غمزدہ اور پریشان ہونے کے باوجود سیفی سرونجی کے پہنچنے کے بعد اسی خندہ پیشانی کے ساتھ خاطر تواضع کی اور اپنی بیٹی آفرین کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں سے کھانا بنا کر کھلایا ان کا یہ معاملہ صرف سیفی سرونجی کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ ہر دوست اور دشمن کے ساتھ ہے۔ ان کے اس خلوص محبت اور مہمان نوازی سے ان کے تمام دوست خوب واقف ہیں پروفیسر عبدالقوی دسنوی ڈاکٹر محمد نعمان پروفیسر شکور خاں اقبال مسعود وقار فاطمی پروفیسر آفاق احمد اور سرونج اور بھوپال کے علاوہ جامعہ کے تمام احباب واساتذہ اس بات کے معترف ہیں کہ خالد محمود صرف ایک اچھے شاعر اور اچھے نثر نگار ہی نہیں ہیں بلکہ بہت پیاری دلکش اور جاذب شخصیت کے مالک ہیں جب وہ خود اچھی شخصیت کے مالک ہیں تو ظاہر کہ ان کے دوست بھی کچھ کم نہیں ہونگے ان میں

بھی زیادہ تر وہی بات پائی جاتی ہو گی کیونکہ وہ ایسے ہی دوستوں کو پسند بھی کرتے ہیں۔ بولنے کا انداز ان کا ایسا ہے کہ کوئی بھی موضوع ہو نہایت اعتماد سے گفتگو شروع کر دیتے ہیں کئی بار میں نے سوچا کے ان سے ایک انٹرویو کرلوں اور میں نے موقعہ محل دیکھ کر ایک دو سوال بھی کئے میں اپنا سوال مکمل کر بھی نہیں پایا تھا کہ خالد محمود نے تقریر شروع کر دی پھر میں نے سوچا کہ اس انٹرویو میں میرے سوالوں کا تو پتہ ہی نہیں چلے گا اور سارے انٹرویو میں ان کے جواب کے سوا کچھ نہ ہو گا۔ سچ تو یہ ہے کہ خالد محمود ایک ایسے ذہین فن کار کا نام ہے جس کے پاس معلومات کا خزانہ ہے ان کی عام گفتگو میں شوخی اور ان کے انداز میں ایک ایسی مقناطیسی کشش ہے کہ جب وہ بولتے ہیں تو لوگ ان کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں یوں بھی خالد محمود کسی کو بولنے کا موقع کم ہی دیتے ہیں عام طور پر زیادہ باتیں کرنے والوں سے لوگ کترانے لگتے ہیں مگر خالد محمود جتنا بولتے ہیں اتنی ہی زیادہ تعداد میں ان کے دوست ان کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں ظاہر ہے کہ کسی بھی شخص کی ایک ہی موضوع پر گفتگو زیادہ سے زیادہ آدمی ایک دو دن سن سکتا ہے اور تیسرے دن بور ہونا یقینی ہے لیکن چونکہ خالد محمود کے پاس ایک ایسا ذہن ہے جس میں نئے نئے موضوعات اور نئی نئی معلومات کا بڑا ذخیرہ جمع رہتا ہے جس کا وہ موقع و محل کی مناسبت سے بروقت استعمال کرتے ہیں۔

خالد محمود کی شخصیت کی انہیں خوبیوں نے انہیں اتنا ہر دل عزیز بنادیا ہے کہ خالد محمود جہاں جاتے ہیں وہاں اپنی محبت کی خوشبو بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ ہر محفل میں ان کا بھرپور استقبال ہوتا ہے جگہ جگہ ان کے اعزاز میں نشستیں ہوتی ہیں، دعوتیں ہوتی ہیں وہ بھوپال آتے ہیں تو بھوپال میں ایک ادبی چہل پہل قائم ہو جاتی ہے اور ان کے دوستوں کا حلقہ انہیں خلوص و محبت کے حصار میں گھیر لیتا ہے۔ ڈاکٹر نعمان، اقبال مسعود رشید انجم، عشرت قادری، ظفر صہبائی، نسیم انصاری، وغیرہ سب کے سب نہ صرف ان کی عزت کرتے ہیں بلکہ ان سے دل و جان سے محبت کرتے ہیں اگر خالد محمود نے پروگرام بنالیا کہ سرونج چلنا ہے تو سارے گروپ کو نسیم انصاری اپنی کار میں لئے چلے آرہے ہیں اور دو دو تین تین دن سرونج میں ادبی گپ شپ کر کے اور سیر و تفریح کا لطف اٹھاتے ہوئے کبھی مولا علی صاحب کی ٹیکری پر کبھی عمر میاں کے کھیتوں پر کبھی کرشی وگیان کیندر اور کبھی فخرالدین صاحب کی ٹیکری پر تفریح کا پروگرام چل رہا ہے۔ اور سرونج کہ دوستوں میں ڈاکٹر شان

فخری ڈاکٹر شاہد میرؔ، ڈاکٹر عزیز الدین، عبدالحفیظ عارف، محی الدین انجم، ڈاکٹر وکیل عمر میاں، عرفان میاں، مرزا فصیح اللہ بیگ، عبدالصبور خاں، حافظ حدیث احمد، عتیق میاں، سلیم میاں، محمد میاں، عبدالحمید مما، ولی اللہ میاں وغیرہ سبھی جمع ہو جاتے ہیں ایک ہل چل سی مچ جاتی ہے۔ کبھی کبھی اندور سے ڈاکٹر مختار شمیم لکھنؤ سے ڈاکٹر فرید اقبال بھوپال سے سہیل قیومی اور بمبئی سے حبیب رضا تشریف لا کر ان محفلوں میں شریک ہو جاتے ہیں جب سب مل جاتے ہیں تو بس خوش گپیوں اور کھانے پینے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اکثر و بیشتر تو مرغ و ماہی اور تیتر و بٹیریں ہی قربانی دیتے ہیں مگر یوں بھی ہوتا کہ کبھی خلیل بھائی کے ہوٹل کے سمو۔ سے کھائے جا رہے ہیں کبھی عمر میاں کے کھیت کی مونگ پھلی او بھٹے کھائے جا رہے ہیں کبھی عارف کے گھر کی دال باٹی، جو سب کو پسند ہے، کھائی جا رہی ہے کبھی کسی استاد شاعر کا جشن منایا جا رہا ہے اور کبھی کسی معمولی شاعر کی شاعری کا موازنہ میر اور غالب سے کیا جا رہا ہے: ن بھر قہقہے اور جبر یہ دعوتوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے خالد محمود ایک بہت اچھے انشائیہ نگار اور خاکہ نگار ہیں ان کے موضوعات اچھوتے اور انداز منفرد ہے۔ کبھی صغرہ آپا کے وظیفہ یاب ہو جانے پر کبھی سٹی بس پر کبھی افطاری پر غرض یہ کہ ان کی باتوں میں ان کے جملوں میں کچھ نہ کچھ نیا پن ضرور ملتا ہے۔ اگر یہاں ان کے انشائیوں کے کچھ اقتباس پیش کروں تو یہ مضمون ایک مکمل کتاب کی صورت اختیار کر لے گا۔ لیکن ان کی انفرادیت کے پہلو اجاگر کرنے کے لئے صرف چند سطریں کوٹ کرنے پر اکتفا کر رہا ہوں یہ تازہ ترین انشائیہ اکتوبر ۱۹۹۷ء کے کتاب نما میں شائع ہوا ہے جو جامعہ کی مشہور ادیبہ ناول نگار ڈاکٹر صغرہ مہدی کے رٹائیرڈ ہونے پر تحریر کیا گیا ہے اس خاکے کا ایک اقتباس پیش ہے۔

"شعبہ کو ابھی صغرہ آپا کی سخت ضرورت ہے۔ ان کے رکنے سے سبھی کا فائدہ تھا۔ مگر عجیب دستور زمانہ ہے جن کے رکنے سے فائدہ ہوتا ہے وہ تو رکتے نہیں اور جن کے جانے سے فائدہ ہوتا ہے وہ رک جاتے ہیں۔ صغرہ آپا بضد ہیں کہ میں تو جاؤنگی میں کیوں توسیع کا وظیفہ مانگوں میں تو ہرگز نہیں مانگونگی۔ انہیں لاکھ سمجھائے کہ قانون قاعدہ بھی تو کوئی چیز ہے اس کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا۔ مگر ان کا اپنا بھی قاعدہ قانون ہے اور وہ اس کا لحاظ ضروری سمجھتی ہیں"

یہ تو صرف ایک انشائے کی چند سطریں ہیں اس کے علاوہ خالد محمود نے کئی انشائے

اور خاکے لکھے ہیں جو مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں سچ بات تو یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اچھے شاعر ہیں یا اچھے نثر نگار۔ ہاں یہ ضرور بات ہے ان کی خوبصورت منفرد شخصیت کی طرح ان کی ہر تحریر بھی منفرد ہوتی ہے۔

خالد محمود کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بچوں میں بچے بن جاتے ہیں دوستوں میں دوست اور ادیبوں میں ادیب۔ ہاں جب ان کے خاص دوست مختار شمیم اور شاہد میر، شان فخری، کے مطب میں بیٹھتے ہیں تو ایک شخص کی شدت سے یاد آتی ہے۔ وہ ہیں مرحوم وقار فاطمی جو ہر محفل کی جان تھے۔ حالانکہ میں ان کی محفلوں میں نہیں بیٹھتا تھا اس لئے کہ ان محفلوں میں کئی تو میرے شاگرد تھے جو میرا ادب احترام کرتے تھے یا میں ان کا لحاظ کرتا اور میرے سامنے وہ بے باک گفتگو سے کتراتے یہی وجہ تھی کہ میں ان محفلوں سے دور رہتا تھا لیکن ان کے ہر کام اور ادبی سرگرمیوں پر ضرور میری نظر رہتی تھی۔

خالد محمود کا اپنی زندگی میں یہ معمول رہا ہے کہ انہوں نے کبھی پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا اور زندگی کو بھرپور طریقے سے اپنے ڈھنگ سے گزارا ہے۔ شاید اسی لے انہوں نے اس طرح کے اشعار کہے ہیں۔

اسے تم زندگی کہہ کر پکارو پہاڑی سلسلہ ہے اور میں ہوں
ہر دم یہ سوچتا ہوں مری زندگی مجھے شاید کسی مقام پہ تھک کر اتار دے
ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی کہ دیوار دیور چلنے لگا

یہ بات بھی حقیقت ہے کہ جب کوئی شخصیت ابھرنے لگتی ہے اور وہ ترقی کی منزلوں کو چھونے لگتی ہے تو اس کے دشمن اور حاسد بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ دوست نما دشمن حاسد ہی ہوتے ہیں یہ بات ہر بڑی شخصیت پر لاگو ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ خالد محمود بھی آج ان شخصیتوں مین سے ایک ہیں جو منزل بہ منزل ترقی کی جانب تیزی سے گام زن ہیں۔ ان کے آس پاس رہنے والے ان کے دوستوں میں ایسے بھی کئی ہونگے جو ان سے رشک وحسد کرتے ہونگے ایسی تجربے کو خالد محمود نے چند اشعار میں اسطرح بیان کیا ہے۔

چہرے ہیں پرخلوص تو رنجش دلوں میں ہے جو بات دشمنوں میں نہیں دوستوں میں ہے
اس فرد سے پھر آج میں ہنس کر ملا کہ جو موقع ملے تو پشت میں خنجر اتار دے

خنجر چلا کے مجھ پہ بہت غمزدہ ہوا　　　بھائی کے ہر سلوک میں شدت لہو کی تھی
جن کو لباس فاخرہ پہنا رہے ہیں آپ　　　اک روز آستیں چڑھا کر بھی آئینگے
ہائے وہ احباب جن کے سینۂ شفاف میں　　　داغ پڑ جاتے ہیں دامن میرا اجلا دیکھ کر

میں یہ آج تک نہ سمجھ سکا کہاں لوگ میرے شریک ہیں
کہ میں ہنس دیا تو وہ ہنس دئے جو میں رو دیا تو وہ ہنس دئے۔

خالد محمود ایک منکسر مزاج غیور حوصلہ مند، بلند کردار، پختہ عزائم اور اخلاقی جرات رکھنے والے ایسے بامروت انسان ہیں جو ہزاروں غموں کو خوش اسلوبی سے برداشت کرنے کی صلاحیت اور حوصلہ رکھتے ہیں ان میں زندگی کے مشکل سے مشکل امتحان میں شریک ہونے کی ہمت ہے اور پیچھے رہنا بھی گوارہ نہیں۔

تھکنے لگے ہیں پاؤں مگر میر کارواں　　　پیچھے نہ رہ سکوں گا مرا سر اتار دے

خالد محمود کی شخصیت کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ انکی طبیعت میں ایک تعمیری ضد پائی جاتا ہے اگر کسی نے کہہ دیا کہ یہ کام تم سے نہیں ہوگا پھر تو خالد محمود اس کام کو کر کے ہی دم لیں گے یہی ضد ان کی کامیابی کی راہیں ہموار کرتی چلی جاتی ہے کیسا ہی بڑا کام ہو وہ اسے نہ صرف چیلنج کے طور پر قبول کرتے ہیں بلکہ اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچا کر ہی چھوڑتے ہیں۔ ان کے اسی انوکھے اور ضدی مزاج نے انہیں آج سرونج سے سیفیہ کالج اور سیفیہ سے جامعہ ملیہ دہلی تک پہنچادیا۔ جامعہ میں وہ ایک متحرک فیض رساں اور فعال شخصیت کہلائے جاتے ہیں ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں میں خالد محمود ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ غربت کی زندگی گزارنے اور کڑی محنت کی صعوبتیں جھیلنے والا سرونج کا یہ نوجوان طالب علم آج اپنی محنت اور جدوجہد سے کامیابی کی اس منزل پر پہنچ گیا ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے آدمی اپنی پوری زندگی صرف کر دیتا ہے آج وہ جامعہ کے بہترین بنگلے میں رہتے ہیں اور اپنی ماروتی کار میں گھومتے اور چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ خالد محمود کاغذ کی ناؤ پر سمندر پار کرنے والی شخصیت کا نام ہے۔ ان کا یہ شعر سب سے زیادہ انہیں پر صادق آتا ہے۔

ہر آسماں پہ مثل مہ و کہکشاں رہے
"اپنا مقام لیکے رہے ہم جہاں رہے"

سیفی سرونجی

ڈاکٹر خالد محمود سے میرا تعلق

۱۹۶۵ء میں جب میری عمر بارہ تیرہ سال کی ہو گی مجھے تاریخی ناول پڑھنے کا اتنا شوق ہوا کہ میں نے نسیم حجازی صادق سردھنوی عبدالحلیم شرر راشدالخیری اور خان محبوب طرزی کے تمام ناول پڑھ ڈالے ان دنوں دلکش ساگری مرحوم کے بیڑی کے کارخانے میں ملازم تھا اور دن بھر بیڑی کاریگروں کو ناول پڑھ کر سنایا کرتا تھا۔ دلکش صاحب ہر ماہ کارخانے میں طرحی نشستوں کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ میرا دل بہت چاہتا کہ میں بھی ان نشستوں میں پڑھوں اتفاق سے اسی کارخانے میں مرحوم منور زبیری بھی کام کیا کرتے تھے جو بہت اچھے شاعر تھے میں نے بھی چند غزلیں کہیں اور انہیں دکھائیں وہ بہت خوش ہوئے اور ان کی اصلاح بھی کر دی اس طرح میں بھی ان نشستوں میں پڑھنے لگا۔ دلکش صاحب مجھے ملازم نہیں بلکہ اپنے گھر کا ایک فرد ہی سمجھتے تھے۔ انہوں نے ان نشستوں کا پورا انتظام مجھے سونپ دیا اب ہر ماہ شعراء کو اطلاع دینا انہیں جمع کرنا سب کام میں کرنے لگا۔ ان نشستوں میں خالد محمود شاہد میر وقار فاطمی مختار شمیم کلیم سرونجی ذبیح صاحب طالب عرفانی دانش مالوی خادم طاہری کے علاوہ کبھی کبھی بھوپال سے عشرت قادری ظفر صہبائی عبدالمتین نیاز اور دیگر شعراء بھی تشریف لایا کرتے تھے۔

میرے پاس جب کتابوں کا کافی ذخیرہ ہو گیا تو میں نے ۱۹۶۹ء میں سیفی لائبریری کے نام سے ایک لائبریری قائم کر لی جہاں شہر کے تمام قابل ذکر شعراء بیٹھنے لگے۔ اسماعیل ذبیح طالب عرفانی خالد محمود صاحب بھی کبھی کبھی تشریف لاتے اور اسماعیل ذبیح اور مختار شمیم صاحب کی طرح میری حوصلہ افزائی فرماتے اب میں تاریخی ناولوں کے علاوہ دیگر کتابیں بھی رکھنے لگا۔ یہ تمام کتابیں میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے منگواتا تھا۔ نسیم انہونوی

صاحب کتابیں منگوانے کی وجہ سے نسیم بک ڈپو کا "سرپنچ" بھی بھیجا کرتے تھے۔ میں نے پہلی بار نعت کہی اور نسیم صاحب کو سرپنچ میں اشاعت کے لئے بھیج دی وہ نعت انہوں نے اتنی پسند فرمائی کہ اپنی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ حریم میں بڑے اہتمام کے ساتھ ایک صفحہ پر شائع فرمائی پھر تو میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں دیگر ادبی رسائل میں بھی غزلیں اور کہانیاں بھیجنے لگا۔ اور چھپنے کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ ۲۵ برس گذر گئے ادھر خالد محمود صاحب شاہد میر مختار شمیم وقار فاطمی اسماعیل ذبیح صاحب میرا حوصلہ بڑھاتے رہے ۱۹۷۲ء میں میری ایک نظم "ہماری زبان" میں شائع ہوئی دہلی سے خالد صاحب تشریف لائے تو انہوں نے بہت مبارکباد دی اور مجھ سے کہا تمہارے چھپنے کا سلسلہ اچھا ہے لیکن مطالعہ ضرور کرتے رہنا اب تک کیا کچھ پڑھ لیا ہے مجھے بتاؤ میں تمہیں کتابیں بھیجواؤں گا سرسید حالی شبلی محمد حسین آزاد ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کی کتابیں تو یقیناً پڑھ لی ہونگی۔ وہ یہ سب باتیں ایک ہی سانس میں کہہ گئے ادھر گھبراہٹ سے میرا برا حال میں نے کہا خالد صاحب سچ بات تو یہ ہے کہ میں نے ان سب کا نام ہی پہلی مرتبہ سنا ہے یہ سن کر خالد صاحب حیران رہ گئے اور غصے میں مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور ولی دکنی سے لیکر آج تک کی شاعری پر ایک گھنٹے کی تقریر کر ڈالی اور سمجھایا کہ چھپنے چھپانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا جب تک کہ پڑھو گے نہیں اور میرے ایک دوست محمود ملک سے کہا کہ انہیں جامعہ اردو علیگڑھ سے ادیب کا فارم بھروا دیجئے بہت سی کتابیں دیں اور میری فیس بھی پتہ نہیں کس نے جمع کی اس طرح میں ان کے قریب ہوتا گیا۔

یوں تو خالد صاحب نے مجھے بچپن میں مدرسہ ریاض الاسلام میں پڑھایا تھا جہاں میں قرآن شریف حفظ کیا کرتا تھا خالد صاحب کی شخصیت میں اس وقت بھی ایک عجیب سی کشش تھی ان کے سمجھانے کا انداز اور ترقی کرنے کے خواب دکھانا اور اس پر عمل کرنے کا جذبہ تو انہوں نے بچپن میں ہی مجھ میں پیدا کر دیا تھا حالانکہ جب انہیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ بچپن میں ان کا پڑھایا ہوا سیدھا سادھا ایک دیہاتی طالب علم کسی دن سیفی سرونجی بن جائے گا اور نہ مجھے یہ پتہ تھا کہ خالد صاحب اس مقام تک پہنچ جائیں گے دہلی جانے کے بعد بھی یہ سلسلہ بند نہیں ہوا جب بھی دہلی جاتے میری غزلیں لے جاتے اور دہلی سے شائع ہونے والے مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپوا دیتے اس کے علاوہ جب بھی میری کوئی غزل یا

کہانی اچھے پرچے میں شائع ہوتی تو مبارکباد کا خط لکھتے اور میری حوصلہ افزائی کرتے۔ اور اپنے ہر خط میں مطالعہ جاری رکھنے کی ہدایت ضرور کرتے اس طرح یہ سلسلہ جاری رہا اور خالد صاحب سے میں قریب سے قریب تر ہوتا گیا حالانکہ خالد صاحب سے زیادہ میں مختار شمیم اور شاہد میر و وقار فاطمی کے زیادہ قریب رہا ہوں اور بے تکلف بھی، خالد صاحب میرے استاد رہے ہیں اس لئے میں ادب کی وجہ سے ان سے بے تکلف نہ ہو سکا دوسری وجہ یہ بھی رہی کہ ان کے چھوٹے بھائی آصف محمود سے بہت زیادہ دوستی ہے اس لئے وہ بھی اس نظر سے دیکھتے خالد صاحب نے ہمیشہ مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا وہ ہمیشہ مجھے دہلی بلاتے رہے لیکن میں حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے ان دنوں نہ جا سکا مگر اتفاق سے ۱۹۸۳ء میں میرے شعری مجموعے روشن الاؤ کی اشاعت کے لئے مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی نے مالی تعاون سے نوازا انہیں دنوں محمود ملک ایک ٹریننگ کے سلسلے میں دہلی گئے تھے اور خالد صاحب کے یہاں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس موقع کو میں نے غنیمت سمجھا اور دلی جا پہنچا خالد صاحب اتنے ٹوٹ کر ملے کہ میں سب کچھ بھول گیا ایسا لگتا تھا کہ جیسے میں اپنے ہی گھر میں ہوں بیس دن تک دہلی میں رہا خالد صاحب نے جامعہ کے تمام بڑے بڑے لوگوں سے تعارف کرایا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ ڈاکٹر مظفر حنفی صغرا مہدی وہاج الدین علوی یوسف پاپا اور دیگر انہیں دنوں ان کی بیٹی کی پہلی سالگرہ تھی جس میں جامعہ کے علاوہ دیگر کئی ادبی شخصیات نے شرکت کی ان سے بھی خالد صاحب نے اس طرح تعارف کرایا کے آج جامعہ کے تمام لوگ مجھے خالد صاحب کے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتے ہیں مظفر حنفی صاحب بھی گھنٹوں ہمیں سمجھاتے اور دہلی میں جو ادبی سرگرمیاں ہوتیں ان میں جانے کے لئے اپنا کارڈ دے دیتے جسے لیکر میں اور محمود ملک کبھی غالب اکیڈمی جا رہے ہیں تو کبھی ایوان غالب کبھی کسی مشاعرے میں کبھی کسی سیمینار میں جہاں کبھی پروین شاکر آرہی ہیں کبھی افتخار عارف تو کبھی اردو کے نئے افسانے پر سیمینار ہو رہا ہے جس میں سلام بن رزاق انور خاں انور قمر۔ مشتاق انجم عثمانی سے ملاقاتین ہو رہی ہیں کبھی کسی مشاعرے میں مخمور سعیدی مجتبیٰ حسین کمار پاشی امیر قزلباش شمس الرحمٰن فاروقی گلزار دہلوی حاجی انیس دہلوی غرض یہ کے دہلی کے تمام ادیبوں اور شاعروں سے ملاقاتیں ہوتیں ظاہر ہے کہ دہلی میں جن حضرات سے ملاقاتیں ہوتیں ان میں خالد صاحب ہی میرے لئے ذریعہ بنے ورنہ دہلی

جیسے شہر میں پندرہ پندرہ دن ٹھہرتا یہ الگ بات ہے کہ آج ان کی ہی طرح مہربان حاجی انیس، بلائی صاحب ہیں جہاں اکثر میں ٹھہرتا ہوں پھر تو میں سال میں کئی کئی مرتبہ جانے لگا اور خالد صاحب کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیتے میں پردیس میں ہوں حد تو یہ ہے کہ سرونج آنے جانے کا کرایہ بھی دیتے ویسے میرے بارے میں یہ بات بھی مشہور ہے کہ میں ہندوستان کسی بھی کونے میں ایک طرف کے کرائے سے چلا جاتا ہوں اور ادھر سے واپسی کا انتظام خدا کر ہی دیتا ہے بھوپال جاتا تھا تو وقار فاطمی صاحب مرحوم کرایہ دیتے اندور جاتا ہوں تو آج بھی مختار شمیم مجھے اپنے بھائی کی طرح سمجھتے ہیں بمبئی جاتا ہوں تو عبدالاحد ساز جیسے پیارے دوست نہ صرف کرایا بلکہ رہنے ٹھہرنے کا بھی انتظام کردیتے ہیں۔ اور دہلی تو مجھے اب گھر جیسا لگنے لگا ہے۔ تعریف کی بات تو یہ ہے کہ سب کچھ بغیر کہے ہوتا یہ خدا کا کرم نہیں تو اور کیا ہے؟

جب قدرت کسی شخص کو کوئی مرتبہ یا مقام دینا چاہتی ہے تو اس کی ترقی کے لئے سب ذرائع بھی مہیا کردیتی ہے اور وہ ذرائع ہوتے ہیں اس کے والدین اس کے اساتذہ اس کے دوست احباب خالد محمود کی شخصیت کو بنانے میں بھی ان کے اساتذہ دوست احباب اور والدین کی دعاؤں کا خاص رول رہا ہے بھوپال میں سیفیہ کالج کے فخرو بھائی خالد صاحب سے بہت محبت کرتے تھے یہ فخرو بھائی کی ہی عنایتوں کا نتیجہ ہے کہ آج خالد محمود جامعہ ملیہ کے اس عہدے پر ہیں فخرو بھائی میں یہ خوبی تھی کہ وہ سیفیہ کالج کے ان تمام ذہین طالب علموں پر گہری نظر رکھتے ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں بھی بڑا تعاون کرتے تھے سیفیہ کالج کے ذہین طالب علموں میں خالد محمود اس وجہ سے بھی بہت نمایاں تھے ان کی نظم نذر سیفیہ جو ایک سو سے زیادہ اشعار پر مبنی تھی سیفیہ کالج میں نہیں پورے مدھیہ پردیس میں مشہور تھی کئی اخبارات میں چھپی تھی ایک صاحب نے تو اس نظم سے متاثر ہوکر اخبار کو ایک بڑے اشتہار سے نوازا تھا جہاں ایک طرف فخرو بھائی خالد صاحب کو اتنا چاہتے تھے وہیں دوسری طرف خالد صاحب بھی ان سے بے حد عقیدت رکھتے تھے فخرو بھائی کے انتقال پر جب کئی جگہ ان کے تعزیتی جلسے منعقد کئے جارہے تھے تو خالد صاحب نے بھی اپنے تعزیتی خطبے میں فرمایا تھا۔ کہ میں اور مجھ جیسے بہت سے لوگوں کی اہمیت اور وجود جناب فخرو بھائی کی محبت اور نوازش کا مرہون منت ہے" خالد محمود ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو اپنے چھوٹوں سے پیار

اور اپنے بڑوں کا نہ صرف احترام کرتے ہیں بلکہ ان کے لئے ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کو تیار رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے دوست بھی ایسے کہ ہر وقت ان پر جان دیتے ہیں ظاہر ہے کہ محبت محبت سے پیدا ہوتی ہے بھوپال کے دیگر دوستوں میں اقبال مسعود ڈاکٹر محمد نعمان خان عشرت قادری ظفر صہبائی نسیم انصاری آفاق صاحب کے علاوہ عبدالقوی دسنوی اور ڈاکٹر حامد حسین جیسے بے شمار اساتذہ بھی ان سے اتنی محبت کرتے ہیں جتنا کہ ان کے دوست خالد صاحب جب بھی بھوپال آتے ہیں تو ادبی سرگرمیاں تیز تر ہو جاتی ہیں جگہ جگہ ان کے اعزاز میں نشستیں ہوتی ہیں کبھی نسیم انصاری صاحب کے بنگلے پر تو کبھی عشرت قادری صاحب کی لائبریری میں کبھی کس کے یہاں کبھی کسی سیمینار میں شرکت کرتے کبھی کوئی ورکشاپ اور پھر ان تمام ادبی سرگرمیوں سے اخبارات میں سرخیوں میں خالد محمود کا نام آتا کبھی انہیں نئی نسل کا نمائندہ شاعر کہا جاتا کبھی انہیں مشرقی اقدار زندہ رکھنے والے شاعر کا خطاب دیا جاتا ہر پروگرام میں خالد صاحب نہ صرف پیش پیش رہتے بلکہ اپنی تحریروں اور تقریروں سے اپنی صلاحیتوں کا جادو جگاتے رہتے دہلی ہو یا بھوپال خالد صاحب نے اپنی صلاحیتوں کو ہر جگہ منوایا ہے کبھی صغرا آپا کے وظیفہ یاب ہو جانے پر خاکہ پڑھ رہے ہیں تو کبھی دہلی کی سٹی بسوں میں سفر کا حال انشائیے کی شکل میں پیش کر رہے ہیں خالد صاحب کے تمام کارناموں کا اگر مختصر مختصر جائزہ بھی لیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے گی اس لئے کہ وہ ایک اچھے شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھے نثر نگار بھی ہیں نثر کی بھی مختلف اصناف مثلاً انشایہ نگاری خاکہ نگاری اداریہ سفر نامے جیسی ہر صنف میں ان کا انداز مختلف دکھائی دیتا ہے کبھی کبھی بالکل سنجیدہ موضوعات پر لکھیں گے جیسے غالب کی نعت گوئی جوش کی مرثیہ نگاری اور جب دوسرے موڈ میں ہونگے تو خوبصورت انشایے سٹی بس کا سفر بیوی جب اچانک میکے سے آجائے اس کے علاوہ نئی نسل کے بہت سے شاعروں کی کتابوں پر دیباچے فلیپ کے لئے رائے مثلاً سلیم انصاری فاروق انجم سیفی سرونجی اور دیگر کئی شعراء کی ادیبوں اور شعراء پر سچ بات تو یہ ہے کہ خالد محمود ایک بیدار ذہن اور طاقت ور لہجے کے شاعر ہیں بہت سوچ سمجھ کر ہر موضوع کا انتخاب کرتے ہیں نثر ہو یا نظم زبان ہمیشہ صاف ستھری اور پیاری ہوگی وہ نئی نسل کے ایک ایسے شاعر کہے جاتے ہیں جنہوں نے بلاوجہ کچھ نہیں لکھا نہ صرف چھپنے چھپانے کے لئے ۱۲ جولائی ۱۹۸۶ء کے آفتاب جدید بھوپال میں

رائٹرس گلڈ کے ایک پروگرام میں فضل تابش نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ دہلی میں خالد محمود نے جدو جہد کر کے اپنا مقام خود بنایا ہے اور خوشی کی بات ہے کہ ان کی شاعری میں مشرقی اقدار زندہ ہیں فضل تابش نے کہا تھا اپنے بعد آنے والی نسل کی بہترین شاعری سن کر مجھے ہمیشہ اچھا لگتا ہے خالد محمود بھی انہیں شعراء میں سے ایک ہیں۔ خالد محمود نئی نسل کے ان شعراء میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں زندگی کے مختلف تجربات کو اپنے مفکرانہ انداز سے شعری روپ میں پیش کیا ہے ان کی شاعری میں فکر کی گہرائی بہت نمایاں ہے یہ بات بھی میں اکثر اپنے مضامین میں لکھ چکا ہوں کہ جو شخص اچھی نثر نہیں لکھ سکتا وہ شعر کی بلند تر منزل تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے کہ نثر لکھنے والے کو پڑھنا پڑتا ہے اس کا مطالعہ وسیع ہوتا ہے ظاہر ہے کہ جب وہ مطالعہ کرے گا دنیا کے اچھے ادب کی پہچان ہوگی اور اس کا شعور بھی پختہ ہوگا۔ وہ شاعری میں ایک انفرادیت پیدا کرے گا اس کا الگ اسٹائل ہوگا ہمارے اردو کے زیادہ تر شعراء مطالعہ کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اپنی ہلکی پھلکی عاشقانہ شاعری کو معیاری شاعری سمجھتے ہیں اس غلط فہمی کی وجہ سے وہ شعراء مشاعروں اور نشستوں میں پڑھنے کو ہی اردو ادب کی خدمت سمجھتے ہیں ایسے شعراء کے ختم ہوتے ہی ان کی شاعری بھی ختم ہو جاتی ہے بچتے وہی ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اور خالد محمود کا شمار ایسے ہی پڑھے لکھے شعراء میں ہوتا ہے۔ خالد محمود نے بچپن سے ہی مطالعہ کرنے کو اپنا شعار بنالیا تھا اس مطالعہ کی وجہ ہے کہ انہوں نے ہندی انگریزی اور افریقی کہانیوں اور ناولوں کے ترجمے کئے ہیں ظاہر ہے کہ ان کی شاعری بھی عام اور سطحی نہیں ہو سکتی عام ڈگر سے ہٹ کر چلنا ان کا خاص میدان رہا ہے جس رستے میں عام لوگ چلتے ہیں وہ اس رستے سے ہمیشہ بچکر چلتے ہیں اور عام روش سے ہٹ کر چلنے کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک نمایاں انفرادیت پیدا ہوگئی ہے مثال کے طور پر چند شعر دیکھئے۔

میرے دروازے پر یہ بھیڑ کیسی — کوئی آیا ہے یا کوئی گیا ہے
زمیں مرے پاؤں پکڑے رہیں — ادھر ہوگئے آسماں، آشنا،
ہر اک زخم پر دل نے آواز دی — مرے محترم، مہرباں، آشنا

گھر میں رکھیں غزلوں کا فن اک غالب اک میر
ہر شاعر کے پکے دشمن اک غالب اک میر

پیچھے پیچھے سارے شاعر وہ بھی کتنی دور
آگے آگے دو ہی سجن اک غالب اک میر

جھوٹوں کا دربار نہیں ہوں سرکاری اخبار نہیں ہوں
اکثر وہ بھی چبھ جاتا ہے جو کہتا ہے خار نہیں ہوں
تمہیں ایک آئینہ ہے اور تم ہو مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

اس طرح کے بے شمار شعر خالد محمود کے یہاں مل جائیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ خالد محمود ایک ذہین اور سماجی اور ادبی شعور رکھنے والے شاعر ہیں خالد محمود کی شاعری میں جذبے کی آنچ اور فکر کی گہرائی نمایاں ہونے کے ساتھ ساتھ روانی اور تازگی کم نہیں ہوتی اس کی وجہ یہ ہے کہ خالد محمود جب شعر کہتے ہیں یعنی تخلیقی عمل سے گذرتے ہیں تو ایک فلسفی مفکر نظر آتے ہیں اور دوستوں کی محفلوں میں یا دوران سفر ایک زندہ دل انسان کی طرح تفریح کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور یہی سیر و تفریح کبھی کبھی انشائیوں اور شعری روپ میں تازگی بن کر ان کی تخلیقات کا حصہ بن جاتے ہیں چند شعر اور دیکھئے۔

دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
اک دستِ نازیاد کا شانہ دبا گیا
امنگیں شوق محرومی امیدیں وسوسے اور تم
گذشتہ ہل چلوں کے دل کئی قصے سناتا ہے

سنو لگ کترا کے چلنے لگے مجھے زندگی کا ہنر آگیا
ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی کہ دیوار دیوار چلنے لگا
خالد نے شاید آئینہ دیکھا نہیں کبھی دلّی میں چاہتا ہے اپنا مکان ہو

امنگیں، شوق، محرومیاں، امیدیں، وسوسے آج نئی نسل کا سب سے بڑا المیہ ہے نئی نسل جس ذہنی انتشار میں مبتلا ہے ان سب کا اظہار خالد محمود کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے دلی میں مکان کا خواب ہر ماہ فکروں کے ملبوس بدل کر آنا لوگوں کا کترا کے گذرنا

رشتے ناطوں کا پھیرنا اور پھر جب یہیں شاعر آسودہ حال ہوتا ہے تو تمام آسائشوں کے بعد بھی جس سکون کا وہ متلاشی ہے اس سے محرومی۔ غرض یہ کہ نئی نسل کے تمام مسائل کو خالد محمود نے اپنی شاعری میں شاعری کی ہی طرح پیش کیا ہے کوئی بھی بات ان کی دیگر جدید شعراء کی طرح خشک نہیں۔ بلکہ اس میں جذبے اور شدتِ احساس نے ایک زبردست تاثیر پیدا کر دی ہے۔

وقتِ قیام دستِ قضا نے نہیں دیا
چلنے لگے تو ساتھ ہوا نے نہیں دیا
مانگتا ہے تو وجود ذاتِ باری کا ثبوت
کیا جہانِ رنگ وبو اے بے خبر کافی نہیں

○

خالد محمود کا فن

شاعر

نثر نگار

تبصرے، تعلیمات ، انٹرویو، خطوط

قرۃ العین حیدر

مجھے آنکھ دی تم کو منظر کیا

خالد محمود کے کلام کو کئی بار سننے کا اتفاق ہوا۔ ان کے اشعار میں تازگی اور ندرت ہے۔ مایوسی یا فرار، بے چہرگی، حصار ذات ... ں یا انسانی وجود کی لایعنیت قسم کا کوئی منفی میلان ان کے یہاں نہیں ملتا، اس ... ں اخلاقی قدریں، عظمتِ انسان اور حوصلہ مندی کے زمزمے، کلاسیکی رچاؤ ... ھ ان کی شاعری کی پہچان ہیں۔ ان کے یہاں غم کا جمالیاتی اظہار بھی لطف و ... راہم کرنے کا وسیلہ بن گیا ہے۔ عام طور پر وہ اس قسم کے شعر کہتے ہیں ؎

ہر اک فیصلہ اس ... بہتر کیا
مجھے آنکھ دی تم کو منظر کیا

اجالا نفی ہے ... س نے کہا
اندھیرے میں تھے ہم نے باور کیا

عشق ... یر ہونا چاہئے
پاؤں میں زنجیر ہونا چاہئے

... ب آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

حوصلہ ٹوٹا تو وہ عبرت کا منظر آگیا
اُڑ نہیں پائے پرندے بال و پر ہوتے ہوئے

ازل سے کسی شے میں گردش نہ تھی
چلا میں تو سنسار چلنے لگا

تیرے ساتھ چلنے کی عادت نہیں
ہماری نہ کر آزمائش ہوا

ہر کس و ناکس پہ کرلیتا ہے فوراً اعتبار
بے خبر کتنا ہے خالد ہوتے ہوئے

ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگا

خالد محمود کی غزلوں میں روایتی مضامین بھی ہیں اور علائم بھی، لیکن ان کی تخلیقی

انہوں نے ان خیالات کو نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ چونکہ وہ زبان کے مزاج شناس ہیں اور الفاظ کے دروبست سے شعر میں نغمگی پیدا کرنے کے فن سے بھی واقف ہیں۔اس لئے اُکھڑی اور نامانوس زمینوں سے بھی صاف اور دلنشیں شعر نکال لیتے ہیں۔ میرے نزدیک خالد محمود کی شاعری کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ شعوری طور پر فلسفۂ جدید و قدیم کو در آمد و بر آمد نہیں کرتے۔ عصر حاضر کے جن مسائل سے ایک صحیح الذہن انسان متاثر ہوتا ہے ،انہی معاملاتِ عقل و دل کو وہ تخلیقی زبان کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔ غزلوں کے علاوہ ان کی بعض نظمیں بھی بڑی پُراثر ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی ایک نظم ''چھ دسمبر'' اُس لرزہ خیز واقعہ پر لکھی گئی نظموں میں ایک جاں سوز اضافہ ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ خالد محمود بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ میرؔ و غالبؔ کی روایت سے ان کا رشتہ گہرا ہے۔اسی لئے انہیں یہ احساس ہے۔

پیچھے پیچھے سارے شاعر وہ بھی کتنی دور
آگے آگے دو ہی سخن اِک غالبؔ اِک میرؔ
ان کے آگے کون جلائے اپنا شعر چراغ
خالدؔ دو سورج ہیں روشن اِک غالبؔ اِک میرؔ

O

پروفیسر علی محمد خسرو
سابق وائس چانسلر اور چانسلر
علیگڑھ مسلم یونیورسٹی
چیرمین فائنانس کمیشن آف انڈیا

خالد محمود کی شاعری ایک تاثر

ایک دن عزیزم اختر الواسع کے گھر پر ڈاکٹر خالد محمود کا کلام سننے کا اتفاق ہوا تو ان کے لہجے کی ندرت، خیالات کی تازگی اور مضامین کی جدت، جسمیں احساس کی شدت بھی تھی، نے بیحد متاثر کیا۔

شاعری میں اگر اپنے زمانے کی آگہی اور عرفان نہ ہو تو وہ پھر محض لفظوں کی بازی گری بن کر رہ جاتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے ڈاکٹر خالد محمود کا جتنا کلام پڑھا اور سنا ہے اس میں عام انسانی زندگی کے تجربات، مشاہدات اور کرب وانبساط سب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

کام دلی کے سوا ہوتے نہیں
اور نا ہنجار دلی دور؟

قافلے میں ہم اس مقام پہ ہیں
جو صدائے جرس سے باہر ہے

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شے کی فراوانی نہیں ہے

تمہیں اک آئینہ ہو اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہی اور میں ہوں

اجالا نفی ہے جب اس نے کہا
اندھیرے میں تھے ہم نے باور کیا

ڈاکٹر خالد محمود جدید بھی ہیں لیکن قدیم سے انکا رشتہ صالح بنیادوں پر استوار ہے۔ وہ اسلاف کی روایات اور کلاسیکی شاعری سے استفادہ بھی کرتے ہیں اور اسکے معترف و مداح بھی ہیں۔ اس بات کی اس لیے بھی بڑی اہمیت ہے۔ کہ آج جب "بزعم خود" ہر شخص اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا، ایک حقیقی تخلیق کار اور فنکار کے یہاں یہ رویہ صرف ان کے انکسار کا نہیں بلکہ اس اعتماد کا بھی پتہ دیتا ہے جو اسے خود پر، اپنی تخلیقی صلاحیتوں پر ہے نیز اس شاعری ورثے پر بھی جو اسے متقدین سے ملا ہو۔

مجھے خوشی ہے کہ سہ ماھی "انتساب" ڈاکٹر خالد محمود کی تخلیقی و شعری خدمات کے اعتراف میں ایک خاص نمبر شائع کر رہا ہے۔ ہم عصروں کی خدمات کی ستائش ایک صحت مند اور زندہ معاشرے کا وصف ہے۔ اس لئے میں سہ ماھی "انتساب" کے ذمہ داروں کو اس کے لیے مبارکباد دیتا ہوں۔

○

خالد محمود کے چند متفرق اشعار

جو ہو سکے تو اسے مجھ سے دور ہی رکھئے
وہ شخص مجھ پہ بڑا اعتبار کرتا ہے

میں صرف نیلی فون کا احسان مند ہوں
اُن کا پیام بادِ صبا نے نہیں دیا

کبھی کہیں سے آجاتا ہے کوئی مسافر بھولا بھٹکا
ویسے تو اک مدت سے خالدؔ سونی ہیں وشواس کی راہیں

وہ بے وفا ہے یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
کفِ خیال میں اک آئینہ سا رہتا ہے

وقتِ قیام دستِ قضا نے نہیں دیا
چلنے لگے تو ساتھ ہوا نے نہیں دیا

جو کام، کام تھے خالدؔ تمام باقی ہیں
عزیزمن تری باتیں سوائیاں دیکھیں

پروفیسر شمیم حنفی
ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

نئے لہجے کی جستجو

خالد محمود کا مجموعہ "سمندر آشنا" ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا۔اس طرح ان کی شاعری سے تعارف کا سلسلہ پچھلے پندرہ برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ گاہے گاہے انھوں نے نظمیں بھی کہیں۔انشائیے، مضامین، خاکے بھی لکھتے رہے۔اردو میں سفر ناموں کی روایت پر ایک سنجیدہ علمی اور تحقیقی کام بھی پورا کرلیا۔مزاجاً مجلسی آدمی ہیں اس لئے شخصی اور سماجی تقریبات میں بھی ہمیشہ سرگرم دکھائی دیے۔ جامعہ میں اپنے تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ انتظامی امور میں بھی جن اساتذہ نے شہرت پائی ان میں خالد محمود کا شمار کم عمروں میں ہوتا ہے۔ مگر وہ اپنی عمر سے زیادہ سنجیدہ پندرہ بیس برس پہلے بھی نظر آتے تھے۔اس سنجیدگی کے غبار سے کبھی کبھی ایک کھلنڈری اور شوخ طبیعت رکھنے والے نوجوان کی شبیہ بھی ابھرتی ہے۔ بہت نجی قسم کی محفلوں میں یا پھر اس وقت جب آپ ان کے شعر سن رہے ہوں۔

خالد محمود کے مزاج میں جتنی تیزی اور بے خوفی ہے، اتنے ہی تکلف اور حجاب کا اظہار ان کی شعر خوانی سے ہوتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مجبوراً ہی شعر کہتے اور سناتے ہیں ایسا اکثر ہوتا ہے کہ شعر رسماً کہا جائے تو بات بنتی نہیں۔ ضرورتاً یا ارادۃً کہا جائے تو ایک معاشرتی فریضے کی تکمیل ہو جاتی ہے اور بس لیکن مجبوری کی حالت میں شعر کہنا گویا کہ ایک گہرے باطنی دباؤ اور داخلی ترغیب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ خالد محمود شعر سناتے ہیں تو اس طرح جیسے کہ انھیں اپنے اظہار سے زیادہ سننے والوں کا قرض چکانے سے غرض ہو۔ یہ دلداری خالد کی طبیعت کا بنیادی وصف ہے اور زندگی کا، دوستوں کا، زمانے کا قرض چکانے کے معاملے میں وہ ہمیشہ سنجیدہ رہتے ہیں۔

خالد محمود کی شوخی، جس کا اظہار بہت رچے ہوئے طریقے سے بعض اوقات ان

کے شعروں میں، یا نجی صحبتوں میں ہوتا ہے، دراصل ان کی سنجیدگی کا ہی ایک روپ ہے ایک ذاتی احساسِ غم یا چاروں طرف پھیلتی ہوئی بدہیئتی پر غصہ، خالد کو کبھی کبھی پردہ داری کے پھیر میں طنز اور شوخی کے راستے پر لگا دیتا ہے۔ یہ شائستہ فکری ہمارے زمانے میں افسوس کہ متاعِ عام نہیں بن سکی۔ اسی لئے اکثر شاعروں کے یہاں ایک طرح کی کلیت، دنیا بیزاری، برہمی اور ذات آلودگی کی کیفیت عام دکھائی دیتی ہے۔ یہ صورت حال بھی اگر حقیقی تجربے کی دین ہو تو بجا اور برحق، لیکن زیادہ تر صورتوں میں اس کیفیت نے صرف ایک رسم نبھائے جانے اور چاروں طرف پھیلے ہوئے راگ میں راگ ملائے جانے کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ موضوعات کی فہرست سازی تو خیر ہر زمانے کے شعری سرمائے کی بنیاد پر ممکن ہے، مگر ہمارے زمانے میں تو شعری علائم، استعارات، اسالیب اظہار کی گنتی بھی مشکل نہیں رہی۔ کثرت میں وحدت ہی سطح پر عذاب بن جاتی ہے۔ اور اسی کی وجہ سے، سالوں میں یا آئے دن سامنے آنے والے شعری مجموعوں میں جس قسم کی شاعری سے ہمارا تعارف ہوتا ہے اس میں تکرار بہت ہے۔ یک رنگی بہت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعر کہنے والے ایک طرح کی پریڈ میں مصروف ہیں۔ شاعروں کے نام اڑا دیے جائیں تو کسی کا کلام کسی کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔ الگ الگ اس کی پہچان دشوار ہوتی جا رہی ہے۔

خالد محمود نے غالباً دانستہ طور پر ایک نئے لہجے کی جستجو کو اپنا مقصود بنایا ہے۔ چنانچہ نہ تو وہ نوکلاسیکی لہجے کے شاعر ہیں، نہ ترقی پسند لہجے کے اور نہ ہی جدید لہجے کے۔ انھوں نے فیض ہمارے زمانے کے مروجہ اسالیب کے ساتھ ساتھ اپنے پیشروؤں کے تجربے سے بھی اٹھایا ہے، گویا کہ ان کا لہجہ غزل کے آزمودہ آہنگ اور اسالیب کی آمیزش سے ایک مختلف اور تازہ کار رنگ پر خود کو پہچاننے اور متعین کرنے کی کوشش سے عبارت ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لئے میں کچھ اشعار پیش کرتا ہوں:

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شے کی فراوانی نہیں ہے

ہر اک فیصلہ اس نے بہتر کیا
مجھے آنکھ دی تم کو منظر کیا

قافلے میں ہم اس مقام پہ ہیں
جو صدائے جرس سے باہر ہے

ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگا

کوہِ گراں کے سامنے تیشے کی کیا بساط
عہد جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی

اس طرح کے شعروں میں ہمیں جو مجموعی آہنگ ملتا ہے اس کی تشکیل اور تعمیر روایت اور شخصی تجربے کی باہمی سرگرمی کے بغیر ممکن نہیں۔ خالد محمود اس رمز سے باخبر ہی نہیں اس کے قائم کردہ تخلیقی ضابطے کے پابند بھی ہیں۔ اسی لئے ان کی تلاش رائگاں نہیں گئی۔

○

ڈاکٹر مظفر حنفی
اقبال چیر پروفیسر کلکتہ یونیورسٹی

"سمندر آشنا" کا شاعر

نئی شاعری کا سب سے بڑا مسئلہ اظہار ذات سے وابستہ تصور کر لیا گیا ہے اس لئے ۱۹۶۰ء کے بعد شاعری سے شوق فرمانے والے حضرات عام طور پر ابلاغ کے نام سے اسی طرح بدکتے ہیں جس طرح کسی زمانے میں ترقی پسند شعرا رجعت پرستی کے الزام سے خوف کھاتے تھے اور یہ تصور اس حد تک عام ہو گیا ہے کہ جدیدیت کی اصطلاح ہی بعضوں کے نزدیک افہام و تفہیم کی نفی کے مترادف ہو گئی ہے۔ ایسے غبار آلود مطلع ادب سے پچھلے دس بارہ سال کے درمیان طلوع ہونے والے ستاروں میں سے ایک کا نام خالد محمود ہے۔ بلاشبہ ان کی غزلیں اسی آشوب آگہی اور کرب ذات کا اظہار ہیں جس میں پوری جدید نسل مبتلا نظر آتی ہے لیکن اشعار کی تعمیر و تشکیل میں آہنگ اور تاثر کے ساتھ ساتھ مفہوم پر جتنا زور صرف کیا گیا ہے، تشبیہات، استعارات اور لفظی تشکیلات میں جیسی معنی خیزی پیدا کی گئی ہے اسے اہمال سے دور کا بھی تعلق نہیں البتہ کہیں کہیں اس تخلیقی ابہام سے ضرور کام لیا گیا ہے جو شعر کے مفہوم میں وسعت اور تاثر میں کئی پرتیں پیدا کرتا ہے:

ہر کمند ہوس سے باہر ہے
طائر جاں قفس سے باہر ہے

کوہ گراں کے سامنے تیشے کی کا بساط
عہد جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی

آواز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھئے
پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی

زمیں پر گرا تو یہ روشن ہوا
کہ خالد ترے راز داروں میں تھا

ایسے متعدد اشعار آپ کو "سمندر آشنا" میں پڑھنے کو ملیں گے۔ ان کی طلسماتی کیفیت دراصل اس ابہام کی زائیدہ ہے جو لفظوں کے تخلیقی برتاؤ سے پیدا ہوا ہے۔ طائر جاں کا قفس سے باہر ہوتے ہی کمند ہوس کی دسترس سے آزاد ہو جانا، کوہِ گراں کے مقابل تیشے کی بے بضاعتی کے باوجود لہو کی شرارت کا جوئے شیر کی صورت میں نمودار ہونا، پیچھے پلٹ کر دیکھنے کا تقاضا اور پلٹنے پر پتھر کے آدمی سے ملاقات (جانے آواز پتھر کے آدمی نے دی تھی یا پلٹنے والا پتھر کا ہوا) زمین پر گرنے کے بعد روشن ہونا کہ آدم خاکی رازِ ازل کا امین تھا، یہ سامنے کے مفاہیم ہیں جو مندرجہ بالا اشعار میں خوبصورتی کے ساتھ پروئے گئے ہیں البتہ الفاظ کے انتخاب اور نشست و برخاست میں ایسی فنکارانہ چابکدستی سے کام لیا گیا ہے کہ قاری اپنے ظرف اور حوصلے کے مطابق ان میں نئی جہات اور دوسری پرتیں بھی تلاش کر سکے ۱۹۷۰ء کے بعد کی نسل کے غزل گویوں میں تخلیقی ابلاغ کی ایسی روشن مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

پچھلے صفحات میں استاذی محترم قوی صاحب نے خالد محمود کی شخصیت اور کردار کے جن اساسی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اپنے تجربے اور شاعر سے ذاتی تعلق کی بنا پر میں ان کی توثیق کرتا ہوں اور شہادت کے طور پر خالد کے یہ اشعار پیش کرنا چاہتا ہوں:

تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

ہر اک زخم پر دل نے آواز دی
مرے محترم، مہرباں، آشنا

شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا مری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شے کی فراوانی نہیں ہے

ترے ساتھ چلنے کی عادت نہیں
ہماری نہ کر آزمائش ہوا

طبیعت میں خلوص، جانسوزی، غم سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ، ایثار کا مادہ اور بے لوثی نہ ہو تو یقین کیجئے شاعر ایسے چبھتے ہوئے شعر کہہ ہی نہیں سکتا۔ خود پسند اور خود نما

احباب کے ساتھ نباہ کرنا، ان کی کج ادائیوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ جھیلنا ان کے دکھ درد میں برابر کی شرکت رکھنا۔ اور اس کے ساتھ ایک درویشانہ قناعت سے کام لے کر زمانہ سازی سے دور رہنا خالد محمود کی فطرت ہے اور اس فطرت کی عکاسی نہ صرف پیش کردہ اشعار میں نظر آتی ہے بلکہ اس مجموعے کے تقریباً ہر صفحے پر جھلک مارتی دکھائی دے گی۔ ہمارے اکثر نئے شعرا کی تخلیقات ان کے شخصیت کے لئے حجاب کا کام کرتی ہیں، خالد محمود کے اشعار ان کی ذات اور شخصیت کی آئینہ داری کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

خالد کی شاعری نے بھوپال کی جس ادبی فضا میں آنکھ کھولی اس میں سراج میر خاں سحر سے لے کر شعری بھوپالی تک کی کلاسیکی غزل بھی مہک رہی تھی اور محمد علی تاج سے لے کر اختر سعید تک کی ترقی پسندانہ غزل کی خوشبو بھی فضا میں رچی بسی تھی نیز فضل تابش سے کر ظفر صہبائی تک آنے والی نسل کی تخلیقات میں جدید رجحانات کی بوباس بھی رچ بس چکی تھی۔ اس پر مستزاد سیفیہ کالج کے شعبہ اردو کا کھلا ڈلا ماحول اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی تربیت یعنی بیج نم زمین میں پڑا۔ آب و ہوا موافق ملی اور آبیاری کرنے والے معقول۔ نتیجے میں خالد محمود کی غزل قدیم و جدید کے غیر فطری حصار سے بالاتر ہو کر شاعر کے سچے جذبات و احساسات اور نجی تجربات کی ترجمان بن کر سامنے آئی۔ نہ اس نے کلاسیکیت کے صحت مند عناصر کو رد کرنا ضروری سمجھا نہ اپنی معاشرتی زندگی سے انحراف کو لازمی جانا اور نہ ہی لکیر کے فقیر بننے پر قناعت کی۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کی غزل میں زبان و بیان کی لطافت و چاشنی بھی ہے، طرز ادا کا اچھوتا پن بھی اور آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی کے اظہار کی صلاحیت بھی۔ بالفاظ دیگر ان کی غزل کلاسیکیت، ترقی پسندی اور جدیدیت کا حسین سنگم ہے:

دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
اک دست ناز یاد کا شانہ دبا گیا

کوئی شے گھر کی خوش نہیں آتی
وہ برس دو برس سے باہر ہے

میں تجھ سے بڑھ کے ساسی شعور رکھتا ہوں
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

خدا رکھے امریکہ وردس کو
میاں اپنا اخبار چلنے لگا

کوٹھیوں سے معذرت کے ساتھ کیا معلوم تھا
دھوپ میں جھلسے ہوئے بھی آدمی کہلائیں گے

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے

کیا ان اشعار میں بیک وقت کلاسیکیت کی مہک، ترقی پسندی کی چمک اور جدیدیت کی جھلملاہٹ کارفرما نہیں ہے۔ خالد محمود کے بیشتر اشعار طنز کی اساس پر ایستادہ ہیں لیکن ان کا طنز یہ لہجہ یگانہ کی طرح خشونت آمیز یا شاد عارفی کی مانند واشگاف نہیں ہے اس میں ایک خاص نوع کی نرمی اور لطافت ہے یعنی نشتر لگانے کے ساتھ ہی شاعر کافوری مرہم بھی رکھتا چلتا ہے کہ زخم میں جلن نہ ہو۔ پھر یہ بھی ہے کہ خالد محمود کے طنز کا نشانہ اگر دوسرے بنتے ہیں تو ان کی اپنی ذات بھی اس کی زد پر آتی ہے۔ مثالیں کچھ زیادہ ہو گئیں لیکن اچھے شعر سننے میں ایسا کچھ زیاں بھی نہیں

مندر کی گھنٹیوں سے فضا گونجنے لگی ۔۔۔ شاید ہوا ہے وقت سحر کی اذان کا
برائے تشنہ لب پانی نہیں ہے ۔۔۔ سمندر کا کوئی ثانی نہیں ہے
کام دلی کے سوا ہوتے نہیں ۔۔۔ اور ناہنجار دلی دور ہے

ابھی دھوپ خالدؔ پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگا

موضوعات کا اتنا وسیع ذخیرہ رکھنے والا، ادائیگی کے لئے ایسے نادر اسالیب اختیار کرنے والا، زبان و بیان میں ایسی احتیاط برتنے والا اور فن میں اپنی شخصیت کو اس سلیقے سے سمونے والا یہ شاعر نئی غزل کے لئے تازہ خون کی سی حیثیت رکھتا ہے۔

○

پروفیسر قاضی عبید الرحمٰن ہاشمی
صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ
نئی دہلی

حرکی پیکروں کی شاعری

شاعری جس نوع کا فنی اور جمالیاتی وظیفہ ہے اس کی پہچان فقط لفظ سے ہوتی ہے نہ معنی سے بلکہ ان دونوں کی پیوستگی سے وجد میں آنے والی کلیت کا نام شاعری ہے۔ اس مرکب کی متناسب تشکیل، تنظیم و تعمیر میں فنکار کا تخیل بے حد اہم کردار ادا کرتا ہے۔ خصوصاً زندگی کے عموماً مرئی اور ٹھوس حقائق کو شاعرانہ آب و رنگ عطا کرنے میں بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو شعری تجربہ تہی مایہ اور کم سواد ہو کر رہ جاتا ہے بلکہ ایسے تجربے کو شعری تجربہ کہنا ہی سرے سے غلط ہوگا۔ یہ شاعرانہ تخیل اور شاعرانہ نظر ہی تو ہے جو زندگی کی جامد اور بے رنگ حقیقتوں میں نئے رنگوں اور امکانات کی جستجو کرتی ہے، لمحہ حال کے بطن میں مرتعش مستقبل کے دلنشیں خوابوں کو دیکھتی اور دکھاتی ہے۔ یہ وہ شاعرانہ کائنات ہے جو اصلیت سے قریب ہوتے ہوئے بھی اپنی ایک الگ پہچان اور امتیاز رکھتی ہے۔ اصوات و علائم رنگوں اور شعری پیکروں سے آراستہ یہ کائنات بس اپنی نظیر آپ ہے۔ اس تناظر میں خالد محمود کی شعری کائنات کا سفر بھی لطف و لذت سے خالی نہیں ہے۔ خالد محمود غزل کے شاعر ہیں اور ریزہ خیالی کی ریاضت سے بخوبی باخبر ہیں۔ فیشن پرستی ان کا شیوہ نہیں اسی لئے ان کے یہاں قصہ جدید و قدیم میں آویزش اور پیکار کے بجائے ایک نوع کی ہم آہنگی اور امتزاج کی صورت نمایاں ہے۔ حسی پیکروں کی صورت گری میں بھی اسی روش اعتدال کا ظہور ہوا ہے، اکثر جذبات کے فشار نے رنگین تتلیوں کی صورت اختیار کر لی ہے جن کا تعاقب اپنے اندر عجب لطف رکھتا ہے، تاہم بوقلموں شعری پیکروں سے آراستہ تخیل کی اس سرزمین کا لطف ان جاری پیکروں کے سبب ہے جو حرکت اور حرارت کا ... معنی ... اور قدر و قیمت عطا کرتے ہیں۔

خصوصیات ہیں جو خالد محمود کے شعری پیکروں میں عام طور پر دیکھی جا سکتی ہے، مثلاً

حوصلہ ٹوٹا تو وہ عبرت کا منظر آ گیا
اڑ نہیں پائے پرندے بال و پر ہوتے ہوئے

پرندوں میں حوصلۂ پرواز کی کمی کے باعث، ان کی حالت زبوں کے علی الرغم خود پرندہ، اڑان اور بال و پر کی وساطت سے جہاں ایک دلنشیں بصری پیکر سامنے آتا ہے وہاں حرکت اور حرارت کی مصوری بھی پیش نظر ہے جو ہر پرندے کے استعارے سے وابستہ ہو کر خود شاعرانہ ذہن کی ساخت پر بھی روشنی ڈال رہی ہے۔ مرقع نگاری کی ایک صورت اس شعر میں دیکھیں ؂

ہر ایک سمت ہیں پختہ بلند دیواریں
سنہری دھوپ کے آنگن بتا کہاں ہے تو

یہاں ''سنہری دھوپ'' کی معنویت غور طلب ہے جو شہری تمدن کے فروغ سے ماضی کا ایک خواب بن چکی ہے، ''سنہری دھوپ'' ایک مجرد نامیاتی پیکر ہے جو زندگی کی ایک مانوس حقیقت کو حقیقت بنا کر پیش کر دیتا ہے۔

مسلسل تحریک اور مرتعش پیکروں کی کچھ دلچسپ مثالیں ذیل کے اشعار میں دیکھی جا سکتی ہیں جو ایک ہی ردیف کے حامل ہیں ؂

نہیں ہے اگر ان میں بارش ہوا — اٹھا بادلوں کی نمائش ہوا
کبھی برف ہے گاہے آتش ہوا — تجھے کیا ہے دلی سے رنجش ہوا
شکستہ سفینہ مسافر نڈھال — تلاطم شب تار بارش ہوا
ترے ساتھ چلنے کی عادت نہیں — ہماری نہ کر آزمائش ہوا

عجیب اتفاق ہے کہ غزل کے یہ اشعار منفرد ہونے کے باوجود ردیف کی یکسانیت کے سبب ایک مکمل نظم کا تاثر دے رہے ہیں جن میں شاعر ہوا سے مخاطب ہو رہا ہے، البتہ نامیاتی پیکروں کی جستجو کی حد تک ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ پوری نظم نما غزل شاعرانہ تخیل کی

معجزہ کاری اور زرخیزی کی خوبصورت مثال ہے۔ چنانچہ بارش، بادل، ہوا، آتش، سفینہ اور تلاطم بصری سمعی اور مشموعاتی پیکر ہونے کے ماسوا زندگی اور اس کے زیر تپش اور حرارت کی لامتناہی صورتوں کا استعارہ ہے بے شک ان اشعار کی وساطت سے شاعر کے قصے ساز رومانی تخیل کی مہارت کا بھی سراغ ملتا ہے لیکن جذبات کی مصوری اس پر مستزاد ہے شاعرانہ تخیل ہر آن نئے مضامین کی جستجو میں سرگرداں رہتا ہے، چنانچہ یہ شعر ؂

شب کی اندھری کوکھ سے نکلا مری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

معنوی سطح پر اپنی ذات اور آفتاب جہاں تاب کے درمیاں تقابل اور پر لطف اعلان افتخار کے ماسوا سورج اور چراغ کی وساطت سے بننے والا دلنشیں پیکر اپنی داخلی خصوصیات کے اعتبار سے زندگی ہی کے متعلقات کا تسلسل اور گہرا با معنی اشاریہ ہے حاری (Thermal) پیکروں کے حوالے سے یہ شعر توجہ طلب ہے ؂

کوہ گراں کے سامنے تیشے کی کیا بساط
عہد جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی

یہاں تیشہ، جنوں، لہو کی تمام تر استعاراتی معنویت ان بصری اور مجرد تمثالوں کے سبب ہے جو اپنا ایک لازمی، حرکی اور نامیاتی کردار رکھتی ہیں۔ اسی ضمن میں یہ شعر ؂

وہ بے وفا ہے یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
کفِ خیال میں اک آئینہ سا رہتا ہے

روایتی مضمون کو اس درجہ دل آویز شعری اسلوب میں ڈھالنا کمال ہنر مندی ہے کفِ خیال میں آئینہ کا استعاراتی تلازمہ جہاں شاعرانہ تخیل اور جمالیاتی ادراک وصناعی کا نمونہ ہے اپنی حرکی کیفیات اور زندگی سے معمور مضمرات کے لحاظ سے بھی ''آئینے'' کا پیکر بے مثال ہے۔ اسی مضمون کی ایک نئی صورت اس شعر میں دیکھی جاسکتی ہے ؂

سیلاب کی آمد پہ نہ حیرت ہے نہ ڈر ہے
خالد کا تو دریا کی گزر گاہ میں گھر ہے

یہاں بھی سیلاب اور دریا کی استعاراتی معنویت ان سے برآمد ہونیوالے بصری

پیکروں کے سبب ہے، تاہم ان پیکروں کو پایان کار جو خصوصیت قابل توجہ بناتی ہے وہ سیلاب اور دریا کے باطنی وجود میں پوشیدہ اضطراب اور زندگی کی تڑپ ہے۔ اس سلسلہ کا آخری شعر ؎

لہو میں وہ جوش و ترنم نہیں
یہ دریا کبھی کوہساروں میں تھا

یہاں بھی شاعر کی نظر جن استعاروں کا انتخاب کرتی ہے وہ لہو، جوش، ترنم دریا اور کوہسار سے مزین شاعرانہ تخیل و تصور کی سرزمین ہے، ان بصری تمثالوں اور مجرد، مشموعاتی حسیّ پیکروں کے ہجوم میں ایک خصوصیت جو یہاں بھی ان بظاہر غیر متعلق پیکروں کو ایک رشتۂ وحدت میں پروتی اور داخلی ربط پیدا کرتی ہے اب وہی زندگی اور اس کے اندرون سے ابلتا ہوا نغمہ سرمدی ہے جس کا سرور دائمی ہے۔

خالد محمود کی شعری تمثالوں کے اس مختصر سے جائزے سے جہاں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ شاعری کے جمالیاتی تقاضوں اور فنی آداب و رسوم سے کامل آشنائی رکھتے ہیں وہاں یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی شاید غلط نہیں کہ اپنے مسلک اور بنیادی نصب العین کے اعتبار سے وہ شر کے بجائے خیر یاسیت کے بجائے آرزو مندی۔ سائے کے بجائے روشنی، موت کے بجائے زندگی اور اس کی تمام تر ایجابی، مثبت اور صالح اقدار کی سرافرازی کے خواہاں، ان کے نقیب اور علمبردار ہیں۔

○

ڈاکٹر اسعد بدایونی
شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

خالد محمود کی غزل۔ ایک تاثر

خالد محمود کی شاعری کو میں نے رسائل کے حوالے سے بہت کم پڑھا تھا۔ لہٰذا ان کے بارے میں کوئی رائے بھی قائم نہیں کی تھی۔ یوں بھی رسائل میں کسی شاعر کی ایک آدھ غزل پڑھ کر کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ مگر اب کئی رسائل کسی ایک شاعر کی آٹھ دس چیزیں ایک ساتھ شائع کرنے لگے ہیں جس سے بڑی حد تک کوئی نہ کوئی رائے قائم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ رسائل کے مخصوص گوشے اور نمبر بھی زندہ اور تازہ فن کاروں کو نمایاں کرنے کا کام انجام دینے لگے ہیں۔ مگر عام طور پر ان رسالوں کو مالی تعاون بھی وہی فن کار فراہم کرتا یا کراتا ہے جس کا گوشہ یا نمبر ہو۔ اس صورتِ حال میں بیشتر ناقص گوشے اور نمبر ہی سامنے آرہے ہیں۔ کیونکہ ان کا مقصد فن کار کی تعینِ قدر نہیں بلکہ تعریف و توصیف ہوتا ہے فرمائش پر لکھے گئے مضامین عام طور پر ہر فن کار کو عظیم اور منفرد ثابت کرتے نظر آتے ہیں۔ بیشتر مضامین میں صرف نام اور اشعار تبدیل کردیے جاتے ہیں۔ یہ رویہ کتنا درست یا کتنا غلط ہے اس کا فیصلہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہی ہوگا مگر کیا فن کار اپنے ضمیر سے مطمئن ہونگے جو یہ سب کر رہے ہیں یا اسے فروغ دے رہے ہیں؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جس پر غور کرنا ہر سنجیدہ قاری اور فن کار کے لیے ناگزیر ہے۔

خالد محمود کا یہ نمبر کس طرح شائع ہورہا ہے یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ مگر ان کی تخلیقات کو ایک ساتھ پڑھ کر خوشگوار حیرت ضرور ہوئی کہ ایک اچھا شاعر ابھی تک میری دسترس سے باہر تھا:

دل کی دنیا میں اندھیرا ہو تو روشن کچھ نہیں
آنکھ، چشمِ سنگ ہے شمس و قمر ہوتے ہوئے

حوصلہ ٹوٹاتووہ عبرت کا منظر آگیا
اڑ نہیں سکتا پرندہ بال وپر ہوتے ہوئے
ہر کس وناکس پہ کرلیتا ہے فوراً اعتبار
بے خبر کتنا ہے خالؔد باخبر ہوتے ہوئے

مندرجہ بالااشعار ایک ہی غزل کے ہیں مگر کیاان سے عہد حاضر و موجود کی سفاکی اور ریاکاری کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز منظر نامہ تشکیل نہیں دیا جاسکتا؟ یقیناً ایسا ممکن ہے۔ دل کی دنیااگر روشن ہو تو باہر کے مناظر بھی سر سبز و شاداب نظر آتے ہیں اور حوصلے کی شکستگی و سائل کے باوجود کسی کام کے انجام میں مانع ہوتی ہے۔ رشتوں کی بے حرمتی کرنے والے، دوسروں کے اعتبار کو ٹھیس پہنچانے والے افراد سے یہ دنیا بھری پڑی ہے اور خالد محمود کو اس سنگین صورتِ حال کا شاکی و نوحہ گر ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔

تصوف کے مسائل و معاملات اور اصطلاحات اردو شاعری میں ابتدا ہی سے شامل رہے اور وہ شاعر جو باضابطہ صوفی نہیں تھے انھوں نے بھی منھ کا مزہ بدلنے کے لئے تصوف کا سہارالیا ہے اور تصوف کو "برائے شعر گفتن خوب است" کا درجہ ماضی قریب تک حاصل رہا ہے۔ لیکن نئے شعرانے اس طرف بالکل دھیان نہیں دیا۔ مگر مجھے خالد محمود کے ایک شعر میں جدید صوفیانہ طرزِ اظہار کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اگر وہ اس طرزِ اظہار یا اسلوب کو مزید وسعت دے سکے تو عہدِ حاضر کے ایک "مختلف" شاعر کا درجہ انھیں ضرور حاصل ہو جائے گا۔ شعر کے الفاظ نہایت سادہ مگر گہرائی و گیرائی میں سمندر مثال ہیں صوفیانہ استغنا کا وہ شعر یہ ہے۔

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شے کی فراوانی نہیں ہے

خالد محمود کھلی آنکھ اور روشن ذہن کے شاعر ہیں اور اپنی ارد گرد کی دنیا اور اسکے مسائل پر گہری نظر بھی رکھتے۔ درس و تدریس کے پیشے سے وابستگی کے بعد امتحان لینا اور ممتحن ہونا ایک نہایت معمولی بات ہے مگر موجودہ تعلیمی نظام کی بگڑی ہوئی صورتِ حال میں امتحان گاہ میں تین گھنٹے امن و سکون کے ساتھ گزار دینا نہایت دشوار کام ہے۔ جہاں ممتحن کو خود امتحان سے دو چار ہونا پڑتا ہے:

لڑکوں کو نقل کرنے سے ہے روکنا مجھے
پھر وقت آگیا ہے مرے امتحان کا

خالد محمود کا سیاسی و سماجی شعور نہایت بیدار اور دراک واقع ہوا ہے۔ مذکورہ بالا شعر کے حوالے سے اسے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ سر دست سیاسی سروکار یا منظر نامے کے حوالے سے دو اشعار پیش ہیں:۔

یہ آگ کس نے لگائی یہ خون ہے کس کا
مرے وطن مرے گلشن بتا کہاں ہے تو
میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

فارسی ادبیات سے ان کی وابستگی شیخ سعدی کے مشہور مقولے کو اپنے ایک شعر میں نظم کرنے سے ظاہر ہوتی ہے وہ مشہور مقولہ ہے "تا تریاق از عراق آوردہ شود، مار گزیدہ مردہ شود" اب خالد محمود کا یہ شعر دیکھیے:۔

کون دلّی سے مسیحا لائے گا
چل دیا بیمار دلّی دور ہے

عہدِ حاضر و موجود میں رشتوں اور رابطوں میں خلوص و محبت کا فقدان اور منافقت کا جو اندازِ یار جحان شامل ہو گیا ہے اسے خالد محمود نے اس طرح شعری پیکروں میں منتقل کیا ہے:۔

گز بھر اونچی لہروں والے دریا کی طغیانی کیا
جس میں جتنا کم ہے پانی اتنا ہی طوفانی ہے

گاؤں کا اک سیدھا سچا آدمی
شہر میں کیوں لا دلایا، پھینک دے

جو ہو سکے تو اسے مجھ سے دور ہی رکھیے
وہ شخص مجھ پہ بڑا اعتبار کرتا ہے

میں جس خیال سے دامن کشیدہ رہتا ہوں
وہی خیال مرا انتظار کرتا ہے

ہم عصر حالات و واقعات کا شاعرانہ اظہار خالد محمود کی غزلیہ شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ ان کی تقریباً ہر غزل میں ایسے اشعار مل جائیں گے جو عہد حاضر و موجود سے ان کی بے اطمینانی اور موجودہ انسانی رویوں کے ساختہ و پرداختہ فتنہ پرور ماحول میں علم و ہنر کی

ناقدری کے شکوے کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے کلام میں انفعالی قنوطیت بہر حال نہیں ہے اور غالباً ایسا اس لیے ہے کہ وہ ابھی انسان سے پوری طرح مایوس نہیں ہوئے:۔

تمھیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

خالد محمود کی مختلف غزلوں کے مطالعے کے بعد جو رائے قائم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم عصر شعرا میں وہ ایک قابلِ ذکر شاعر ہیں مگر ان کی ادبی شہرت ان کے دوسرے بہت سے ہم عصر شعرا کے مقابلے میں خاصی محدود ہے۔ اس کی وجہ بادی النظر میں کسی "ادبی مافیا" سے ان کی عدم وابستگی ہی نظر آتی ہے۔ یا پھر خالد محمود نفسِ مطمئن کے حامل ہیں کیونکہ شہرت و نام وری ان کے نزدیک "لذتِ تسکین باطل" کے علاوہ کچھ نہیں:۔

بجز اک لذّت تسکینِ باطل
کسے شہرت نے خالد کیا دیا ہے

خالد محمود کے اس سوالیہ شعر کا کوئی معقول جواب قارئین کے پاس ہو تو ہو فی الوقت مجھے نہیں سوجھ رہا ہے۔ میں نے ان کی غزلوں پر جو رائے دی ہے ضروری نہیں کہ پڑھنے والے اس سے متفق بھی ہوں۔ یقیناً ان کے اس نمبر میں بہت سے وقیع مضامین شامل ہونگے جو ان کی شاعری کی تحسین و تفہیم کے نئے گوشوں کو اجاگر کریں گے۔

○

ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی
نائب مدیر رسالہ "جامعہ"
ڈاکٹر ذاکر حسین اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ،
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔ ۲۵

نارسائی کا رمز آشنا شاعر۔ خالد محمود

شاعری کے حوالے سے خالد محمود کا نام میرے نزدیک اس لئے قابل ذکر ہے کہ جب ان سے قربت بھی نہیں تھی ان کے کئی اشعار پہلی ہی سماعت میں مجھے ازبر ہو گئے اور آج تک ذہن میں محفوظ ہیں مثلاً

ترے ساتھ چلنے کی عادت نہیں
ہماری نہ کر آزمائش ہوا
دیکھی جو اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
اک دستِ نازیاد کا شانہ دبا گیا

زمانہ اور ہوائے زمانہ پر اک نگاہ غلط انداز ڈال کر آگے بڑھ جانے کے رویے اور تیور کا اظہار وہی کر سکتا ہے جس نے اس کے انصرافات کا قریب سے مشاہدہ کیا ہو اور اس کی ترغیبات کے آگے پسپانہ ہونے کا عزم بھی کر رکھا ہو خواہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہو کہ بقول مجروحؔ ؎

ہوائے دہر نے بدلی نہ ہم سے وضعِ خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

زمانہ بہت تیز رفتار ہے زندگی کی برہنہ حقیقتیں روبری کھڑی نظر آتی ہیں۔ لیکن اکثریت ان سے کترا کر نکل جانے والوں کی ہے۔ خوف اور اندیشے ان ذہنوں پر بھی منڈلا رہے ہیں جو نصف صدی پہلے ان کے ادراک کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے گویا کہ ہمارا عہد معصومیت کے تقدس اور ارضی تجربات کی کثافت کے درمیانی فاصلے کو پُر کر چکا ہے۔ ان اندیشوں سے آگاہ کرنے والے پہلے بھی کم تھے اور اب وہ مرحوم ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ

اندیشہ فردا تشکیک اور بے یقینی سے عبارت ہے اور تذبذب اور کشمکش سے بھی۔ یہی بے یقینی اور عدم تحفظ کا احساس آج کے انسان کو جھوٹے سہاروں کی طرف لے جاتا ہے اور سائے کی جنوں خیز تلاش بے سمت انسان کو گرتی ہوئی دیوار کی طرف سے بھی غافل کر دیتی ہے۔ شاعر اسی احساس کو یوں بیان کرتا ہے۔

ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگا

شاعری اپنی تمام تر تعریفوں اور تشریحوں سے قطع نظر نارسائی کا عمل بھی ہے مصور ہو کہ رقاص، سنگ تراش ہو یا شاعر ہر کوئی اپنے ذہن میں جاگزیں کسی آدرش تصور کو دستیاب قدرتی خام مواد کی مدد سے ایک قالب عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ کوشش اگر سعی رائیگاں نہیں ثابت ہوئی تو سعی کامل بھی نہیں بننے پائی۔ اس طرح لبِ بام تک پہنچنے سے پہلے بار بار کمند کا ٹوٹنا اس تخلیقی عمل کی سرگرمی کو پر لطف اور بامعنی بناتا ہے۔

خالد کا شعری سرمایہ مختصر مگر وقیع ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام ''سمندر آشنا'' میں مجھے جس خوبی نے خاص طور پر متاثر کیا وہ ہے مختصر بحروں میں کہی گئی غزلوں کی اچھی خاصی تعداد۔ سیدھے سادھے ساڑھے تین یا چار الفاظ میں پُر معنی مصرعے موزوں کرنا اسی کے لئے ممکن ہے جسے نہ صرف زبان و بیان پر قدرت حاصل ہو بلکہ اس کا تجربہ اور احساس بھی بالیدہ ہو۔ مشاہدے کی یہی وسعت اور بالیدگی فنکار کو حق و ناحق، نور و ظلمت کے امتیاز سے آگاہ کرتی ہے اور آئینہ نما بے چہرہ لوگوں کے درمیان رہ کر جینے کا ہنر بھی سکھاتی ہے۔ خالد اس معیار پر بڑی حد تک کھرے اترتے ہیں۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے۔

روز اخبار ہم سے کہتا ہے — جھوٹ کو سچ کے باب میں رکھئے
ایک زنجیر کیا کٹی خالد — مجھ سے کترا گیا مرا سایہ
چہرہ چہرہ ایک سوال — یعنی میرا کیا ہوگا

انہوں نے زمانے کی تیز رفتاری اور اس کی دراکی سے پیدا ہونے والے گوناگوں مسائل کے تئیں اپنی ردِ عمل کو تخلیقی اظہار عطا کرنے میں خاص سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہے

سوا نیزے پہ سورج آگیا ہے — ہماری صف ابھی سیدھی نہیں ہے
ہم فضاؤں میں کچھ اونچا اڑ کر — بھول بیٹھے ہیں بسیرا اپنا

آج کی سبھی خبریں نارمل سی لگتی ہیں ساحلِ سمندر پر کل وہ بھیڑ کیسی تھی
اک ذرا، تیز ہوئی تھی رفتار ہم سفر چیخ اٹھا آہستہ

مصلحت پسندی تہذیب نو کا شعار ٹھہری ہے اور صاف گوئی کو اس دور سے ناشائستگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ شاعر زمانے کی اس کج روی سے پوری طرح باخبر ہے۔

اس فرد سے پھر آج میں ہنس کر ملا کہ جو موقع ملے تو پشت میں خنجر اتار دے
تہذیب نو نے اس کا نشاں تک مٹا دیا جیسے خلوص وقت کے ماتھے پہ داغ تھا

"سمندر آشنا" کے اشاعت کے بعد سے خالد نے نظم کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور جن موضوعات کا انتخاب اپنے لئے کیا ہے وہ ان کے مخصوص ذہنی رویوں کا پتہ دیتے ہیں یعنی کہ وہ زندگی کے بارے میں سنجیدہ زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں اس کی پامالی پر اشک فشاں ہوتے ہیں۔ مثلاً "وجود کا کرب" ایسی ہی ایک نظم ہے جس میں شاعر محافظِ وطن کہلانے والوں کے ہاتھوں اہلِ وطن کی ہلاکت پر نوحہ کناں ہے۔ یہ نظم اپنی جگہ پر ایک ایسا سوال بھی ہے جس کا جواب ہر آنے والی نسل اپنے ہم عصروں سے طلب کرتی رہے گی

تمہیں مبارک ہو موت اپنی کہ مر گئے ہو تو کتنے خوش ہو
کہ اب تمہاری طرف تو نالیں نہیں اٹھیں گی تمہارے اپنے محافظوں کی
نہیں جلیں گے مکاں تمہارے تمہارے بچے یتیم ہوں گے نہ مائیں بیوہ
تمہاری بہنوں کی عصمتیں بھی نہیں لٹیں گی نہ تم جیو گے نہ تم مرو گے
کہ مر چکے ہو تو مطمئن ہو تمہیں مبارک ہو موت اپنی

لیکن نظم کا اگلا حصہ بتا رہا ہے کہ مرنے والوں کا یہ اطمینان خام خیالی سے زیادہ کچھ نہیں اور جن سانحات کی طرف اوپر کے بند میں اشارہ ہوا ہے وہ برابر رونما ہوتے رہیں گے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے:

کہ ہم جو زندہ ہیں اس لئے ہیں کہ اپنی باری کے منتظر ہیں
سب اپنی باری کے منتظر ہیں ہم اپنی باری کے منتظر ہیں
وہ اپنی باری کے منتظر ہیں

تاہم یہ خام خیالی اور فسردگی رجائیت اور اور اور زندگی پر موت کو ترجیح دینے کی حوصلہ مندی میں تبدیل ہو جاتی ہے جب ہمارا واسطہ "زندگی کیا ہے اگر موت اسے کہتے

ہیں" سے پڑتا ہے دونوں نظمیں اس طرح ایک ہی حقیقت کے متضاد پہلوؤں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ دوسری نظم اپنی رومانی فضا اور مترنم تفصیلات سے سوگواری کے احساس کو تقویت اور طمانیت سے ہمکنار کر دیتی ہے اور قاری بھی خود سے کہہ اٹھتا ہے اگر موت یہی ہے تو زندگی کیا ہے یعنی اس موت نے تو زندگی کو بھی شرمسار کر دیا ہے۔ نظم کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

آج پھر رات گئے درد نے کروٹ بدلی دل کے حساس دریچے سے ہوا کا جھونکا
میں نے سوچا تھا کہ لمحات کی رفتار لئے شعلۂ آتشِ غم چھو کے گزر جائیگا

شاعر مختلف جلتی بجھتی کیفیتوں سے گزر کر آخری بند میں ان الفاظ میں ہم کلام ہے:

صاف ہوتے گئے تصویر کے دھندلائے نقوش ذہن کی سطح پر نورانی سا پیکر ابھرا
نرم مشفق سے خدو خال دمکتا چہرا بولا احساس کہ یہ ہیں وہی سجاد حسین
منبع علم تھی کل ذات گرامی جن کی علم کی آج بھی پہچان ہے تحفہ ان کا
موت نے چھین لیا پیکر خاکی لیکن وہ نئے دور کے سینے میں ابھی زندہ ہیں

خالد کوئی پچیس سال سے تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں وہ معلم کے فرائض سے آشنا اور اس کی تقدیس کے قائل بھی ہیں اور اس دور کی معلم ناشناسی کے رویے سے شاکی بھی۔ ظاہر ہے کہ اس رویے کا اہم ترین سبب ہے ہر قدر کو پیسے میں تولنے کا چلن اس کے باوجود خالد اس صورت حال کو بدلنے کی ہمت رکھتے ہیں اور دنیا سے پر اعتماد لہجے میں مخاطب ہیں۔

میں اگر نہیں ہوتا جنگلوں کے پیڑوں کی
خشک چھال اور پتے سب تمہارے جسموں کا
جزو بن گئے ہوتے میں اگر نہیں ہوتا
تو تمہاری اولادیں نالیوں کے کیڑوں سی زندگی بسر کرتیں
میں کہ اک معلم ہوں

خالد نے ایسی نظمیں بھی کہیں ہیں جہاں وہ مظاہرہ کائنات سے سرگوشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کی حقیقت پر اپنے دل کی مختلف کیفیتوں کی اور آرزوؤں کی

رہنمائی میں نظر کرتے ہیں مثال کے طور پر "زاویے" کے دو بند:

چاند لگتا ہے کرشن ہو جیسے　　اور تارے ہوں گوپیاں اس کی
کرشن کو میں نے جب جہاں پایا　　گوپیوں ہی کے درمیاں پایا
چاند لگتا ہے اک ٹرافی ہے　　اور تارے ہیں کپس چاندی کے
جیت کر کوئی ٹیم ان سب کو　　آسماں پر سجا کے آئی ہے

خالد کی شاعری کے اس جائزے سے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ نارسائی یا نیم رسائی کے عمل میں اس نے ایسے نقوش ضرور ابھارے ہیں جو الوداع کہتی ہوئی اس صدی کے ربع آخر کے شعراء میں اس کی حیثیت کو مستحکم کرتے ہیں۔

○

ڈاکٹر شہپر رسول
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

خالد محمود کی غزل کا ایک نمایاں پہلو

خلوص رنگ انکسار، انسان نوازی اور مذہبی و تہذیبی روایت وافکار سے لبالب روز و شب خالد محمود کی شخصیت اور شعری فکر کی بنت میں شامل ہیں اپنی بات کو پر زور انداز میں کہنے، اعتراف وانحراف کا اعلان کھلے دل اور کھلی آواز سے کرنے نیز دوسروں کے ساتھ خود اپنی ذات پر بھی طنز کی بوچھار کرنے کا ہنر و حوصلہ ان کی مذکورہ بنیادی شخصی اور شعری فکر کے عناصر ترکیبی میں شامل ہے۔ چنانچہ خالد محمود کی غزل کو اس فرد کے احساس و ادراک کی تصویر کہا جاسکتا ہے جو اکثر و بیشتر فرد ہوتے ہوئے "افراد" بن جانے کے وطیرے کا حامل ہو اور بعض اوقات انبوہ افراد و اشخاص میں تنہا ہو جانے کے ملال کو باوقار سنجیدگی کے ساتھ معمولِ زیست بنالینے کا سلیقہ بھی رکھتا ہو۔

مذکورہ بالا شخصی و شعری رویے کی تفہیم خالد محمود کی غزل میں چمکنے والے شعری پیکروں کی وساطت سے بخوبی ہو سکتی ہے، کیونکہ تخلیق کار کی مخصوص پیکر تراشی اس کے تجربات و مشاہدات کا ایسا ہمہ رنگ آئینہ ہوتی ہے جس میں اس کے تجربات و تاثرات کی کائنات، اس کی وسعت نگاہ اور اس کی شعری تخلیقی حدود کو دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

خالد محمود کی غزل میں نئی زندگی کے آلام و مصائب، حادثوں، واقعوں، شکستوں اور خواب شکن کیفیات کا اظہار تو ملتا ہے لیکن مایوسی کی فضا کے لیے ان کے شعری رویے میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بلکہ انہوں نے مذکورہ حالات و کیفیات سے صبر و شکر اور قناعت کشید کرنے کا فن سیکھا ہے اور "انا" کا ایک ایسا خوبصورت اور بھرپور پیکر تراشا ہے جو موصوف کی شخصیت اور شاعرانہ استغنا کا عکاس ہے۔ میں نے اس سے پیشتر کہیں لکھا ہے کہ "انا" اسی وقت صحت مند ہو سکتی ہے جب اس کے پس پشت نسلی شرافت اور آبائی فراست

کے ساتھ ساتھ ذاتی ذہانت و ذکاوت بھی مصروف کار ہو۔ خالدؔ محمود کی شعری فکر میں متذکرہ تمام چیزوں کا دیدار بحسن و خوبی کیا جا سکتا ہے۔ وہ "انا" کے پیکر کی تخلیق میں اپنی مخصوص لفظیات کے ساتھ تخلیقی طنز کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ جس کے سبب رنگ سخن اور گہرا ہو جاتا ہے ؎

تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

بھڑکتی آگ میں پیدا ہوا ہوں
سمندر زندگی سے آشنا ہے

ساری کایا اور مایا پھینک دے
اپنے سر سے دھوپ چھایا پھینک دے

ہر کمند ہوس سے باہر ہے
طائر جاں قفس سے باہر ہے

شہ رگ پر تلوار رکھی ہے، تیور میں سلطانی ہے
اپنی کلاہ کج کے قرباں قاتل کو حیرانی ہے

شاید کہ مر گیا مرے اندر کا آدمی
آنکھیں دکھا رہا ہے برابر کا آدمی

پہلے شعر میں آئینہ اور اس کی بے پناہ تلازماتی وسعت کا "میں" کی طنزیہ کیفیت کے ساتھ وارد ہونا، دوسرے شعر میں شاعر کی ذات کا سمندر کی شکل اختیار کر لینا اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں زندگی کرنے کو اپنا معمول ظاہر کرنا، تیسرے شعر میں کایا اور مایا روپی دھوپ چھایا کو پھینکنے پر اصرار کرنا، چوتھے شعر میں طائر جاں کا ہوس کی دسترس سے باہر ہونے کے سبب ہر قفس اور تمام بندشوں سے آزاد ہونا بلکہ دور اور بے نیاز ہونا، پانچویں شعر میں شہ رگ پر تلوار کے رکھے ہوئے ہونے کے باوجود تیوروں میں سلطانی قائم رہنا اور اس کج کلاہی پر قاتل کا حیران ہونا اور آخری شعر میں برابر کے آدمی کے آنکھیں دکھانے پر اپنے اندر کے آدمی کے مر جانے کا گمان ہونا ایسا استعاراتی شعری اظہار ہے جو ایک ہمہ جہت، معنی خیز اور تابندہ نفسیاتی شعری پیکر کی تجسیم کرتا ہے۔ جس کو "انا" کا پیکر کہا جا سکتا

ہے۔ یہ پیکر شعری معنویت اور رمزیت میں اضافے کا موجب بھی ہے اور شاعر کے طبعی نیز نسلی تحفظات کا آئینہ دار بھی۔ ان اشعار میں خالدؔ محمود زندگی کے جس عرفان اور جس رنگ کو انگیز کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا سراپا خواہ دنیا دار آدمی کا ہو لیکن ان کی روح یقیناً ایک صوفی کی روح ہے۔ یہ تمام اشعار ان کے افتخار پندار کو بھی تصویر کرتے ہیں نیز ان کے خمیر میں گندھے ہوئے روایتی انکسار اور عصری شعور کی چمک کے انسلاک واختلاط سے معنوی دھنک رنگی کا سماں بھی پیش کرتے ہیں۔

کولرجؔ نے کہا تھا کہ جدید شاعر آنکھ اور کان کا غلام ہے۔ اس قول کو یقیناً خیال پارینہ کہا جا سکتا ہے لیکن اس صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چشم و گوش آج بھی انسانی زندگی میں روزن امکان و وسیلۂ وجدان کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس حیثیت و اہمیت پر آئندہ بھی سوالیہ نشان قائم کرنا امکان میں نہیں ہے چنانچہ کسی بھی شاعر کے یہاں بصری اور سمعی پیکروں کا ہونا ایک فطری امر ہے۔

خالدؔ محمود نے عصری سچائیوں اور جمالیاتی محسوسات کی شعری پیش کش کے لیے زبان کے تخلیقی امکانات اور کلاسیکی شعری روایات کے گہرے شعور کو جس فنی رچاؤ اور فنی خلوص کے ساتھ برتا ہے وہ ان کے لہجے میں انفرادیت کے نقوش بھی روشن کرتا ہے اور ان کے تمام حواس کے بیدار و متحرک ہونے کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ لیکن ان کے بصری اور سماعی محسوسات و مدرکات ان کے شعری منظر نامے کی تشکیل میں خصوصی اور بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ وہ جب حسی تجربات کو اپنی مخصوص زبان (جس پر ان کی فکر کی چھاپ بخوبی دیکھی جا سکتی ہے) میں پیش کرتے ہیں تو مانوس کیفیات اور دیکھی بھالی حالتیں بھی تخلیقی اسرار کے باعث قاری و سامع کو حیرت خیز مسرت بہم پہنچاتی ہیں، اور ان کا بصری ادراک ان کی شاعری کے کلیدی الفاظ اور ان الفاظ کے تلازمات کی مدد سے کثیر المعانی بصری پیکر خلق کرنے لگتا ہے۔

ہر اک فیصلہ اس نے بہتر کیا
مجھے آنکھ دی تم کو منظر دیا
ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگا

شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا مری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا
وہ بھی ہیں سب قریب مگر دور دور ہیں
یاروں کی زندگی ہے ستاروں کی زندگی

(۱) خود کو بینائی عطا ہونے اور محبوب کے منظر بن جانے پر شاعر نے خدا کے فیصلے کی بہتری کا اعتراف کر کے بظاہر راویتی صبر و شکر کا اظہار کیا ہے لیکن آنکھ اور منظر کے تخلیقی استعمال کے ذریعے حس بصارت کو متحرک کر کے ایک ایسے بصری پیکر کی تخلیق بھی کی ہے جس نے شاعر کے داخلی جذبے کو مجسم کر دیا ہے (۲) اس شعر میں دھوپ کی تمازت سے جھلنے کے عمل سے قبل ہی دیوار دیوار چلنے کا منظر دکھا کر نئی زندگی کی دور اندیشی، عجلت پسندی اور خوف انگیزی کو مرتسم کیا گیا ہے۔ (۳) یہاں شب، اندھیری کوکھ، سورج غریب اور بے چراغ مکاں جیسے الفاظ و تراکیب جس رعایت لفظی، تضاد اور طنز کی کیفیت کو سامنے لاتے ہیں اس نے ایک ایسے پیکر کی تعمیر و تشکیل کی ہے جو سیاہ بنیادوں پر پنپتی ہوئی سفید پوش زندگی کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ (۴) اس شعر میں ستاروں کے بظاہر قریب لیکن اصلاً دور ہونے کا ذکر کر کے ہم عصر دوستانہ منافقت کو متشکل کیا گیا ہے۔ یہ تمام پیکر بصری ادراک کی کار فرمائی اور توانائی کے غماز ہیں۔ خالد محمود نے ان پیکروں کی وساطت سے عصری سچائیوں اور جمالیاتی محسوسات کے متنوع اور دلکش نقوش ثبت کئے ہیں۔ ان پیکروں میں حس باصرہ کو متحرک کرنے والے کلیدی عناصر یعنی آنکھ اور منظر نیز ان کے تلازمات دھوپ، سورج، دیوار، شب، اندھیرا، چراغ اور ستارے وغیرہ تحرک کی خصوصیت سے ہم آہنگ ہو کر اسلوب و فکر کی معنویت، پیچیدگی اور حسن کاری میں اضافہ کرتے ہیں۔

پیشتر عرض کر چکا ہوں کہ خالد محمود کے اسلوب شعر میں جہاں جمالیاتی تجربات و مشاہدات کی رنگارنگی اپنا سحر دکھاتی ہے وہیں نئی زندگی کے تضادات اور ان تضادات کے زیر اثر جنم لینے والی طنز کی کیفیت ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہی کیفیت شاعر کے مخصوص تہذیبی و فکری پس منظر کو پیش منظر بناتی ہے اور سامع و قاری سے ایک منفرد رشتہ تفہیم و ترسیل قائم کرتی ہے۔ چنانچہ شاعر کے سماعی محسوسات و مدرکات کی بنیاد پر مرتسم ہونے والی پیکروں میں بھی محولہ بالا کیفیت کی معنوی اور مجازی جہات کی گوناگونی کے

جلوے دیکھے جاسکتے ہیں ؎

قافلے میں ہم اس مقام پہ ہیں
جو صدائے جرس سے باہر ہے
مندر کی گھنٹیوں سے فضا گونجنے لگی
شاید ہوا ہے وقت سحر کی اذان کا
ابھی کل تک تو تم اچھے بھلے تھے
یہ کس لہجے میں اب باتیں کرے ہو

ان اشعار میں صدائے جرس، گھنٹی، گونج، اذان، لہجہ اور بات جیسے الفاظ نہ صرف زبان کے مجازی اور خلاقانہ استعمال نیز شاعر کی حسی انفرادیت کو سامنے لاتے ہیں بلکہ معنوی تہہ داری کے باعث قاری کے تجربات میں شریک ہونے کی پوری پوری صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ گویا حس سماعت کو متحرک کرنے والی یہ تمام لفظی تصویریں شاعر کے مافی الضمیر کی ترسیل کا نعم البدل بن گئی ہیں۔

نتیجتاً کہا جاسکتا ہے کہ خالد محمود کی غزل میں در آنے والے "انا" کے پیکر کے ساتھ ہی ان کے بصری اور سماعی پیکروں کا مطالعہ نہ صرف آج کی معاشرت اور اعمال وافکار کو واشگاف انداز میں پیش کرتا ہے بلکہ ان کے تخیل کی خلاقی و زرخیزی اور حسی بیداری کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ خالد محمود کے شعری پیکر تجربات کی انوکھی اور ان دیکھی سمتوں کو بھی روشن کرتے ہیں اور ان کے مخصوص انداز نظر کو اپنے تصویری تاثر کی مدد سے مزید معنی خیز بنا کر ان کی شعری انفرادیت کا امتیاز قائم کرتے ہیں۔

○

ڈاکٹر رفعت اختر
ٹونک۔(راجستھان)

خالد محمود ایک تاثر

مغربی ادب میں ہر دہے کہ بعد تقریباً تیس فی صد تخلیقی الفاظ کی تعبیر و تشریح یکسر بدل جاتی ہے اُردو ادب میں نصف صدی کہ بعد کسی لفظ کا میلان واستعمال تبدیل ہو تا ہے لیکن تشریح کے بعد کی شاعری میں ہر دہے کے بعد لفظ کے تخلیقی استعمال کا رد و قبول تلاش کیا جاسکتا ہے۔خالد محمود کا تعلق بھی اُردو شاعری کی نئی نسل سے ہے جنھیں الفاظ کے رکھ رکھاؤ اور تخلیقی استعمال پر ملکہ حاصل ہے۔

آج کا ادب زندگی کی تفسیر ہی نہیں بلکہ از سر نو تعمیر، تعبیر و تشریح بھی ہے، ادب میں یہ میلان ردّ تعمیری نقطۂ نظر سے منسوب کیا جاتا ہے، خالد محمود کا شعری آہنگ نہ صرف ردّ تعمیر سے میل کھاتا ہے بلکہ موصوف کے یہاں سچی جدّت بھی بدرجہ اتم موجود ہے چند شعری لفظیات بغیر کسی انتخاب کے دیکھی جاسکتی ہیں۔ چشم سنگ، بے چراغ سورج، لبِ تصوّر، کفِ خیال، یاد کا شانہ، لفظیات پر مشتمل اشعار اس طرح ہیں۔

دل کی دُنیا میں اندھیرا ہو تو کچھ روشن نہیں
آنکھ چشمِ سنگ ہے شمس و قمر ہوتے ہوئے

شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا میری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

ہر ایک پھول کو چومے لبِ تصوّر سے
درونِ دل کوئی شیطاں بھلا سا رہتا ہے

وہ بے وفا ہے یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
کفِ خیال میں اک آئینہ سا رہتا ہے

دیکھی جب اُس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
اک دستِ نازیاد کا شانہ دبا گیا

ایک اچھا پروفیسر اچھا شاعر نہیں ہوتا اور اچھا شاعر اچھا پروفیسر نہیں ہوتا۔ خالد اچھے استاد بھی ہیں اور خوبصورت شاعر بھی۔۔ غزل کے ساتھ خالد محمود نے نظم میں بھی تخلیق کے جوہر دکھائے ہیں۔ موصوف کی نظم جس کا عنوان "معلم" ہے ایک شاہکار نظم کہی جا سکتی ہے حالانکہ نظم خاصی طویل ہے لیکن پھر بھی نقل کرنے کو جی چاہتا ہے،

میں کہ اک معلم ہوں
میں نے تم کو بخشا ہے
اک شعورِ بے پایاں
آگہی کے دریا میں
تیرنا سکھایا ہے
عقل کے مناروں سے
روشنی عطا کی ہے
میں کہ اک معلم ہوں
تم ہنوز گونگے تھے
تم ہنوز ننگے تھے
جنگلوں میں جھاڑوں میں
سخت جاں پہاڑوں میں
زندگی کی اُمیدیں
آتشِ گرسنہ کی
بندگی میں لاتے تھے

اور سعی پیہم سے
تم کبھی اس آتش کو
بے ضرر پرندوں کے
خون سے بجھاتے تھے
اور یہ بھی ہوتا تھا
بے ضرر پرندوں کے
خون سے بجھانے کی
جب تمہاری ہر کوشش
رائگاں چلی جاتی
اور سعئ لاحاصل
اک سوال سا بن کر
تم غریب لوگوں کے
سامنے چلی آتی
آہ! تم کہ تنگ آکر
اپنا گوشت کھا لیتے
یعنی اپنے ہی جیسے
غم نصیب انساں کی
بوٹیاں چبا لیتے

میں کہ اک معلم ہوں

آہ! تم کہ بے چارے
روشنی سے بے بہرہ
زندگی سے ناواقف
موت کی گپھاؤں میں
شب پناہ غاروں میں
زندگی کی اُمیدیں

آتش گرسنہ کی
بندگی میں لاتے تھے
اور سعیِ پیہم سے
تم کبھی اس آتش کو
بے ضرر چرندوں کے
خون سے بجھاتے تھے
میں اک معلّم ہوں
میں کہ تم کو دنیا میں
موت کی گپھاؤں سے
زندگی میں لایا ہوں
اور میں تم کو دنیا کے
شب پناہ غاروں سے
روشنی میں لایا ہوں
میں کہ اک معلّم ہوں
میں نے تم کو بخشا ہے
اک شعورِ بے پایاں
عقل کے مناروں سے
روشنی عطا کی ہے
آگہی کہ دریا میں تیرنا سکھایا ہے
اور تم کو حیواں سے
آدمی بنایا ہے
میں کہ اک معلّم ہوں
تم ہنوز عریاں تھے
کب تمہیں میسّر تھا
یہ لباس تن پوشی

میں نے تم کو پہنائے
صد ہزار پیراہن
تم ہنوز گو ننگے تھے
کب تمہیں سلیقے سے
بات کرنی آتی تھی
میں نے تم کو سکھلائے
گفتگو کے سارے فن
میں کہ اک معلم ہوں
میں کہ زندگانی سے
نااُمید رہرو کو
منزل مقاصد تک
اپنے ساتھ لایا ہوں
اور اس طریقے پر
شعبہ ہائے دنیا میں
بار بار آیا ہوں
میں کہ اک معلم ہوں
آج تم مہذب ہو!
آج تم ہو شائستہ!
یہ بھی میری کوشش کا
لازمی نتیجہ ہے
میں کہ اک معلم ہوں
میں اگر نہیں ہوتا!
میں اگر نہیں ہوتا!
جنگلوں کے پیڑوں کی
خشک چھال اور پتے

سب تمہارے جسموں کا
جزو بن گئے ہوتے
میں اگر نہیں ہوتا
تو تمہاری اولادیں
نالیوں کے کیڑوں سی
زندگی بسر کرتیں
میں کہ اک معلم ہوں
میں وہ ہوں کہ دنیا میں
اپنا مرتبہ پایا۔
تھیں تمہاری اولادیں
اور میں باپ کہلایا،

آدم سے اِس دم تک کی علمی تاریخ خالد محمود کی نظم میں سما گئی ہے۔۔ میرا خیال ہے کہ خالد محمود کی یہ نظم اردو نظم کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ ہے۔
جنسی رشتوں کی ترجمانی اب کوئی خالد محمود سے سیکھے۔ ''دوسرا رشتہ'' نظم آپ بھی پڑھیں۔

وہ سوچتی تھی کسی وقت ماں سے کہہ دوں گی
کہ اونچے قد کا صحت مند جسم والا شخص

ہمارے گھر میں جو روز آیا کرتا ہے
میں خواہشات کی دنیا میں اس کی محرم ہوں

خوشی سے ماں اسے فرزندگی میں لے لے گی
ہر آرزو کا مری احترام کرتی ہے

اور اک رات یہی سوچ کر وہ خلوت میں
جو ماں سے ملنے کو پہنچی تو انکشاف ہوا

کہ جس کو ماں کا وہ بیٹا بنانے والی تھی
وہ شخص رشتے میں اب اس کا باپ لگتا ہے

اس نظم کے بعد خالد محمود کا یہ شعر بھرپور لطف دیتا ہے کہ

ہر شئے ہر ایک شئے کی طرح بے ثبات ہے
کچھ دن کے بعد تو بھی مجھے بھول جائے گا

بادی النظر میں خالد کا یہ شعر:۔

میں صرف ٹیلی فون کا احسان مند ہوں
اُن کا پیام بادِ صبا نے نہیں دیا

شاید قارئین کو ہضم نہ ہو لیکن خالد محمود نے دماغ سے سانس لیتی دنیا اور محبت کی بڑی اچھی ترجمانی کی ہے۔ آج ٹیلی فون سب سے تیز نامہ نو کر ہے۔ لیکن ''بادِ صبا'' کا اہتمام روایت کی پاسداری بھی کرتا ہے۔ خالد کے یہاں صبا، ہوا، اور گھر ایسا استعاراتی مثلث ہے کہ جس کی داد ذہین طبقے کو دینا ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ قطرہ وجود ضرور ''سمندر آشنا'' ہوگا۔ اور آئندہ دہے میں خالد محمود کی تخلیقی شناخت مزید سامنے آئے گی۔

O

محمد ایوب واقف
و۰نڈی، بمبئی ۴۰۰۰۴۳

خالد محمود۔۔۔ ایک تاثر

خالد محمود صاحب اپنی عمر کے پچاس سال مکمل کر چکے ہیں یہ بھی ایک خوبصورت اتفاق ہے کہ جناب خالد محمود کی عمر اور ہمارے وطنِ عزیز کی آزادی کی عمر میں کوئی تفاوت نہیں ہے۔ دونوں کی عمریں شانہ بہ شانہ چل رہی ہیں آزادیٔ ہند کی پچاسویں سالگرہ گولڈن جوبلی (جشن طلائی) کی شکل میں ملک کے گوشے گوشے میں منائی جارہی ہے اور جناب خالد محمود کی پچاسویں سالگرہ کے خوبصورت موقع پر "سہ ماہی انتساب" کے مدیر محترم جناب سیفی سرونجی اور ان کے لائق وفائق ساتھی ہماری مبارکباد کے صدفی صد مستحق ہیں کہ انہوں نے یہ قابل تعریف اور قابلِ احترام جسارت کرڈالی۔ یہ دور اردو زبان کے لئے انتہائی پر آشوب دور ہے اردو اور اردو والوں کے سامنے مشکلوں کا ایک پہاڑ کھڑا کر دیا گیا ہے ایسے میں کسی رسالے کا عام شمارہ ہی نکالنا آندھی میں چراغ جلانے کے مترادف ہے خصوصی نمبر کی بات کہاں سوچی جاسکتی ہے۔ لیکن سیفی سرونجی اور ان کے ساتھیوں نے اس ناممکن امر کو ممکن بناڈالا سیفی صاحب نے اپنے خط میں مجھے لکھا ہے کہ خالد محمود نمبر کے دوسو صفحات کی کمپوزنگ ہو چکی ہے۔ خالد محمود صاحب قسمت کے دھنی ہیں کہ حین حیات وہ اپنی کامیابی کا خوش نما منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

ہم آپ سے یہ عرض کر چکے ہیں کہ خالد محمود اپنی عمر عزیز کے پچاس سال مکمل کر چکے ہیں۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ انہوں نے پندرہ بیس سال کی عمر میں اپنی ادبی زندگی کا آغاز کر دیا تو یقینی طور پر تیس یا پینتیس سال کی مدت وہ علم وادب کی خدمت میں صرف کر چکے ہیں ایک علمی وادبی شخصیت کے لئے اگر قدرت کی طرف سے اتنی مدت اور مہلت بھی ودیعت کر دی جائے تو اسے بڑی بات سمجھنی چاہئے خالد محمود صاحب کو اپنے پروردگار کی

بارگاہ میں اس لئے بھی سر بہ سجدہ ہونا چاہئے کہ ان سے اس نے وہ کام لیا جو دنیاوی زندگی کا سب سے اہم اور مقدم کام سمجھا جاتا ہے ورنہ کروڑوں انسان پیدا ہوتے ہیں اور اپنی طے شدہ زندگی جی کر پیوندِ خاک ہو جاتے ہیں ان کے نام تک باقی نہیں رہتے۔

"رازِ خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں"

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ تیس پینتیس سال کی اپنی علمی وادبی زندگی میں جناب خالد محمود نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے آیاان کی تحریروں میں اعلیٰ انسانی قدروں اور فنی محاکات کا پر تو موجود ہے یاان کی حیثیت کارِ رائیگاں کی سی ہے میں نے اب تک خالد محمود صاحب کی نثر و نظم پر مشتمل جو چیزیں دیکھی اور پڑھی ہیں ان کی روشنی میں بغیر کسی پس و پیش کے کہہ سکتا ہوں کہ ان کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں حسن بھی ہے اور تعمیر کا پہلو بھی۔ ان کے یہاں زبان کا رچاؤ تو ایسا ہے کہ جسکی مثال دی جاسکتی ہے ان کی علمی و ادبی خدمات اور فتوحات کا دائرہ کافی وسیع ہے، انہوں نے شاعری بھی کی ہے اور تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں تحقیق کی گتھیاں بھی سلجھائی ہیں اور خاکے اور انشائیے بھی تحریر کئے ہیں۔ ترجمے بھی کئے ہیں اور اسکولوں اور کالجوں کے طلباء کے لئے درسی کتب بھی ترتیب دی ہیں۔ "سمندر آشنا" ان کا شعری مجموعہ ہے اس مجموعہ میں ان کی جتنی بھی تخلیقات شامل ہیں ان کا مطالعہ ذہن پر خوشگوار اثرات مرتب کرتا ہے ان کی شعری تخلیقات میں عصری حسیت کی کار فرمائی بھرپور طریقے سے پائی جاتی ہے فن کے اعتبار سے بھی ان کی شاعری کسی خامی کی مرتکب نہیں ہے۔ خالد محمود صاحب ابھی جوان صالح ہیں اگر ان کا شعری سفر اسی جذبۂ خلوص اور ریاضت کے ساتھ جاری رہا تو ان کا شمار ہمارے عہد کے ممتاز شاعروں میں ہوگا۔ اس موقع پر ان کی غزلوں کے کچھ اشعار پیش کرنے کو جی چاہتا ہے ملاحظہ فرمائیں۔

ہر ایک سمت ہیں پختہ بلند دیواریں
سنہری دھوپ کے آنگن بتا کہاں ہے تو
جو تو نہیں تو لہو سرد ہوتا جاتا ہے
میرے وجود کی دھڑکن بتا کہاں ہے تو

راستہ پر خار دلی دور ہے
سچ کہا ہے یار دلی دور ہے
کام دلی کے سوا ہوتے نہیں
اور ناہنجار دلی دور ہے
کل تلک کہتے ہیں دلی دور ہے
آج بھی سرکار دلی دور ہے

جھوٹوں کا دربار نہیں ہوں
سرکاری اخبار نہیں ہوں
دنیا بھی میری دشمن ہے
میں بھی اپنا یار نہیں ہوں
دونوں ہی جانب دھوکا ہے
میں دریا کے پار نہیں ہوں

کتنی ندیاں کتنے دریا
پی کر پیاسا رہا سمندر
دل کی تپش سے آنکھیں بھیگیں
آگ میں پیدا ہوا سمندر

ڈاکٹر خالد محمود صاحب کی غزلوں سے جو متفرق اشعار میں نے پیش کئے ہیں انہیں پڑھ کر محض واہ وا کہہ دینے سے بات نہیں بنے گی۔ یہ اشعار اپنے خالق کی اس دروں بینی اور خوش فکری کا پتہ دیتے ہیں جو بڑے ریاض اور بڑی تپسیا کے بعد حاصل ہوتی ہیں سماجی اور معاشرتی زندگی کے معاملات و مسائل کی جتنی خوبصورت عکاسی ان اشعار میں کی گئی ہے اس کی تعریف و توصیف نہ کرنا خالد محمود صاحب کے حق میں بڑی ناانصافی ہوگی۔ اچھا شاعر الفاظ کی نرمی و ملائمت سے اگر ایک طرف بھینی خوشبوؤں سے معطر فکر کا ماحول تیار کرتا ہے

تو دوسری طرف طنز کی گہری اور تیز کاٹ بھی کرتا ہے خالد صاحب کے جو اشعار میں نے ابھی پیش کئے ہیں ان کے اندر ان کیفیات کا پتہ بڑی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔

خالد محمود صاحب کی علمی و ادبی شخصیب میں بڑی کشش ہے اس کشش کا تقاضا تو یہ ہے کہ اس کا جائزہ تفصیل سے لیا جائے تاکہ ہمارے قارئین ان کی پر کشش شخصیت سے اور ان کی علمی و ادبی فتوحات سے لطف اندوز بھی ہوں اور کچھ حاصل بھی کر سکیں لیکن ایسا تفصیلی جائزہ اس خاکسار کے لئے سر دست ممکن نہیں ہے۔ دو روز قبل میرے بائیں گال کی ایک گلٹی کا آپریشن ہوا ہے۔ بستر پر پڑا ہوا ہوں۔ اسی دوران سہ ماہی جریدہ انتساب کے اڈیٹر سیفی سرونجی صاحب کا فرمائشی خط ملا کہ میں خالد محمود نمبر کے لئے اپنے تاثرات قلمبند کر کے بھیج دوں۔ اس دلپذیر دعوت کو قبول کرنا ضروری سمجھا۔ افراتفری میں قلمبند کئے گئے تاثرات حاضر ہیں۔

خالد محمود صاحب بنیادی طور پر استاد ہیں۔ درس و تدریس ان کا پیشہ ہے جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسے مشہور اور اہم درسگاہ میں شعبۂ اردو سے وابستہ ہیں ان کی یہ حیثیت بذاتِ خود ایک اہم حیثیت ہے آئندہ موقع ملا تو انشاءاللہ ان کی ہمہ جہت شخصیت پر تفصیل سے لکھوں گا۔ سر دست بس اتنی ہی باتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ باقی نیک خواہشات

○

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
مدیر ''کہسار''
بزاپورہ، بھاگلپور (بہار)

خالد محمود کی غزلوں میں پناہ گزینی کا احساس

شاعر اپنے ذاتی جذبات کے اظہار کی وجہ سے، جو اس کی اپنی زندگی کے کسی مخصوص واقعہ سے متاثر ہو کر برانگیختہ ہوئے ہیں، دلچسپ اور اہم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے اسکے مخصوص جذبات سادہ ہوں یا خام یا سپاٹ ہوں۔ لیکن جہاں تک شاعری میں اس کے جذبات کا تعلق ہے وہ بہت پیچیدہ ہے۔ لیکن یہ جذبات ان لوگوں کے جذبات سے بالکل مختلف ہوں گے جو زندگی میں غیر معمولی اور پیچیدہ جذبات رکھتے ہیں۔

شاعر کا کام معمولی جذبات کا استعمال کرنا ہے اور انہیں شاعری میں برتتے وقت ایسے احساسات کا اظہار کرنا ہے جو متداول جذبات میں بالکل نہیں پائے جاتے۔ ایسے موقع پر وہ جذبات جن کا اسے کوئی تجربہ نہیں ہے اور وہ جذبات بھی جن سے وہ مانوس ہے۔ ساتھ ساتھ استعمال میں آئیں گے۔ دراصل یہ تجربوں کی بہت بڑی تعداد کا ارتکاز ہوتا ہے اور اس ارتکاز سے نتیجہ کے طور پر ایک نئی چیز وجود میں آتی ہے۔ یہ تجربے اس قبیل کے ہوتے ہیں کہ عملی آدمی کو یہ سرے سے تجربے نظر نہیں آتے اور یہ ارتکاز ایک ایسا ارتکاز ہوتا ہے جو نہ تو شعوری طور پر پیدا ہوتا ہے اور نہ غور و خوض سے یہ تجربے حافظے کے زور سے جمع کئے جاسکتے ہیں بلکہ یہ خود بخود ایک ایسی فضا میں متحد ہو جاتے ہیں جسے ان معنی و سکون و خاموشی کا نام دیا جاسکتا ہے کہ وہ واقعات کو معمولی طور پر دیکھتے ہیں۔

شاعری کی تخلیق میں بہت بڑا ہاتھ شعوری فکر اور غور و خوض کا بھی ہوتا ہے۔ شاعری جذبات کے آزادانہ اظہار کا نام نہیں ہے بلکہ جذبات سے فرار کا نام ہے۔ شاعری شخصیت کے اظہار کا بھی نام نہیں ہے بلکہ شخصیت سے فرار کا نام ہے لیکن در حقیقت فرار کی اس نوعیت کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کے پاس شخصیت بھی ہے اور جذبات بھی ہیں۔

شخصیت اور جذبات سے بھر پور شاعر خالد محمود بھی ہیں۔ وہ بی ایڈ ہیں، اردو میں ایم اے ہیں، پی ایچ ڈی ہیں، ادیب کامل، منشی فاضل، فاضل دینیات ہیں اور تعلیمی، تربیتی اور تجرباتی کورسیز سے متصف ہیں۔ وہ شاعر ہیں، مقالہ نگار ہیں۔ تبصرے، خاکے اور انشائیے بھی انہوں نے لکھے ہیں۔ اس سے ان کے دماغ کے لا تعداد احساسات کا اندازہ ہوتا ہے۔ امتیاز کی اس نوعیت میں تنوع اور گہرائی ہے۔

بحثیت غزل گو ان کی فنکاری میں تخلیقی قوت ہے۔ اور قدروں کی صحت مندی کو برتنے میں ذکاوت کی سطح بلند ہے، ساتھ ہی ایما و اشارہ میں عصری حسیت کے نقوش ابھارنے کا ہنر وہ اچھی طرح جانتے ہیں ۔

نیا مہینہ فکروں کے ملبوس بدلنے آتا ہے
آ پھر اپنے ذہن کے اندر قرضوں کے عنوان لگا

ہم فضاؤں میں کچھ اونچا اڑ کر
بھول بیٹھے ہیں بسیرا اپنا
جو ہو سکے تو اسے مجھ سے دور ہی رکھیے
وہ شخص جو مجھ پہ بڑا اعتبار کرتا ہے
سنو لوگ کترا کے چلنے لگے
مجھے زندگی کا ہنر آگیا
خالد نے شاید آئینہ دیکھا نہیں کبھی
دلی میں چاہتا ہے کہ اپنا مکان ہو

خالد محمود اپنی غزلوں میں واضح اور روشن صورت پیش کرتے ہیں۔ دراصل یہ پیکریت کی کامیابی ہے۔ شاعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ پیکریت کی تخلیق کے لئے جن تصویروں کو پیش کرے وہ واضح ہوں۔ خالد محمود خاص صورت کے ذریعہ اپنے جذبات کی نمائندگی کرتے ہیں اور خیالات کی فضاؤں میں چمک پیدا کرتے ہیں ۔

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے

بستر پہ ڈال دیتا ہوں ٹوٹا ہوا بدن
پھر کروٹوں سے جوڑتا رہتا ہوں رات بھر

روز اخبار ہم سے کہتا ہے
جھوٹ کو سچ کے باب میں رکھیے

بجز اک لذت تسکین باطل
کسے شہرت نے خالد کیا دیا ہے

واقعیت و مثالیت و ایمائیت، پرواز تخیل، قوت ادراک، حسن و جدان، امید و نامیدی کی کشمکش، گداز کی کیفیت اور ذہنی تصورات نے خالد محمود کی شاعری خصوصاً غزلوں کو اعتبار بخشا ہے۔

امنگیں ، شوق، محرومی، امیدیں، وسوسے اور تم
گذشتہ ہلچلوں کے دل کئی قصے سناتا ہے
آگ ہے منبع جو کچھ بھی ہو
شبنم، آنسو، گھٹا سمندر
پھولنے پھلنے سے ہر ڈالی نہیں جھکتی کہ آپ
سرو کی مانند ہیں، شاخ ثمر ہوتے ہوئے

خالد محمود کا مزاج تخیلی نہیں بلکہ تخلیقی ہے۔ان کی دنیا گرد و پیش کے واقعات کی عکاس ہے، واردات قلبی اور مشاہدات کی ذہین ترجمانی کی وجہ سے وہ گنجینۂ معنی کا طلسم کھولتے ہیں۔

تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں
ذرا سنبھال اسے ڈوب ڈوب جاتا ہوں
یہ تیری آنکھ کا قطرہ مجھے سمندر ہے

جس میں خالی ہے کرائے کا مکان
اس گلی میں نہیں رہتا کوئی
دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
اک دست نازیاد کا شانہ دبا گیا

خالد محمود زبانی پہلو پر بھی زور دیتے ہیں، جو لوگ خدا کے وجود کے قائل ہیں ان کے لئے دنیا کی ہر بات خدا کے وجود پر دلیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خالد محمود ایک سوچنے والا فعال ذہن رکھتے ہیں ؎

مانگتا ہے تو وجود ذات باری کا ثبوت
کیا جہانِ رنگ و بو اے بے خبر کافی نہیں؟
نہ ہو سکے تری رحمت کی شان کے شایاں
مرے گناہوں کو یوں شرمسار ہونا تھا

خالد محمود جس سماجی و تہذیبی، سیاسی و معاشی افراتفری کے دور میں سانس لے رہے ہیں اس میں ہر شئے رسمی پہلو لئے ہوئے ہے اور انسان محض خیالی زاویۂ نگاہ کا مالک بن کر رہ گیا ہے۔ رشتے کے رنگ پھیکے پڑ چکے ہیں اور تکلف کی صنعت گری پابہ جولاں ہے ؎

ہر شئے ہر ایک شئے کی طرح بے ثبات ہے
کچھ دن کے بعد تو بھی مجھے بھول جائے گا
وہ بھی ہیں سب قریب مگر دور دور ہیں
یاروں کی زندگی ہے ستاروں کی زندگی

نئی زمین کی تلاش میں خالد محمود کی غزلیں بے اطمنانی کا پتہ دیتی ہیں ساتھ ہی پناہ گزینی کا احساس اور اعلیٰ ساعتوں کا سراغ بھی ان کی غزلوں سے ملتا ہے۔

O

ڈاکٹر محمد نعمان
صدر شعبہ، سیفیہ کالج، بھوپال

خالد محمود کی غزل گوئی

خالد محمود نے سرونج (مدھیہ پردیش) کی مردم خیز سرزمین مالوہ میں آنکھیں کھولیں اور وہاں کی مخصوص تہذیبی و ادبی فضا کے زیر اثر شاعری کی جانب متوجہ ہوئے۔ بھوپال اور سیفیہ کالج کے ادبی ماحول نے ان کے شوق کو جلا بخشی۔ شاعری میں جناب راہی قاسمی اور نثر میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی رہنمائی میں ان کی صلاحیتوں کو جو اعتبار ملا اس سے انہوں نے نہ صرف کالج بلکہ سرونج اور بھوپال کے ادبی حلقوں میں بہت جلد اپنی پہچان قائم کرلی۔ بقول خود:

ہر آسماں پہ مثل مہ و کہکشاں رہے
''اپنا مقام لے کے رہے ہم جہاں رہے''

۱۹۷۶ء میں بغرض ملازمت جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے منسلک ہونے کے بعد شعر وادب کی تخلیق کے بہترین مواقع میسر آئے۔ جن سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے مختلف موضوعات پر تنقیدی مضامین، انشائیے اور تبصرے تحریر کئے۔ سفر ناموں پر تحقیقی مقالہ (زیر نگرانی ڈاکٹر مظفر حنفی) قلم بند کرکے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی،ایچ،ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی لکھنؤ کے تعاون سے مقالہ شائع کیا، انعامات حاصل کئے۔ این سی ای آر ٹی اور نیشنل اوپن اسکول (دہلی) کے تحت نصابی کتب مرتب کیں، ترجمے کئے، طویل و مختصر نظمیں لکھیں، ریڈیو اور ٹی وی پروگرام کے لئے گیت لکھے۔ مختلف کانفرنسوں ورکشاپوں اور سیمناروں میں شرکت کی غرض سے ہندوستان کے کم و بیش تمام صوبوں کا سفر کیا اور اسی کے ساتھ بحیثیت ایک خوش فکر غزل گو شاعر ملک کے ادبی حلقوں میں مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ غزلیات پر مشتمل ان کا پہلا شعری مجموعہ ''سمندر آشنا''

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے مالی تعاون سے ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔

خالد محمود کے کلام کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی مخصوص نظریے کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کے یہاں کلاسیکی رچاؤ، عصری آگہی اور جدید حسیت کا نہایت متوازن امتزاج ملتا ہے۔

خالد محمود کی عمر کے اعتبار سے ان کے اشعار کی تعداد کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بغیر کسی تاثر، تجربے یا مشاہدے کے شعر کہنے کے قائل نہیں ہیں۔ میں نے گزشتہ پچیس سالہ رفاقت میں جس طرح خالد محمود کو دیکھا ہے اس کا پرتو ان کی شاعری میں بھی صاف دیکھتا ہوں۔ ان کے کئی اشعار ایسے ہیں جو فوری طور پر کسی واقعے سے متاثر ہو کر کہے گئے ہیں مثلاً جاں نثار اختر کے انتقال کی خبر آئی ہے، شعبہ اردو سیفیہ کالج میں تعزیتی جلسے کی تیاری ہو رہی ہے۔ خالد محمود کچھ لکھنے میں مصروف ہیں۔ کچھ دیر بعد ایک سلپ میری جانب بڑھاتے ہیں جس پر یہ شعر رقم ہے:

کتنے باقی بچے ہیں مرنے کو
لاشیں اٹھ جائیں تو شمار لگے

سمندر آشنا میں اب یہ شعر قدرے ترمیم کے ساتھ اس طرح ملتا ہے ؎

کتنے زندہ بچے ہیں مرنے کو
لاشیں اٹھ جائیں تو شمار لگے

ایک موقع پر شعبہ اردو سیفیہ کالج میں خالد محمود کسی بات پر غم زدہ بیٹھے ہیں استاد محترم وسنوی صاحب نے انہیں سمجھانے کی خاطر جو جملہ ادا کیا ہے اس سے وہ نہ صرف مطمئن ہو جاتے ہیں بلکہ اسے فوری طور پر شعر کے پیکر میں ڈھال کر اپنی نامکمل غزل کو مکمل کر لیتے ہیں ؎

خالد میاں یہ زیست کوئی کھیل تو نہیں
چھوٹی سی ایک بات پہ چہرہ اتر گیا؟

دلی کی سٹی بس میں سفر کرنے کا اتفاق جن حضرات کو ہوا ہوگا وہ اس کے تلخ تجربات سے بخوبی واقف ہوں گے خالد محمود ان تجربات کو دلچسپ ترین انداز میں انشائیہ "سٹی بس کا سفر" (مطبوعہ کتاب نما دہلی) میں بیان کر چکے ہیں لیکن شعر کی صورت میں وہ

اسے اس طرح پیش کرتے ہیں۔

سٹی بس نے جواں حس چھین لی ہے
ہمارا جسم اب باقی نہیں ہے

مجھے زمانہ طالب علمی میں ان کے ذریعے کہے گئے وہ اشعار بھی یاد آرہے ہیں جبکہ ہمارا شاعر معاشی پریشانیوں میں مبتلا رہتا تھا۔

نیا مہینہ فکروں کے ملبوس بدلنے آتا ہے۔
آپھر اپنے ذہن کے اندر قرضوں کے عنوان لگا

یا

گیا مہینہ آخر شب کا گھورا ندھیرا چاٹ گیا
آج میں اپنے گھر کے اندر خود اپنا مہمان لگا

حسب ذیل اشعار بھی اسی دور ابتلا کی یادگار ہیں جبکہ حالات کا مارا ہوا شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے

یا

شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا مری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

خالد محمود کے بیشتر اشعار ان کی شخصیت، مزاج کردار اور حالات کے آئینہ دار ہیں جن میں ان کی سادہ مزاجی، ذہانت، حسیت، خوداری، بے باکی اور صاف گوئی صاف جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی ان کی شاعری کے تیور دوسروں سے مختلف ہیں۔ وہ ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر ہیں مثال کے طور پر چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں — کسی شے کی فراوانی نہیں ہے
تھکنے لگے ہیں پانو مگر میر کارروں — پیچھے نہ رہ سکوں گا مرا سر اتار دے
مقابلہ ہو تو سینے پہ وار کرتا ہے — وہ دشمنی بھی بڑی پروقار کرتا ہے

زخمی ہوا بدن تو وطن یاد آگیا
اپنی گرہ میں ایک روایت لہو کی تھی

میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

حوصلہ ٹوٹا تو وہ عبرت کا منظر آگیا
اڑ نہیں پائے پرندے بال و پر ہوتے ہوئے

قافلے میں ہم اس مقام پہ ہیں
جو صدائے جرس سے باہر ہے

لڑکوں کو نقل کرنے سے ہے روکنا مجھے
پھر آگیا ہے وقت مرے امتحان کا

ترے ساتھ چلنے کی عادت نہیں
ہماری نہ کر آزمائش ہوا

گھر میں رکھیں غزلوں کا فن اک غالب اک میر
ہر شاعر کے پکے دشمن اک غالب اک میر

خالد محمود کے کلام میں طنز کا عنصر اس قدر نمایاں ہے کہ اس کی زد سے نہ صرف دوسرے بلکہ خود ان کی ذات بھی محفوظ نہیں رہ سکی ہے مثلاً

ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگا

خوبیٔ قسمت سے ہیں اتنے میسر آشنا
گھر کے سب شیشے ہوئے جاتے ہیں پتھر آشنا

کوٹھیوں سے معذرت کے ساتھ کیا معلوم تھا
دھوپ میں جھلسے ہوئے بھی آدمی کہلائیں گے

اس فرد سے پھر آج میں ہنس کر ملا کہ جو
موقع ملے تو پشت میں خنجر اتار دے

ذرے سے کم بساط پہ سورج نگاہیاں
خالد بھی اپنا ہے تو مقدر کا آدمی

جو ہو سکے تو اسے مجھ سے دور ہی رکھئے
وہ شخص مجھ پہ بڑا اعتبار کرتا ہے

ان اشعار میں گہرے طنز کی نشتریت کے ساتھ ساتھ ایسی نرمی تہہ داری اور لطافت پنہاں ہے جو قاری کو غور و فکر کرنے، لطف اندوز ہونے اور شاعر کا ہمنوا بنانے پر اصرار کرتی ہے۔

خالد محمود نے بعض علامتوں کے فنکارانہ استعمال سے کلام میں ایک جہاں معانی پیدا کر دیا ہے۔ سورج، دھوپ، منظر، آسمان، ہوا، سمندر، شجر اور پتھر کو جو پیکریت اور معنویت عطا کی گئی ہے اس سے نئی نئی جہتیں اور پرتیں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ ملاحظہ کیجئے اس نوع کے چند اشعار۔

پیاسے کے لئے پانی نہیں ہے
سمندر کا کوئی ثانی نہیں ہے

موسم گرما، گرم ہوائیں اور اس پر سے بھاری دھوپ
سورج میرے سر کے اوپر ڈال گیا ہے ساری دھوپ

ہر اک فیصلہ اس نے بہتر کیا — مجھے آنکھ دی تم کو منظر کیا
اجالا نفی ہے، جب اس نے کہا — اندھیرے میں تھے ہم نے باور کیا
لہجہ وبجہ، شوخی و وخی سارے ان کے کھیل — دونوں شاطر دونوں پر فن اک غالب ایک میر
پیچھے پیچھے سارے شاعر وہ بھی کتنی دور — آگے آگے دو ہی سجن اک غالب اک میر
جن راستوں پہ دھوپ تھی اب دھوپ بھی نہیں — سورج نے اپنا سایہ بھی سر سے اٹھا لیا
تشنگی سب کی بجھا تا ہے شجر — دھوپ کو پانی پلا تا ہے شجر
دور جنگل میں قطار اندر قطار — بستیاں اپنی بساتا ہے شجر
میں گنجان شہروں کا مارا ہوا — نوازش، نوازش، نوازش ہوا
اہل ہنر ملامت و نیا کا غم نہ کر — بیری اگر ہے گھر میں تو پتھر بھی آئیں گے
ستارے چھونے کی خواہش جوان رہنے دے — ہمارے سر پہ ابھی آسمان رہنے دے

خالد محمود روز مرہ پیش آنے والے واقعات وحادثات کو مخصوص تراکیب، تلمیحات، محاورات، تشبیہات واستعارات کے ذریعے اس خوبی اور فنکاری سے پیش کرتے ہیں کہ نہ تو تخلیقی اظہار وابلاغ پر حرف آتا ہے اور نہ ہی شعریت مجروح ہوتی ہے البتہ شاعر کی عالمانہ بصیرت اور قادر الکلامی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مثلا

آواز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھئے — پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی
سوا نیزے پہ سورج آگیا ہے — ہماری صف ابھی سیدھی نہیں ہے
کام دلی کے سوا ہوتے نہیں — اور نا ہنجار دلی دور ہے
ہم نے کشتی میں کرلیے روزن — بے سہارا ہوئے تو پار لگے
کوہ گراں کے سامنے تیشے کی کیا بساط — عہد جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی

کلام خالد کاایک وصف یہ بھی ہے کہ انہوں نے میر، آتش، غالب، اور اقبال سے فنی استفادہ اور ذہنی اکتساب کر کے مصرعوں پر مصرعہ لگا کر، تصرف یا تضمین کے ذریعے اپنے

اشعار کو نہایت برجستہ انداز میں نئے مفاہیم سے آراستہ کیا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

"صبح گزری شام ہونے آئی میر"
تیز کر رفتار ولی دور ہے

آنکھوں میں دھوپ دل میں حرارت لہو کی تھی
آتش جو اس تھا تو قیامت لہو کی تھی

"موت کا ایک دن معین ہے"
زندگی دسترس سے باہر ہے

ہمارا گھر بھی صحرا ہو گیا ہے
مگر غالب سی ویرانی نہیں ہے

"اسے روم ازل انکار کی جرات ہوئی کیونکر"
کہیں انسان بھی بیٹھا نہ ہو شیطان کے اندر

بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہونے کے باوجود خالد محمود نے حسن و عشق کے موضوعات سے اجتناب کیا ہے۔ ان کے یہاں اس سلسلہ کے اشعار اول تو بہت ہی کم ہیں اور اگر ہیں بھی تو ایک خاص ندرت و سنجیدگی اور وقار کے ساتھ مثلاً

دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی　　اک دست نازیاد کا شانہ دبا گیا
ان کا خیال آتے ہی اک روشنی ہوئی　　اس روشنی میں ذہن کا کمرہ نہا گیا
تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو　　مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں
عشق دامن گیر ہونا چاہئے　　پانو میں زنجیر ہونا چاہئے
ذرا سنبھال اسے ڈوب ڈوب جاتا ہوں　　یہ تیری آنکھ کا قطرہ مجھے سمندر ہے

خالد محمود کے کلام میں آپ بیتی اور جگ بیتی دونوں کی کار فرمائی ہے انہوں نے صالح ادبی روایات سے انحراف نہ کر کے عصری حسیت، اور ادبی رجحانات سے ہم آہنگ ہو کر اپنے سچے جذبات و احساسات کو زبان و بیان کی لطافت، وسعت اور گہری معنویت کے ساتھ پیش کیا ہے جس کے سبب ان کا شمار نئی نسل کے نمایندہ شاعروں میں ہوتا ہے۔

○

عشرت ظفر
فہیم آباد کالونی، کانپور

خالد محمود کی غزل کا طلسم

خالد محمود کا کوئی شعری مجموعہ اب تک میرے زیر مطالعہ نہیں آیا ہاں مقتدر جرائد ورسائل میں ان کا کلام میری نظر سے اکثر و بیشتر گزرتا رہا ہے، اور میں ایک لطیف تاثر سے دوچار ہوتا رہا ہوں۔

مدیر سہ ماہی انتساب میرے دوست ڈاکٹر سیفی سرونجی نے خالد محمود کے پچاس غزلیہ اشعار بھیج کر یہ حکم دیا ہے کہ میں خالد محمود کی غزل سے متعلق کچھ اظہار خیال کروں۔

مجھے ذرّے میں نبض دنیا دیکھنے یا قطرہ میں دجلہ کا مشاہدہ کرنے کا نہ تو حوصلہ ہی ہے اور نہ ہنر آتا ہے، مجھے تو صعوبت جہاں گردی اٹھانا ہی پڑتی ہے، لیکن بہر حال اس کوچہ نوردی میں ایک لطف تو ہے ہی، اور جمود چونکہ میرے لئے عذاب بنتا ہے کہ میں تسلسل و تحرک کا لذت گیر ہوں۔

میں نے انتہائی انہماک و توجہ سے یہ چند اشعار پڑھے تو مجھے ہر شعر ایک ایسا آئینہ نظر آیا جو صرف اپنے گرد و پیش کے مناظر ہی نہیں سمیٹتا ہے بلکہ انہیں اپنے نہاں خانۂ باطن میں محفوظ رکھتا ہے، اور مسلسل ان کی جلوہ نمائی میں مصروف رہتا ہے۔ اس طرح ہر شعر ایک نگار خانہ بن جاتا ہے جس میں ماضی سے مستقبل تک پھیلی ہوئی تصویروں کی فصل لہلہاتی نظر آتی ہے۔ انہوں نے کہا بھی ہے۔

تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

اس شعر میں لفظ آئینہ دونوں مصرعوں میں آیا ہے، لیکن اپنی معنیاتی سطح پر مختلف

ہے پہلے مصرعے میں آئینہ ایک اسم ایک شے کی شکل میں آیا ہے، جبکہ دوسرے مصرع میں آئینہ یعنی مکاشفہ ہے گویا مجھ پر سب روشن ہے، یہ دراصل آگہی کی بہت بڑی بساط ہے جس کے عقب میں کائنات تعمیر و تخریب کے عمل سے دوچار نظر آتی ہے۔

مکاشفے اور مشاہدے کی جس کیفیت کا بیان اس شعر میں ہوا ہے اس کا جلوہ خالد محمود کے یہاں بیشتر مقامات پر دیکھا جا سکتا ہے، ایسے مقامات بھی ہیں جہاں وہ تلاش ذات کو گمر ہی تصور کرتے ہیں اور ایک ذہنی خلا کے اسیر نظر آتے ہیں، اور اسی ذہنی خلا کے عالم میں انہیں اپنے دروازے پر کچھ بھیڑ تو نظر آتی ہے مگر آنے جانے والوں کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے ہیں. مگر ان کا یہ یقین ضرور ہوتا ہے کہ آمدورفت جاری ہے گویا احساس ہی شدت ہے، لیکن تلاش ذات کی اس منزل میں ان کے شعور کا توانا آبشار ایک نئے انداز سے ان کے افکار کے صحرا میں اترتا ہے اور جس سے ہر ذرہ سیراب و شاداب ہو جاتا ہے اور یہ شعر سامنے آتا ہے۔

بھڑکتی آگ میں پیدا ہوا ہے
سمندر زندگی سے آشنا ہے

غالب نے تو آتش کدے کو سمندر کی جاگیر کہا تھا، گویا اس عمارت کی بنیاد رکھی تھی ایک ایسا مضمون اردو شاعری کو دیا تھا، جس سے آگے کے راستے کھلے، اور خالد محمود کے اس شعر نے ایک یا سنگ میل قائم کیا ہے، سمندر کوئی اسطوری ذی روح نہیں ہے تاریخی کتب، ایران کے آتش کدوں میں اس کے وجوود کا سراغ دیتی ہیں۔ ضو دیں نے آتش پرستوں کے مندر میں بھڑکتی ہوئی "مقدس آگ" میں اس جانور کو دیکھا کہ بناوٹ میں چوہے جیسا ہوتا ہے اور آگ میں چلتا پھرتا ہے، فارسی شاعری میں اس کا ذکر بیشتر مقامات پر ہوا ہے، غالب کے یہاں اردو فارسی دونوں میں اس کا ذکر آیا ہے، لیکن خالد محمود نے اس آتش خور ذی روح کا ذکر خوبصورت انداز میں کیا ہے، آگ جو ہر شے کو کھا لیتی ہے، آگ جو فنا انجامی کا تصور پیش کرتی ہے اس آگ میں سمندر جیسے ذی روح کا پیدا ہونا اور پھر پوری طرح زندگی کرتے رہنا حیات انسان کے ایک نقطہ ارتفاع کو پیش کرتا ہے، یعنی انسانی زندگی اپنے گردو پیش بھڑکتی ہوئی آگ کے حصار میں ہے، ایسا حصار جو غیر فانی ہے اور ہم اس حصار میں زندہ ہیں، خالد محمود نے اس شعر میں زندگی کا ایک غیر فانی تصور پیش کیا ہے، پرومیتس

نے زیوس کے ذخیرۂ نعمت سے آگ چرا کر انسانوں کو دی تھی، خود ابتلا میں اسیر ہوا تھا محض اس لئے کہ انسانی نسل نئی لذتوں سے ہمکنار ہو سکے تو اسے خبر نہیں تھی کہ انسان اس آگ کا کس انداز میں استعمال کرے گا اس سے شہروں بستیوں کو جلا کر راکھ کر دیگا، کبھی اس قدر خوف زدہ ہوگا کہ اسے سجدہ کرے گا لیکن پرومتھس اس بات سے واقف نہیں تھا کہ وہ کیا چیز انسانوں کو دے رہا ہے وہ تو یہ دیکھتا تھا کہ دیوتا آگ سے لطف لے رہے ہیں، انسان زمہریری ہواؤں کے دام میں قید ہو کر ٹھٹھرتے رہتے ہیں نہ آگ سے متعارف ہیں نہ اس کے اسرار سے واقف، چنانچہ اس نے آگ انسانوں کو دے دی جو بیک وقت زندگی اور اس کے فنا کا سفاک اعلامیہ تھی۔ کیونکہ آگ کہیں تو ظاہر میں سب کچھ خاکستر کر رہی ہے تو کہیں نظر نہیں آتی مگر خرمن جسم و جاں بھونک دیتی ہے۔ جیسے غالب کا یہ شعر ؎

شنیدۂ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم

ببیں کہ بے شر رو شعلہ می توانم سوخت

آگ کی تاریخ طویل ہے خدا کی نافرمانی بندگی کو نذر استکبار کر دینے کا عمل اس کی سرکشی و غضب ناکی سے بھرے مزاج کی علامت ہے لیکن کہیں پر یہ پیغمبری کے حصول تک کا وسیلہ بنتی ہے جو اس کے مزاج کی علویت کی طرف اشارہ لیکن ترحم اس قدر ہے کہ سمندر کو جنم دیتی ہے اس کی پرورش کرتی ہے اپنے جسم سے اس کی غذا فراہم کرتی ہے اس کی بود و باش کے لئے فضا کو سازگار بناتی ہے۔

خالد محمود کے اشعار میں مظاہر فطرت کو نئی طرح سے پیش کیا گیا ہے عرفان ذات کی تازہ جہتیں کھلتی ہیں وہ ذہنی خلا میں اسیر ہونے کے بعد ایسا محسوس کرتے ہیں کہ آسمانوں سے ان کی شناسائی بڑھ رہی ہے۔

زمینیں مرے پاؤں پکڑے رہیں

ادھر ہوگئے آسماں، آشنا

خالد محمود کے یہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ زندگی کو نئے پیمانوں سے دیکھ رہے ہیں اس طرح ان کے یہاں اسالیب کی جو توانائی و شگفتگی ابھری ہے وہ بے حد ثمر آفریں ہے طرز ادا کی تبدیلی ایک خاص جہت کی غماز ہے وہ اشیا کو بصری پیکروں میں پیش کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ لمسی کیفیت بھی برقرار رہتی ہے، کیونکہ کوئی بھی شے جب بصری

دائروں میں آتی ہے تو سب سے پہلے آنکھ اس کے لمس سے سرشار ہوتی ہے اس سرشاری کی کیفیت شاعر کے ذہن کو ایک غیر فانی لذت سے آشنا کرتی ہے

ہر اک راہ "سنگ گراں آشنا" نہیں تھے ہمارے کہاں آشنا
راتوں کا درد بہہ کے اب آنکھوں میں آ گیا یہ کون میرے جسم کے اندر سما گیا
لہو میں وہ جوش و ترنم نہیں یہ دریا کبھی کوہساروں میں تھا
چاند کی دنیا میں کیا اندھیر ہے پتھر ملے ہم نے سوچا تھا وہاں سے روشنی بھر لائیں گے

خالد محمود کی غزل زندگی کا آئینہ ہے اس میں ہر طرح کی تصویریں ہیں، ان تصویروں میں وہ لمحے تو بولتے ہی ہیں جن کو شاعر کا ذہن شکار کر رہا ہے، ان لمحوں کی آوازیں بھی ہیں جو ابھی نا آفریدگی کے صحرا میں ہیں مگر وہ اپنے وجود کا کسی نہ کسی طرح اظہار کر رہے ہیں۔

خالد محمود جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں شعبہ اردو سے وابستہ ہیں انکی تخلیقی جہتوں میں نظم بھی ہے اور نثر بھی، وہ عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں فن کار کو تازہ کار جہانوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، اور وہ ان آوازوں کی طرف اس طرح بڑھتا ہے جس طرح حاتم کوہ ندا کی طرف گیا تھا اور آخر کار اس طلسم سربستہ کے اسرار سے پوری طرح متعارف ہو کر لوٹا تھا۔

O

خالد محمود کے چند متفرق اشعار

O

ان کو آنا ہی کب تھا جو آئے نہیں، چاند نکلا نہیں تھا تو کیا دیکھتے
کان سن ہو گئے آہٹوں پر دھرے آنکھیں پتھرا گئیں راستہ دیکھتے
کشتی جاں کے نادان ملاح تھے ہم نے سمتِ سفر کی بھی پروا نہ کی
آپ ہوتے تو گہرائیاں ناپتے، باد باں کھولتے تو ہوا دیکھتے

عارف عزیز
روزنامہ "ندیم"
بھوپال

خالدؔ محمود کی شعری انفرادیت

جن خالدؔ محمود کو میں جانتا ہوں ان میں شاعرانہ لا ابالی پن کا دور دور تک گزر نہیں، ان کے فن کی طرح شخصیت میں بھی ایک ایسی دلنواز انفرادیت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، یہ انفرادیت وقار خوش سلیقگی، باقاعدگی اور انسان دوستی سے اس حد تک عبارت ہے کہ خلوص و محبت کی کوئی ایمائی یا اشاراتی تصویر اگر بنائی جائے تو یقیناً وہ حد درجہ خالدؔ محمود سے مشابہ ہوگی، کسی پر رعب ڈالنا یا کسی سے مرعوب ہونا ان کی سرشت میں داخل نہیں، اسکے بجائے شائستگی، سنجیدگی اور وضع داری کا احساس نیز مسائل کے باریک ترین پہلوؤں پر نظر رکھنے کی صلاحیت ان میں خوب پائی جاتی ہے۔

خالدؔ محمود کی ان شخصی صفات اور اضافی خوبیوں کی نمائندہ ان کی وہ شاعری بھی ہے جو مجموعہ کلام "سمندر آشنا" کے صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کے بعد کہی جانے والی غزلوں اور نظموں کے مطالعہ سے بھی احساس ہوتا ہے یہ ان کی اپنی آواز ہے جس پر کسی دوسرے کا پرتو تو نظر آسکتا ہے مگر چھاپ ممکن نہیں، خالدؔ محمود نے ان غزلوں میں تقلید و پیروی کے بجائے گہرے خلوص اور کسی قدر انکساری سے اپنے تجربات بیان کئے ہیں اور اسی لئے ان کا لہجہ یک گونہ انفرادیت کا حامل ہوگیا ہے عشق اور مشک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "اس کی خوشبو چھپائے نہیں چھپتی"، خالدؔ محمود کے اشعار میں بھی ایسی مہک ہے کہ دل و دماغ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے اس دعوے کی توثیق میں ان کے درج ذیل اشعار ہی کافی ہونگے۔

دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی　　　اک دستِ نازیاد کا شانہ دبا گیا

کوٹھیوں سے معذرت کے ساتھ کیا معلوم تھا
دھوپ سے جھلسے ہوئے بھی آدمی کہلائیں گے
کوہِ گراں کے سامنے تیشے کی کیا بساط
عہدِ جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی

خالدؔ محمود کی شاعری متعدد رنگوں کے امتزاج سے تشکیل پاتی ہے لیکن اس کا کوئی رنگ دھندلایا ملگجا نہیں اور وہ رنگ زیادہ دلفریب یا گہرا ہے جہاں خالدؔ محمود ایک دنیا شناس شخص کی طرح طنز سے کام لیتے ہیں مگر اس طنز میں بھی ایک ترکیبی حسن اور اس تجربہ کا ارتکاز ملتا ہے جو ہمارے تجربہ سے مختلف تو ہو سکتا ہے تاہم اسکی سچائی سے انکار اس لیے آسان نہیں کہ اکثر اس کی نشریت کا نشانہ خود ان کی ذات بھی بنتی ہے مثلاً۔

ابھی دھوپ خالدؔ پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگا
میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے
خالدؔ نے شاید آئینہ دیکھا نہیں کبھی
دلی میں چاہتا ہے کہ اپنا مکان ہو

اردو شاعری میں طنز کی روایات جتنی قدیم ہیں اتنی طرحدار نہیں لہذا طنز نگار شعراء کی تعداد بھی محدود ہے ان میں بھی کثرت ان شاعروں کی ہے جو عموماً اپنا دامن مزاح تک محدود رکھتے ہیں اور طنز ان سے سرزد ہو جاتا ہے، مفکر طنزیہ شعراء میں جن کو شمار کیا جاسکتا ہے ان میں اکبرؔ کا طنز چڑ چڑاہٹ اور شکست خوردگی کی نذر ہو گیا ہے، اقبالؔ کے یہاں تفکر کی بلندی نے طنز کو دوسری ہی ہیئت عطا کر دی ہے، شبلیؔ، حسرتؔ اور فیضؔ سیاسی طنز کے زیادہ خوگر رہے، یگانہؔ کے لہجہ میں زہرناکی اور جوشؔ و شادؔ عارفی کے یہاں طنز کا جو برمحل اظہار ملتا ہے خالدؔ محمود کا طنز اس سے جدا ہے وہ نہایت بردباری اور سنجیدگی کے ساتھ نیز بڑے متوازن لب و لہجہ میں طنز کا استعمال کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں۔

روز اخبار ہم سے کہتا ہے
جھوٹ کو سچ کے باب میں رکھئے
عروج آدم خاکی کا دور ہے خالد
فلک پہ جاتے ہیں اب لوگ سیر فرمانے
دماغ رہزن اخلاق، دل گہن کی طرح
بدن پہ پوشش بے داغ ہے کفن کی طرح
کچھ نشیمن پھونک ڈالو کچھ رکھو آباد بھی
باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی
میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

دہلی کے قیام سے خالدؔ محمود کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں وسعت ہی پیدا نہ ہوئی زندگی کے تضادوں اور محرومیوں کا عرفان بھی حاصل ہوا ہے لیکن جب اس نے طنز کی شکل اختیار کی تو یہ شعر وجود میں آئے۔

کام دلی کے سوا ہوتے نہیں
اور نا ہنجار دلی دور ہے

ہائے وہ احباب جن کے سینہ شفاف میں
داغ پڑ جاتے ہیں دامن میرا اجلا دیکھ کر

بنگلوں کی زندگی ہے نہ کاروں زندگی
یوں بھی گزر رہی ہے ہزاروں کی زندگی

مجھے عزت سے اپنی یہ گلا ہے
کہ میرے دوستوں کا دل دکھا ہے

خالدؔ محمود نے ''سمندر آشنا'' کی غزلیات میں صرف طنزیہ پیرایہ پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے یہاں ایک خاص نوع کی لطافت اور صدیوں کے تہذیبی اقدار کی وہ رنگ وروشنی بھی رچی بسی ملتی ہے جس کو آپ رومان پسندی یا روایت پرستی کا نام دے سکتے ہیں اس کی ایک مثال مجموعہ کے صفحہ ۹۲ پر موجود غزل ''حسرت ہے آرزو ہے یاس ہے'' میں ملتی ہے، اس غزل میں ساقی، میکدہ، گلشن، باغباں، گل، اور صیاد گویا روایتی شاعری کے تمام لوازمات ان کے مقررہ اور معینہ معنی کے ساتھ جلوں گر ہیں، پھر بھی ان کے یہاں روایت پرستی جدید رجحانات کے ساتھ خلط ملط ہونے کی وجہ سے قابل لحاظ بن گئی ہے، اسی طرح ''داغؔ اسکول'' کے انداز میں شعر کو محض رعایت لفظی تک محدود رکھنے کا سقم بھی وہ بعض جگہ دور نہیں کر پائے ہیں اگرچہ زبان و بیان پر قدرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے رعایت لفظی کو جدید قالب میں سمونے کی کوشش ضرور کی ہے۔

ہر کمندر ہوس سے باہر ہے
طائر جاں قفس سے باہر ہے

میری تخئیل کو لازم ہیں غموں کے نشتر
پھول کا جسم سدا کانٹوں کا پہرا مانگے

خالدؔ محمود کے یہاں ایک اور خصوصیت پائی جاتی ہے اور وہ ہے ادبی، تاریخی

اور مذہبی تلمیحات اور تلمیحاتی اشاروں یا اساتذہ کے مصرعوں پر تضمین مثلاً ۔

ہمارا گھر بھی صحرا ہو گیا ہے
مگر غالبؔ سی ویرانی نہیں ہے

''صبح گزری شام ہونے آئی میرؔ''
تیز کر رفتار دلی دور ہے

''اسے روز ازل انکار کی جرات ہوئی کیونکر''
کہیں انسان بھی بیٹھا نہ ہو شیطان کے اندر

آنکھوں میں دھوپ دل میں حرارت لہو کی تھی
آتش جوان تھا تو قیامت لہو کی تھی

خالدؔ محمود نے اپنے اشعار میں تضاد یا تکرار کو جس خوبصورتی سے برتا ہے اس کے لئے بھی وہ داد کے مستحق ہیں ۔

وہ مجھ کو ٹوٹ کے چاہنے لگا ہے کچھ دن سے
وہ کچھ دنوں سے برابر خفا سا رہتا ہے

مندر کی گھنٹیوں سے فضا گونجنے لگی
شاید ہوا ہے وقت سحر کی اذان کا

خشک سالی کھا گئی افراد کو
بہہ گئے گھر بھی جو برسا ٹوٹ کر

دل کی تپش سے آنکھیں بھیگیں
آگ میں پیدا ہوا سمندر

''موت کا ایک دن معین ہے''
زندگی دسترس سے باہر ہے

میں گنجان شہروں کا مارا ہوا
نوازش، نوازش، نوازش ہوا

''سمندر آشنا'' کے خالق کو زبان و بیان پر مکمل دسترس حاصل ہے اور جہاں جہاں انہوں نے تجربات و حوادث کو طنز پر فوقیت دی ہے، وہ ایک بڑے مگر جدید شاعر نظر آتے ہیں مثال کے طور پر چند مزید اشعار ۔

مقابلہ ہو تو سینے پہ وار کرتا ہے
وہ دشمنی بھی بڑی پروقار کرتا ہے

جو ہو سکے تو اسے مجھ سے دور ہی رکھئے
وہ شخص مجھ پہ بڑا اعتبار کرتا

اس فرد سے پھر آج میں ہنس کر ملا کہ جو
موقع ملے تو پشت میں خنجر اتارد۔

زندگی کے لطف کی فرصت کہاں سے لائیں گے
وقت جب جینے کا آئے گا تو ہم مر جائیں ۔

ان اشعار میں گہرے تفکر کے ساتھ مشاہدہ کی جو چمک نظر آتی ہے وہی خالدؔ محمو۔

کی انفرادیت اور اٹھان ہے، جس سے عام قاری ہی نہیں پروفیسر عبدالقوی دسنوی اور مظفر حنفی جیسے فن کے ثقہ پارکھ بھی متاثر ہوئے ہیں اور اسی بنا پر اعتماد سے کہا جا سکتا ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی، محمد علوی، شہریار اور مظفر حنفی نے غزل کو جس جدت، ندرت اور لب و لہجہ کی تازگی و حرارت سے لذت آشنا کیا خالد محمود اسی سلسلہ دراز کی ایک کڑی ہیں۔

بحیثیت مجموعی خالد محمود ایک باصلاحیت اور منفرد شاعر ہیں، ان کے یہاں الفاظ میں حسن، تناسب، مضامین میں کہیں مکمل اور کہیں جزوی ندرت اور لہجہ میں انفرادیت ہے، لیکن روایت پرستی، ازکار رفتہ استعارات، تشبیہات، علامات اور تلمیحاتی اشاروں سے بھی وہ لیس ہیں جو ان کی خوبی بھی ہے اور کمزوری بھی، تاہم ان کے لہجہ میں اکبر و غالب باہم مدغم نظر آتے ہیں وہ نسبتاً کم طنزیہ اور زیادہ سنجیدہ غزلوں میں بھی نسبتاً زیادہ طنزیہ اور کم سنجیدہ اشعار کہہ جاتے ہیں اور اہم بات یہ ہے کہ وہ کسی منزل کو منزل سمجھ کر جمود کا شکار نہیں ہوتے جیسا کہ خود انہوں نے بھی سمجھا اور کہا ہے ؎

دوستو! تم کو مبارک ہوں تمہاری منزلیں
میں بھی تھک جاتا تو شاید کوئی منزل ڈھونڈتا

O

اظہر غوری
ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۲۵

خالد محمود کی نظم نگاری

میرے لئے جس طرح یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ڈاکٹر خالد محمود کی شخصیت میں زیادہ بانکپن ہے یاان کی شاعری میں، اسی طرح یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل لگتا ہے کہ ان کی غزل زیادہ دلکش وپائیدار ہے یاان کی نظم۔

ڈاکٹر خالد محمود سے میری واقفیت زیادہ پرانی نہیں تاہم میں جس قدر جان سکا ہوں اس کے مطابق ان کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی صالح عناصر ہیں اور وہ ایک مخلص، سنجیدہ، منکسر مزاج اور باکردار شخص ہیں۔ یہ صفات ہمارے زمانے میں کمیاب ہیں۔ اور چونکہ شاعری گردو پیش کے حالات کے ساتھ خود شاعر کی شخصیت، کردار اور طرز فکر کی آئینہ دار ہوتی ہے اس لئے خالد محمود کی شاعری بھی پاکیزہ ہے انہوں نے حسن وعشق کے مضامین کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنایا بلکہ اپنے دور کے مسائل کی کوکھ سے جنم لینے والے حقائق کو اپنا موضوع بنایا۔ انہوں نے جذباتیت سے یکسر پہلو تہی کی تاہم حقیقت پسندانہ تفکر کی آمیزش کر کے اسے زیادہ معنویت دینے کی کوشش ضرور کی ہے۔

مجھے چند صفحوں میں خالد محمود کی نظم پر کچھ عرض کرنا ہے۔ بارے نظم کا بھی کچھ بیان ہو جائے۔ میں غزل کا مخالف نہیں۔ غزل کا اختصار، قوت ابلاغ اور سمندر کو کوزہ میں بھرنے کی صلاحیت اپنی جگہ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ میر و غالب نے اپنے نشتروں اور حسن بیان سے دلوں کے تار چاہے جتنا جھنجھنائے ہوں معاشرہ کو اقبال کی نظموں کی طرح متاثر نہیں کر سکے۔ غزل اپنی ساری ادبی چاشنی کے باوجود نظم کی طرح اصلاح معاشرہ کے لئے مفید نہیں ہوتی اور نظم کی یہی افادیت کبھی کبھی غزل پر اسے فوقیت عطا کر دیتی ہے خالد محمود کی نظموں میں بھی ایک تعمیری مقصدیت نمایاں نظر آتی ہے جس

، پیچھے اصلاح معاشرہ کی تڑپ کار فرما ہے۔

خالد محمود کی شاعری کا عرصہ اب خاصا طویل ہو چکا ہے تاہم ان کا کلام جو منظر ا پر آیا ہے وہ اتنا زیادہ نہیں کہ انہیں پُر گو کہا جا سکے پھر بھی وہ شورش کاشمیری کے الفاظ ، "جذبی کی طرح چالیس مصرعوں اور بیس شعروں کے شاعر" بھی نہیں۔ان کی نظموں ، جوش ملیح آبادی والا طنطنہ و ہمہمہ نہیں ہے لیکن انہوں نے نظیر اکبر آبادی کی طول بیانی و ال سے بھی اپنا دامن بچایا ہے وہ تجربات کی بھٹی میں تپے ہوئے ایک دردمند اور باشعور ان کی حیثیت سے حقیقت پسندانہ خیالات کو انوکھے اور تیکھے اسلوب میں پیش کرنے کا ہنر نتے ہیں اور یہی البیلا اسلوب ان کی شاعری کا امتیازی وصف ہے۔

خالد محمود کی شاعری ان کی حساس و جانسوز طبیعت کا آئینہ ہے وہ اکثر حالات کی ا ظریفی پر کڑھتے ہیں اور طنز سے کام لیتے ہیں لیکن اس طنز میں رکیک انداز اور پھوہڑپن ں آنے پاتا گویا ایسا لگتا ہے کہ وہ سماج کے جسم پر نشتر لگانے پر مجبور ہوتے ہیں تو اس پور احساس کے ساتھ لگاتے ہیں کہ نشتر کے بعد مرہم رکھنا بھی ضروری ہے خواجہ حسن ی مرحوم نے اسی بات کو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے قلمی خاکہ میں (جہاں سر کرپس ، ساتھ ان کے مذاکرات کا ذکر ہے) اپنے مخصوص خوبصورت انداز میں یوں ادا کیا تھا کہ

"معاف کیجئے گا۔ آپ کو تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوئی ہوگی لیکن یہ نشتر آپ کی ت کے لئے بہت ضروری تھا"

خالد محمود کی ساری نظمیں میری نظروں سے نہیں گزریں لیکن جن چند نظموں ڑھنے کا مجھے موقعہ ملا ہے ان سے ان کی قادر الکلامی شدت احساس، فکری بالیدگی ادائے ن کی قدرت اور ایک خاص قسم کا بانکپن نمایاں ہے اگرچہ یہ آزاد نظمیں اور نظم معریٰ ہیں اکستانی اسلام، ہندوستانی سیکولرزم اور اشتراکیت کی طرح میری فہم سے بالاتر رہی ہیں ن ان نظموں کو پڑھ کر خود نظم معریٰ کے تعلق سے مجھے اپنی رائے میں ایک خوشگوار یلی کا احساس ہوا۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنگ میل بن چکا ہے جب ایک یل نفرت خیز اور خون آشام تحریک کے نتیجہ میں بابری مسجد کو سورج کی کھڑی دھوپ ، اور قانون کے نام نہاد محافظوں کی نگاہوں کے سامنے شہید کر دیا گیا اور اور ہندوستانی

سیکولرزم کو شکست فاش نصیب ہوئی، ہندوستانی جمہوریت کے ایوان کے درو بام لرز اٹھے اور ملک گیر فسادات کی شکل میں پورے ملک میں تانڈو کا وہ رقص ہوا کہ الامان و الحفیظ ہزاروں لاشیں تڑپیں اور مجبور و بے کس اقلیت تلملاتی اور سسکتی رہ گئی یہی خون کے آنسو خالد محمود کی نظم ''وجود کا کرب'' اختیار کر گئے۔

سنو، سنو، سب مرے عزیز!
مرے رفیقو!
مرے وطن، مادر وطن کے عجیب لوگو!
غریب لوگو!
تمہیں مبارک ہو موت اپنی
کہ مر گئے ہو تو کتنے خوش ہو
کہ اب تمہاری طرف تو نالیں نہیں اٹھیں گی
تمہارے اپنے محافظوں کی
نہیں جلیں گے مکاں تمہارے
تمہارے بچے یتیم ہوں گے نہ مائیں بیوہ
تمہاری بہنوں کی عصمتیں بھی نہیں لٹیں گی
نہ تم جیو گے نہ تم مروگے
کہ مر چکے ہو تو مطمئن ہو
تمہیں مبارک ہو موت اپنی
مگر ہماری طرف تو دیکھو
ہماری حالت عجیب تر ہے
کہ ہم تو اب تک بھی جی رہے ہیں
وہیں کھڑے ہیں
تو گویا اب پھر وہی سب ہوگا
جو ہو چکا ہے تمہارے آگے
تمہارے پیچھے،

پھر اس سے پہلے
پھر اس سے پہلے
مگر سنو سب مرے عزیزو!
کہ ہم جو زندہ ہیں، اس لئے ہیں
کہ اپنی باری کے منتظر ہیں
سب اپنی باری کے منتظر ہیں
ہم اپنی باری کے منتظر ہیں
وہ اپنی باری کے منتظر ہیں

موجودہ بھوپال کی علمی و ادبی تاریخ میں دو نام بہت نمایاں ہیں ایک مولانا محمد عمران خاں ندوی مرحوم کا جنہوں نے اپنی بے مثال جدو جہد سے ہندوستان کی سب سے بڑی مسجد تاج المساجد کو جو نامکمل رہ گئی تھی پایۂ تکمیل تک پہونچایا اور اس میں دارالعلوم تاج المساجد جیسا عظیم الشان دینی تعلیمی ادارہ قائم کر کے دینی علوم کی تعلیم کا معقول انتظام کر دیا۔ دوسرے ملا سجاد حسین مرحوم جنہوں نے سیفیہ کالج جیسا عصری علوم کا عظیم الشان ادارہ قائم کر کے بھوپال اور اسکے قرب و جوار کے لوگوں کو تعلیمی پسماندگی سے نکال کر تعلیم و ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کا زبردست کارنامہ انجام دیا ملت کے اس دردمند کی پہلی برسی پر ہمارا شاعر احسانمندی اور قدر دانی کے گہرے جذبات میں ڈوب جاتا ہے جسکا نتیجہ "زندگی کیا ہے اگر موت اسے کہتے ہیں" کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ نظم شروع ہوتی ہے۔

آج پھر رات گئے درد نے کروٹ بدلی
دل کے حساس دریچے سے ہوا کا جھونکا
میں نے سوچا تھا کہ لمحات کی رفتار لئے
شعلۂ آتش غم چھو کے گزر جائے گا
اور پھر موج صبارات کی کالی چلمن
غیر محسوس سی جنبش سے بصد ناز و ادا
ایک جانب کو کو ہٹائے گی بقدر توفیق
تلخ یادوں کا دھواں دل کے نہاں خانوں سے

تیز پرواز پرندے سا گزر جائے گا
صبح نو باندھ کے آئے گی سنہری سہرا!
اور طباشیر بکھیرے گی
مگر یوں نہ ہوا ___________
میں نے سوچا تھا کہ جب شب کا فسوں ٹوٹے گا
خود بخود ذہن کے آنگن میں خیالوں کا مزاج
شاہ خاور کی تمازت سے پگھل جائے گا
سازِ فطرت پہ فضاؤں میں خوش آواز طیور
اپنے نغمات اچھالیں گے
مگر یوں نہ ہوا ___________
اس کے برعکس ہوایوں کے افق کا چہرہ
سرخ ہوتا گیا، ہوتا گیا، ہوتا ہی گیا
صبح کے زرد ستارے نے کیا مجھ کو سلام
تو یوں محسوس ہوا پیکر اخلاص کوئی
تعزیت کو کسی گھر آئے پس از مرگ عزیز
دل کو مانوس فضاؤں نے بہت کچھ چھیڑا
حسب معمول سحر آئی، اجالے جاگے
پرچم خاور مشرق کھلا، طائر چہکے
لیکن ایسا نہ ہوا، جیسا کہ اندازہ تھا
تلخ یادوں کا دھواں دل کے نہاں خانوں سے
تیز پرواز پرندے کی طرح اڑ نہ سکا
خود بخود ذہن کے آنگن میں خیالوں کا مزاج
شاہِ خاور کی تمازت سے بدل بھی نہ سکا
صبح تو آئی مگر رات کی تقدیر لئے
سال دو سال کی سوئی ہوئی تصویر لئے

صاف ہوتے گئے تصویر کے دھندلائے نقوش
ذہن کی سطح پر نوارانی سا پیکر ابھرا
نرم مشفق سے خدو خال، دمکتا چہرہ
بولا احساس کہ یہ ہیں وہی سجاد حسین
منبعِ علم تھی کل ذات گرامی جن کی
علم کی آج بھی پہچان ہے تحفہ ان کا
موت نے چھین لیا پیکر خاکی لیکن
وہ نئے دور کے سینے میں ابھی زندہ ہیں
بلکہ رخشندہ و تابندہ و پایندہ ہیں
دل کی محفل میں سدا صدر نشیں رہتے ہیں
زندگی کیا ہے۔اگر موت اسے کہتے ہیں

خالد محمود نے بہت سے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔اس مختصر سے مضمون میں ان سب کے نمونے پیش نہیں کئے جاسکتے پھر بھی چند نظموں کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

اپنی نظم ''دوسرا رشتہ'' میں خالد محمود نے اس سماجی بے راہ روی پر بہت مختصر اور موثر انداز میں روشنی ڈالی ہے جو اب ہمارے سماج میں سرطان کی طرح تیزی سے پھیل رہی ہے اور اسے گھن کی طرح کھوکھلا کرتی جارہی ہے یعنی جنسی آوارگی۔

''پتھر'' کے عنوان سے ایک خوبصورت نظم میں خالد محمود نے پتھر کے تعلق سے فکر و نظر کے بہت سے گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے یہ پتھر کان سے بھی نکلتے ہیں اور اونچے پربتوں کے بھی ہوتے ہیں۔ خام مکانوں میں بھی لگے نظر آتے ہیں اور پختہ حویلیوں میں بھی۔ کہیں یہ پتھر سنگ میل بن کر راستہ دکھاتے ہیں تو کہیں مندروں میں سج کر خود اپنے پیکر تراشنے والوں سے اپنے آپ کو خالق کہلواتے نظر آتے ہیں۔ کبھی یہی پتھر ان محلوں کی زینت نظر آتے ہیں جہاں کبھی جابر و قاہر بادشاہ سکونت پذیر ہوا کرتے تھے تو کہیں سنگ مرمر بن کر تاج محل کے حسین پیکر میں ڈھل جاتے ہیں یہی پتھر کہیں ہیرے بن کر خوبان جہاں کی محبت کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں کہیں انہیں کے لئے خون کی ندیاں بہتی ہیں کبھی یہی پتھر منبروں کی زینت بنتے ہیں جن پر چڑھ کر واعظانِ کرام عوام کو اللہ سے

ڈراتے ہیں اور خود حاکموں سے ڈرتے ہیں پتھر ہی سنگ اسود کی شکل اختیار کرتا ہے تو لاکھوں لوگ عقیدت سے اسے بوسہ دیتے ہیں۔

ایک اور دلکش نظم ''زاویے'' میں چاند کی جلوہ آرائیوں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ کبھی اسے جھیل کے گہرے پانیوں میں نہاتے دیکھا جاتا ہے کبھی وہ تاروں کے جھرمٹ میں اس طرح نظر آتا ہے جیسے کرشن گوپیوں کے درمیان یا راجا اندر حسین پریوں کے لشکر کے ساتھ راج سنگھاسن پر براجمان ہوں۔ کبھی ایسا لگتا ہے کہ چاند کوئی دلہن ہے جو اپنی سہیلوں کے بیچ گٹھری سی بنی بیٹھی ہے۔ کبھی ایسا لگتا کہ چاند کوئی پھول ہے جس کے ارد گرد تتلیاں منڈلا رہی ہوں کبھی چاند فلمی ہیرو کی طرح اپنے شیدائیوں کے درمیان نظر آتا ہے۔ کبھی کسی دولہا کی طرح اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں کبھی چاند ایک پاگل نظر آتا ہے جسے شریر لڑکوں نے گھیرے میں لے رکھا ہو کبھی شمع کے مانند لگتا جس پر پروانے نچھاور ہو رہے ہوں۔

مغربی تہذیب کی یلغار کے آگے مشرقی تہذیب جس بے بسی کا شکار ہے اسکا اظہار خالد محمود نے اپنی نظم ''فاصلہ'' میں اس طرح کیا ہے۔

میں ایک مشرقی خاتون تھی قسم لے لو
خود اپنے سائے سے ڈرتی تھی چونک جاتی تھی
وہ مجھ کو غیر مہذب کے نام سے اکثر
پکار کر مرے نشتر لگایا کرتے تھے
انہوں نے مجھ کو بہ اصرار چند مردوں سے
کسی وجہ سے وہ احباب جن کو کہتے تھے
ملایا، بات کرائی، تکلفات اٹھے
بقول ان کے نئی روشنی ملی مجھ کو
اور آج جبکہ میں تہذیب کی امانت ہوں
ہر اک نظر میں ہوں روح رواں لطافت کی
ہر ایک شب نئی آغوش کی ضیافت ہوں
وہ مجھ سے لڑتے ہیں، وہ مجھ سے روٹھ جاتے ہیں
کبھی کبھی مجھے محسوس ایسا ہوتا ہے

کہ جس خیال پہ نازاں تھے وہ ہمیشہ سے
اب اس خیال کے آتے ہیں ٹوٹ جاتے ہیں

تعلیم و تربیت کا انسانی ذہن کی نشو و نما اور انسانی تہذیب کے ارتقاء میں جو کلیدی کردار رہا ہے اس کے مطابق معلم و مربی کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے قدیم سماج میں تو مثل مشہور تھی ''کہ جس نے مجھے ایک حرف سکھایا میں اس کا غلام ہو گیا'' لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارا آج کا معاشرہ معلم و مربی کو وہ باعزت اہم مرتبہ دینے سے پہلو تہی کر رہا ہے جو اسکا جائز حق ہے مادہ پرست سماج ہر چیز کو مالی منفعت کے ترازو سے تولنے کا عادی ہے خالد محمود نے جو خود بھی ایک معلم ہیں، ایک معلم کے دلی کرب کا شدید احساس رکھتے ہوئے اپنی طویل نظم ''میں کہ اک معلم ہوں'' میں معلم کے بنیادی کردار کے مختلف پہلوؤں کو خوبصورتی کے ساتھ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے مثلاً:

میں کہ اک معلم ہوں
میں نے تم کو بخشا ہے
اک شعور بے پایاں
آگہی کے دریا میں
تیرنا سکھایا ہے
عقل کے مناروں سے روشنی عطا کی ہے

میں کہ اک معلم ہوں
میں کہ تم کو دنیا میں
موت کی گپھاؤں سے
زندگی میں لایا ہوں
اور تم کو دنیا کے
شب پناہ غاروں سے
روشنی میں لایا ہوں
میں کہ اک معلم ہوں

میں اگر نہیں ہوتا
جنگلوں کے پیڑوں کی
خشک چھال اور پتے
سب تمہارے جسموں کا
جزو بن گئے ہوتے
میں اگر نہیں ہوتا
تو تمہاری اولادیں
نالیوں کے کیڑوں سی
زندگی بسر کرتیں

میں کہ اک معلم ہوں
میں وہ ہوں کہ دنیا میں
ایسا مرتبہ پایا
تھیں تمہاری اولادیں
اور میں باپ کہلایا

مختصر یہ کے ڈاکٹر خالد محمود، نئی نسل کے ان نمائندہ شاعروں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں جنہوں نے اردو شاعری کو ایک خاص انداز اور لہجہ دیا ہے اور اُپنے گہرے شعور، حقیقت پسندانہ انداز بیان اور اظہار خیال کی جدت کے ساتھ اردو شاعری کے کارواں کو آگے بڑھانے والوں میں آگے ہیں۔

O

کوثر مظہری
شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

خالد محمود کا جہانِ شعر

اس کارگاہ ہستی میں اسرار و رموز کی ان گنت پرتیں ہیں۔ ان پرتوں کو کھولنے والا کوئی ایک شخص نہیں ہوتا۔ ہر شعبہ فکر سے متعلق اشخاص اس میں حصہ لیتے ہیں۔ کچھ پرتیں صوفیائے کرام کھولتے ہیں۔ تو کچھ رہنمائے قوم، کچھ تجار کھولتے ہیں تو کچھ کاشتکار۔ اسی انسانی سماج کا ایک فرد شاعر بھی ہوتا ہے جسے بیشتر دانشوروں اور مفکروں نے سماج کا حسّاس ترین فرد تصور کیا ہے۔ اس امر میں صداقت بھی ہے۔ بقول جگر ؎

راز جو سینۂ فطرت میں نہاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دل شاعر پہ عیاں ہوتا ہے

خالؔد محمود بھی اسی حساس ترین طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے بھی کائنات کے اسرار و رموز کی پرتیں کھولنے کی کاوش کی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

ہر اک فیصلہ اس نے بہتر کیا
مجھے آنکھ دی، تم کو منظر کیا

اس شعر میں اللہ کی تعریف بھی ہے اور محبوب کے منظر بن جانے کا دل پذیر واقعہ بھی۔ خود میں اور محبوب (منظر) کے مابین ایک اٹوٹ رشتے کا اشاریہ بھی۔ اور آگے بڑھیں تو خالؔد کے اندر موجود احساس کی چنگاری کا پتہ بھی چلتا ہے۔ کبھی کبھی ان کے یہاں تجربے کا اظہار اور اسلوب اس درجہ غم آگیں ہوتا ہے کہ ذہن و ادراک پر غم کی فضا چھا جاتی ہے

نصف دنیا بھوک سے اور پیاس سے مغلوب ہے
دست و بازو، ذہن و دل، لعل و گہر ہوتے ہوتے

"موت کا ایک دن معین ہے"
زندگی دسترس سے باہر ہے
برائے تشنہ لب پانی نہیں ہے
سمندر کا کوئی ثانی نہیں ہے

خالدؔ محمود احساس اور جسم کے جمہوری نظام میں توازن چاہتے ہیں۔ کسی بھی جذبے سے مغلوب ہونا غیر متوازن صورت حال کے مترادف ہے جو انسانی ذہن یا نظام جسم کو غیر جمہوری بناتا ہے۔ خالدؔ خوش قسمت ہیں کہ ان کے یہاں توازن برقرار ہے۔ اسی لئے تو وہ کہتے ہیں۔

نظام جسم جمہوری ہے خالدؔ
کسی جذبے کی سلطانی نہیں ہے

جس توازن کا اوپر ذکر کیا گیا وہ تب ہی برقرار رہ سکتا ہے جب کسی شے کی فراوانی نہ ہو۔ اس عالم میں جس کو بیش بہا مستی و سرخوشی کا خزانہ ہاتھ آتا ہے وہ متصوفانہ اور فقیرانہ ہوتا ہے۔ بوریانشینی میں بھی سلطانی و جہانبانی کی شان ہمارے بزرگوں اور صوفیائے کرام کا حصہ رہی ہے۔ اور یہی خالدؔ کی ذہنی تربیت کا خاصہ رہا ہے۔ تیور ملاحظہ کریں ؎

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شے کی فراوانی نہیں ہے

یہ شعر پڑھ کر یہ ہرگز نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان کے اندر حرکت و عمل کا مادہ مفقود ہے۔ دراصل انہیں اپنی ذات اور اس کائنات کا عرفان حاصل ہے۔ زمانے کی شاطرانہ چال پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ہر مسئلے کی دروں بینی ان کا وصف ہے۔ دو شعر ؎

مرے وجود کی دھڑکن بتا کہاں ہے تو　　جو تو نہیں تو لہو سرد ہوتا جاتا ہے
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے　　میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں

جب آدمی کو عرفان ذات اور عرفان کائنات حاصل ہو جاتا ہے تو اس کے اندر ایک طرح کی غیر معمولی غیر مرئی قوت پیدا ہو جاتی ہے جو اسے سمندر آشنا اور طوفان آشنا کرتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خوف اور دہشت کی جگہ جوش و ولولہ ہمت مردانہ و جرات رندانہ کی صفت پیدا ہو جاتی ہے ؎

سیلاب کی آمد پہ نہ حیرت ہے نہ ڈر ہے
خالد کا تو دریا کی گزر گاہ میں گھر ہے
تھکنے لگے ہیں پاؤں مگر میر کارواں
پیچھے نہ رہ سکوں گا مرا سر اتار دے

خالد محمود کا شعری سفر خط مستقیم پر جاری نہیں ہے کیونکہ ان کے یہاں غم کی آنچ بھی ہے، سرخوشی اور سرمستی بھی، طنز و مزاح کا لہجہ بھی ہے اور فکر و فلسفہ کے رموز بھی، پھولوں کا رس بھی ہے اور نیش عسل بھی۔ گویا ایک زندگی ہے جس میں تنوع ہے۔ یعنی ؎

آواز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھئے — پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی
سورج ستارے، کوہ و سمندر فلک، زمیں — سب ایک کر چکا ہے یہ گز بھر کا آدمی
ہر کمند ہوس سے باہر ہے — طائر جاں قفس سے باہر ہے
دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی — اک دستِ نازیاد کا شانہ دبا گیا

مولانا حالی نے غالب کے لئے "حیوان ظریف" کی اصطلاح وضع کی تھی۔ اسے غالب کے لئے ہی رہنے دیا جائے مگر یہ عرض کرنا یہاں ضروری ہے کہ خالد کے یہاں حس ظرافت اور بذلہ سنجی کے عناصر موج زن ہیں۔ اور وہ اس حس کی مدد سے طنز کے تیر برسا جاتے ہیں ؎

مندر کی گھنٹیوں سے فضا گونجنے لگی — شاید ہوا ہے وقت سحر کی اذان کا
کام دلی کہ سوا ہوتے نہیں — اور نا ہنجار دلی دور ہے
باقی ہیں دنیا میں جب تک دونوں کے دیوان — ہر سچے شاعر کی الجھن، اک غالب اک میر
خالد نے شاید آئینہ دیکھا نہیں کبھی۔ — دلی میں چاہتا ہے کہ اپنا مکان ہو

خالد محمود نے اپنی شاعری کو فیشن پرستی اور بے جا تصنع سے بچائے رکھا ہے۔ اگر ان کا رشتہ کلاسکی شعری سرمایہ سے استوار نہ ہوتا تو شاید وہ بچ نہ پاتے۔ سماج اور قوم میں کشیدگی اور رشتوں کی بے وقعتی اور شکست و ریخت پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس متغیر ماحول میں کبھی کبھی انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی بدل چکے ہیں۔ اور اب وہ دوسروں کے لئے اشتباہ کا رویہ رکھتے ہیں۔ اس غیر معتبر دنیا میں ان کی اپنی شخصیت کا اعتبار بھی مشکوک ہو گیا ہے تبھی تو وہ کہتے ہیں ؎

جو ہو سکے تو اسے مجھ سے دور ہی رکھیے
وہ شخص مجھ پہ بڑا اعتبار کرتا ہے

رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے اور ان میں جاگزیں کرب اور اضطراب کی کیفیت کی صوری ملاحظہ کریں ۔

بھائی کے ہر سلوک میں شدت لہو کی تھی
خنجر چلا کے مجھ پہ بہت غم زدہ ہوا
مہرباں! آشنا!
مرے محترم!
ہر اک زخم پر دل نے آواز دی

جو فنکار اپنے ماضی کے سرمائے کو فراموش کر دیتا ہے، اس کے تاریخی اور تخلیقی شعور پر بے رونقی کی دبیز گرد جم جاتی ہے اور اس صورت حال میں افکار اور احساسات کی شفافیت متاثر ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس حال میں ماحول یا گرد و پیش کے وقوعے کی عکاسی پوری طرح ممکن نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خالدؔ کی فکری اساس شفاف اور مستحکم ہے، شعور کی سیالیت برقرار ہے اس پر کائی نہیں جمی ہے۔ پوری کائنات اسی کی شفاف سطح پر منعکس ہوتی ہے گویا کائنات آرپار دکھائی پڑتی ہے۔ موضوعات اور ان کی جہات کی جھلک نظر آتی ہے۔

خالدؔ محمود کو آگاہی ہے کہ کبر و نخوت سے انسان قعر مذلت میں چلا جاتا ہے۔ انہیں یہ بھی احساس ہے کہ شعور کا پانی جب گدلا ہوگا تو تصویر دھندلی ہوگی۔ وہ رب کائنات سے دست بہ دعا ہیں ۔

انساں کے سر سے کبر کا پتھر اتار دے
بار الٰہ! اس کو زمیں پر اتار دے

جدیدیت کی مسموم ہوا نے اچھے اچھے ذہنوں کو خراب کیا ہے۔ جب بک بٹن سرکتی جین، بکری میں میں کرتی ہے، مچھلی کہاں سے کمرے کے اندر چلی گئی، سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا جیسی شاعری ہو رہی تھی، اس وقت کی نئی نسل اس کے ریلے میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئی۔ اس کا اثر کامل طور پر نہ سہی جزئی طور پر بعد کی نسل پر بھی پڑا اور بہتوں نے نقالی اور فیشن پرستی کے زعم میں الم غلم کہنا شروع کر دیا۔ تعجب ہے کہ ہمارے کچھ نقادوں نے مذکورہ بالا نوع کی شاعری کے لئے متنوع مہذب توجیہات گڑھ لیں۔ یہ بھی خوب ہے کہ غیر مہذب اور مخرب اخلاق شاعری کے لئے مہذبّ توجیہات، قوت انتقاد اور جہت توجیہات کے اسلوب کی داد دینا پڑتی ہے۔ مگر نئے ذہنوں میں کچھ خالدؔ محمود جیسے لوگ

بھی آئے جنھوں نے اپنے کلاسیکی اور تہذیبی ورثے اور تاریخی شعور کی مدد سے ایک تازہ اور متحرک منظر نامہ تشکیل دیا۔ کہیں کہیں گانو کی جیتی جاگتی سچی قدریں میر کی شعری بساط پر شعری مہروں کی مانند بچھ گئیں۔ دیکھئے خالد محمود کا رنگ

گاؤں کا اک سیدھا سچا آدمی شہر میں کیوں لا دلایا پھینک دے
راتوں کا درد بہہ کے اب آنکھوں میں آگیا یہ کون مرے جسم کے اندر سما گیا
اک ذرا تیز ہوئی تھی رفتار ہم سفر چیخ اٹھا ، آہستہ
ہر شے ہر ایک شے کی طرح بے ثبات ہے کچھ دن کے بعد تو بھی مجھے بھول جائے گا

ان شعروں میں کرب کی آنچ بھی ہے اور زندگی کی سچائی بھی۔ حیاتِ انسانی کے رموز و نکات بھی ان کی غزلوں میں امٹ نقوش کی مانند تابندہ نظر آتے ہیں یعنی خلوص کی آنکھ سے کائنات اور حیات کی دروں بینی۔

جناب خالد نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ سماج اور سیاست کے ڈھکوسلے اور رہنماؤں کے سطحی پن کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ انہوں نے ایسے موضوعات کی پیش کش کے لئے اس صنف کو موزوں جانا ہے۔ "۶ر دسمبر" ایک پر اثر اور احساس کی دنیا کو مہمیز کرنے والی نظم ہے۔ شاعر اس تاریخی سانحے میں جان بحق ہونے والوں کو مبارک باد دے رہا ہے۔ پہلے تو یہ ایک متضاد رویہ معلوم ہوتا ہے مگر جب وہ کہتے ہیں:

تمہارے بچے یتیم ہوں گے نہ مائیں بیوہ
تمہاری بہنوں کی عصمتیں بھی نہیں لٹیں گی
نہ تم جیو گے نہ تم مروگے
کہ مر چکے ہو تو مطمئن ہو
تمہیں مبارک ہو موت اپنی

تو مطلع صاف ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے جو ملک عدم جا چکے ان کے سامنے یہاں کا مذموم اور ہلاکت خیز ماحول نہیں ہے گویا ایک حد تک وہ مطمئن ہیں۔ دراصل اس نظم میں شاعر نے IRONY کو پیش کیا ہے۔

شاعر کی آنکھ کیمرہ اور دوربین سے زیادہ پاور فل ہوتی ہے۔ اس کی چشم بصیرت کے پردے پر کیسی اور کہاں کہاں کی تصویریں منعکس ہوتی ہیں، آسانی سے سمجھا نہیں

جا سکتا۔ رشتوں کی Ambigyity اور فکری تحیر آمیزی ہے۔ ملاحظہ کریں کہ سماج میں پنپ رہے کریہہ رشتوں کی دھند کو انہوں نے کس طرح Penetrate کرنے کی کوشش کی ہے:

وہ سوچتی تھی کسی وقت ماں سے کہہ دوں گی
کہ اونچے قد کا صحت مند جسم والا شخص

ہمارے گھر میں جو ہر روز آیا کرتا ہے
میں خواہشات کی دنیا میں اس کی محرم ہوں

خوشی سے ماں اسے فرزندگی میں لے لے گی
ہر آرزو کا مری احترام کرتی ہے

اِ ایک رات یہی سوچ کر وہ خلوت میں
جو ماں سے ملنے کو پہنچی تو انکشاف ہوا

کہ جس کو ماں کا وہ بیٹا بنانے والی تھی
وہ شخص رشتے میں اب اس کا باپ لگتا ہے

(دوسرا رشتہ)

اس میں عہد نو اور مغرب زدہ سوسائٹی کی جنسی بے راہ روی اور مرد وزن کے بے محابہ اختلاط پر طنز بھی ہے۔ اور ایک طرح سے Elite کلاس کی کریہہ صورت اور ناآسودہ زندگی کی عکاسی بھی۔ خالد اس موضوع کو تخلیقی قوت اور فنی پوشیدگی کی مدد سے نبھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

معلمی ایک پاکیزہ فریضہ ہے۔ خالد محمود کی "میں کہ اک معلم ہوں" ایک اچھی اور تجربے سے معمور نظم ہے سچ ہے کہ ایک معلم ہی آدمی میں موجود برائیوں اور غیر انسانی عناصر و عوامل کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے کا کام کرتا ہے۔ اس نظم سے صرف ایک بند۔

آج تم مہذب ہو
آج تم ہو شائستہ

یہ بھی میری کوشش کا
لازمی نتیجہ ہے

شعور کے سطحی پن اور معیار نسوانیت کے غارت ہونے کو بھی خالدؔ نے اپنی نظم "فاصلہ" میں موضوع بنایا ہے۔ ایک مشرقی خاتون کو جب ایک مغرب زدہ شوہر اپنے احباب میں متعارف کرا کرا سے بے تکلف بناتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ کیا ہوتا ہے، اسے خوبصورتی سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو خالدؔ کی بالغ نظری اور پختہ شعور ہونے پر دال ہے۔ نظم کا نصف آخر حصہ دیکھیں:

بقول ان کے نئی روشنی ملی مجھ کو
اور آج جب کہ میں تہذیب کی امانت ہوں

ہر اک نظر میں ہوں روح رواں لطافت کی
ہر ایک شب نئی آغوش کی ضیافت ہوں

وہ مجھ سے لڑتے ہیں وہ مجھ سے روٹھ جاتے ہیں
کبھی کبھی مجھے محسوس ایسا ہوتا ہے

کہ جس خیال پہ نازاں تھے وہ ہمیشہ سے
اب اس خیال کے آتے ہی ٹوٹ جاتے ہیں
(فاصلہ)

ہماری تہذیب اور ہمارا مشرقی رکھ رکھاؤ جس طرح ناپید ہو رہا ہے وہ اس عہد کا ایک کرب ناک اور پر استعجاب المیہ ہے۔ نئی تہذیب اور نئے فیشن نے مشرقیت کی کمر توڑ دی ہے۔ اس مصنوعی زندگی اور سماج کے اس کھوکھلے زاویے پر گہری نظر ہے۔
خالدؔ محمود کی تخلیقی اور فنی آنکھ کائنات اور سماج کی دروں بینی میں مصروف ہے۔
یب ایسی شے جس کی طرف ہم آپ غور سے کبھی دیکھتے نہیں اور نہ اس پر سوچتے ہیں، خالدؔ
س ی تعریف و توجیہ پیش کرتے ہیں۔ "پتھر" کے عنوان سے ایک طویل نظم ہے۔ مکان کا

پتھر، مندر کا پتھر، محلوں کا پتھر، منبر کا پتھر، تاج محل کا پتھر، مقدس پتھر جو حجر اسود سے موسوم ہے، وغیرہ۔ خالد کی نگاہ آج کی ترقی یافتہ قوم اور ملک پر بھی جاتی ہے جو چاند پر قدم تو رکھ آئے مگر وہاں سے آنے والے پتھر ہی لے کر آئے۔ اس نظم میں طنز کا عنصر بھی جابہ جا موجود ہے:

آؤ ان سے ملو یہ پتھر ہیں
واعظ وحافظ وفقیہ وامام
اس پر اپنے قدم جماتے ہیں
خود تو ڈرتے ہیں حاکموں سے مگر
ہم کو اللہ سے ڈراتے ہیں
آؤ ان سے ملو یہ پتھر ہیں
یہ وہ پتھر ہیں آج عظمت کے
کتنے اعزاز اس نے پائے ہیں
چاند پر جا کے لوٹنے والے
چند پتھر ہی لے کے آئے ہیں

اسی طرح ایک نظم میں انہوں نے "چاند" کو مختلف زاویے سے پیش کیا ہے اس نظم میں جو لوچ اور کیف آور فضابندی ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ صرف دو بند ملاحظہ کریں:

چاند لگتا ہے کرشن ہو جیسے
اور تارے ہوں گوپیاں اس کی
کرشن کو میں نے جب جہاں پایا
گوپیوں ہی کے درمیاں پایا
چاند لگتا ہے ایک پاگل ہے
اور تارے شریر لڑکے ہیں
پگلا راہوں سے جب نکلتا ہے
ایک جھنڈ اس کے ساتھ چلتا ہے

اس نظم میں دو تین بند زبردستی کے ہیں۔ ایک جگہ چاند کو شمع اور تاروں کو پروانوں سے تشبیہ دی گئی ہے شمع (چاند) ساری رات جلتی ہے تو پروانے (تارے) بھی ساتھ ساتھ صبح تک جلتے ہیں۔ دونوں کی روشنی صبح ہونے کے ساتھ ساتھ پھیکی پڑ جاتی ہے۔ پروانے کے لئے بجھنے کا استعمال بھی مناسب نہیں۔ اس طرح جہاں چاند کو طوائف اور تاروں کو اس کے شیدائی بتایا گیا ہے وہاں بھی دو مصرعے حلق سے نہیں اترتے "ٹرافی اور "کپس" والی تعبیر بھی یونہی سی ہے۔ بلکہ شعریت مجروح ہو گئی ہے دوسرے سارے بند تازہ کار اور تاثیر سے پر ہیں۔

خالد محمود نے غزلیں اور نظمیں دونوں لکھیں۔ ان کی شاعری میں قدامت پرستی سے آزادی ہے۔ مگر اپنے ماضی کے سرمایوں اور شاعری کے رکھ رکھاؤ کا خیال رکھا ہے۔ احساس میں اتنی گنجائش ہے کہ وہ حیاتِ انسانی اور کائنات کی خورد بینی اشیا کی تصویر یر الفاظ میں پیش کر سکیں۔ ان کے یہاں نہ جذبوں کی فراوانی ہے اور نہ دوسری اشیا کی۔ ایک لطف ہے، کیف ہے، نشہ ہے، شدت ہے تہی دامانی میں بھی استغنا اور سلطانی کا رنگ ہے گویا نئی شاعری کے منظر نامے پر ایک نئے تیور کا بانکا اور پرکار شاعر ہے، جس کا نام ہے خالد محمود وہ اسی تازگی کے ساتھ پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے۔

O

احمد محفوظ
جواہر لال یونیورسٹی، دلی

خالد محمود کی غزل

کلاسیکی عہد سے لے کر اب تک کے سفر میں اردو غزل طرح طرح کی تبدیلیوں سے آشنا ہوئی ہے۔ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں ہی عہد بہ عہد ہمیں غزل کی تازہ کاری کا خوشگوار احساس ہوتا رہا ہے۔ صنفِ غزل اپنے فنی تقاضوں کے سبب اتنی ہی تبدیلیاں گوارا کرتی ہے جتنی اس کی رسومیات اور شعریات اس کی اجازت دیتی ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک ہی عہد کے مختلف شعرا کی غزلوں میں خاصا فرق رہا ہے۔ عہد حاضر میں جو غزلیں کہی جارہی ہیں انہیں جدید غزل سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا ایک طرح سے دیکھا جائے تو جدید غزل کلاسیکی غزل سے مختلف کوئی شے قرار پاتی ہے۔ اور اس امر میں ایک حد تک صداقت بھی ہے۔ تاہم یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ جدید اور کلاسیکی غزل میں جو بات مشترک ہے وہ دونوں کا غزل ہونا ہے۔ اور جب صنفی اعتبار سے دونوں ایک ہیں تو جدید غزل کتنی ہی جدید کیوں نہ ہو جائے وہ کلاسیکی غزل کی خصوصیات سے یکسر دست بردار نہیں ہو سکتی۔ خالد محمود کی غزلوں کو دیکھ کر سب سے پہلے یہی احساس ہوتا ہے۔

خالد محمود کی غزلوں میں جہاں تک مضامین کی نوعیت کا تعلق ہے تو ان میں بیشتر مضامین وہ ہیں جن میں انسان بحیثیت فرد مرکزی کردار کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ داخلیت پسندی کی اصطلاح اگرچہ اب خاصی پرانی ہو چکی ہے لیکن ان غزلوں میں یہ میلان ہم دیکھ سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں اس قسم کی داخلیت نہیں ہے جس کے ڈانڈے شکستِ ذات، موت کی خواہش اور دنیا جہان سے مکمل کنارہ کشی سے ملتے ہیں۔ اس کے بر خلاف ان غزلوں کا مرکزی کردار ایسا فرد ہے جو محروم و مایوس تو ہے لیکن تکمیل خواہش کے لئے سرگرداں و پریشان بھی نظر آتا ہے۔ اور یہ بھی ہے کہ کہیں کہیں اسے خواہشات کے پورے نہ ہونے کا

گمان یقین کی منزل پر بھی پہنچا دیتا ہے جہاں احساس محرومی اس پر غالب آجاتا ہے۔

قافلے میں ہم اس مقام پہ ہیں
جو صدائے جرس سے باہر ہے

شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا میری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

ہر پھول جسم وجاں کے لئے خار تھا سو ہے
باغ جہاں میں وہ جو اک آزار تھا سو ہے

کف دست بلا ہے اور میں ہوں
سفینہ کہہ رہا ہے اور میں ہوں

تلاش ذات نے بھٹکا دیا ہے
اب اک ذہنی خلا ہے اور میں ہوں

ان غزلوں میں متکلم کی گمراہی اور در بدری تلاش ذات کا نتیجہ ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متکلم تلاش ذات پر آخر آمادہ کیوں ہوا؟ جواب میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ خارجی دنیا کی صورت جب اس حد تک مسخ ہو گئی کہ فرد اس میں اپنی شناخت کھونے لگا اور خارجی دنیا سے خود کو ہم آہنگ کرپانا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تو اس نے اپنے اندر کی دنیا سے رشتہ جوڑنا چاہا اور اس طرح اپنی معرفت حاصل کرنا چاہی یعنی اپنی ذات کی تلاش میں نکلا لیکن یہ انسان کی بدقسمتی ہی کہی جائے گی کہ وہ اپنی تلاش اسی وقت شروع کرتا ہے جب دنیا اسے پوری طرح کثیف اور پراگندہ کر چکی ہوتی ہے۔ پس اس صورت میں ذات کی سمت اس کا سفر گرد وغبار بھرے راستوں میں ہی ہوتا ہے چنانچہ بھٹکنا انسان کا مقدر ہو جاتا ہے اور اس کو چاروں طرف خلا ہی خلا نظر آتا ہے۔

بجھ گئے غالباً امید کے سارے ہی چراغ
ابھی کچھ دیر ہوئی ایسا اندھیرا تو نہ تھا

کبھی کہیں سے آجاتا ہے کوئی مسافر بھولا بھٹکا
دیئے تو اک نگہ سے خالد بنی ہیں رشد اس کی راہیں

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے

بستر پہ ڈال دیتا ہوں ٹوٹا ہوا بدن
پھر کروٹوں سے جوڑتا رہتا ہوں رات بھر

اوپر کے ان دو اشعار میں جس صورت حال کا بیان ہے اس کا تعلق ہمارے زمانے کی اس اذیت اور کربناکی سے ہے جس سے انسان دوچار ہے۔ آج کا فرد زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ نہیں دے پا رہا ہے حالانکہ زمانے کے ساتھ چلنا اس کی مجبوری ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ دن بھر کی تگ و دو کے بعد ایسا محسوس کرتا ہے گویا اس کا جسم بے جان ہو گیا اور وہ نیم مردہ یا مردہ صورت میں خود کو بستر کے حوالے کرتا ہے۔ چونکہ اگلے دن کی دوڑ دھوپ میں اسے دوبارہ شامل ہونا ہے اس لئے ٹوٹے ہوئے بدن کو کسی نہ کسی طرح تازہ دم کرنا بھی اس کی مجبوری ہے۔ اس اذیت ناک صورت حال کو ایک جدید شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے۔

لوگ ہی آن کے یکجا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں

خالد محمود کا شعر "بستر پہ ڈال دیتا ہوں " درج بالا شعر سے اس لئے زیادہ پر اثر معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں اپنے کو جوڑنے اور یکجا کرنے کا عمل خود متکلم کے ذریعہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس میں یہ معنی بھی شامل ہیں کہ یہاں متکلم کا کوئی معاون و مددگار بھی نہیں ہے جو اس کے کرب و اذیت میں شامل ہو۔ ظاہر ہے یہ کیفیت زیادہ تکلیف دہ اور صبر آزما ہے۔

فکری اعتبار سے ان غزلوں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں اپنے عہد کے تلخ حقائق کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ انسان کے کردار اور معاشرے کی صورت حال میں جو منفی تبدیلیاں آج نظر آتی ہیں ان کی طرف بھی یہاں اشارے ملتے ہیں۔ یہ اشارے کہیں کہیں براہ راست انداز میں ہیں اور کہیں انھیں بالواسطہ صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

انساں کے سر سے کبر کا پتھر اتار دے
بار الٰہ اس کو زمین سے اتار دے

اس فرد سے پھر آج میں ہنس کر ملا کہ جو
موقع ملے تو پشت میں خنجر اتار دے

میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

خوبیِ قسمت سے ہیں اتنے میسر آشنا
گھر کے سب شیشے ہوئے جاتے ہیں پتھر آشنا

اس گھر کا ٹیلی فون ابھی جاگ جائے گا
صاحب کو لے کے چل دیا دفتر کا آدمی

فکر و خیال سے متعلق کہی گئی مذکورہ باتوں کی کم و بیش ہر جدید غزل گو کے کلام میں نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ یعنی فکری اعتبار سے جدید غزل میں ایک طرح کی مماثلت نظر آتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ نئے زمانے کے شاعروں نے فن اور فکر دونوں پر توجہ کی۔ لہٰذا یہ کہنا مناسب نہیں کہ موجودہ صدی میں اردو غزل کی فکری دنیا ایک ہی ہے اور ہر نیا شاعر اسی دنیا کا باشندہ ہے۔ ہاں جہاں تک سوال غزل کی فنی خصوصیات کا ہے تو اس میدان میں ہر اچھے شاعر نے اپنی انفرادیت کا کچھ نہ کچھ ثبوت ضرور پیش کیا ہے۔ چونکہ غزل کے فن کی بنیاد استعارے پر ہے اس لئے تقریباً تمام اچھے غزل گویوں کے کلام میں استعارہ سازی کے ذریعہ خیال کو وسیع کرنے اور اس میں نئے نئے پہلو نکالنے کا عمل صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

فنی بنیاد پر خالد محمود کی غزلوں میں جس تازگی کا احساس ہوتا ہے وہ دراصل استعاروں کو نیا کر کے استعمال کرنے کا نتیجہ ہے۔ روشنی، ستارہ، آسمان، اجالا، ہوا، پتھر، سمندر ایسے استعارے ہیں جو جدید اردو غزل میں بہت پہلے سے استعمال ہو رہے ہیں اور آج

بھی شاید ان کی قوت ختم نہیں ہوئی۔ لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ شاعری کی ہنر مندی انھیں کتنا جاندار بنا کر ہمارے سامنے لاتی ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ استعاروں کو فنی ہنر مندی کے ساتھ استعمال نہیں کیا جاتا اور وہ شعر میں بے جان ہو جاتے ہیں۔ خالد محمود کے کلام میں مذکورہ بالا استعاروں کی کار فرائی کو دیکھ کر ایک خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ اور یہ احساس اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ استعارے بے جان بنا کر استعمال نہیں کئے گئے ہیں۔ درج ذیل اشعار میں استعاروں کی کار فرمائی دیکھئے ؎

شکستہ سفینہ مسافر نڈھال
تلاطم شب تار بارش ہوا
میں گنجان شہروں کا مارا ہوا
نوازش نوازش نوازش ہوا

ترے ساتھ چلنے کی عادت نہیں
ہماری نہ کر آزمائش ہوا
وہ بیوفا ہے یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
کف خیال میں اک آئینہ سا رہتا ہے

ریت کی دیوار سے کیا فائدہ
عمر سے رہتا ہے رشتہ ٹوٹ کر
تمھیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

استعاروں کے ذریعہ کہیں کہیں خوبصورت پیکر سازی بھی کی گئی ہے ان میں بصری پیکر زیادہ ابھارے گئے ہیں ؎

راتوں کا درد بہہ کے اب آنکھوں میں آگیا
یہ کون میرے جسم کے اندر سما گیا!

ان کا خیال آتے ہی اک روشنی ہوئی
اس روشنی میں ذہن کا کمرہ نہا گیا
صدارت کی مسند تھی یاروں میں تھا
بزعم تصور ستاروں میں تھا

غزل میں حسن معنی کو قائم کرنے کے جو ذرائع ہیں ان میں الفاظ کے کار آمد استعمال کے علاوہ رعایت، مناسبت، ضلع، تضاد وغیرہ کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان کے التزام سے الفاظ متحرک ہو جاتے ہیں جو مزید لطف کا باعث بنتے ہیں۔ یہ بات ان غزلوں میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

چاند کی دنیا میں کیا اندھیر ہے پتھر ملے
ہم نے سوچا تھا وہاں سے روشنی بھر لائیں گے
دل کی دنیا میں اندھیرا ہو تو کچھ روشن نہیں
آنکھ چشم سنگ ہے شمس و قمر ہوتے ہوئے

بھڑکتی آگ میں پیدا ہوا ہے
سمندر زندگی سے آشنا ہے

وفا نہ دیکھی فقط بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہو ان کا جنھوں نے برائیاں دیکھیں
پہلے ہی مرحلے میں قلم ہو کے رہ گئے
دست ہنر کو ہاتھ دکھانے نہیں دیا

ان اشعار میں خط کشیدہ الفاظ کے ذریعہ جو حسن پیدا ہوا ہے وہ رعایت، مناسبت، ضلع اور تضاد کا ہی مرہون منت ہے۔ کلاسیکی غزل میں یہ باتیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ خالد محمود کے کلام میں ان ذرائع کا استعمال اس بات کی دلیل ہے کہ انھوں نے اپنی روایت سے گہرا رشتہ جوڑ رکھا ہے۔ زبان اور لہجہ کے اعتبار سے بھی خالد کی غزلیں ایک نوع کا لطف

فراہم کرتی ہیں۔ جگہ جگہ محاوروں کے استعمال سے اشعار میں برجستگی پیدا کی گئی ہے۔ اور بندش ایسی رکھی گئی ہے کہ روانی کا بے حد احساس ہوتا ہے ؎

اک ذرا تیز ہوئی تھی رفتار
ہم سفر چیخ اٹھا آہستہ

ہم فضاؤں میں کچھ اونچا اڑ کر
بھول بیٹھے ہیں بسیرا اپنا

جس میں خالی ہے کرائے کا مکان
اس گلی میں نہیں رہتا کوئی

ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگا

بجز اک لذت تسکین باطل
کسے شہرت نے خالد کیا دیا ہے

تھکنے لگے ہیں پاؤں مگر میر کارواں
پیچھے نہ رہ سکوں گا مرا سر اتار دے

خالد محمود کی غزلیں تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ نہیں تو کیا ہوا؟ اصل پیمانہ تو کلام کی کیفیت ہے اور کیفیت کے اعتبار سے یہ غزلیں بلا شبہ ایسی ہیں کہ جدید غزل میں انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ فکر سے زیادہ فن کی سطح پر ہم ان سے متاثر ہوتے ہیں اور یہی بات شاعر کی کامیابی کی دلیل ہے۔

O

عبد الاحد سازؔ
زکریہ نیوز بلڈنگ، مہر علی روڈ، ممبئی

حسرتِ روزِ ملاقات رقم کی میں نے

ڈاکٹر خالدؔ محمود کی ادبی شخصیت کی یوں تو کئی جہتیں مجھ پر ایک عرصے سے اُجاگر ہیں۔ ان کے تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی پڑھے انشائیوں اور اداریوں سے بھی مستفیض ہوا، معروضی و موضوعاتی نثر بھی دیکھی اور تعلیم و تدریس سے اُن کے عملی و قلمی انسلاکات سے بھی خوب واقفیت رہی لیکن جس راستے سے ان کے لئے دل میں اک اُنسیت اور یگانگت کا احساس در آیا، وہ اُن کی شاعری ہے یہ اُنسیت بھی اس طرح امڈتی رہی کہ جب جب ان کا کلام پڑھا بے ساختہ ان سے مصافحہ کرنے اور تبادلۂ خیال کرنے کو جی چاہنے لگا۔ یہ مراد ابھی تک پوری نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی میں اپنے اس اشتیاق کی ان تک ترسیل کر پایا ہوں۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ سال سرونج میں احقر کے شعری مجموعے "خموشی بول اٹھی ہے" پر ایک مذاکرے میں خالدؔ محمود صاحب شریک ہوئے اور اس مذاکرے کی رپورٹ جب "انتساب" میں شائع ہو کر مجھ تک پہنچی اور میں نے اپنے تعلق سے ان کے تاثرات پڑھے تو معاً مجھے محسوس ہوا کہ انہوں نے بھی محض رسمی یا ستائشی الفاظ نہیں کہتے ہیں بلکہ میری شاعری کو اپنا کر قریب تر کر کے اس پر ایک مخلصانہ طور پر متوازن رائے دی ہے۔ دل سے دل کو تو راہ ہوتی ہی ہے۔ مگر مشترک عصری تجربے سے گزرنے والے فن کاروں کے مابین یہ راہ شاید زیادہ روشن ہوتی ہے۔ تخلیقی رہ گزر پر وہ مجھے یقیناً اپنے سینیئر، پیش رو، اپنے سے آگے آگے مگر قریب قریب معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرا اتفاق دیکھئے کہ اسی سال کے اوائل میں یکم مارچ ۱۹۹۷ء کو ان سے سرونج میں ملاقات عین متوقع تھی۔ برادرم سیفی سرونجی نے مجھے سرونج کے آل انڈیا مشاعرے کے لئے مدعو کیا تھا۔ ڈاکٹر خالدؔ محمود کی شرکت بھی یقینی بتائی گئی تھی۔ مگر "وائے برالم نا کئی دہر"

کہ اسی ہفتے عشرے یہ دل خراش خبر ملی کہ ان کی اہلیہ محترمہ انتقال کر گئیں۔ ملاقات کا خروش، اندر ہی اندر غائبانہ طور پر شرکتِ غم کے گہرے پانی میں تہہ نشیں ہو گیا۔ ایسے سانحے درد کی نمی اور نرمی لئے شخصیت کے نہاں خانوں میں دائماً رچ بس جاتے ہیں، جہاں سے تخلیقِ شعر کے سوتے اک گداز کے ساتھ کبھی پھوٹ نکلتے ہیں۔

خالد محمو صاحب سے ملاقات بہر حال ہونی ہے اور عن قریب ہی ہو گی۔ اس خصوص میں اپنا تجربہ ہی کچھ اس طرح کا ہے کہ اپنے وہ چند مخصوص ہم عصر یا قریب کے قدرے سینئر شاعر، جن کو پڑھتے ہوئے، ان سے ملنے اور بات کرنے کا بے محابا دعا پیدا ہوا ہے، اُن سے اس عمل کے دو ڈھائی سال کے عرصے کے اندر اندر بالمشافہ ملاقات بھی ہو گئی ہے۔ رؤف خیر، اسعد بدایونی، عذرا پروین، آشفتہ چنگیری، غضنفر، کرشن کمار طور، شاہد میر، شبیر آصف، سلیم انصاری کے ساتھ یہی صورت صادق آئی ہے۔ غالب امکان ہے کہ آئندہ اک دو برسوں میں، بمبئی میں یا دہلی میں یا کسی تیسرے شہر کی کسی ادبی تقریب میں خالد محمود کے ساتھ الفاظ کی دروبست میں سمائی ہوئی خیال و احساس کی یہ دیرینہ ہم کلامی، مصافحے اور مسکراہٹ کی خوش رنگ جہت میں بھی پھیل جائے گی۔ انشااللہ! فی الحال ان کے چند اشعار سے دوبارہ حظ اندوز ہونے کو جی چاہ رہا ہے، جن کا کیف و اثر دل و دماغ میں پیہم مرتعش ہے ؂

دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
ایک دستِ ناز یاد کا شانہ دبا گیا

تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

اک ذرا تیز ہوئی تھی رفتار
ہم سفر چیخ اٹھا، آہستہ

ہم فضاؤں میں، کچھ اونچا اڑ کر
بھول بیٹھے ہیں بسیرا اپنا

تھکنے لگے ہیں پاؤں مگر میر کارواں
پیچھے نہ رہ سکوں گا، مرا سر اتار دے

وقتِ قیام دستِ قضا نے نہیں دیا
چلنے لگے تو ساتھ ہوا نے نہیں دیا

کبھی کہیں سے آجاتا ہے، کوئی مسافر بھولا بھٹکا
ویسے تو اک یگ سے خالد سونی ہیں وشواس کی راہیں

○

سلیم انصاری
۵۵۹۔ موتی نالہ
جبل پور (ایم پی)

ڈاکٹر خالد محمود کا تخلیقی سفر
(سمندر آشنا" کے حوالے سے)

۱۹۶۰ء کے آس پاس اردو شاعری میں ترقی پسند تحریک زوال کے آخری سرے پر پہنچ چکی تھی جس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ترقی پسند تحریک کے نظریات عوامی کم سیاسی زیادہ تھے۔ دوسری وجہ ایوان شعر وادب کے دروازے پر دستک دیتی ہوئی ایک ایسی ادبی نسل کی آمد تھی۔ جس کے پاس بھوک اور جنس کے نعرے بازیوں کے علاوہ معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی مسائل کے اظہار و بیان کے منفرد وسیلے تھے۔

ڈاکٹر خالد محمود تخلیق کاروں کی اسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس نے ادب میں فکر و اظہار نیز اسلوب و بیان کی سطح پر ہونے والے تغیرات کا براہ راست مشاہدہ کیا تھا۔

ڈاکٹر خالد محمود دشت زندگی کی مسافت کے دوران جب جنگل، پیڑ، دریا، دھوپ، چٹان، پتھر اور ریت جیسے الفاظ میں پوشیدہ، قوت اظہار کو بروئے کار لاکر نئی دشاؤں کے سفر پر نکلے تو حد امکان تک پھیلے ہوئے احساسات کے نیلے سمندر نے انہیں سوچنے پر مجبور کیا کہ ان کے اندر کا انسان بظاہر شانت اور گمبھیر ہے لیکن یہ سکوت دائمی نہیں بلکہ فکر کی سطح پر آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے۔

یہیں انہیں اپنے سمندر آشنا ہونے کا احساس ہوا۔ ایک اور سمندر جوان کے داخلی جذبوں کی زیریں سطح پر موجود تھا۔ اس کا منتھن کر کے انہوں نے زہر اور امرت دونوں کشید کئے۔ امرت کو تو جوں کا توں اپنی شعری اکائیوں میں پیش کر دیا لیکن زہر میں اپنے لہجے کی شیرینی ملا کر اسکی کڑواہٹ کو کم کرنے کا جو اہم کام انہوں نے کیا ہے اسے "سمندر آشنا" کی غزلوں میں آسانی سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود کی شاعری میں ''سمندر'' ایک بلیغ استعارے کی حیثیت سے کئی مقام پر استعمال کیا گیا ہے لیکن ہر بار ایک نئے مفہوم کے ساتھ۔۔ یہی ان کی سمندر سے آشنائی کا جواز بھی ہے۔

چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔۔۔۔۔

برائے تشنہ لب پانی نہیں ہے
سمندر کا کوئی ثانی نہیں ہے

سورج، ستارے کوہ وسمندر، فلک زمیں
سب ایک کرچکا ہے یہ گز بھر کا آدمی

آج تک باقی ہے دل پر ان کی نظروں کا اثر
موجزن ہے میری آنکھوں میں سمندر آشنا

ہر ایک بات خموشی سے پی گیا خالدؔ
یہ آدمی تو سمندر دکھائی دیتا ہے

ذرا سنبھال اسے ڈوب ڈوب جاتا ہوں
یہ تیری آنکھ کا قطرہ مجھے سمندر ہے!

آج کی سبھی خبریں نارمل سی لگتی ہیں!
ساحل سمندر پر کل وہ بھیڑ کیسی تھی؟

قطرہ قطرہ ہوا سمندر
انسانوں کا گھنا سمندر

محولہ بالا اشعار میں ''سمندر'' ایک واضح علامت کے طور پر نہایت کامیابی سے استعمال کیا گیا ہے لیکن ہر شعر میں ''سمندر'' الگ معنوی سطح پر جلوہ گر ہوتا ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود کے پاس تجربات و مشاہدات کی ایک وسیع Range ہے۔ان کے یہاں وسیلۂ اظہار پر مکمل دسترس کا احساس ہوتا ہے جس کی وجہ سے علامتیں کہیں بھی Overlap نہیں کرتیں اور ترسیل کے المیہ کا شکار بھی نہیں ہوتیں۔ میرے نزدیک اچھی شاعری کی یہی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود بے حد خلیق، ملنسار، خوش وضع اور خوش مزاج انسان ہیں۔ ہر وقت متبسّم، ہر وقت ہنستے کھلکھلاتے اور قہقہے لگاتے ہوئے۔ ہمیشہ زندگی کے خوبصورت لمحوں کی تلاش میں مصروف اپنے چھوٹوں سے ہمیشہ شفقت اور محبت سے پیش آنے والے، حوصلہ افزائی اور مدد کرنے میں ہمیشہ پیش پیش۔

ڈاکٹر خالد محمود کی شاعری پڑھتے وقت، ان کی شخصیت کے تمام تر گوشے منور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد محمود پڑھے لکھے انسان ہیں۔لہٰذا اپنے عہد کا تہذیبی، سیاسی اور سماجی شعور بھی ان کے یہاں عام آدمی کے مقابلے زیادہ معیاری ہے۔اپنے سیاسی شعور

کے بارے میں خود کہتے ہیں:

میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں
میری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

ڈاکٹر خالد محمود کے یہاں اخلاقی قوتیں بھی کارفرما ہیں جو انہیں تخلیق کی نئی لذتوں سے آشنا کراتی ہیں۔ وہ دنیا کو ایک Globel village (عالمی گاؤں) کی صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ دنیا کے انسانوں میں ہمدردی، پیار، باہمی تعاون اور اخلاقی قدروں کی بازیافت کا خواب دیکھنے میں خوشی اور آسودگی محسوس کرتے ہیں۔ وہ عام آدمی کے کرب کو داخلی سطح پر محسوس کر کے اس میں عملی طور پر شریک رہتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

خالد ہر ایک غم میں برابر شریک تھا
سارے جہاں کے بیچ رفاقت لہو کی تھی
دنیا سے کرب و درد کا رشتہ نبھا سکوں
اتنا لہو تو آج بھی میری رگوں میں ہے!
جھلسے نہ کوئی اپنی طرح اس خیال سے
صحرا میں کچھ درخت بھی ہم نے لگا دیئے
خنجر چلا کے مجھ پہ بہت غمزدہ ہوا
بھائی کے ہر سلوک میں شدت لہو کی تھی

ڈاکٹر خالد محمود کے اشعار میں جہاں ایک طرف امن و آشتی اور اخلاق و مساوات اور انسان دوستی کے واضح نظریات کا احساس ہوتا ہے وہیں دوسری طرف معاشرتی، معاشی، تہذیبی اور سیاسی مسائل سے پیدا شدہ نتائج نیز بکھرتی ٹوٹتی تہذیبی قدروں کی زبوں حالی اور انسانی ذہن کے نفسیاتی بکھراؤ اور بھٹکاؤ کا احساس بھی ہوتا ہے۔

اس اعتبار سے یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر خالد محمود کے یہاں فکر و احساس کا تنوع اور اظہار کی رنگا رنگیوں نے ایک نیا جہان معنی خلق کیا ہے۔ جس کا احاطہ پوری طرح اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ لہٰذا ان کے اس شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں۔

کام دلّی کے سوا ہوتے نہیں
اور ناہنجار دلّی دور ہے

○

ڈاکٹر حدیث انصاری اثری
شعبۂ اردو، اسلامیہ کریمیہ کالج، اندور

خالد محمود کا آئینہ خانۂ شعر

کوئی بھی عہد ہو سچی شاعری اور شاعر زمانے سے ماورا ہو کر اپنی شناخت بنا لیتے ہیں ان کا تعارف کرایا نہیں جاتا ہے بلکہ خود بخود لفظوں کے پیکر میں ان کی ذات شخصیت اور فن و کمال اہل نظر کو فکر و شعور کی بالیدگی، حظ نفس سے لطف اندوز ہونے کے لئے دعوت نظارہ دیتی رہتی ہے۔

آج ادب و شاعری کشمکش کے ایسے موڑ پر کھڑی ہوئی ہے جہاں سے کسی قیمت یا رفتار کا تعین کرنا اہل دانش کے لئے تذبذب اور کشمکش کا مسئلہ بن گیا ہے ماضی کی فعال تحریکوں اور روایتوں کا خوبصورت دبستان ہے حال اور جدیدیت کے خوش فکر، جاذب نظر دلکش منظر ہیں پھر بھی ادب اور ادیب، شاعر اور شاعری ایک گھٹن محسوس کر رہے ہیں ایسے حالات میں نمود کی خواہش کا طوفانی مد و جزر بھی سر اٹھا کر ادب و شاعری کی صالح، پاکیزہ اور آہنی دیواروں میں شگاف پیدا کرنے کے در پے ہیں لیکن ان سب صورتوں کے باوجود اہل دانش کا ایک طبقہ اپنے خون جگر اور وجود کی ریزہ کاری سے ادب و شاعری کے روایتی حصار میں خلوص و وفا، جذبہ و ایثار اور فکر و شعور کی آواز سے اپنے پیکر کی شناخت اور اپنے عہد کی سچی ترجمانی کا فریضہ بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے خالد محمود بھی انہیں عصری تقاضوں پر مبنی کارواں میں اپنی تشکیل کردہ بزم کے مشعل بردار ہیں۔

خالد محمود ایک سچے شاعر ہیں اور صداقت پر مبنی ان کی شاعری نے اپنے لئے ایک "آئینہ خانۂ شعر" بنایا ہے جس میں ان کی مخصوص انفرادیت کا رنگ و نور منعکس ہے اس میں درد و کرب اور خوشی و مسرت کی متوازن لے اور سر کا تال میل اہل محفل کو توجہ دینے پر مجبور کر دیتا ہے یوں تو ان کا دائرہ عمل بہت پھیلا ہوا ہے لیکن ان کی شخصیت اور فن کا عمل

جس دوشیزہ کے زلف و رخسار کا اسیر ہے وہ صنف غزل ہے اس معشوقۂ شعر کے ساتھ زندگی بسر کرنے اس کے ہر ہر ادا سے لطف اندوز ہونے اور دوسروں کو بھی اس کی خوشبو کا احساس دلانے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے زمانے کے نشیب و فراز اور حالات کی کشمکش میں مصلحت سے الگ ہو کر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی سعی کو اپنا شیوہ بنا لیا ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے دائرہ فکر میں جو پیکر ابھرتا ہے اس کی آواز، رنگ اور حسن میں ایک جاذبیت اور کشش ہوتی ہے۔ ان کا کلام ان کے جذبہ شوق اور ہوش و خرد کا آئینہ دار ہے۔ ان کے ذاتی اور سماجی تجربہ میں کسی نقطے کو ارتکاز حاصل نہیں ہے۔ انہوں نے زندگی اور مسائل زندگی سماج اور سماجی مسائل کو ہی شعری فکر کا قالب عطا کیا ہے اور معانی کے ابلاغ اور ہیئت کی تشکیل پر زور دیا ہے۔

جو تو نہیں تو لہو سرد ہوتا جاتا ہے
مرے وجود کی دھڑکن بتا کہاں ہے تو
وہ مجھ کو ٹوٹ کے چاہنے لگا ہے کچھ دن سے
وہ کچھ دنوں سے برابر خفا سا رہتا ہے
وہ بے وفا ہے یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
کف خیال میں اک آئینہ سا رہتا ہے
مسجود ہر وجود کے قدموں میں گر گیا
شیطاں ہی ایک صاحب کردار تھا سو ہے
تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں
اک ذرا تیز ہوئی تھی رفتار
ہم سفر چیخ اٹھا، آہستہ

غزل اور دل دونوں ایک دوسرے کے لئے سازو نغمہ ہیں ہمدم، رفیق، رازداں اور افشائے راز ہیں۔ یہ اپنی کائنات خود آباد و ویران کرتے ہیں ان کے نظام کائنات کا اصول سب سے منفرد اور نرالا ہے جس میں سوائے محبوب کے کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے خوشیوں اور رعنائیوں کی محفل آراستہ ہو یا غم و الم کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر، ڈصحرا کی ویرانی ہو یا انسانی ہجوم کا

متلاطم بازار ! غزل اپنی لطافت اور دل اپنی چاہت کا سامان فراہم کر لیتا ہے۔

غزل سے خالد محمود کا بڑا گہرا رشتہ ہے وہ اپنے محبوب (غزل) کے پہلو میں بیٹھ کر اس کے تار نفس کو چھیڑتے ہیں، مختلف طرح کے راز و نیاز، درد و کرب اور ذات و کائنات کی باتیں کرتے ہیں تو یہ افقی رنگ ابھرتا ہے۔

رنگ و رامش، زمزمے گل ہائے تر ہوتے ہوئے
دل اکیلا اور اتنے ہم سفر ہوتے ہوئے

آنسوؤں سے سرد ہو جاتی ہے ہر سینے کی آگ
میرا دل آتش کدہ ہے چشم تر ہوتے ہوئے

کل پھر جھلستا دن مجھے در پیش ہے خدا
آنکھوں میں میری ظرف سمندر اتار دے

میں جس خیال سے دامن کشیدہ رہتا ہوں
وہی خیال مرا انتظار کرتا ہے

شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا مری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

مندرجہ بالا اشعار کی روشنی میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ خالد محمود کے شعور میں مدّو جزر کی کیفیت ہے انہوں نے اپنی محنت سے ایک دنیا تعمیر و آباد کرنے کا منصوبہ ترتیب دیا ہے لیکن عصری مسائل کے انبار میں اس کی تکمیل کا خواب تعبیر کی حقیقت سے آشنا ہوتا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ وہ اس بے بضاعتی اور کم مائیگی پر ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ فکر تعمیر کا بکھراؤ ہی ان کی شعری حسیت کا نقطۂ آغاز ہے جس کے ذریعے وہ فرد سے سفر کر کے اپنے کو اجتماعیت میں مدغم کر دیتے ہیں۔

تلاش ذات نے بھٹکا دیا ہے
اب اک ذہنی خلا ہے اور میں ہوں

خالد محمود کو زندگی کی بے ثباتی اور اس کی حقیقتوں کا گہرا عرفان ہے وہ زندگی کو ایک خوبصورت گلدستہ کی صورت سجا کر حظ نفس حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔ اس کی تکمیل کے لئے سرگرداں بھی ہیں لیکن لطف زیست کے مقابلے میں زندگی کی بے

ثباتی سے خائف ہیں۔

زندگی کے لطف کی فرصت کہاں سے لائیں گے
وقت جب جینے کا آئے گا تو ہم مر جائیں گے

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے

خالد محمود نے اپنے جذبے اور احساس کو بڑے احتیاط اور سمجھنے کے بعد ہی اسے غزل کا پیراہن عطا کیا ہے وہ فکر و الفاظ، رمز و معانی، تشبیہات و استعارات کی اہمیت اور تخلیقی سطح پر ان کے استعمال کا کامل ہنر رکھتے ہیں۔ شعر کی تہذیبی اور شائستہ قدروں کو ابھارنے میں احساس جمال اور جذبے کی شدت کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اگر یہ ہنر چھوٹی بحر کی غزلوں میں سلیقہ سے استعمال کیا جائے تو شعر میں چستی اور چاشنی کے ساتھ ایک طرح کا نرم بہاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور یہی حسن و خوبی اسے فصاحت و بلاغت کے خانے میں داخل کر دیتی ہے۔ اس طرح کی حسن و خوبی میرؔ و غالبؔ کا طرۂ امتیاز ہے لیکن اس خصائص کی رنگین اور منقش صورتیں ہمیں خالدؔ محمود کے ہاں بھی مل جاتی ہیں۔

ہر اک فیصلہ اس نے بہتر کیا
مجھے آنکھ دی تم کو منظر کیا

راستہ پر خار دلّی دور ہے
سچ کہا ہے یار دلّی دور ہے

وہ سدا سے مل رہا تھا ٹوٹ کر
آج بچھڑا ہے تو بچھڑا ٹوٹ کر

لہو میں وہ جوش و ترنم نہیں
یہ دریا کبھی کوہساروں میں تھا

دونوں جانب دھوکا ہے
میں بھی دریا پار نہیں ہوں

دل بنا کر بھیج دو
بات بھی سوغات بھی

خالد کی غزلیہ شاعری وقار و عظمت کی امین ہے ان کی متوازن طبیعت نے کسی جذبہ کو یہ اجازت نہیں دی ہے کہ شعر کی تہذیبی اور شائستہ قدروں اور صالح روایتوں کے حصار توڑے۔ شاید انہیں اس کا پورا علم ہے کہ اس طرح کی وقتی بغاوت یا کج روی ذات و فن کا خود مدفن تیار کرتی ہے۔ زندگی، زمانہ اور ادب کا اعتدال اور اس کے تقاضوں کا خاموش حل وہ اپنے فکری تخلیقات کے ذریعہ تلاش کرنے کی سعیٔ حاصل کر رہے ہیں۔

○

ڈاکٹر سید حامد حسین
۵۵ فضا، احمد آباد پلس۔ بھوپال

خالد محمود کے انشائیے اور خاکے

خالد محمود کی اصل شناخت ان کی شاعری ہے۔ لیکن ان کے کئی ایسے گن بھی ہیں جو شرمندہ نہیں کرتے لیکن حیرانی میں ضرور ڈالتے ہیں۔ ان کی شگفتہ مزاجی، اور شگفتہ بیانی بھی ان میں سے ایک ہے۔ بظاہر تو یہ "ساتویں اور آٹھویں دہے" کے مستند اور سکہ بند شاعر کا شیوہ نہیں۔ بھلا جب کالی، پیلی، کھردری، اٹ پٹی غزل اور کھنڈروں، گٹروں اور جھاڑ جھنکاڑ میں پلی بڑھی نظم کا بول بالا ہو تو ہنسنا، ہنسانا، لطف لینا اور سلیقہ برتنا اپنے آپ فیشن سے باہر ہو جاتا ہے۔ ہمارے ایک مخلص دوست کے ساتھ جو کسی خاص پایے کے جدید شاعر بھی ہیں، ہم اپنے تعلقات کے بہتر ہونے کا ہنوز انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیں چیلنج کیا تھا کہ ہم جدید فن کی کم سے کم الفاظ میں تعریف کریں اور ہم نے عرض کیا تھا کہ ہمارے نزدیک جہاں ہماری برداشت کی حدیں ختم ہونے لگتی ہیں، ہمیں سمجھنا چاہئے کہ وہیں سے جدید فن کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔ خالد محمود یہ نوبت نہیں آنے دیتے۔ ان کی شاعری بھی حدود میں رہتی ہے اور ان کا مزاج بھی۔ ان کے مزاج میں نوجوانوں کیسی شوخی ہے لیکن ان کے انداز میں گزرے وقتوں کے بزرگوں جیسی مروت اور شائستگی۔ زیادتی ان کے آئین حیات کا اصول نہیں۔ ان کے نزدیک نوکِ قلم کا مصرف محض چبھن پیدا کرنا نہیں۔ وہ اس کا استعمال زندگی کی کشتیوں اور دائروں کو سنوارنے اور سجانے کے لئے کرتے ہیں۔

خالد محمود کے خاکے نہ تو ستم شعاری کا نمونہ ہیں اور نہ ظریفانہ کھلواڑ کے۔ لیکن ستم ظریفی کو انھوں نے فنِ لطیف کے درجے پر پہنچایا ہے۔ عبدالطیف اعظمی کے خاکے "ذکر اس پری وش کا" کا عنوان غالبؔ کے مصرع کا نصف آخر ذہن قاری کے لئے چھوڑتے ہوئے، نصف اول کو ستم ظریفانہ رمزیت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ قاری اپنے

ذہن میں پری اور پری زاد، دیو اور دیوزاد اور عبدالطیف اعظمی صاحب کا تصور اور تقابل کرتے ہیں اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ عبداللطیف اعظمی ایک ادارہ ہیں۔ ثبوت ملاحظہ ہو۔

"یہ تمام ہستیاں مولانا محمد علی سے لے کر پروفیسر محمد مجیب تک جامعہ میں تو اب موجود نہیں۔ لیکن لطیف صاحب کے اندرون میں بہر حال موجود ہیں۔ سب کی روحیں عالم ارواح کو چلی جاتی ہیں۔ ان حضرات کا عالم ارواح لطیف صاحب ہیں جامعہ ملیہ میں یہ آٹھ دس افراد بیک وقت کبھی نہ رہے ہوں گے 'مگر لطیف صاحب کے دل و دماغ کے ہوسٹل میں روم میں پائنرز ہیں۔"

عبداللطیف اعظمی کے محققانہ کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"تاریخ پیدائش سے متعلق، پیدا ہونے والے شخص کا دعویٰ بھی غلط ثابت کر دکھاتے ہیں وہ انتہائی محتاط قسم کے محقق ہیں۔ تاریخ ولادت، کی تصدیق کے لئے صاحب ولادت کے والدین کا نکاح نامہ طلب کر لیتے ہیں۔ کبھی اس قسم کی دلیل لاتے ہیں کہ فلاں ادیب کی بائیں آنکھ میں دائیں جانب سرخ رنگ کا تل ہے اور ایسے لوگ دسمبر کی پندرہ سے پچیس تاریخ کے درمیان پیدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اگر خدانخواستہ کسی ایسے شخص کے میونسپل کاغذات، ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ اور اسکول کی سند یا خود موصوف یعنی صاحب ولادت دسمبر میں پیدا ہونے کا دعویٰ کریں تو لطیف صاحب ان کی پچھلی سات پشتوں اور آئندہ سات نسلوں کو دسمبر میں پیدا نہ ہونے دیں گے شاعر اور ادیب کی زندگی اور موت لطیف صاحب کے ہاتھ میں ہے۔ جب اور جہاں چاہیں پیدا کر دیں جس تاریخ کو چاہیں مار دیں۔ نہ جانے کتنے شاعروں اور ادیبوں کو اپنی پیدائش اور وفات کے معاملے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر رکھا ہے۔"

عبداللطیف اعظمی کو تحریک ثابت کرنے کے لئے یہ انداز اختیار کیا ہے۔

"لطیف صاحب جب متحرک ہوتے ہیں تو سراپا تحریک نظر آتے ہیں۔ بلکہ دیکھنے والوں میں بھی تحریک پیدا کر دیتے ہیں۔ لطیف صاحب چلتے وقت سیکنڈوں سے زیادہ نظر ہی نہیں آتے وہ تو بس ایک چھلاوہ ہیں۔ چشم

زدن ہیں اپنے گھر اور اپنے گھر سے اردو گھر (جسے وہ اپنا ہی گھر سمجھتے ہیں)۔
اردو گھر سے جامع مسجد اور جامع مسجد سے مکتبہ جامعہ پہنچ جاتے ہیں۔"

عزیز اندوری پر خالد محمود نے ان ہی کے الفاظ میں ایک "منی خاکہ" لکھا ہے۔ خاکے میں ستم ظریفی کا رنگ سوا ہو گیا ہے۔ شروع کرتے ہیں۔

"ممکن ہے مجھ سے پہلے بھی کسی نے یہ بات کہی ہو کہ اندور کی دو چیزیں زیادہ مشہور ہیں۔ ایک تو اندوری توس (پاپے) اور دوسرے عزیز اندوری اندور کے توس چائے میں بھگو کر کھائے جاتے ہیں۔ چائے میں بھیگنے کے بعد ان توسوں کی شکل دیکھ کر عزیز اندوری بہت یاد آتے ہیں۔"

یہ عبارت پڑھ کر آپ کو عزیز اندوری کو دیکھنے کا ضرور جی چاہنے لگے گا۔ عزیز اندوری کو عزیز افادی ثابت کرتے ہوئے خالد محمود لکھتے ہیں۔

"ان کے ادبی مشاغل، اقتصادی مشاغل اور دلچسپ مشاغل ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ انھوں نے بہت لکھا۔ مگر دوسروں کے لئے زیادہ اپنے لئے کم ان کی شاعری تو خیر کوئی کیوں لیتا، البتہ نثر میں انھوں نے وہ ایثار دکھایا کہ مصحفی کو بھی شرمندہ کردیا۔ اچھی تحریریں دوسروں کو دے کر کمزور تحریریں خود رکھ لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اسلام نے کہا کہ جو چیز تم اپنے لئے پسند کرو وہی اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرو۔ عزیز اندوری نے اسلام کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔"

"صغرا آپا وظیفہ یاب ہوئیں" کے بارے میں یہ طے کرنا کہ وہ خاکہ ہے، انشائیہ ہے، خاکہ نما انشائیہ ہے یا انشائیہ نما خاکہ، تاثر ہے یا رسم و دستور کی ادائیگی، یہ ہمارا مقصد نہیں۔ بات خالد محمود کے لطف بیان کی ہے، وہ ہے اور اس کے پیچھے تقویت دینے والا خلوص، اپنی طرف کھینچنے والا کھرا پن اور توجہ کو گھیر لینے والی بیساختگی ہے۔ انشائیے کی خصوصیت کو بیان کرتے ہوئے یوں تو بہت کچھ کہا گیا ہے۔ تغزل کی طرح انشائیے کی روح کو بھی تعریفات کے گھیرے میں لینا ممکن نہیں۔ صحیح تو یہ ہے کہ انشائیہ، اسلوب تحریر کا نام نہیں۔ وہ ذہن کی رو کا انداز ہے۔ انشائیہ ایک ایسی ترنگ ہے جو کہیں سے اٹھتی ہے اور کسی بھی سمت میں بڑھتی اور پھیلتی ہے۔ پھر اچانک مڑ جاتی ہے۔ اس سمت کا اپنا نام نہیں ہوتا۔ یہ رو اس سمت کا نام دیتی

ہے۔ خالد محمود کی تحریرات بھی اکثر اسی قسم کی تخلیقی حالت وجد کی پیداوار ہیں۔ اگر ادبی ہاٹ میں کثرت استعمال سے یہ نکتہ کھس نہ گیا ہوتا تو اس کیفیت کے لئے "مس موجی" کی اصطلاح خالد محمود کے اسلوب کے ایک امتیاز کو نمایاں کرنے کا ضرور جتن کرتی۔

ڈاکٹر صغرا مہدی کے اس وداعیہ میں کہیں یہ تاثر ابھر کر آتا ہے۔

"کبھی وہ ہم سے لڑتیں۔ کبھی ہمارے لئے دوسروں سے۔ کبھی ڈانٹتیں۔ کبھی سمجھاتیں۔ اگر انھیں یہ احساس ہو جاتا کہ ان سے زیادتی ہو گئی ہے تو بے چین ہو جاتیں اور اس وقت تک بے چین رہتیں جب تک اس کی تلافی نہ کرلیں۔ ان کی تلافیاں اکثر بڑی خوش ذائقہ، رسیلی اور خوشبودار ہوتیں۔ کبھی کبھی گرم گرم نمکین تلافیاں بھی چائے یا کافی کیساتھ نظر آجاتیں۔"

اور کہیں یہ پر لطف نقشہ نظر آتا ہے۔

"صغرا آپا کی شوخیاں اور شرارتیں جامعہ بھر میں مشہور ہیں۔ صغرا آپا اور عذرا باجی کی جوڑی کو خدا سلامت رکھے۔ ایک زمانے میں قیامت برپا کرر کھی تھی۔ کون تھا جو ان کی زد سے بچا ہو مشاعروں میں یہ دونوں پیچھے بیٹھ کر وہ ہو ننگ کرتیں کہ اللہ میاں بھی شاعروں کا ساتھ چھوڑ دیتا۔ مرنے کے بعد تو شاعروں کو دوزخ میں جانا ہی ہے۔ مشاعروں میں یہ دونوں ان کی زندگی بھی دوزخ بنادیتی ہیں اگر یہ کسی جلسے یا مشاعرے میں پیچھے بیٹھی ہوں تو انھیں آگے بلا لینا چاہئے، ورنہ سامعین کا ... کے جذبات واحساسات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔"

خالد محمود کے انشائیوں میں زبان کے ساتھ بڑا سلیقہ مندی کا سلوک ملتا ہے۔ آپ کو ابھی تک ایسا شعبدہ گر نہیں ملا ہو گا۔ جو لیمو کو بغیر کاٹے اس کا عرق نچوڑ لے۔ لیکن خالد محمود قیصری آپریشن کئے بغیر الفاظ کے بطن سے معنی کا جوڑا پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک معنی جو سنجیدہ لغت نگار کی ڈکشنری کی طرف لے جاتا ہے اور دوسرا جو شوخ نکتہ داں کے لئے ذکاوت آمیز بصیرت کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ خالد محمود اپنی تراکیب سے چقماق کا کام لیتے ہیں ان کے الفاظ قاری کے ذہن میں باہم ٹکرا کر ایسے شرارے پیدا کرتے ہیں جو کائنات

معنی کے کئی غیر متوقع گوشوں کو روشن کرنے کا کام کرتے ہیں۔ ادب کے ادنیٰ ہنر مند اور اعلیٰ فنکار میں یہی فرق ہے کہ عام لکھنے والا صرف لفظوں کی سوداگری کرتا ہے۔ الفاظ اس کے لئے عام اشیائے صرف کی طرح ہوتے ہیں جو افراد کی اظہار و بیان کی سطحی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ادبی فنکار لفظوں کو تراش اور گڑھ کر ان میں نگینوں کی قدر قیمت پیدا کرتا ہے یہ تراش نگینوں کے پہلوؤں کو نئی چوندکا دینے والی تابناکی بخشتی ہے۔

خالد محمود کے انشائیوں میں لفظوں کی اسی تراش خراش، تابناکی اور چکاچوند کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے اسلوب کی انفرادیت یہی ہے کہ اس میں سطحیت کی بے تاثیر یکسانیت نہیں۔ ان کے بیان میں ایک ایسی معنوی تابکاری کی گنجائشیں جا بجا نظر آتی ہیں جو فکر و خیال کی کئی اندرونی تہوں پر اپنا نقش چھوڑنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خالد محمود کو اپنے بیان میں عناصر داخل کرنے میں خاص دلچسپی ہے جو قاری کے لئے غیر متوقع ہوں اور اس کے لئے آسان حیرت کا سبب بنیں۔ آسان حیرت سے مراد وہ رد عمل ہے جو قاری کو ہم قدم بنائے رکھے، جہاں قاری خوشی خوشی مصنف کے ساتھ رہے۔ داستان کو اپنے محیر العقول بیان سے قاری کو مبالغے اور بے یقینی کی دنیا میں ڈھکیل دیتا ہے۔ ایک اچھا فنکار اپنے قاری کو اپنے ساتھ رکھتا ہے۔

خالد محمود اپنے انشائیوں میں اکثر ایسی ہی بیانیہ صلاحیتوں سے کام لیتے ہیں۔ ایک انشائیے ''سٹی بس کا سفر'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ خدانخواستہ دلی میں قطار میں کھڑے ہونے کا رواج نہیں۔ رواج یقیناً ہے جب تک بس نہیں آتی لوگ نہایت صبر و سکون کے ساتھ صف بنائے کھڑے رہتے ہیں۔ پھر جیسے ہی بس پر نظر پڑی ہے پتھروں کے زمانے کی تہذیب جاگ اٹھتی ہے مساوات کا یہ عالم کہ محمود و ایاز بس کے ایک ہی دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور ایک ہی دروازے سے اترتے ہیں۔ دلی والوں کو بس میں چڑھنے کا فن بھی خوب آتا ہے۔ بس میں نقب لگا کر داخل ہو جاتے ہیں یوں بھی سٹی بس کو سوار ہونے والوں کی بہ نسبت اترنے والوں کی زیادہ فکر رہتی ہے لوگ اترتے بھی اس طرح ہیں جیسے بس کے اندر فرقہ وارانہ فساد ہو گیا

ہو۔ بار بار بس میں سوار ہونے اور اترنے کی بھاگ دوڑ میں حصہ لینے والوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور یہ ایک دوسرے میں اس قدر گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ شناخت مشکل ہو جاتی ہے۔ دلی میں زندگی کا بڑا حصہ لوگ بس اسٹاپ پر گزارتے ہیں۔"

اسی طرح سیٹ پر بیٹھنے کے فن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر آپ کے قریب والا شخص اپنی حرکات و سکنات سے اٹھتا ہوا معلوم ہو رہا ہو تو بالکل اسی طرح ہوشیار ہو جائیں جس طرح مچھلی کے شکار کے وقت ڈور ہلنے پر ہو جاتے ہیں پھر اس سے پہلے کہ بیٹھا ہوا شخص اپنی جگہ سے پورا اٹھے۔ اپنے آپ کو اس کی جگہ پر گرادیں۔ پھر اپنی دونوں ٹانگوں کو اتنا اوپر اٹھائیں کے ٹانگیں آپ کے سر کے قریب پہنچ جائیں۔ اس طرح اس کو باہر آنے کی جگہ دیتے ہوئے ٹانگوں کو نیچے گرالیں دلی میں یوگا کی ٹریننگ کا ایک بڑا مقصد سٹی بس کے سفر میں سیٹ حاصل کرنے کا فن سکھانا ہے۔"

ایک اور انشائیے "جب اچانک میکے سے بیوی آجائے" میں خالد محمود نے بیچارگی کے بیان سے ایک مزاحیہ صورت حال ترتیب دی ہے۔ اس انشائیے میں بھی خالد محمود نے غیر راست بیان کے پر لطف امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ انشائیے کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے۔

"کسی بیاہتا شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎ آتا ہے یاد مجھ کو گذرا ہوا زمانہ۔ یہ مصرع سن کر ہمیں بھی اپنا زمانہ یاد آگیا۔ سبحان اللہ کیا اچھے دن تھے۔ ہم سینکڑوں نگاہوں کے مرکز تھے۔ ہر وقت کچھ حسینوں کی اور کچھ ان کے والدین کی نظریں ہمارا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آؤ بھگت ہوتی۔ پیار محبت کے لئے ڈونگرے برستے اور ہماری تعریف و توصیف میں وہ ساری باتیں کہی جاتیں جو ہمارے اندر نہ پہلے تھیں اور نہ آج ہیں۔"

بیوی کی اچانک واپسی اور گھر میں مشاعرے کے اہتمام کے نتیجے میں افراتفری سے پیدا ہونے والی گھبراہٹ سے نمٹنے کے لئے جو قدم اٹھائے جاتے ہیں، ان کا بیان ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:

"سب سے پہلے فرسٹ ایڈ کے طور پر ہم نے جلدی جلدی سب سامان

اپنے مقام پر پہنچانے کی ناکام کوشش کی۔ ہمارا یہ اضطراری عمل ایسا ہی تھا جیسے کوئی چور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سامان باندھ کر لے جانا چاہتا ہو چنانچہ ایسے غیر فطری تمل کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ جو سامان اپنی جگہ بر قرار تھا وہ بھی بیقرار ہو گیا"۔

اس انشائیے میں خالد محمود نے اپنی ایک مزاحیہ غزل بھی شامل کی ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

کس قدر کیف بداماں ہیں ہماری بیوی
ایسی کیا ہوں گی کسی اور کی پیاری بیوی

اپنے میکے کی ہیں گر راج دلاری بیوی
تو ہیں سسرال کی بھی آنکھ کی تاری بیوی

سب عزیزوں نے بیک نٹک کہا ہے
خوب سیرت بھی ہیں واللہ تمہاری بیوی

کبھی خوش ہیں تو نظر آتی ہیں پوری شوہر
کبھی غصے میں وہ بن جاتی ہیں ساری بیوی

ہم کو بھاتی ہے اسی وقت سے صورت ان کی
اپنے میکے میں تھیں جس وقت کنواری بیوی

خالد محمود کی تحریرات جن میں ان کے تنقیدی مضامین بھی شامل ہیں، زبان کے تخلیقی استعمال پر ان کی قدرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کی سنجیدہ تحریرات منطقیت اور حقیقت حال کے اظہار کو مرکزی اہمیت دینے کے باوجود محض ریگ زار الفاظ کا نقشہ نہیں پیش کرتیں۔ ان کی اس خلاقانہ صلاحیت نے جس کا بھرپور اظہار ان کی شاعری کی شکل میں نظر آتا ہے، ان کی اختراعی ہنر مندی کو نمایاں طور پر تقویت پہنچائی ہے۔ اس ہنر مندی نے خالد محمود کے انشائیوں میں خاص طور پر خیال افروز تراکیب و تماثیل کی تشکیل میں مدد کی ہے۔ لفظوں کے انتخاب، مناسبتوں کے اہتمام، استعاراتی نظام کی ترتیب میں خالد محمود نے قابل توجہ فنکارانہ شعور کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

خالد محمود کی ادبی کاوشوں کے موجودہ ذخیرے کے سرسری جائزے سے ہی یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ایسی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک ہیں جو صرف ایک خصوصی اسلوب تک محدود نہیں۔ وہ الگ الگ نوع کے اسالیب نثر و نظم پر یکساں اعتماد کے ساتھ قدرت رکھتے ہیں اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ تخلیقی نثر کو مالا مال کرنے کی جانب اور زیادہ توجہ کریں گے۔

O

ڈاکٹر سید حامد حسین
کوہ فضا، احمد آباد پلس، بھوپال

خالد محمود اور ان کا سفر ناموں کا مطالعہ

خالد محمود نے دراصل ایک تخلیقی فنکار کی حیثیت سے امتیاز حاصل کیا ہے اور اس تخلیقی فنکاری کا امتیاز ان کا ذہنی شعور، فکری صلاحیت اور تہوں کو پار کرتی ہوئی حقیقت تک پہنچنے والی ایک نظر ہے۔ اس نظر اور فکری صلاحیتوں کی واضح کار فرمائی خالد محمود کی علمی تحریرات میں نظر آتی ہے۔ خالد محمود کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین میں محض رسمی کاوش کے آثار نہیں دکھائی دیتے بلکہ ان میں فراہم کی گئی بصیرتوں سے دریافت حقیقت کے نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ خالد محمود کا تحقیقی مقالہ "اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ" ان کے اسی تنقیدی شعور اور ان کی تحقیقی کاوش کا ایک بھرپور نمونہ ہے۔

اردو میں ابھی تک موضوعاتی مقالے تحریر کرنے کی کوئی طاقتور روایت ابھر نہیں پائی ہے۔ عام طور پر ہمارے مصنفین اپنی تحریرات کو موضوعات کے مخصوص گوشوں تک محدود رکھتے ہوئے کسی خاص زاویے سے جائزہ لینے کو اپنے عملی مقصد کی تکمیل سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں انسائیکلوپیڈیائی ادب کی کمی سب کو کھٹکتی ہے۔ چنانچہ جس وقت بھی ایک وسیع دائرے میں کسی قسم کی معلومات درکار ہوتی ہیں تو ہمیں اکثر دوسری زبانوں میں تیار کی گئی حوالے کی کتابوں کی جانب رجوع کرنا پڑتا ہے۔

خالد محمود کا سفر ناموں پر یہ مقالہ اصلاً اردو میں تحریر سفر ناموں کا مطالعہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سفر کے تجربے سے لے کر سفر نامے کے ادبی امتیاز تک ایک طویل و بسیط موضوع کا احاطہ کرتا ہے۔ سفر ناموں پر بحث کرنے سے پہلے انہوں نے یہ ضروری سمجھا ہے کہ وہ زندگی میں سفر کی ضرورت، سفر کی دلچسپیوں، اس کے چیلنج اور روداد سفر جاننے کی خواہش جیسے بنیادی پہلوؤں کا جائزہ لیں۔

سفر اور سیاحت کے فرق کو نمایاں کرتے ہوئے انہوں نے سفر کی اقسام اور سفر کے وسائل سے بھی بحث کی ہے۔ سفر انسان کے لئے نہ صرف عملی اور کاروباری ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے بلکہ وہ انسان کے ذہن و فکر پر بھی اپنے اثرات مرتب کرتا ہے اور اس کو نفسیاتی آسودگی بھی بہم پہنچاتا ہے اور کیونکہ سفر انسان کے فکر واحساس کو ایک خاص قسم کی تسکین اور لطف کا سامان فراہم کرنے کا سبب بنتا ہے، اس لئے سفر کی روداد اور سفر کے دوران حاصل ہونے والے تجربات کا بیان ایک خاص دلچسپی کا حامل ہوتا ہے۔ یہی دلچسپی سفر نامے لکھنے اور پڑھنے کے لئے تحریک بنتی ہے۔

سفر ناموں نے دھیرے دھیرے اب ایک جداگانہ صنف ادب کا اعتبار حاصل کر لیا ہے۔ خالد محمود نے سفر ناموں کے اسی ادبی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے سفر نامے کے فن اور اس کی تکنیک سے بحث کی ہے اور سفر ناموں کی اقسام متعین کی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔

> ''سفر نامہ صرف انسانی تجربات و مشاہدات اور ظاہری آنکھوں سے نظر آنے والے حالات و واقعات کا مجموعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ سیاح کے اپنے احساسات اور تاثرات کا آئینہ بھی ہوتا ہے۔''

وہ کہتے ہیں کہ:۔

> ''اچھا سفر نامہ قاری کو اپنا ہم سفر بنالیتا ہے۔ قاری وہ سب کچھ دیکھتا ہے جو سفر نامہ نگار نے دیکھا ہے۔ وہ سب کچھ محسوس کرتا ہے جو سفر نامہ نگار نے محسوس کیا ہے، اس کے تجربات میں شریک ہوتا ہے۔''

وقت کے ساتھ ساتھ سفر ناموں کی ترتیب، پیش کش اور نوعیت میں بھی فرق آیا ہے۔ قدیم و جدید سفر ناموں میں مصنف کے نقطہ نظر اور رد عمل کے اظہار میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ خالد محمود نے اس جانب بجا طور پر نشاندہی کی ہے۔ قدیم مصنف سفر نامے سے اپنی شخصیت کو باہر رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے محض ایک روئداد، ایک رپورٹ کی شکل میں مرتب کرنا اپنا کمال سمجھتا ہے، جب کہ دور حاضر میں مصنف کی شخصیت ہی سفر نامے کو اس کی دلکشی اور اور اس کی اصل توانائی عطا کرتی ہے۔ خالد محمود نے سفر ناموں کے موضوعات اور اسالیب کا تفصیلی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس صنف کے حدود و امکانات سے بھی بحث کی ہے۔ اس کے باوجود کہ آج سفر نامہ دھیرے دھیرے ایک منفرد صنفِ ادب کی شکل اختیار

ہوتا جارہا ہے، سفر نامے کی صنفی خصوصیات کا تعین ایک دشوار مسئلہ بن گیا ہے۔ علمی اعتبار سے اسے ایک دشواری تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن تخلیقی اعتبار سے یہی وصف سفر نامے کو ایک ایسی فنی لچک فراہم کرتی ہے جو قاری کو ہر بار ایک نئے انداز سے آسودہ کرنے کی اپنے اندر گنجائش رکھتی ہے۔ مصنف کے شخصی تاثر اور رد عمل کی توانائی سے ہی سفر نامے کو اب تخلیقی ادب کا اعتبار حاصل ہوا ہے۔ خالد محمود بھی اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں:

> ”سفر نامہ جو دشوار و طویل راستے کی مسافت طے کرنے کے بعد اب اس مقام پر آگیا ہے جہاں اس کی اپنی آواز، چہرہ اور اپنی پہچان ہے اور وہ دیگر نثری اصناف مثلاً افسانہ، ڈراما، آپ بیتی یار پور تاژ سے الگ صنف ادب کے طور پر پہچانا جاسکتا ہے“

سفر نامے پر اصولی بحث کے بعد خالد محمود نے سفر نامے کی ابتدا اور تاریخی ارتقا پر روشنی ڈالی ہے انہوں نے یونانی سیاح ہیرو ڈوٹس کو پہلا سفر نامہ نویس مانا ہے اور میگستھنز کے ”انڈیکا“ کو دنیا کے اولین باقاعدہ سفر نامے کا درجہ دیا ہے۔ جہاں تک اردو سفر ناموں کا تعلق ہے خالد محمود کی تحقیق ہے کہ:

> ”تاحال دریافت شدہ اردو سفر ناموں کی طویل فہرست میں یوسف خاں کمبل پوش کا تاریخ یوسفی معروف بہ عجائبات فرنگ اردو کا اولین سفر نامہ قرار پاتا ہے۔ کمبل پوش نے ۱۸۳۷ء میں انگلستان کا سفر کیا تھا اور ان کا سفر نامہ ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا۔ سر سید احمد خاں کا ”مسافران لندن“ ان کے ۷۰۔۱۸۶۹ء کے سفر لندن کی روداد ہے۔ لیکن یہ سفر نامہ سر سید کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا۔ اس کے بعد سفر نامہ لکھنے پر خصوصی توجہ دی جانے لگی اور نثار علی بیگ، محمد حامد علی خاں نواب رام پور، محمد عمر خاں رئیس محمد گڑھ، باسودہ وغیرہ نے اپنے اپنے سفر نامے لکھے۔ لیکن جس تصنیف نے سفر نامے کو ایک خاص علمی وقعت عطا کی وہ شبلی کی ”سفر نامہ روم و مصر و شام“ تھی۔ جہاں محمد حسین آزاد کا ”سفر ایران“ ان کے اسلوبِ نگارش کی نمائندگی کرتا ہے، وہیں محمد جعفر تھانیسری کی تصنیف ”کالا پانی“ ایک ایسی اہم تاریخی اور سماجی دستاویز ہے جسے فراموش نہیں

کیا جا سکتا۔ عبدالرحمٰن امرتسری کا "سفر نامہ بلاد اسلامیہ" ایک سیاح کی دلچسپ سرگزشت کا اچھا نمونہ پیش کرتا ہے۔"

خالد محمود نے بیسویں صدی میں تحریر کیئے گئے سفر ناموں کا بہ نظر غائر تجزیہ کیا ہے۔ اس صدی میں تحریر کیئے گئے سفر ناموں کی تعداد بھی زیادہ ہے اور مصنفین کے نقطہ نظر اور ان کے اسلوب نگارش میں بھی زبردست رنگا رنگی ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں جو خاص طور پر قابل توجہ سفر نامے سامنے آئے، ان کی نشاندہی کرتے ہوئے خالد محمود لکھتے ہیں۔

"مہاراجہ کشن پرشاد، شیخ عبدالقادر، خواجہ غلام الثقلین، منشی محبوب عالم، خواجہ حسن نظامی، سید ابو ظفر ندوی، قاضی ولی محمد، محمد علی قصوری، سید سلیمان ندوی، نشاط النسا بیگم اور قاضی عبدالغفار کے سفر نامے اپنی اپنی طرز میں منفرد ہیں۔"

تقسیم کے بعد جن مصنفین کے سفر ناموں پر خالد محمود نے خاص طور پر اپنی توجہ مرکوز کی ہے ان میں ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین، سید احتشام حسین، ثریا حسین، عبادت بریلوی، ابراہیم جلیس، مختار الدین احمد، سید ابوالحسن ندوی، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، مرزا ادیب، خواجہ غلام السیدین، محمد طفیل، وزیر آغا، مسعود احمد برکاتی کے نام شامل ہیں۔ برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں جو نئی جغرافیائی حد بندی ہوئی اور ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آمد و رفت کی جو پابندیاں ظہور میں آئیں انہوں نے ایک بالکل نئے انداز کی سیاحت کو جنم دیا جس میں جذباتیت، ناسٹلجیا اور اجنبیت کے احساس سے پیدا ہونے والے ملے جلے تاثرات نے ہندوستان اور پاکستان میں آنے والوں کے سفر ناموں کو ایک الگ ہی انداز بخشا۔ ایسے سفر ناموں کا جائزہ لینے کے لئے خالد محمود نے ایک الگ باب قائم کیا ہے۔ مقالے کے ضمیمے کی حیثیت سے حج کے سفر ناموں کا ایک جائزہ بھی شامل کیا گیا ہے۔

اردو سفر ناموں پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالتے ہوئے خالد محمود اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تکنیک کے اعتبار سے سفر نامہ بڑی حد تک قدیم روش پر گامزن ہے۔ لیکن موضوع اور مواد کے اعتبار سے قدیم و جدید سفر ناموں میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ خالد محمود کہتے ہیں کہ

"موضوعات کے لحاظ سے آج کا سفر نامہ نگار صرف تاریخی اور جغرافیائی

سطح پر معلومات جمع کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اپنی ذات میں سفر کرتا ہے۔ اس کے نزدیک سفر نامہ نگار کی ذات ہی سفر نامے کا مرکزی کردار ہے۔ اسی کے آس پاس سارا ماحول گردش کرتا ہے۔ اس لئے وہ سفر نامے کو اپنی شخصیت اور ذات و صفات کے اظہار کا وسیلہ سمجھتا ہے اس کے نزدیک سفر نامہ صرف واقعات سفر کا بیان نہیں، کیفیاتِ سفر کا بیانیہ ہے۔"

قدیم و جدید سفر ناموں کا مقابلہ کرتے ہوئے خالد محمود اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

"قدیم سیاح جو کچھ دیکھتا تھا ایک غیر جانبدار رپورٹر کی طرح من و عن بیان کر دیتا تھا۔ وہ اپنی ذات اور شخصیت سے زیادہ سفر اور معاملات سفر سے سروکار رکھتا تھا اور انہیں کو اہمیت دیتا تھا۔ اس کی نظر ہر وقت اپنے مقصد پر رہتی تھی۔ نئے سفر نامہ نگار نے سفر ہی کو مقصود سفر بنانے کی کوشش کی ہے۔ جدید اور قدیم سیاح میں ایک اور فرق یہ ہے کہ جدید سفر نامہ نگار صرف زمانہ حال میں سفر نہیں کرتا۔ ماضی کی بازیافت بھی کرتا ہے۔"

ایک صنف ادب کی حیثیت سے سفر نامے نے قابل توجہ تخلیقی گنجائشوں اور اظہاری امکانات کو نمایاں کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کے باوجود خالد محمود کی رائے ہے کہ سفر ناموں میں:

"جابجا کچھ ایسی خامیاں بھی نظر آتی ہیں جو ایک طرف سفر نامے کی صداقتوں کو مجروح کرتی ہیں تو دوسری جانب اس کی سرحدوں کو فکشن کے حدود میں داخل کر دیتی ہیں۔ نئے سفر ناموں میں حد سے زیادہ مبالغہ آرائی، سفر نامہ نگار کا اپنی ذات کو بہت زیادہ اہمیت دینا، اپنے نظریات پر اصرار کرنا اور اس حقیقت کو فراموش کر دینا کہ سفر نامہ، ناول اور افسانہ سے الگ اپنی ایک منفرد شناخت بھی رکھتا ہے، نئے سفر نامے کی بے احتیاطیاں ہیں۔"

خالد محمود نے جن عناصر کو بے احتیاطی سے تعبیر کیا ہے ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو سفر نامے کے تخلیقی امکانات سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ تخلیقی فنکار کے فن کو اکثر پابندیاں توڑ کر ہی فروغ حاصل ہوتا ہے۔

خالد محمود کے اس مقالے کی امتیازی خصوصیت موضوع کی تفصیل کے ساتھ

چھان بین کے باوصف جائزے کی جامعیت ہے۔ انہوں نے زیر بحث سفر ناموں کے تعارف، تجزیے اور تعین مقام میں ایک معقول توازن بر قرار رکھا ہے۔ بحث کے لئے انہوں نے ایک معروضی اسلوب اختیار کیا ہے لیکن اسے بے رنگ اور بے مزہ نہیں کہا جا سکتا۔ مقالہ ایک ایسے لطیف، لچک دار انداز تحریر کی مثال ہے جس میں جہاں مقالہ نگاری کی موضوع کے ساتھ شخصی وابستگی سے پیدا ہونے والی ایک جاذبیت ہے۔ وہیں اس میں منطقی ربط سے پیدا ہونے والی وہ معقولیت ہے جو قاری کے فکر و ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

مقالے کا دستاویزی پہلو بہت مضبوط ہے۔ خالد محمود نے مستند حوالوں کی مدد سے اپنا مقدمہ تیار کیا ہے۔ سفر اور سفر ناموں کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے کیلئے انہوں نے صرف اردو زبان کے دائرے کے اندر اپنی تحقیق و تفتیش کو محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اپنے دعوے کی تائید میں عالمی ادب سے مستند مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اردو سفر ناموں کی دریافت، شناخت اور ان کی اہمیت کے تعین میں انہوں نے تحریرات کے قدری معیار کو تو مد نظر رکھا ہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کے دائرے کو اس طرح پھیلایا ہے کہ اس میں بر صغیر کے تقریباً سب ہی چھوٹے بڑے سفر نامے سمٹ آئے ہیں۔ اس طرح ان کا جائزہ اردو سفر ناموں کا ایک ایسا بھرپور مطالعہ ہے جو ہمیں کسی اور حوالے سے مستغنی کر دیتا ہے۔ کتاب کے آخر میں شامل کتابیات اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لئے نئی راہیں کھولتی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ یہ مقالہ صرف سفر ناموں میں خصوصی علمی دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ہی مستند معلومات کا ایک ذخیرہ ہو، یہ مقالہ ایک عام قاری کی دلچسپی کو بھی اپنی جانب کھینچتا ہے۔ مقالے میں جا بجا اہم سفر ناموں کا خلاصہ اور سفر ناموں کے اندر سے منتخب اقتباسات بھی پیش کئے گئے ہیں۔ جو عام قاری کے لئے دلچسپی کا سامان فراہم کرتے ہیں اور اس جائزے سے اصل سفر ناموں کے مطالعے کے لئے بھی ایک تحریک پیدا ہوتی ہے۔

جیسا کہ ابتداء میں عرض کیا جا چکا ہے۔ خالد محمود کا تخلیقی ادب کے ساتھ طویل عرصے سے ل کا معاملہ ہے۔ وہ خوش فکر شاعر اور نکتہ شناس انشائیہ نگار ہیں۔ سپاٹ، بے رنگ اسلوب انہیں مطمئن نہیں کرتا۔ زبان کے پر تاثیر استعمال کے اس تخلیقی رجحان کے نشانات ان کے مقالے کے ہر صفحے پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ تقریباً سوا تین سو صفحات پر پھیلے ہوئے اس مقالے کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی قاری اپنے تجربے کو مشقت کے زمرے میں نہیں رکھنا چاہے گا۔

ڈاکٹر صادقہ ذکی
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

کتاب کی قبائے صفات پر تبصرہ نگاری کا عمل

ڈاکٹر خالد محمود کے حوالہ سے

سچ تو یہ ہے کہ "کتاب" اپنے دیدہ ور کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ شاید اسی لیے اندھیری کوٹھریوں یا مچانوں پر پڑے ہوئے ذخیروں میں بند کتابیں مدتوں اپنی آزادی کے خواب دیکھا کرتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ اس جنس گرانمایہ کے بازار میں آنے کے باوجود بھی کتاب کا بازار ٹھنڈا ہی رہتا ہے۔ کتب بینی کے شائقین کتابیں خریدنے کی ہمت نہیں رکھتے جب کہ خواص کو کتابیں تحفتاً مل جاتی ہیں۔ لہٰذا کتاب کی آزادی کیسے ممکن ہو؟ ایسی صورت حال میں کتاب اپنے دیدہ ور کی بے خبری کا شکار ہو کر خاک ہوتی رہتی ہے۔ اس انجام سے محفوظ رہنے کے لیے کتاب کی رسم اجرا کا انعقاد اور اس پر تبصرے کروانا اچھی بات ہے۔ علمی درسگاہوں کے کتاب خانے اکثر کتاب کو قارئین کے مخصوص حلقوں تک پہنچانے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ اخبارات و رسائل میں تبصرہ نگاری کے کالم اس لحاظ سے مناسب ترین وسیلہ اظہار ثابت ہوتے ہیں۔ فہرست کتب میں کسی نئی کتاب کا شامل ہونا یا اس کے اشتہار سے کتاب کی خبر تو مل جاتی ہے لیکن اس کی گیرائی اور گہرائی کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ تبصروں کے کالم کتب فروشوں کی توجہ کو بھی اسیر کر لیتے ہیں۔ کتاب مارکیٹ میں موجود ہو تو پڑھنے اور خاص طور سے تحقیق کرنے والوں کے لیے یہ انبساط کا سبب ہوتا ہے۔ اس طرح کسی نہ کسی حد تک خرید و فروخت کا سلسلہ ہی شروع ہو جاتا ہے۔

تبصرہ نگاری ایک آزاد صنف ہے۔ خیال و اظہار کی رنگارنگی کے باوجود اس کے کچھ تقاضے بھی سامنے آتے ہیں۔ اس لیے اسے خاصا ذمہ دارانہ عمل بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس مختصر تحریر میں مجموعی طور پر کتاب کی قدر و قیمت پر اظہار خیال کیا جاتا ہے۔ اس میں موضوع کی

افادیت۔ مواد۔ ترتیب و تنظیم۔ اسلوب تحریر اور طباعت کا معیار پیش نظر ہوتا ہے۔ صاحب کتاب کا ذکر یا تعارف بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ایسی تحریروں کو گروپ بندی، کسی بھی قسم کی مخاصمت، تنگ نظری یا تنگ دلی سے آزاد ہونا چاہیے۔ مبصر کا صاحب کتاب سے متفق ہونا ضروری نہیں لیکن موضوع کی اہمیت اور کام کی نوعیت کا اعتراف بہر حال ہونا چاہیے۔ ہماری رائے میں کم از کم مبصر کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ قارئین کو کتاب سے متعارف کرائے۔ اور عام طور پر ایسا ہوتا بھی ہے۔ لیکن اکثر اس کے برعکس کچھ باتیں سامنے آتی ہیں۔

تبصروں میں کتاب سے متعلق عموماً حسن و قبح کا پہلو آجاتا ہے۔ لیکن بعض تحریوں میں تنقیص کا پہلو مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ جذبۂ خیر سے تہی دست یہ جانبدارانہ شعوری کوشش کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ اسی اعتبار سے صاحب کتاب کو کوئے ملامت میں گھسیٹنے کی بات بھی پسندیدہ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح ادب میں مبالغہ سے انبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے لیکن حد سے زیادہ مبالغہ بات کی قیمت کو کچھ کم کر دیتا ہے۔ 'تحسین' اگر سائنٹفک انداز سے سامنے آئے تو کتاب زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ صاحب کتاب اگر خود اپنی کتاب پر تبصرہ کریں اور اسے کسی اور کے نام سے شائع کرائیں تو ایسی تحریروں میں تحسین کی لے بہت اونچی رہتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کتاب کے مستحسن پہلوؤں کو نہ ابھارا جائے بلکہ ان کا اعتراف تو کھل کر ہونا چاہیے۔ تحریری کاموں کے مختلف اور متعدد تقاضے ہوتے ہیں۔ اظہار اپنی تراش خراش میں کچھ آزادیوں اور پابندیوں سے کام لیتا ہے۔ بعض تحریریں ایسی بھی سامنے آتی ہیں جن میں کچھ نہ کچھ کہنے کے بہانے وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں جن کا سارے فسانے میں کوئی ذکر نہ ہو۔ صاحب کتاب ایسی باتوں کو مسکرا کر برداشت کر لیتے ہیں یا پھر جواب نامہ تحریر کر ڈالتے ہیں۔ کم از کم تبصرے کے نام پر ایک تحریر تو سامنے آجاتی ہے۔

تبصرہ جب مختصر ترین ہو تو اسے تعارف کے ذیل میں رکھا جا سکتا ہے۔ ایسی طویل تحریریں مضامین کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہیں اور یہ تبصروں یا جائزوں کے عنوانات کے تحت شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین انہیں تبصروں کے ذیل میں قبول کر لینے کے عادی ہو چکے ہیں۔ کسی تبصرے میں پیش کیے گئے صاحب کتاب کے باقاعدہ تعارف نامہ سے بھی ایسی تحریریں طویل ہو جاتی ہیں۔ بہر حال تبصرہ مضمون کے مقابلہ میں ایک مختصر تحریر ہوتی ہے جس میں

کتاب کے تمام ضروری پہلوؤں کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ کسی کتاب کا المیہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے متوقع قاری کی توجہ سے محروم رہے اور کتاب کی قسمت کا طرۂ یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پڑھی جائے۔ اس لیے چند کا وجود پا جانا صاحب کتاب کے لیے 'عید نظارہ' کا حکم رکھتا ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود کی تبصرہ نگاری کے ذیل میں اس مختصر صنف کے خدوخال پر کچھ سوچنے کا موقع ملا۔ دوسری تحریروں کی طرح خالد محمود کی تبصرہ نگاری کا بھی ایک طویل سلسلہ ہے۔ خود ان کے بیان کے مطابق ۱۹۷۳ء سے تادم تحریر انہوں نے تقریباً پچاس سے زائد کتابوں پر تبصرے کیے ہیں۔ ان میں رسائل کے نمبر بھی شامل ہیں۔ جو متعدد اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ اس تعداد کو دیکھتے ہوئے ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ ماشاءاللہ خالد محمود کے تعلقات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے انہیں اپنے احباب سے تحفتاً کتابیں ملتی رہی ہوں گی۔ مزید یہ کہ ان کے مراسم اہل کتب کے علاوہ مدیران سے بھی قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ کچھ ایڈیٹر صاحبان کی فرمائشوں اور کچھ کتابی تحائف کی پاسداریوں کے بہانے انہیں تبصرے کرنے کا موقع ملتا رہا۔ 'کتب بینی' مبصر کی طبیعت کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ خالد محمود ان لوگوں میں سے ہیں جو اکثر کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے اپنی خریدی ہوئی پسندیدہ کتابوں پر بھی تبصرے کیے ہوں گے۔ بہر حال اتنے سارے تبصروں کی ورق گردانی کیجئے تو خود بخود کئی پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ خالد محمود اپنی نظر کو کسی بھی موقع پر تنگ نہیں ہونے دیتے۔ قد آور شخصیات کی کتابوں کی بات اور ہے، وہ نئے لکھنے والوں کی کتابوں کا جائزہ بھی وسعت قلب و نظر سے لیتے ہیں۔ غیر معروف لوگوں کے اور نوجوان ادیبوں کے بعض کام بہت اچھے ہوتے ہیں، لیکن کام کی اہمیت کا اعتراف کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور سے آجکل کی گروپ بندیوں کے دور میں بھی خالد محمود جانب دارانہ رویوں سے بے نیاز رہتے ہیں۔

تبصروں میں صاحب کتاب کی محنت کے ساتھ مبصر کی شخصیت کی ایک جھلک بھی سامنے آجاتی ہے۔ تبصرہ کرنے والے کو کتاب کے سمندر میں 'ڈوب جانے' کی عادت نہ ہو تو تبصرہ کتاب کے سرسری تعارف یا اشتہار سے کچھ زیادہ کام نہیں کرتا ہے۔ پیش نظر تبصروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ مبصر نے ناقدانہ عمل سے کام رکھا ہے۔ یہ ممکن ہے کہ

پیش لفظ پڑھ لیا جائے اور ورق گردانی سے کام چلا لیا جائے۔ یہ پہلو تہی ایک سعی لا حاصل سے زیادہ درجہ نہیں رکھتی۔ تحریر تو ایک آئینہ ہوتی ہے جس میں کام کی نوعیت کا ہر عکس کمپیوٹر کی طرح شفاف سطح پر نمودار ہو جاتا ہے۔ بہر حال پیش لفظ سے کتاب کے اختتام تک خالد محمود کی گرفت یکساں طور پر مضبوط رہی ہے۔ اور اسی گرفت کے سہارے وہ نتائج بر آمد کرتے ہیں۔ بات کو وزنی اور پر تاثیر بنانے کے لیے وہ اکثر اپنے ذہن میں محفوظ مواد کو بھی استعمال کر لیتے ہیں۔ تبصرہ جیسی مختصر صنف میں حوالوں کی گنجائش کہاں ہوتی ہے۔ یا" بہ قول" کے سہارے دوسرے صاحب نظر ادیبوں کو ہمراہ لے لیا جائے۔ لیکن دیکھنے میں آیا ہے کہ یہاں تبصرہ نگار نے اکثر ایسی تحریروں میں اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ لیکن ان میں اختصار کو ملحوظ رکھا ہے۔ جس کی وجہ سے اختصار کے چوکٹے میں یہ تحریریں کھپ گئی ہیں۔ در اصل خالد محمود ستھرے ادبی ذوق کے ساتھ اچھی حس مزاح رکھتے ہیں اور یہ حس فوری طور پر ذہن میں محفوظ معلومات سے نتائج بر آمد کر لیتی ہے جو بے ساختہ نوک قلم پر آجاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ کسی مزاح نگار کے انکشافات پر ہر مرتبہ قاری لوٹ پوٹ ہو جائے۔ مزاح کی لہر کئی قسم کی ہوتی ہے۔ کبھی انسان مسکرا کر رہ جاتا ہے۔ اور کبھی اچانک کسی خوش لطفی سے دو چار ہو جاتا ہے۔ زیر نظر اقتباس پر توجہ کیجیے۔

".. حق تو یہ ہے کہ ان کتابوں نے جن میں شعر شور انگیز اور تفہیم غالب کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں اردو ادب کے سرمایہ میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمان قدوائی نے بڑی اچھی اور سچی بات کہی ہے کہ "شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے ان ادیبوں میں سے ہیں کہ جن کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو وہ ایک ادبی واقعہ ہوتا ہے۔ "گویا یہ تین سال میں چار ادبی واقعے ہوے۔"

(انداز گفتگو کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، کتاب نما اکتوبر، ۱۹۹۳ء)

خالد محمود کی دوسری تحریروں اور عام گفتگو میں یہ رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس اقتباس میں صدیق الرحمٰن قدوائی کا جملہ بھی صورت حال پر بڑا با معنی اور پر لطف ہے۔ لہٰذا خالد محمود کے رنگین اور پر مزاح چینل نے اسے فوراً کیچ کر لیا۔

خالد محمود کی تبصرہ نگاری میں حوالوں کا رنگ دوسرے کئی مواقع پر بھی دیکھا جا

سکتا ہے۔ محبوب راہی کی کتاب "تردید" پر تبصرہ ختم کرتے ہوئے انہیں اچانک وزیر آغا کے کچھ جملے یاد آگئے جو محبوب راہی کے فکر و فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے محبوب راہی کو فوراً وزیر آغا کے حوالے کر دیا۔ ملاحظہ ہو۔

> "ڈاکٹر وزیر آغا کے خیال میں محبوب راہی کو غالب کا انداز مرغوب ہے چنانچہ ان کے ہاں فکر کو پر عطا ہوئے ہیں اور جذبہ کو وارفتگی نصیب ہوئی ہے اور فکر اور جذبہ ایک دوسرے میں جذب ہونے کے لیے بے تاب نظر آتے ہیں "

'تدریس کا اپنا ایک مزاج اور رنگ ہوتا ہے جو اکثر تحریر سے بھی عیاں ہو جاتا ہے۔ تبصرہ نگاری کے کوچے میں بھی خالد محمود بہت سنبھل کر قدم اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح جیسے نوجوان امت کی رہ نمائی میں کوئی استاد بہت سنبھل کر لکچر دیتا ہے۔ انہوں نے کتاب کے موضوع کو متعلقہ پس منظر اور روایت کی روشنی میں دیکھا ہے۔ تبصرہ نگاری میں تفصیل کی گنجائش نہیں ہوتی، لیکن جملوں کا انداز اس "گیرائی" کو سامنے لاتا ہے۔ اس پیمائش سے انہوں نے اکثر کتابوں کا وزن کیا ہے۔ یہ خصوصیت انہیں مشاہیر کے کارناموں سے مرعوب ہو جانے سے بھی بچاتی ہے۔ تبصرہ لکھنے والے کو کتابی کارنامے یا ادیب کی شہرت مرعوب کر دے تو ممکن ہے کہ وہ صرف تعریفوں کے پل باندھ کر اپنے تبصرہ کو ختم کر ڈالے۔ لیکن خوامخواہ کی تحسین آفرینی کے خلاف تحسین شناسی کا ایک سچا اور سائنٹی فک انداز بھی ہوتا ہے۔ علمی حیثیت سے کسی مخصوص شئے کا اعتراف کرنا اچھی بات ہوتی ہے۔ اس میں مبالغہ راہ نہیں پاتا۔ خالد محمود بڑے مناسب انداز میں کھلے دل سے کارناموں کا اعتراف بھی کرتے ہیں اور حوصلہ مندی اور عدم مرعوبیت کا ثبوت بھی دیتے ہیں مثلاً فاروقی صاحب کے تبصرے میں یہ جملہ ملاحظہ کیجئے۔ "شب خون نے نئے ادب کو روشناس کرانے اور فروغ پذیر بنانے میں نمایاں اور اہم کردار ادا کیا ہے، نئے ادب کی کم و بیش دو نسلوں کو بنانے بگاڑنے کا سہرا اسی پرچے کے سر ہے" (تبصرہ، انداز گفتگو کیا ہے) اس طرح کے برجستہ جملے ان کے تبصروں میں جا بجا اچانک نظر آجاتے ہیں۔ کچھ باتیں دوسروں کی زبانی کہی جاتی ہیں تو کچھ خود ادیب کی زبان سے بھی سنوا دی جاتی ہیں یہ باتیں پیش لفظ یا مقدمہ کا حصہ ہو سکتی ہیں۔ یا کسی اور موقع پر دیئے گئے بیان کا حصہ بھی وزیر آغا کی کتاب "دستک اس

دروازے پر" کے تبصرے کا آغاز مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے۔

"میری یہ کتاب محض ہلکی سی ایک دستک ہے جو میں نے عظیم اسرار Great Mystery کے دروازے پر دی ہے۔ میں زندگی بھر وقفے وقفے سے یہ دستک دیتا آیا ہوں اور دوسری طرف اس کے جواب میں کبھی تو مستقل سناٹا اور کبھی واضح دستک مجھے بھی سنائی دی ہے "

(کتاب نما، فروری ۹۴ء)

ادیب کسی براہ راست طرز کا عادی نہیں ہوتا۔ وہ چاہے تو گرد و پیش کی کسی شئے کو زبان دے کر مقصد کی ترسیل کر سکتا ہے۔ ایسا وہی شخص کر سکتا ہے کہ جو خیال کی ترسیل کو نئی جہتوں سے برتنے کا تجربہ کر سکے۔ اوپر کے اقتباس میں وزیر آغا کے تخلیقی عمل کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔ اور اس کے بعد ان کے تعارف کو 'اوراق' کے حوالہ سے تازہ کیا گیا ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تبصرہ نگاری ایک آزاد تحریر ہوتی ہے۔ اسے کسی بھی طرح شروع اور ختم کیا جا سکتا ہے۔ بات صرف اتنی ہوتی ہے کہ مبصر کی نظر میں کونسا پہلو بہت اہم ہے اور اسے کس طرح روشن کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے خالد محمود نے مختلف انداز اختیار کیے ہیں تبصرہ کرتے ہوئے صاحب کتاب کے خیالات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پیشتر ذکر آچکا ہے کہ یہ خیالات پیش لفظ یا مقدمے سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ دراصل کتاب کا یہ ابتدائی حصہ ایک رہ نما تحریر ہوتی ہے جو پوری کتاب کا ماجرا بیان کرتی ہے۔ اس سے تبصرہ کرنے والا اتفاق بھی کرتا ہے یا اختلاف کی گنجائش بھی نکل آتی ہے۔ لکھنے والے کے لیے کتاب کا پورا مواد مفاہمت کرتا ہے وہ چاہے تو کتاب کے کسی بھی پہلو سے اختلاف کر سکتا ہے لیکن خامیاں تلاش کرنے والوں کی اپنی ایک شناخت بن جاتی ہے۔ علمی حیثیت سے کسی پہلو پر اتفاق نہ کرنا الگ بات ہے لیکن متواتر تبصروں میں 'تنقیص' کو مطمع نظر بنا لینا کچھ اچھی بات نہیں۔ اس سے ذہنیت کے پردے فاش ہو جاتے ہیں۔ اور بے لگام انا کا بے معنی اصرار توجہ کرتا رہتا ہے۔ علمی نظر کی بات اور ہوتی ہے۔ اس میں جذبہ خیر ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کا اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔

خالد محمود فن پارہ کی طرف تنقیص کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔ البتہ معیار کے سلسلہ میں اشاروں کی زبانی وہ 'کچھ' ضرور کہہ جاتے ہیں۔ تبصرہ جیسی مختصر اور رواں

دواں تحریر تفصیلات کا بار کم کم برداشت کرتی ہے۔ اخلاقی رشتے بھی شاید اس کی اجازت نہیں دیتے۔ دو ایک تبصروں میں وہ خامیوں کی طرف اس طرح توجہ دلاتے ہیں۔ مثلاً

> "موسم زرد گلابوں کا" بازار میں آیا تو مجموعہ دیکھ کر غصہ بھی آیا افسوس بھی ہوا کتابت، طباعت، کاغذ، سرورق، غرض کتاب کی اشاعت کا کوئی حصہ کوئی گوشہ اس کے شایان شان نہ تھا۔ یہی افسوس مجھے اپنے ایک دوسرے پسندیدہ شاعر ظفر صہبائی کا شعری مجموعہ "دھوپ کے پھول" دیکھ کر ہوا تھا۔ آج کے دور میں جب کہ اکیڈمیوں کی معاونت کا بازار گرم ہے۔ گئے گزرے شاعر بھی اچھی خاصی کتاب چھاپ لیتے ہیں قاری کا مزاج آفسیٹی ہو گیا ہے۔ نگاہیں جاذب نظر کتابوں کی متلاشی رہتی ہیں اور پھر شاہد میر تو بڑا پیارا شاعر ہے۔"

(تبصرہ: موسم زرد گلابوں کا)

خالد محمود کی تبصرہ نگاری کا ایک ضروری حصہ صاحب کتاب کی شخصیت کا تعارف ہوتا ہے۔ یہ آغاز وسط یا اختتام پر کہیں نہ کہیں سامنے آجاتا ہے اور تبصرہ کے مدار پر اختصار سے طوالت کے درمیان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ تبصرہ نگاری میں تعارف نامہ کا پایا جانا بہت ضروری نہیں ہوتا۔ لیکن خالد محمود کے تبصروں میں یہ ان کی انسان دوستی اور ادب نوازی کے نتیجہ میں وجود پاتا ہے۔

ڈاکٹر خالد محمود نے چند مضمون نما طویل تبصرے بھی لکھے ہیں۔ لیکن عام طور پر متعلق تحریروں میں انہوں نے اختصار کے حسن کو ملحوظ رکھا ہے۔ انہوں نے ایسی تحریروں کو مخصوص روایت کے تابع نہیں رکھا۔ انہیں بات کو مختلف انداز سے کہنے اور مواد کو پیش کرنے پر عبور حاصل ہے۔ ان کے بعض جملے کتاب اور قارئین کے رشتے پر جمی ہوئی گرد کو صاف کرتے چلے جاتے ہیں یعنی تبصرہ پڑھنے کے بعد طبیعت چاہتی ہے کہ کتاب کو فوری طور پر پڑھ لیا جائے۔ کتاب اسی لیے لکھی جاتی ہے کہ وہ پڑھی جائے۔ کتاب کو خود اپنے صحیح قاری یعنی دیدہ ور کی تلاش ہوتی ہے اور مبصر کا کام یہ ہے کہ وہ کتاب کو اس کے قارئین تک پہنچا دے۔

O

ڈاکٹر رضیہ حامد
مدیرہ "فکر و آگہی"
بھوپال

خالد محمود اور ان کی مزاح نگار

خالد محمود کی شاعری سے تو میں ان کے زمانہ طالب علمی سے ہی واقف ہوں، نہ صرف واقف بلکہ مداح بھی ہوں۔ دہلی آکر ان کے جوہر اور کھلے، تنقیدی اور تحقیقی میدان میں انہوں نے تلاش و جستجو کے لئے سفر کرتے ہوئے سفر ناموں پر مقالہ لکھ کر اپنے علم و فن کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ خالد محمود کی حس مزاح کا علم تو ان سے بارہا گفتگو کرنے اور ان کی گفتگو سننے سے ہو گیا اور ان کی برجستہ گوئی سے لطف اندوز بھی ہوئی۔ مگر وہ مزاح نگار ہیں، اس کا علم مجھے بہت دیر میں ہوا۔ اپنی کوتاہ علمی کا اعتراف کرتے ہوئے آج میرا ارادہ ان کے مزاحیہ مضامین سے لطف اندوز ہونے اور ان پر مضمون لکھنے کا ہے۔ اگر آپ کو یہ مضمون پسند آئے تو اس کا سہرا خالد محمود کے سر اور ناپسند آئے یا کمی نظر آئے تو میں اس کی ذمے دار۔ اس لئے کہ اس کوچہ سے میری شناسائی دور کی ہے۔

زندگی اور اس کے مظاہر ایک ہی ہیں دیکھنے والے کی نظر ان میں تنوع پیدا کرتی ہے۔ ہر فنکار کا مشاہدہ دوسرے فنکار اور عوام سے الگ ہوتا ہے۔

صحت مند معاشرے سے تعلق رکھنے والی کسی بھی زبان کے ادب میں طنز و مزاح کا عنصر ضروری ہوتا ہے۔ طنز و مزاح و خاکہ نگاری اردو ادب میں انشاء اللہ خاں انشاء، مرزا فرحت اللہ بیگ، خواجہ حسن نظامی، مولوی عبد الحق، رشید احمد صدیقی، مشتاق احمد یوسفی، مجتبیٰ حسین تخلص بھوپالی، مصطفیٰ تاج اور خالد محمود کی تحریریں خاص ہیں۔

طنزیہ و مزاحیہ ادب میں مقصدیت اور افادیت کی بھرپور طاقت پوشیدہ ہوتی ہے اور وہ ادب پڑھنے والے کو دعوت فکر دیتا ہے۔ اس طرح دیگر اصناف ادب کے مقابلہ میں یہ صنف بہت دشوار گزار ہے۔ جو انسان کو مزاح کا لطف لینے کے ساتھ ساتھ سوچنے سمجھنے پر

اکساتی ہے۔ یہ ادب تخیلاتی نہیں مشاہداتی ہے طنزیہ اور مزاحیہ نگار کا مشاہدہ دیگر فنکاروں کے مقابلہ میں تیز اور نظر عقابی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضمون لکھنا ایک ایسا فن ہے جو اکتساب کی مدد سے حاصل نہیں ہو سکتا اس کے لئے فنکار کا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ذہین ہونا ضروری ہے۔

خالد محمود ایک حساس انسان ہیں ان کو اپنے معاشرے کی کمیوں کا احساس ہے اور کوتاہیوں کا اندازہ بھی ہے۔ ان کا سماجی شعور پختہ ہے۔ خالد محمود نے اپنے مضامین میں زندگی کی تصویر کشی کرتے وقت ایسے پہلو تلاش کئے ہیں جن پر عام آدمی کی نظر نہیں جاتی۔ اگر پہنچ بھی جاتی ہے تو وہ اس کے ذہن کی گرفت میں نہیں آتے۔ ملاحظہ ہو۔

"حسب معمول بھیڑ شباب پر تھی ہم اس جگہ کو غور سے دیکھ رہے تھے جوان کے کھسکنے پر نیچے سے نکلنے والی تھی۔ ان کی انتھک کوشش کے بعد بہ دقت تمام سیٹ کی ایک چار انچی لکیر پہلی رات کے چاند کی طرح نمودار ہوئی۔" (سٹی بس کا سفر)

دہلی کی بس کے سفر کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بھوپال کی بسوں سے تقابل کرتے ہوئے طنز سے لطف پیدا کیا ہے اور پیراۂ بیان ایسا ہے کہ تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ خالد محمود ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ ان کی ذو معنویت سے تحریر میں شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔

بھوپال کے بسوں کا حال ملاحظہ ہو۔

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب بھوپال کی چمکتی ہوئی نئی پرائیویٹ بسوں کے مروت دار کنڈکٹروں کا مہذب برتاؤ ہماری رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ ان شائستہ کنڈکٹروں میں سواریوں کی عزت کا لحاظ اس حد تک تھا کہ جب تک ان کی بس کا ایک ایک مسافر بس میں سوار ہو کر اس قدر اطمینان سے نہ بیٹھ جائے کہ اس کے اطمینان پر بے اطمینانی کا گمان گزرنے لگے ڈرائیور اور کنڈکٹر نیچے کھڑے رہتے ہیں"

اب دلی کی بسوں کا حال ملاحظہ کیجئے خالد محمود یوں رقمطراز ہیں ۔ ۔

"دلّی والوں کو بس میں چڑھنے کا فن خوب آتا ہے۔ نقب لگا کر داخل ہو جاتے ہیں یوں سٹی بس کو سوار ہونے والوں کو بہ نسبت اترنے والوں کی

زیادہ فکر رہتی ہے جیسے ہی لوگ اترے بس آگے بڑھی۔ لوگ اترتے بھی اس طرح ہیں جیسے بس کے اندر فرقہ وارانہ فساد ہو گیا ہو۔"

اس کے بعد خالد محمود نئی اور پرانی تہذیب و اقدار کا ذکر کرتے ہوئے دہلی کی بس میں سوار ہونے کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

"خدا خدا کر کے ایک بس آئی ہمت کر کے آگے بڑھے ساتھ ہی بھیڑ کے ساتھ ایک خاتون بہتی ہوئی آگے چلی آئیں۔ ہم بھوپال کی بسوں کی تہذیب کے پروردہ سوچا انہیں پہلے سوار ہو جانے دیں اس خیال نے ایک سکینڈ کو قدم روک دیئے خاتون ہمیں دھکا دے کر بس میں سوار ہو گئیں بس بھاگ گئی اور ہم کھڑے کھڑے غبار دیکھتے رہے۔" (سٹی بس کا سفر)

ان تینوں اقتباسات کے بغیر بات واضح نہیں ہوتی۔ اس مضمون میں بڑے شہروں کی دوڑتی زندگی اور اقدار و تہذیب کے خاتمہ کا المیہ خالد محمود نے اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اس المیہ سے واقف ہو کر سامع اور قاری سنجیدہ ہونے کے بجائے ایک لمحہ کو ہنس دیتا ہے۔

آج کے سماج میں لڑکی کی شادی کے لئے اس کے جوڑ کا رشتہ ملنا اور شادی کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ اس لئے سماج میں غیر شادی شدہ اچھے لڑکوں کی جو آؤ بھگت اور پذیرائی ہوتی ہے اس کا نقشہ خالد محمود نے بڑی چابک دستی اور باریک بینی سے کھینچا ہے۔ شادی کرنے کی توضیح بھی خوب بیان کی ہے ملاحظہ ہو۔

"کسی بیاہتا شاعر نے کیا خوب کہا ہے .. "آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ" یہ مصرعہ سن کر ہمیں بھی اپنا زمانہ یاد آ گیا۔ سبحان اللہ کیا اچھے دن تھے ہم سیکڑوں نگاہوں کا مرکز تھے ہر وقت کچھ حسینوں کی اور کچھ ان کے والدین کی نظریں ہمارا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آؤ بھگت ہوتی پیار و محبت کے ڈونگرے برستے اور ہماری تعریف و توصیف میں وہ ساری باتیں کہی جاتیں جو ہمارے اندر نہ پہلے تھیں اور نہ آج ہیں۔ پھر ایسا وقت پڑا کہ اس چرخ کج رفتار کو ہماری یہ مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی اور ہمیں بھی اپنے بزرگوں کی تقلید میں ایک عدد بیوی کا شوہر بننے پر مجبور ہونا پڑا اگرچہ صرف ایک عدد بیوی سے بزرگوں کی تقلید کا . . "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔" (جب اچانک میکے سے بیوی آ جائے)

خالد محمود شاعر، ادب کے طالب علم اور ادب کے استاد ہیں یعنی ادب ان کا

ڑھنا بچھونا ہے۔ان کی تحریروں میں ادب کے فن پارے جابجا نظر آتے ہیں لکھتے ہیں

"خیال خاطر احباب کے ساتھ ساتھ خیال داد شعر بھی تھا اس لئے ان کے آبگینوں کو ٹھیس سے بچانے کے لئے خاطر احباب پر یوں کمر بستہ ہوئے کہ گھر کے بجٹ کے تمام آبگینے خوابوں کی طرح ٹوٹ گئے۔" (جب اچانک بیوی آجائے)

"صغرا آپا آج آپ شعبہ اردو میں اپنی بہترین صلاحیتوں سے خوبصورت یادوں کے انگنت چراغ روشن کرنے اور خلوص کا چمن مہکانے کے بعد رخصت ہو رہی ہیں۔ آپ سے پہلے بھی اسی طرح لوگ جاچکے ہیں اور آپ کے بعد بھی جائیں گے پہلے جانے والے بھی بہت اچھے تھے اور بعد میں جانے والے بھی ضرور اچھے ہونگے کہ سب میں اپنی اپنی خوبیاں ہوتی ہیں۔ آپ خوبیوں کا شفاف دریا ہیں آج کے بعد شعبہ کے درودیوار آپ کی آواز کو ترسیں گے۔" (صغرا آپا وظیفہ یاب ہوئیں)

"پھر لطیف صاحب کا ذوق بھی مختلف ہے اس لیے ماس کمونیکیشن کی جگہ ندوہ ٹائپ کے چند شعبے لطیف صاحب نے اپنے اندر کے ادارہ میں قائم کر رکھے ہیں اور یہ ان کے اندر کی صنعت تضاد ہے کہ مختلف الخیال اور متضاد المزاج اہل خیر حضرات کو اپنے اندر کے ادارہ میں یکجا کرنے کے بعد خود شیخ الجامعہ بنے بیٹھے ہیں۔" (ذکر اس پری وش کا)

"ساری فضا خاموش تھی مگر اس خاموشی میں اتنے سوالات گونج رہے تھے کہ تصور کے کان بہرے ہونے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ادھر بیوی کا عالم یہ تھا کہ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور "ہر سمت پڑھ رہی تھیں وہ اہل جفا کے نام" ادھر ہماری یہ حالت تھی کہ سر جھکائے "ہم بھی کھڑے ہوئے تھے گنہگار کی طرح۔" (جب اچانک میکے سے بیوی آجائے)

عبداللطیف اعظمی جامعہ ملیہ اور اس کے اطراف کی ہر دلعزیز اور بزرگ شخصیت ہیں انہوں نے جامعہ کے کئی بانیاں کی آنکھیں دیکھیں ہیں ان سے کسب فیض کئے ہوئے ہیں۔ وہ ان کی روایات اور اقدار کے گواہ اور امین ہیں خالد محمود ان کی عظمت اور بزرگی کا

اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ جامعہ کی تاریخ ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے۔

"میں نے سب سے پہلے لطیف صاحب کو ایک ادارہ کہا ہے جس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک ادارہ ہے۔ جامعہ کو ادارہ بنانے میں گاندھی جی کے علاوہ مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا آزاد وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں اور اسے ادارہ بنائے رکھنے میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب، ڈاکٹر عابد حسین اور شفیق الرحمٰن قدوائی جیسی ہستیوں کا اس سے تعلق ظاہر کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ تمام حضرات یہاں رہے تو جامعہ ادارہ بنا میرا دعوا یہ ہے کہ یہ تمام ہستیاں مولانا محمد علی سے لے کر پروفیسر محمد مجیب تک جامعہ میں تو اب موجود نہیں لیکن لطیف صاحب کے اندرون میں بہر حال موجود ہیں۔ سب کی روحیں عالم ارواح کو چلی جاتی ہیں ان حضرات کا عالم ارواح لطیف صاحب ہیں۔ جامعہ ملیہ میں یہ آٹھ دس افراد بیک وقت کبھی نہ رہے ہوں مگر لطیف صاحب کے دل و دماغ کے ہوسٹل میں روم پارٹنرز ہیں چنانچہ ان ادارہ سازوں کی یکجائی نے لطیف صاحب کو ایک مستقل ادارہ بنا دیا ہے۔" (ذکر اس پری وش کا)

خالد محمود نے پروفیسر صغرا مہدی کی شخصیت کو بڑے خوبصور اور جامع انداز میں خاکہ لکھتے ہوئے پیش کیا ہے جس سے ان کی شخصیت کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے ہیں۔ کہیں شفیق استاد اور کہیں دوست و بڑی بہن کی طرح نظر آتی ہیں تو کہیں شوخ و طالبہ' میں صغرا مہدی کو صرف بارعب اور شفیق استاد کی حیثیت سے ہی جانتی تھی ان انتے بہت سے خوبصورت روپ دیکھ کر فرط مسرت سے دنگ رہ گئی ملاحظہ کیجئے خالد کا انداز بیان اور صغرا آپا کی شخصیت۔

"صغرا آپا کے جانے کا مجھے اور میرے ہم عمروں کو ذاتی غم بھی ہے کہ وہ شعبے میں ہماری ایک ایسی دوست بن کر رہیں جس میں بڑی بہن کی شفقت کوٹ کوٹ کر بھری تھی، کبھی وہ ہم سے لڑتیں کبھی ہمارے لئے دوسروں سے۔ کبھی ڈانٹتیں کبھی سمجھاتیں اگر انہیں یہ احساس ہو جاتا کہ ان سے زیادتی ہو گئی ہے یا کسی کو ضرورت سے زیادہ ڈانٹ دیا ہے تو بے چین ہو

جاتیں اور اس وقت تک بے چین رہتیں جب تک اس کی تلافی نہ کرلیں، ان کی تلافیاں اکثر بڑی خوش ذائقہ رسیلی اور خوشبودار ہوتیں۔ کبھی کبھی گرما گرم نمکین تلافیاں بھی چائے یا کافی کے ساتھ نظر آجاتیں۔"

"صغرا آپا حق پر ہوں، تو کبھی ہار نہیں مانتیں اور اکثر و بیشتر حق پر ہوتی ہیں۔"

"صغرا آپا کی شوخیاں اور شرارتیں جامعہ بھر میں مشہور ہیں۔ صغرا آپا اور عذرا باجی کی جوڑی کو خدا سلامت رکھے ایک زمانہ میں قیامت برپا کر رکھی تھیں کون تھا جو ان کی زد سے بچا ہو۔ آج بھی یہ دونوں مل جائیں تو شریر سے شریر بچے کے کان کاٹتی ہیں۔ مشاعروں میں یہ دونوں پیچھے بیٹھ کر وہ ہوٹنگ کرتی ہیں کہ اللہ میاں بھی شاعروں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔"

پروفیسر صغرا مہدی کی ادبی سرگرمیوں اور ان کی مختلف تخلیقی و تصنیفی جہات کا ذکر خالد محمود نے اس جامعیت سے کیا ہے کہ دریا کو کوزے میں سمو دیا ہے۔ جملوں کی خوبصورتی اور برجستگی اور بے ساختگی پر سامع اور قاری دونوں کے منھ سے داد و تحسین کے کلمات بے ساختہ ادا ہوتے ہیں۔

"صغرا آپا ناول نگار، افسانہ نگار، مزاح نگار، سفر نامہ نگار اور اس قدر نگار ہیں کہ نگاراں بن چکی ہیں۔" (صغرا آپا وظیفہ یاب ہوئیں)

خالد محمود کی نثر میں بڑی بے ساختگی ہے اور برجستگی سے ایسے ایسے اشعار اور جملے اور الفاظ برمحل استعمال ہوئے ہیں جو پورے پورے مضامین کے متقاضی ہیں۔ یہ ایک طرف قاری کو دعوت مطالعہ دیتے ہیں تو دوسری طرف خالد محمود کے وسیع مطالعہ کو واضح کرتے ہیں۔ خالد محمود کے ان مضامین میں کئی ادبی تلمیحات در آئیں ہیں جس کے لئے ان کو حاشیہ میں لکھ دینا چاہئے تھا کہ "اس کے لئے دیکھیں فلاں کتاب"

خالد محمود کی مزاح نگاری پر لکھتے ہوئے میں نے کئی اقتباس اس مضمون میں شامل کر دیئے مگر چند اقتباس سے بات کا لطف کیسے آتا۔ میں نے سوچا صرف میں ہی کیوں ان سے حظ اٹھاؤں اور مختصر اقتباس سے آپ کو ان مضامین و تحریر کی خوبی سے محروم رکھوں ان مضامین میں خالد محمود کے وہ وہ جوہر کھلے کہ طبیعت عش عش کر اٹھی۔ اس دعا کے ساتھ (میرے ساتھ آپ بھی شریک ہو جائیں) رخصت ہوتی ہوں۔ کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

○

احمد کمال پروازی
توپ خانہ روڈ، اجین
(مدھیہ پردیش)

شاعری، نثر اور خالد محمود

نظام جسم جمہوری ہے خالؔد
کسی جذبے کی سلطانی نہیں ہے

خالؔد محمود یہ شعر کہہ کر بہت پہلے اپنا شعری رویہ اور نصب العین طے کر چکے ہیں۔ ادب کا ہر باخبر و باشعور قاری جانتا ہے کہ وہ ایک سچے شاعر اور تیکھے نثر نگار ہیں۔ جب کسی فنکار کو اظہار کی بے پناہ قوت حاصل ہوتی ہے تو وہ ادب کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ اسکی فطری اور ادبی صلاحتیں اس قدر سرگرم ہوتی ہیں کہ اظہار کے پیمانے خود بخود حرکت میں آجاتے ہیں دوسرے لفظوں میں مواد اپنی ہیئت خود تلاش کر لیتا ہے۔ جس طرح فنِ موسیقی میں راگ، راگنی کے اوقات مقرر ہیں اسی طرح مختلف اصنافِ ادب سے تخلیقی رشتہ قائم کرنے کے اوقات بھی مختلف، مگر مقررہ ہیں اب یہ بات الگ ہے کہ ابھی تک اس مجرّد خیال کی وسعت کو باقاعدگی کے ساتھ کسی منطقی علم کی طرح ڈھالا نہیں گیا۔ مذکورہ اوقات کو دریافت ہونا ہے۔ فی الحال تو یہ مفروضہ وجدان کے اندیکھے دائروں تک ہی محدود ہے۔

بہرحال خالؔد محمود بھی ایسے ہی ہمہ جہت فنکار ہیں۔ جن میں بے پناہ تخلیقی صلاحیت سرگرم ہے۔ ان کی ادبی کارکردگی کا میدان وسیع انکی ذہانت کا سفر بے حصار انکے اظہار کے پیمانے متعدد۔ میری ذہنی وابستگی ان سے اس وقت قائم ہوئی جب میں ان کی اس تحریر سے متعارف ہوا۔

"کسی بھی ملک میں اردو جیسی زندہ زبان کو جس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بے شمار ہو اور جس کا ادب، عالمی ادب سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس کی شیرینی اور لطافت کے سبھی معترف ہوں، زندہ رہنے اور پھولنے پھلنے کے حق ــــ

محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے پڑھنے اور لکھنے والوں کی بہر صورت حوصلہ افزائی ہونی چاہئے اور اس زبان کے ذریعے فارغ التحصیل طلباء کو روزگار کے مواقع بھی حاصل ہونے چاہئیں یہ سارے مطالبات اس عوامی اور ادبی زبان کے حقوق ہیں اور ان حقوق کی تکمیل حکومت کا فرض ہے مگر افسوس کہ اردو کے معاملے میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، آزادی کے بعد ہی سے اس زبان کی زبردست حق تلفی ہوتی رہی اور آج بھی تھوڑی بہت اشک شوئی کے علاوہ یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مرکزی حکومتیں ہوں یا صوبائی سرکاریں دونوں نے اردو کے ساتھ ناانصافی اور حقوق سلبی کا رویہ اختیار کیا ہے ایک طویل عرصے تک جھوٹے وعدوں کے سبز باغات کی سیر کرنے کے بعد جب اردو والوں نے پہلو بدلا اور آنکھیں کھولنے کی کوشش تو ارباب اقتدار نے خوش نما اعلانات کے ذریعے ان کا پہلو دبا دیا اور تنگ ظرف آنکھوں پر چھوٹی موٹی بخششوں کے ہاتھ رکھ دیئے۔ کبھی یوں بھی ہوا کہ سرکار نے خود ہی اردو کو مسئلہ بنایا اور پھر خود ہی اس مسئلے کا حل سمجھا دیا۔ انفرادی انعام واکرام دے کر کبھی مراعات طلب ہونٹوں پر قفل لگا دیئے اور کبھی اعزازات کے قطرے ٹپکا کر زبانیں تر کر دیں۔ اسکے بعد ان مراعات و اعزازات کا ایسا پروپگنڈہ ہوا جیسے حکومت کے بجٹ کا سب سے بڑا حصہ اردو پر خرچ کر دیا گیا ہو۔" ("کتاب نما" کے اداریئے سے اقتباس)

بظاہر یہ ایک مختصر تحریر ہے۔ نہ تو اس میں کوئی فلسفہ بیان کیا گیا ہے اور نہ ہی اسکا علوم کی کسی شاخ سے کوئی علاقہ ہے، قلم کار کا موضوع ہے۔

"ہندوستان میں اردو مسائل کے دو۔رُخ"

اب ذرا سوچئے یہی موضوع اگر ہمیں دے دیا جاتا یا ہم ہی اسکا انتخاب کرتے تو اسے کس طرح رقم کرتے؟ یہاں ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ ہمارے مجرّد خیالات ہیں جو خوبصورت لسانی پیکروں میں پیوست ہو کر متشکل ہو گئے ہیں۔ ہم سوچ رہے ہیں اور تحریر از خود اسلوب میں ڈھلتی جا رہی ہے۔ یہ ہنر مندی یہ اسلوب ایسے ہی نہیں آجاتا، ادب زبان قواعد، اور محاوروں کے بسیط صحرا کی خاک چھاننا پڑتی ہے۔ کہنیوں کے بل چلنا پڑتا ہے۔ اس میں دیانت دار، بے لوث حساس، باشعور۔ بے ریا۔ باضمیر اور کھرا ہونا شرط ہے، جو کہ آج کے عہد میں سب سے دشوار گذار مسئلہ ہے، دشوار اسلئے کہ اول تو ہزار مصلحت کے اس دور میں موضوع کا انتخاب ہی اپنے آپ میں نیک و بد کا مظہر ہے موضوع کا انتخاب ہی مکروہ یا

خوش منظری کا منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ جس طرح آدمی اپنے احباب کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح فنکار بھی اپنے گروہ اپنے رویے اپنے مواد و اسلوب سے پہچانا جاتا ہے۔

خالد محمود بھی بحیثیت مہمان مدیر کے، اداریے کے لئے کوئی دوسرا ادبی و غیرہ ادبی موضوع اختیار کر سکتے تھے مثلاً مابعد جدیدیت، ملٹی کلچر، گلوبلائزیشن، ساختیات، پس ساختیات، تشکیل، وغیرہ وغیرہ، لیکن جس قسم کی سادہ اور شفاف قصباتی آب و ہوا کے زیر اثر ان کی ذہانت، دیانت، اور صلاحیت پروان چڑھی ہے وہ انہیں کسی طرح کی کرتب بازی کی اجازت نہیں دیتی۔ میرا وہ مطلب نہیں کہ اس نوعیت کے موضوعات غیر اہم ہیں بھلا ان موضوعات کی سنجیدگی سے کسے انکار ہے لیکن مجھے یہاں یہ باور کرانا ہے کہ وہ فیشن پرست نہیں ہیں، انکے خمیر میں تصنع نہیں ہے وہ اپنے چہرے پر ادھ کچری مغربی امریکی فکر یا تھیوری سے بوجھل، بے ربط اردو ترجمے کا ماسک لگا کر، ایڑیاں اٹھا کر نمائشی عمل پسند نہیں کرتے ان کی تہذیبی روایت و تربیتی صلاحیت اتنی اتھلی نہیں کہ لخت لخت، جہاں تہاں رسالہ جات میں بکھری ہوئی ترجمہ زدہ فکر سے اپنے مرکز سے اکھڑ جائے۔

ایسی تنقید جو محض تنقید پڑھ کر وجود میں آئی ہو، زیادہ دیر تک اپنے پیروں پر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ تنقید فن پارے کے بطن سے جنم لیتی ہے براہِ راست متن کے مطالعے سے، مشکل یہ ہے کہ ہمارے نام نہاد نقاد فن پارے سے راست طریقے سے تعلق تو پیدا نہیں کرتے سیدھے، سیدھے، مستعار تنقیدی آراؤں یا حوالوں سے قاری کو مرعوب کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ اس سے قاری کا تو کوئی فائدہ ہوتا نہیں خود انکی قدر و قیمت مشکوک ہو جاتی ہے۔ جدیدیت کا دور جواب ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو چکا ہے اس میں جس قدر تنقید لکھی گئی ہے کیا اسکے تناسب سے ادب تخلیق ہوا؟ باستثنا سوائے، مہمل گوئی، کوئی جامع، وقیع اور بصیرت افروز کارنامہ ظہور میں آیا؟ ظاہر ہے ایسی صورتحال سے تنقیدی اصطلاحات تو زبان زد ہو سکتی ہیں لیکن فن؟

جدیدیت کے ہاتھوں، بالخصوص ادب کی حرمت کو کیا کیا نقصانات جھیلنا پڑے ہیں۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ جنہوں نے جدیدیت کے آندھی نما غبار، جھکڑ نما جھٹکوں میں اپنا ادبی وقار اور تخلیقی توازن برقرار رکھا ہے اور واقعتاً ادب کی پاسداری و پاسبانی کی ہے ان میں خالد محمود بھی شامل ہیں موصوف کی غزل کے کچھ اشعار جو کہ موضوع کے اعتبار

سے بر محل ہیں دیکھتے چلئے گا۔

قافلے میں، ہم اس مقام پہ ہیں
جو صدائے جرس سے باہر ہے
میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شئے کی فراوانی نہیں ہے
اجالا نفی ہے جب اس نے کہا
اندھیرے میں تھے ہم نے باور کیا

اسی کے منفرد ساتھ اسلوب کی حامل یہ سطور بھی پڑھئے

"موجودہ ہندوستان میں اردو زبان انہیں مدارس کے دم سے زندہ ہے۔ لیکن یہ دینی مدارس جو اردو کی بقا کے امین ہیں عصری (رائج الوقت) علوم سے ناواقف ہیں اس لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوصف اردو یونیورسٹی میں داخلے کی شرائط پوری کرنے سے قاصر رہیں گے۔ یہ طلباء آئیں گے کہاں سے ہر تعلیم یافتہ شخص جانتا ہے کہ مختلف علوم وفنون کی طرح زبان کی جڑیں بھی یونیورسٹیوں میں نہیں اسکولوں میں پیوست ہوتی ہیں"

محولہ بالا سطریں محض سطریں نہیں ہیں ایک تہہ دار تہذیبی و ثقافتی المیہ ہے۔ ان سطور میں ایک ایسا پریشان کن تفکر مضمر ہے جسے پچاس سالہ تناظر میں صرف محسوس کیا جاسکتا تھا بہر حال یہ بھی اک مجرّد خیال تھا اس خیال کو بھی زبان و محاورہ میسر آگیا۔ اک طرف وجود کے بقا کا مسئلہ دوسری طرف زبان و تہذیب کا تناؤ کریں تو کیا کریں؟ یہ اشعار بھی بر محل ہیں۔

شکوہ کروں کہ شکر کروں آسمان کا
سر پر نہیں گرا مرے، چھپرّ مکان کا
ہراک فیصلہ اس نے بہتر کیا
مجھے آنکھ دی تم کو منظر کیا
رگوں میں خون گردش کر رہا ہے
ستارہ سی وہ پیشانی نہیں ہے

غزل شاعری کی ایک ایسی صنف ہے کہ یہ جس قدر آسان ہے اس قدر مشکل

بھی ہے غزل کے مزاج اور اسکی سرشت کو سمجھنا بڑا دشوار ہے۔ اس میں قوافی اور ردیف کے ساتھ جینا پڑتا ہے۔ فن کے ساتھ فنکار کے تجربے، تخیل، شخصیت، اور فکر کو ضرورتاً پھیلانا اور سمیٹنا پڑتا ہے جسے دوسرے لفظوں میں تخلیقی کرب کہا جاتا ہے اس سے گذرنا پڑتا ہے تجربات کی وسعت اور تخیل کی فراوانی کے برخلاف تخلیقی ضبط، انفرادی جستجو الفاظ کی شناخت، ادبی، جمالیاتی، معاشرتی اجتماعی شعور کا ادراک اسکی لازمی شرط ہے۔ کوری لفاظی، قافیہ پیمائی، فیشن زدگی اسے خوش نہیں آتی۔ غزل جہاں فنکار کو باعزت بناتی ہے وہیں بے آبرو بھی کر سکتی ہے۔

پہلے کسی جگہ میں نے لکھا ہے کہ ہمارے نام نہاد نقادوں کا براہِ راست مغربی فکر و ادب سے رشتہ کٹا پھٹا اور نشتر سا ہے یہی وجہ ہے کہ مستعار فکر کسی جزو کی ہی ترجمانی کرتی ہے کل سے علاقہ نہیں رکھتی۔ وہ اپنے سیاق سے کٹی ہوئی ہے اور سیاق و سباق سے اس بعد کے سبب لاتعلقی کا یہ پس منظر یا موجودہ صورتحال گمراہ کر سکتی ہے خلاء میں معلق کر سکتی ہے چنانچہ میں تو Original فن پارے کے مطالعے کی ہی سفارش کروں گا۔ جدیدیت زدہ افسانوں کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ وہ اپنے سیاق سباق سے کٹے ہوئے ہیں۔

غیر ارضی فضا۔ تجریدی آب و ہوا۔ کردار اور زمان و مکان غائب، اس طرح کا عمل تو غزل کو بھی راس نہیں آتا۔ دراصل غیر ملکی Agenoies نے ہماری تمام صالح تہذیبی و روایتی اقدار اور شاندار ماضی کی تاریخ کو نشانہ بنانے کی سازش کی ہے اور اس میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوئیں لیکن جن سخت جان، اور بامعنی حوالے اور ورثے نے مدافعت و مداخلت کی اس میں اردو کے ساتھ غزل بھی ہے۔ اسی تناظر میں خالد محمود کے کچھ شعر دیکھئے۔

ہر کمند ہوس سے باہر ہے
طائر جاں قفس سے باہر ہے

کل پھر جھلستا دن مجھے درپیش ہے خدا
آنکھوں میں میری ظرفِ سمندر اتار دے

برائے تشنہ لب پانی نہیں ہے
سمندر کا کوئی ثانی نہیں ہے

مضمون کا یہ اقتباس بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

"گذشتہ دو دہائیوں میں حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں نے اردو کے لئے کچھ عملی اقدامات بھی کئے ہیں۔ دہلی میں ترقی اردو بیورو اور صوبوں میں اردو اکیڈمیاں انھیں اقدامات کا حاصل ہیں اردو کے ان اداروں کو رقموں کے ساتھ ساتھ خود مختاری بھی دی گئی ہے۔ اردو والے ان رقموں اور خود مختاری کا صحیح استعمال کرنے سے عاجز اور معذور نظر آتے ہیں۔ جوتوں میں دال بٹنے کی خبریں روزانہ اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ ہر طرف خود غرضی مفاد پرستی اور احباب و اقربا نوازی کے چرچے عام ہیں۔"

بالکل سچ ہے۔ اردو اداروں کا اقتدار جن ہاتھوں کو سونپا جاتا ہے وہ اردو کے فروغ کی سعی کے بجائے حکومت کے برسر اقتدار حلقے کی خوشامد اور خوشنودی حاصل کرنے میں دن رات ایک کر دیتے ہیں "غلامی بنام وفاداری کے مصداق" یہ حضرات سمجھتے ہیں کہ ان کی مسند کا تحفظ ہی اردو کی بقا کا ضامن ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اردو والے جن کو رقم کیساتھ خود مختاری بھی دی جاتی ہے وہ رقم اور خود مختاری کا صحیح استعمال کرنے سے عاجز و معذور ہیں مگر اس کا اعتراف نہیں کرتے اس کے برعکس اپنی معذوری اور نااہلی کو دوسروں کی کوتاہیاں بنا کر پیش کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس تسلسل میں یہ اشعار کس قدر بلیغ اور موزوں ہیں۔

روز اخبار ہم سے کہتا ہے
جھوٹ کو سچ کے باب میں رکھئے

ہر اک زخم پر دل نے آواز دی
مرے محترم، مہرباں، آشنا!

کبھی کہیں سے آجاتا ہے کوئی مسافر بھولا بھٹکا
ویسے تو اک یگ سے خالدؔ سونی ہیں وشواس کی راہیں

O

پروفیسر حنیف کیفی
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔۲۵

سمندر آشنا کا شاعر خالد محمود

(تبصرہ)

غزل کتنی جان دار صنف سخن ہے اور اس میں زمانے کے سرد و گرم میں زندہ رہنے اور اپنے بنیادی کردار قائم رکھتے ہوئے خود کو زمانے کے مطابق ڈھال لینے کی کتنی صلاحیت ہے اس کا اندازہ اس کی تاریخ کے ہر دور اور اس میں رونما ہونے والی مختلف تبدیلیوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے جب جدیدیت نے اردو ادب میں اپنے ر جمائے تو اس نے غزل کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ غزل کہنے والوں کے انداز فکر، طرز احساس اور طریق اظہار سب میں حیرت انگیز تبدیلیاں پیدا ہو گئیں اور اردو غزل ایک ایسے بالکل نئے انقلاب سے آشنا ہوئی جو اس سے پہلے اس کی زندگی کے کسی دور میں نظر نہیں آتا۔ جدیدیت نے بلاشبہ اردو غزل کو فکر و فن کی نئی جہات سے روشناس کر دیا تھا۔ اور شعرا میں انفرادیت کی ایک پر جوش لہر پیدا کر دی تھی جسے اردو شاعری کو عموما اور اردو غزل کو خصوصا اس کی سب سے بڑی دین کہا جاسکتا ہے لیکن جدیدیت کا سب سے زیادہ منفی پہلو یہ تھا کہ ابہام و اہمال کو مقصود بالذات اور شعرا کا اپنی ذات میں گم ہو کر خارجی دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا منتہائے شاعری سمجھ لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ پچھلے چند برسوں میں غزل نے پھر ایک نئی کروٹ لی ہے اور اب وہ بہت زیادہ نکھر اور سنور کر سامنے آئی ہے۔ نہ اب وہ ترسیل کے المیے کا شکار ہے اور نہ خارجی دنیا سے متنفر بے نیاز اس نئی غزل کا خمیر داخلیت و خارجیت کے متناسب امتزاج، لب و لہجہ کی تازگی اور ایک ایسی فنکارانہ رمزیت سے اٹھا ہے جو ناقابل فہم ابہام سے پاک ہے خالد محمود جدیدیت کے اسی صحت مند دور کی پیداوار ہیں۔ ان کی غزل بڑی سنبھلی ہوئی اور

متوازن کیفیات و خصوصیات کی حامل ہے اور یہ توازن اس میں جدیدیت کے صالح احساس اور روایت کے گہرے شعور کے امتزاج نے پیدا کیا ہے جدیدیت سے اپنی غزل کے لئے خالد محمود نے فکر و احساس اور انداز و اسلوب حاصل کیا اور روایت سے پختگی اور توانائی۔ جدیدیت اور روایت کے انہیں عناصر کے امتزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "سمندر آشنا" پہلا نہیں معلوم ہوتا۔ عام طور پر پہلے مجموعہ کلام میں خراب اور کمزور اشعار کی تعداد زیادہ اور اچھے اشعار کی تعداد کم ہوتی ہے لیکن زیر تبصرہ مجموعے کی میزان میں اچھے اشعار کا پلڑا کمزور کے مقابلے میں خاصا بھاری ہے اور یہ اشاریہ ہے اس جوان سال شاعر کے خوش آیند مستقبل اور اس کی شاعری کے روشن امکانات کا۔

خالد محمود اپنی غزل کا خام مواد اپنے گرد و پیش کے ماحول اور روزمرہ زندگی کی معمولی معمولی اشیا سے حاصل کرتے ہیں اور اسے اپنے جذبہ احساس کی آنچ دے کر اس پرکار سادگی کے ساتھ غزل کے سانچے میں ڈھالتے ہیں کہ یہ معمولی اشیا معمولی نہیں رہتیں اور آج کی زندگی کی اہم سچائیاں بن کر ابھرتی ہیں اور جب وہ انہیں طنز لطیف کی چاشنی دے کر پیش کرتے ہیں تو ان کا نقش اور گہرا ہو جاتا ہے۔ نمونے کے طور پر چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے

خدا رکھے امریکہ و روس کو
میاں اپنا اخبار چلنے لگا

ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیور چلنے لگا

میں تجھ سے بڑھ کر سیاسی شعور رکھتا ہوں
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

کوٹھیوں سے معذرت کے ساتھ کیا معلوم تھا
دھوپ میں جھلسے ہوئے بھی آدمی کہلائیں گے

مندر کی گھنٹیوں سے فضا گونجنے لگی
شاید ہو اہے وقت سحر کی اذان کا

اس گھر کا ٹیلیفون ابھی جاگ جائے گا
صاحب کو لے کے چل دیا دفتر کا آدمی

خنجر چلا کے مجھ پہ بہت غم زدہ ہوا
بھائی کے ہر سلوک میں شدت لہو کی تھی

جس میں خالی ہے کرائے کا مکان
اس گلی میں نہیں رہتا کوئی

گرم ہوا کے جھونکے آکر چونکا چونکا دیتے ہیں
منا کیسا ہانپ رہا ہے آری نندیا جاری دھوپ

فن فنکار کی شخصیت کا مکمل آئینہ ہوتا ہے، اس کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی

ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فن پر فنکار کی شخصیت کی پر چھائیاں ضرور پڑتی ہیں۔ خالد محمود کی غزل میں بھی ان کی شخصیت کی مختلف جھلکیاں نظر آتی ہیں ان کی بے تکلفی و بے باکی ان کا خلق و مروت ان کی قناعت پسندی ان کا معلمی کا پیشہ اور ان کی شخصیت پر اس کے ناگزیر اثرات ان سب کا عکس ان کے اشعار میں جھلکتا ہے۔ ان کے تجربات و مشاہدات، جذبات و محسوسات ان کے اپنے ہیں اور اس لئے ان کے اشعار دوسروں کے خیالات کی جگالی نہیں معلوم ہوتے۔ یہ چند اشعار مثالاً پیش کئے جا سکتے ہیں۔

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں کسی شے کی فراوانی نہیں ہے
ترے ساتھ چلنے کی عادت نہیں ہماری نہ کر آزمائش ہوا
شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا مری طرح سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا
ہر قدم ٹھوکریں کھا کھا کے گرا میں مگر چل نہ سکا آہستہ
تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں
گر یہی بے فرصتی قائم رہی تو دیکھنا ہم بھی خالد اپنے گھر میں اجنبی بن جائیں گے
لڑکوں کو نقل کرنے سے ہے روکنا مجھے پھر آگیا ہے وقت مرے امتحان کا
شاید کہ مر گیا مرے اندر کا آدمی آنکھیں دکھا رہا ہے برابر کا آدمی

ادبی دیانت داری کے خلاف اور خود شاعر کے حق میں مضر ہوگا اگر مجموعے کی چند معمولی خامیوں کی طرف توجہ نہ دلائی جائے "سمندر آشنا" میں خالد محمود کی شاعری کے ابتدائی دور کی دو ایک کمزور غزلیں بھی شامل ہیں جو نہ شامل ہوتیں تو بہتر ہوتا۔ ہر چند کہ مجموعہ کلام میں ہر دور کے منتخب کلام کی شمولیت اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ اس سے شاعر کے تدریجی ارتقا کا اندازہ ہو جاتا ہے، اس کے باوجود اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ منتخب کلام ہی شامل ہو اور کمزور کلام کو انتخاب سے خارج کر دیا جائے۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا علم ہے کہ خالد محمود نے انتخاب میں خاصی سختی سے کام لیا ہے لیکن پھر بھی ان سے کچھ چوک ہو گئی۔

مجھے امید ہے کہ "سمندر آشنا" کی وہ تحسین و قدر شناسی کی جائے گی جس کی وہ مستحق ہے اور اسی طرح اس کے خالق کی ایسی حوصلہ افزائی کی جائے گی کہ وہ نقش ثانی کو نقش اول سے ہر اعتبار سے بہتر بنا کر پیش کر سکے۔

اقبال مسعود
روزنامہ "آفتاب جدید"
اقبال میدان، بھوپال

سمندر آشنا

(تبصرہ)

"سمندر آشنا" کا اولین نقش جو دل پر جمتا ہے وہ اس کے حسن ظاہری کا نقش ہے۔ کاغذی پشتے میں ایسی طرحدار کتاب مکتبہ جامعہ لمٹیڈ کا ہی حصہ ہے۔ گرد پوش پر آبی بیلیں سمندر کی گہرائی سے سطح کی جانب اپنے ہاتھ بلند کر رہی ہیں۔ اس بامعنی ٹائٹل اور اس کے حسن ظاہری کے نقش سے بصارت کو الجھتا چھوڑ کر نظر بصیرت جمال باطن پر مرکوز ہوتی ہے تو مایوس نہیں لوٹتی پہلی ہی قرات میں احساس ہو جاتا ہے کہ کتاب کی آرائش عروس کم رو کی زیبائش نہ تھی بلکہ ایک نئی تازہ آواز اور منفرد لہجے سے ملاقات ہوتی ہے۔

خالد محمود ان نئے شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے محض جدت اور ندرت کی خاطر شعریت کا خون نہیں کیا اور نہ ہی غزل کی روایت سے یکسر منقطع ہونے کی کوشش کی ہے بلکہ روایت کے ہی پس منظر میں شعریت اور تغزل کے تازہ امکانات دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے انہوں نے لفظ و معنی کے نئے رشتوں کی تلاش میں نئے شعری تجربے کی ان دیکھی دنیاؤں میں دور کا سفر نہیں کیا۔ بنیادی طور پر وہ کسی خیالی تجربے کے نہیں بلکہ لہجے اور اس کی معنی آفرینی کے شاعر ہیں۔ ان کی شعری معنویت کی تکمیل بھی الفاظ کے لغوی استعمال سے زیادہ لہجے کی افتادگی سے ہوتی ہے۔ ان کا شعری آہنگ الفاظ کی جھنکار سے زیادہ شدید احساسات اور تلخ تجربے کے نکیلے تیز لہجے سے ابھرا ہے۔ خالد کی غزل کا وصف خاص اور اس کا وہ ماحول اور فضا ہے جس کی تعمیر غم زیست، غم روزگار اور کسی حد تک غم محبوب سے مل کر ہوئی ہے۔ آسان سبک الفاظ اور چھوٹی بحروں کا استعمال جو دلالت کے بجائے اشارت کا اظہار ہے، خالد محمود کی غزل کا خاص وصف ہے۔

سمندر آشنا کی شاعری خیال کی لطافت اور جذبے کی تہذیب و طہارت سے عبارت

ہے یہ ہمارے عہد کے ایک ذہین اور حساس شاعر کی آواز ہے جو شاعری کو اظہار جذبات کا ہی نہیں تہذیب کا وسیلہ بھی خیال کرتا ہے۔ احساس و شعور کی یہی شائستگی ہے جو ان کے لہجے میں گھل مل کر بہتر شاعری کے امکان روشن کرتی ہے مگر اس میں ان کے عصری تجربات بھی شامل کرنا از بس ضروری ہے ورنہ خالد کی شاعری کی اصل روح مجروح ہو جائے گی۔

اک دستِ ناز یاد کا شانہ دبا گیا دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
گھر ہیں سب شیشے ہوئے جاتے ہیں "پتھر آشنا" خوبیٔ قسمت سے ہیں اتنے میسر آشنا

اس مجموعے کی ایک غزل کا مطلع ہے۔

سچ کہا ہے یار دلی دور ہے راستہ پر خار دلی دور ہے

یہ ساری غزل معنی خیز اور پر اثر ہے اور آرزوؤں کی ناکامی، خوابوں کی شکست اور سفر شوق کی بے حاصلی کا نوحہ ہے۔ سفر شوق کی بے حاصلی کا یہ احساس خالدؔ کی ساری شاعری پر چھایا ہوا ہے اور زندگی کے تجربے کی معنویت کو مکمل کرتا ہے۔ یہ تجربہ زندگی کی قریبی اور فوری حقیقتوں کو نظر انداز نہیں کرتا بلکہ انہیں حقیقتوں سے زندگی کے معنی اخذ کرتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دکھ درد گھروں میں سامان کی فراوانی کا نہ ہونا۔ سر پر چھت کا سلامت رہنا۔ ہوا کے ساتھ نہ چلنا۔ راہ چلتے رک جانا محرومیاں جو عام طور پر ہمارے لاشعور کی دھندلاہٹوں میں تیرتی رہتی ہیں سمندر آشنا کے شاعر کی زبان میں شعری صداقتیں بن گئی ہیں ان کے اسلوب غزل گوئی میں بظاہر کسی شعوری رہنما کا اندازہ نہیں ہوتا لیکن ان کے لہجے کا پردہ اٹھا کر دیکھا جائے تو سادگی کے بعد بھی صناعی اور پرکاری نظر آجاتی ہے ذرا ان اشعار پر توجہ فرمایئے۔

مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں تمہیں اک آئینہ ہے اور. تم ہو
وہ برس دو برس سے باہر ہے کوئی شے گھر کی خوش نہیں آتی
نوازش، نوازش، نوازش ہوا میں گنجان شہروں کا مارا ہوا
کہ دیوار دیوار چلنے لگا ابھی دھوپ خالد پہ آئی نہ تھی

"سمندر آشنا" کو کہیں سے بھی پلٹ کر دیکھئے ہر صفحے پر آپ کو اچھے شعر مل جائیں گے اور یہ بات خود شاعر کے درخشاں مستقبل کی ضمانت اور اردو شاعری کے میدان میں ایک نئی اور پر کشش آواز کے وجود کی بشارت ہے۔

پروفیسر اختر الواسع
صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر خالد محمود......ایک اچھا استاد

ذاکر صاحب نے کہا تھا معلم کی کتاب زندگی پر علم نہیں بلکہ محبت کا عنوان ہوتا ہے۔ جامعہ کی تعلیمی بستی میں ایسے ان گنت اساتذہ رہے ہیں جو کہ ذاکر صاحب کے اس قول کی چلتی پھرتی تصاویر تھے۔ اب جب کہ زندگی کی ہر سرگرمی پر تجارتی نقطۂ نظر کی حکمرانی کے سائے بڑھتے چلے جارہے ہیں اگر آپ کو ایسے کچھ اساتذہ نظر آجائیں جن کا رویہ پیشہ ورانہ نہ ہو کر مشفقانہ ہو تو کچھ عجوبہ سا لگتا ہے۔ لیکن جیسا کہ کہتے ہیں کہ دنیا کبھی نیک لوگوں سے خالی نہیں ہوتی اسی طرح تعلیمی ادارے اور بستیاں کبھی اچھے اساتذہ سے یکسر خالی نہیں ہوتیں۔ ڈاکٹر خالد محمود بھی ایسے ہی اچھے اساتذہ میں سے ایک ہیں۔

ایک استاذ کی حیثیت سے خالد محمود سے میری شناسائی کا رشتہ دو دہائیوں پر محیط ہے۔ انہیں میں نے ہمیشہ اپنے طالب علموں کے لئے سراسر شفیق اور مہربان سرپرست کے طور پر دیکھا۔ وہ ایک طویل عرصے تک جامعہ سینئر سیکنڈری اسکول میں ہاسٹل کے وارڈن رہے۔ لیکن ایسے سخت نگراں کہ ہر وقت اس فکر میں سرگرداں کہ ان کے کسی طالب علم کے کردار پر کوئی حرف نہ آئے اور وہ اسکول کی بدنامی کا سبب نہ بنے۔ لیکن یہ سب انہوں نے ڈنڈے کے زور پر نہیں کیا بلکہ ایسی محبت اور پیار کے ساتھ کیا کہ طالب علموں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد بنالیا۔ طالب علموں سے جس کردار کی توقع کی پہلے اس کو خود اپنانے کی کوشش کی۔ مثال کے طور پر بحیثیت اتالیق اور استاد ہمیشہ ان کی یہ خواہش رہی کہ ان کے طالب علم سگریٹ نوشی کی بری عادت نہ اختیار کریں اس لئے انہوں نے ہمیشہ اس کا التزام کیا کہ وہ اپنے کسی مہمان کے لئے بھی کسی طالب علم سے سگریٹ نہ منگائیں۔

ہاسٹل میں ان کے زیر نگرانی ایک اچھی خاصی تعداد طالب علموں کی رہتی تھی اور

وہ بھی وہیں رہتے تھے اس لیے جب وہ کوئی نجی اور خانگی تقریب بھی کرتے تو اپنے ان تمام طالب علموں کو ضرور مدعو کرتے۔ اس طرح اپنی خوشیوں میں انہیں شامل کر کے خود بھی خوش ہوتے اور طالب علموں کی بھی گھر والوں سے دوری کے احساس کو کم کر دیتے تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس میں وہ خاصے زیر بار ہوتے لیکن سود وزیاں سے بے نیاز ایک اچھے استاد کے طور پر انہوں نے کبھی اس کا شکوہ نہیں کیا۔

کہتے ہیں ایک اچھا استاد کبھی کسی سے نہیں ڈرتا بلکہ وہ اگر فکر مند ہوتا ہے تو اپنے طالب علموں کی طرف سے۔ اس لئے کہ اگر وہ نظم و ضبط کا خود پابند نہیں ہوگا، صحیح طور پر سبق یا اپنے موضوع کی پوری طرح تیار کر کے نہیں آئے گا تو اس کے طالب علموں کی نظر میں اس کی علمی واخلاقی حیثیت گر جائے گی اور یہ چیز کسی استاد کے ئے موت سے بدتر ہوتی ہے۔ اس لئے خالد محمود نے اس کا بھی ہمیشہ خیال رکھا اور پوری لگن، کامل تیاری کے ساتھ ہمیشہ کلاس لی۔ طالب علموں میں جستجو اور شوق پیدا کرنے کے لئے اپنی کلاسوں میں ہمیشہ ایک مکالمے کا ماحول پیدا کیا، جہاں طالب علم کو نہ صرف سوال پوچھنے کی پوری آزادی دی بلکہ ان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لئے ایک ہمدردانہ رویہ اپنایا۔

خالد محمود کو اردو زبان وادب سے عشق ہے اور انہوں نے معلمی کا راستہ اضطراری طور پر نہیں بلکہ پورے ہوش و حواس کے ساتھ اختیار کیا اس لئے انہوں نے عام طور پر انتظامی ذمہ داریوں کو کبھی درس و تدریس میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ ایک استاد کا وصف یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ صرف کلاس روم میں ہی استاد نہیں ہوتا بلکہ جہاں بھی، جب بھی آپ اس سے علمی طور پر استفادہ کرنا چاہیں وہ اس کے لئے آمادہ رہتا ہے۔ خالد محمود کا معاملہ اور معمول بھی یہی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ اردو زبان کی تعلیم کے لئے طالب علموں کو تلاش کرتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ کسی ساتھی استاد کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس کے بچوں نے اردو نہیں پڑھی ہے تو خالد ــــــ محمود بن کر سترہ حملے کرنے کو اس طرح تیار ہو جاتے ہیں کہ ساتھی استاد اور اس کے اردو سے نابلد بچے سپر انداز ہونے ہی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

ایک اچھے استاد کی طرح خالد محمود کو اپنے طالب علموں کی ذہنی سطح اور علمی و درسی ضرورتوں کا پورا احساس رہتا ہے اور شاید اسی لئے اردو میں ابتدائی درجات سے ثانوی

کی سطح تک نصابت تیار کرنے کے لئے جتنے بھی ورکشاپ اس ملک میں ہوئے ہیں خالد محمود ان میں ہمیشہ "لازمی مضمون" کی طرح شامل رہے ہیں۔

خالد محمود یوں تو ایک خوش فکر شاعر، ایک اچھے انشاء پرداز، کامیاب محقق، ناقد اور کھرے (کھرّے نہیں) دوست ہیں، لیکن جو چیز ہمیشہ خالد محمود کے لئے باعث امتیاز رہے گی وہ یہ کہ وہ ایک بہت اچھے استاد ہیں، ایسا استاد جس کی پہچان اس کی کلاہ علم سے نہیں بلکہ محبت کے اس ہالے سے ہوتی ہے جو ایک اچھے استاد کی اصل شناخت ہوتا ہے۔

○

ڈاکٹر سیفی سرونجی کی مطبوعات

۱۔	روشن الاؤ	شعری
۲۔	ایک لمحہ ایک خواب	شعری
۳۔	جنگل کاٹنے دھوپ	دیوناگری
۴۔	رنگ اور خوشبو	دیوناگری
۵۔	ہم رہ گئے اکیلے	کہانیاں
۶۔	ہم بھی ایڈیٹر بن گئے	انشائیے
۷۔	رنگوں کا امتزاج	مضامین
۸۔	سیفی سرونجی ایک مطالعہ	مرتّب انیس دہلوی
۹۔	خالد محمود شخصیت اور فن	خاص شمارہ
۱۰۔	ناؤ سمندر موجیں	(زیر طبع)
۱۱۔	جگن ناتھ آزاد حیات و فن	(زیر طبع)
۱۲۔	گنبدِ خضرا	(زیر طبع)
۱۳۔	نئی غزل نئے امکانات	(زیر طبع)
۱۴۔	ندا فاضلی حیات و شخصیت	(زیر طبع)

۱۵۔ مدھیہ پردیش کے شاعروں اور ادیبوں کی جمبئی میں ادبی خدمات۔ (زیر طبع)

رابطہ: رہبر کارنر ترکمان گیٹ دہلی۔ 110006

سیفی لائبریری ڈاکٹر سیفی سرونجی، سرونج (مدھیہ پردیش)۔ 464228

پروفیسر محمد صابرین
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ
نئی دہلی

ایک ماہر تعلیم

"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا" غالب نے آدمی اور انسان میں بجا طور پر فرق کیا ہے۔ طالب علمی کے زمانے میں غالب کے شعر کا مطلب جسکا مصرعہ اوپر لکھا گیا ہے استادوں نے ضرور سمجھایا تھا مگر کبھی آدمی اور انسان کے باہمی فرق کے مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ یہ فرق ہماری سمجھ میں خود بخود اس وقت آیا جب 1980 میں ہماری دوستی کا رشتہ ایک ایسے شخص سے استوار ہوا جس نے سرونج، مدھیہ پردیش میں احمد شاہ خاں عرف منشی عبید خاں کے گھر میں آنکھ کھولی اور سرونجی پٹھان ہونے کا شرف حاصل کیا۔ دراز قد، گندمی رنگ، روشن آنکھیں، کشادہ پیشانی، کلین شیو کتابی چہرہ جس پر اکثر خوشی نمودار اور بالوں کو خضابی رونق سے پابندی کے ساتھ آراستہ کرنے کا شوق اس حد تک کہ اس سے غفلت اور Compromese قطعی ناممکن۔ عموماً خوش نما لباس زیب تن کئے ہوئے اور سردی کے موسم میں اکثر سر پر گرم ہیڈ کچھ اس طرح سجائے ہوئے گویا کوئی سخت مزاج فوجی تعطیل پر ہو۔ پڑھنے پڑھانے کا شوق اور اسلامی تعلیم سے حد درجہ دلچسپی۔ والدین اور بزرگوں سے والہانہ عقیدت رکھنے والے اور ساتھیوں اور دوستوں سے بے حد محبت کرنے والے اس شریف النفس، مہذب اور متواضع شخص کا نام ہے ڈاکٹر خالد محمود۔

ڈاکٹر خالد محمود نے ایم اے (اردو) بی ایڈ۔ پی ایچ ڈی نیز ادیب کامل، منشی فاضل، فاضل دینیات مع چند تعلیمی و تربیتی اور تجرباتی کورسز میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ تعلیم کا یہ سفر سرونج اور بھوپال سے ہوتا ہوا دہلی آکر مکمل ہوا۔ سن 1976 میں دہلی میں وہ سب سے پہلے جامعہ سینیر سیکنڈری اسکول میں اردو کے پی جی ٹی مقرر ہوئے۔ اسکول میں بوائز ہوسٹل کی وارڈن شپ بھی انہیں سونپی گئی۔ وہیں اچھا خاصا کشادہ مکان بھی ملا۔ اس وقت متعدد مرتبہ ان کے دولت خانے پر جانے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا یہ گیا کہ وہ مہمان نوازی کے

فرائض بھی بخوبی انجام دیتے اور اپنے طالب علموں کی شکایتوں اور پریشانیوں کو بھی بغور سنتے تھے اور ان کا فوری حل تلاش کرنے کی بھی کوشش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر دلعزیزی جابہ جا دکھائی دیتی تھی۔

جیسا کہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ ڈاکٹر خالد محمود سرونج کی علمی اور مذہبی سرزمین میں پروان چڑھے تھے اور وہیں سے اپنا تعلیمی سفر طے کرتے ہوئے دہلی تک پہنچے تھے۔ دہلی کو مزید حصول تعلیم کے علاوہ حصول روزگار کے لئے بھی وہ منتخب کر چکے تھے لہذا آج بھی یہیں موجود ہیں اور اب شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں گزشتہ کئی برسوں سے بحیثیت ریڈر درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

میں ذاتی طور پر ڈاکٹر خالد محمود کا مداح ہوں، خیر خواہ ہوں، حمایتی ہوں مگر ان کا بے جا طرفدار قطعی نہیں ہوں۔ ان کی ذات کچھ ایسی خوبیوں کی مالک ہے کہ کوئی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کے برعکس وہ جس پر مرتے ہیں بقول غالبؔ اسے مار رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں بھلا کون ان کے دام محبت سے بچ سکتا ہے۔ وہ ہمہ رنگ شخصیت کے مالک ہیں۔ ذہانت ان میں قدرت نے ودیعت کی ہے اور مطالعے کی وسعت ان کی عادت میں شمار ہے۔ کفایت شعاری کا خانہ ان کے یہاں نہیں ملتا۔ بہت خرچیلے ہیں، فراخدل ہیں مگر فضول خرچی سے احتراز کرتے ہیں۔ مہمان بننے کی بجائے انہیں میزبان بننا زیادہ پسند ہے۔ بعض اوقات تو خود میزبان کو ان کا مہمان بننے پر مجبور دیکھا گیا ہے دوسروں کے غم اور خوشی میں برابر کے شریک، اخلاص، ایثار، محبت، انسان دوستی اور فراخدلی کے قائل۔ انہوں نے حق گوئی بے باکی اور اصول پرستی کا دامن بھی کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

ڈاکٹر خالد محمود ایک محنتی، ذہین اور مشفق استاد تو ہیں ہی۔ انہوں نے شاعری، تنقید و تحقیق، خاکے اور انشائیے کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ناول اور درسی کتابوں کے ترجمے بھی کئے ہیں۔ بعض درسی کتابوں کی تالیف میں بھی ان کا اشتراک رہا ہے۔ ان کے طبع زاد شعری مجموعوں میں "سمندر آشنا" اور "شعر چراغ" کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ان کے نثری شاہکاروں میں "اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ" بھی شائع ہو چکا ہے۔ خاکوں اور انشائیوں کا مجموعہ "شگفتگی دل کی" اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ "سعی حاصل" زیر طبع ہیں۔ ان کا طبعی رجحان شاعری اور بالخصوص غزل کی طرف رہا ہے کسی بھی شاعر کے کلام

میں سے پسندیدہ اشعار کا انتخاب دراصل اس کے "رنگ سخن" کے پیش نظر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر خالد محمود کے اکثر اشعار کسی نہ کسی شخص کے مذاق پر ضرور پورے اترتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے کلام پر تنقیدی نظر کا موقع تو نہیں ہے البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی داستان حیات، تجربات، تصورات، تخیلات اور احساسات وغیرہ ان کے کلام میں جابجا نظر آتے ہیں۔ ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن کی صداقت پر شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ان کی ایک غزل جس کا مطلع ہے۔

ہر شاعر کے پکے دشمن اک غالبؔ اک میرؔ
گھر میں رکھیں غزلوں کا فن اک غالبؔ ایک میرؔ

ایسی ہے جس سے غالبؔ اور میرؔ کی بے پناہ عظمت کا اظہار سچے پیرائے میں ڈاکٹر خالد محمود کی زبانی ہوتا ہے۔ یہ غزل صداقت، تخیل، ندرت اور انداز بیان کی وجہ سے بہت مشہور ہوئی ہے۔ بعض شعری نشستوں کے موقعوں پر اکثر اس غزل کی فرمائش بار بار ہوتی رہی ہے اور خالد محمود ہیں کہ ہر مرتبہ اس غزل کو ایک نئے حوصلے اور نئے انداز سے پیش کرتے رہے ہیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے وابستگی کے بعد رفتہ رفتہ ڈاکٹر خالد محمود کی دلچسپی تعلیم کے مختلف میدانوں میں بڑھتی گئی۔ یہ دلچسپی اردو زبان وادب کی تعلیم اردو نصاب کے مسائل سے اس حد تک بڑھ گئی کہ اگر انہیں ایک ادیب یا شاعر سے زیادہ ایک ماہر تعلیم کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، نئی دہلی حکومت ہند کا ایک ایسا خود مختار قومی تعلیمی ادارہ ہے جسے ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں ایک خاص اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے۔ یہ ادارہ ملک میں اسکولوں کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لئے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ اسکول کی سطح پر تعلیمی پالیسی کے نفوذ کے علاوہ اہم تعلیمی امور اور منصوبوں کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے اس سلسلے میں وزارت تعلیم ہند کو وقتاً فوقتاً اپنے مشوروں سے نوازتا رہتا ہے اس ادارے کا تعلق ملک کے تمام تعلیمی اداروں اور بورڈوں سے ہے اور تعلیمی امور میں اسے ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے

تحقیقاتی اور تربیتی منصوبوں کے علاوہ این سی ای آر ٹی کا ایک بڑا کام یہ ہے کہ وہ ملک گیر پیمانے پر اسکول کی مکمل تعلیم کے لئے ماڈل نصابات مہیا کراتی ہے جس کی بنیاد پر

تمام صوبے اپنے تعلیمی پروگرام اور خصوصاً تعلیمی نصابات کو ترتیب دیتے رہے ہیں۔ یہ قومی تعلیمی ادارہ سائنسی اور سماجی علوم کے علاوہ ہندی، اردو اور انگریزی زبانوں میں بھی اسکولوں کے لئے مختلف مضامین سے متعلق درسی کتابیں، مطالعے کے لئے معاون کتابیں، مشقی کتابیں اور بچوں کی عام دلچسپی سے متعلق کتابیں شائع کرتا ہے۔

جہاں تک اسکولوں میں اردو زبان و ادب کی تعلیم سے متعلق درسی کتابوں کی فراہمی کا مسئلہ ہے آزادی کے بعد اس نے مزید افسوسناک صورت اختیار کرلی ہے۔ ان کتابوں کی ترتیب و تدوین کا کام یا تو ختم ہو گیا یا پھر ان کی تیاری کا کام ایسے لوگوں کے ہاتھ لگ گیا جو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کے اصول اور نصابات کے جدید تقاضوں سے واقف نہیں تھے۔ آزادی کے بعد جیسے جیسے ہندوستان میں جمہوری اقدار کی جڑیں مضبوط ہوتی گئیں اور قومی اتحاد کا شعور پیدا ہونے لگا۔ سرکاری سطح پر اردو کی اہمیت بھی محسوس کی جانے لگی۔ ملک کے تعلیمی منصوبوں میں جدید ہندوستانی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کی ترقی و ترویج کا بھی خیال رکھا گیا۔ اس دوران اردو کی بقا اور مدارس میں اس کی تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے نجی طور پر بھی بعض انجمنوں اور اداروں نے صوبائی اور علاقائی ضرورتوں کے تحت اردو میں نصابات اور درسی کتابیں تیار کی ہیں۔ تعلیمی اور لسانی نقطہ نظر سے ان میں بعض کتابیں اچھی ہیں مگر وہ موجودہ زمانے کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتیں۔ ان کتابوں کو محض صوبائی ضرورتوں کے پیش نظر ترتیب دیا گیا ہے۔ ان کتابوں کا معیار اور انداز باہم مختلف ہے۔ بھدی چھپائی خراب کتابت۔ گھٹیا کاغذ، بدصورت سرورق، غرض کہ بدزیب آرائشی اندازان کتابوں میں مشترکہ طور پر پایا جاتا ہے۔ نئی قومی تعلیمی پالیسی کے تحت زبانوں کی تعلیم و تدریس کے لئے قومی یکجہتی اور جمہوری نقطہ نظر کی بنیادوں پر یکساں نصابات کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔ اردو زبان و ادب کی اہمیت کے پیش نظر پہلی مرتبہ غالباً 1982 میں این سی ای آر ٹی نے اسکولوں میں اردو کی تعلیم و تدریس کے لئے قومی سطح پر ایک مخصوص منصوبے کے تحت درجہ اول سے درجہ بارہ تک کے لئے درسی کتابوں کی ترتیب و تدوین اور ان کی طباعت و اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ نصابات اور درسی کتابوں کے سلسلے میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ ہماری موجودہ زمانے کی تعلیمی ضرورتوں کے مطابق ہوں جن کے ذریعے بچوں میں خود اعتمادی، احساس ذمہ داری، حب الوطنی، قومی یکجہتی، وطن پرستی، سچائی

بھ

اور اخلاق و محبت کا جذبہ پیدا ہو سکے۔ اس کے علاوہ انسانی، اخلاقی، تہذیبی اور قومی اقدار کو بھی ان کتابوں میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ آٹھویں درجے تک کی درسی کتابوں کے اسباق اور جملہ انتخابات درجے کے معیار، بچوں کی دلچسپی اور ان کی عمر کے مطابق رکھے گئے ہیں۔ ان کتابوں کو رنگین تصاویر سے مزین کیا گیا ہے۔ انہیں کچھ اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ ان کے مطالعے کے بعد یقیناً بچے مختلف معیار کے مطابق اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار پر قدرت حاصل کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں زبان کی واقفیت، معیاری اردو بولنا پڑھنا اور لکھنا جملے کی ساخت، اجزائے کلام، بنیادی لفظوں کے معنی صحت املا، صحت تلفظ، مطالب کو سمجھنے کی صلاحیت بھی طالب علموں میں پیدا کی جا سکتی ہے۔

نویں سے بارھویں جماعت تک کے طالب علموں کے لئے جو درسی کتابیں تیار کی گئی ہیں ان کے نثری اور شعری انتخابات کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ان کتابوں کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہر سبق سے پیشتر ادیب یا شاعر پر ایک مختصر مگر جامع سوانحی نوٹ کے ساتھ اس کے طرز تحریر یا رنگ کلام کی خصوصیات وضاحت سے تحریر کی گئی ہیں تاکہ طالب علموں میں علم زبان کے ساتھ ساتھ اسلوب تحریر کو پہچاننے اور سمجھنے کی صلاحیت بھی پیدا کی جا سکے۔ اسباق کے اختتام پر جس انداز سے معنی اور اشارے، غور کرنے کی بات اور مشق اور مطالعے کی ترکیب پیش کی ہے اس سے یقیناً ادب و شعر کے منتخب نمونوں کو بہ آسانی اور بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ اہم نکات کو اچھی طرح ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ مشق کا یہ طریقہ طالب علموں ہی کے لئے نہیں بلکہ اردو کے اساتذہ کے لئے بھی کافی اہمیت کا حامل ہے مجموعی طور پر ان درسی کتابوں میں اصناف ادب کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ اردو کے جدید ادبی رجحان سے بھی طلبہ کو واقف کرایا گیا ہے۔ املا اور تلفظ کی صحت پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ یہ کتابیں "اردو کی نئی کتاب" کے نام سے اب سے برسوں پہلے منظر عام پر آچکی ہیں۔ دہلی سینٹرل بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن اور صوبائی سطح پر یہ درسی کتابیں بعض تعلیمی بورڈس کے نصابات میں شامل بھی کی جا چکی ہیں۔

متذکرہ بالا مختصر پس منظر کی روشنی میں اردو کی یہ درسی کتابیں یقیناً ایک مخصوص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی تکمیل میں ملک گیر پیمانے پر پرائمری سے لے کر اعلا ثانوی سطح کے اردو اساتذہ، کالج سے لے کر یونیورسٹی سطح کے اردو لیکچرر، ریڈر اور پروفیسر، ماہرین

لسانیات، ماہرین تعلیم، بعض تعلیمی اداروں کے ڈائریکٹر، ادیب و شاعر اور بعض مولفین نے حصہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خالد محمود کی شرکت، تعاون اور مشورے قابل ستائش ہیں۔ وہ اس اعتبار سے بھی یکتا ہیں کہ انہوں نے کئی برسوں پر مشتمل منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں ابتدا سے آخیر تک اپنی شرکت اور تعاون سے نوازا ہے۔ ان درسی کتابوں کی مکمل تیاری کے سلسلے میں پورے ہندوستان کے مختلف تعلیمی اداروں میں بے شمار ورکشاپ این سی ای آر ٹی کی جانب سے منعقد کئے گئے جن میں شاید ہی کوئی ورکشاپ ایسا ہو جس میں ڈاکٹر خالد محمود نے شرکت نہ کی ہو۔ پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ ان کتابوں کی تکمیل میں ہمارے ساتھ کوشاں رہے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ وہ اردو کی درسی کتب برائے جماعت گیارہ اور بارہ میں باشتراک مولف کی حیثیت سے بھی شامل ہیں۔

این سی ای آر ٹی کی جانب سے ہی غالباً 1989 میں ایک دوسرا منصوبہ اردو بحیثیت ثانوی اور تیسری زبان پڑھانے کے لیے درسی کتابوں کی تیاری کے سلسلے میں شروع کیا گیا تھا۔ اس منصوبے کے تحت درجہ چھے سے درجہ دس تک درسی کتابیں اردو کی تعلیم بحیثیت ثانوی زبان کے اور درجہ سات سے درجہ دس تک درسی کتابیں اردو بحیثیت تیسری زبان کی تعلیم کے لئے تیار کی جانی تھیں۔ تیاری کے بعد ان سبھی کتابوں کو آخری شکل دی جاچکی ہے۔ ان کتابوں کے مسودوں کا جائزہ لینے اور انہیں آخری شکل دینے کا کام بھی ملک کے مختلف تعلیمی اداروں میں ورکشاپ منعقد کر کے مکمل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں بھی ڈاکٹر خالد محمود نے پوری لگن اور فکر کے ساتھ ملک کے گوشے گوشے میں پہنچ کر تمام شرکائے ورکشاپ اور ماہرین تعلیم کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔

تقریباً دو برس قبل این سی ای آر ٹی نے ثانوی اور اعلا ثانوی سطح کے طالب علموں کی ضرورت کے پیش نظر "اردو قواعد" کی کتاب اور اعلا ثانوی سطح کے طالب علموں کی ضرورت کے تحت "تاریخ ادب اردو" کی کتاب مرتب کرنے کا ایک اہم منصوبہ بنایا تھا۔ اردو قواعد کی کتاب تو اسی سال مکمل ہونے کی توقع ہے اور "تاریخ ادب اردو" کی کتاب اپنی تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ ان دونوں کتابوں کی ترتیب کے سلسلے میں ملک کے مختلف صوبوں کے تعلیمی اداروں میں جتنے ورکشاپ اب تک منعقد ہو چکے ہیں ان میں ڈاکٹر خالد محمود کا رول قابل ذکر ہے "تاریخ ادب اردو" کی کتاب میں تو وہ باشتراک مولفین کی فہرست میں بھی شامل ہیں۔

این سی ای آر ٹی کے علاوہ ڈاکٹر خالد محمود نیشنل اوپن اسکول، نئی دہلی، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی نئی دہلی میں بھی بعض تعلیمی منصوبوں کے تحت اردو میں درسی کتابوں کی تالیف میں شامل رہے ہیں۔ مختلف ادبی اور دیگر رسائل میں ان کے بے شمار مضامین، تبصرے، خاکے انشائیے، مہمان اداریے، انٹر ویوز شائع ہوچکے ہیں۔ شعری تخلیقات کی اشاعت بھی عمل میں آئی ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی پروگراموں میں بھی شریک رہے ہیں بے شمار کانفرنسیں، سیمینار، ورکشاپ اور مشاعروں میں بھی شرکت کی ہے، تعلیمی لیکچرز دیئے ہیں اور نثری و شعری نشستوں میں بھی اکثر و بیشتر حصہ لیا ہے۔ لسانی، ادبی، علمی، نصابی، مذہبی، ثقافتی و تہذیبی سے لے کر میزبانی تک کون سی ایسی سرگرمی ہے جس میں ڈاکٹر خالد محمود نے اپنی دلچسپی کا اظہار نہ کیا ہو اور ان تمام میدانوں میں عملی طور پر کارہائے نمایاں انجام نہ دئے ہوں۔ ان کی ان خدمات کو فراموش کرنا آسان نہیں ہے۔ جن کا ذکر دوستوں، رشتہ داروں اور ساتھیوں کی زبان پر اکثر رہتا ہے اور جن کی وجہ سے وہ ہمیشہ یاد کئے جاتے ہیں۔ خدا انہیں مزید توفیق دے۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

O

محمد لئیق اللہ خان
جدّہ (سعودی عربیہ)

زبانیں حکومتوں کے بھروسے پر زندہ نہیں رہتیں

(ڈاکٹر خالد محمود سے ایک ملاقات)

ڈاکٹر خالد محمود کا شمار ہندوستان میں اردو زبان و ادب کی نئی نسل کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے مالوہ کی مردم خیز سرزمین کی بستی سرونج میں آنکھ کھولی۔ سیفیہ کالج بھوپال کے ادبی ماحول نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی، شاعری میں جناب راہی قاسمی اور نثر میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی رہنمائی سے صلاحیتوں کو اعتبار ملا۔ مختلف موضوعات پر تنقیدی مضامین، انشائیے، بیسیوں کتابوں پر تبصرے تحریر کئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے اردو سفر ناموں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ، کے موضوع پر پی. ایچ. ڈی. نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹرننگ دہلی کے تحت گیارہویں بارہویں جماعتوں کے لئے نصابی کتابیں مرتب کیں۔ ٹیلی ویژن کے لئے نظمیں اور گیت لکھے۔

۱۹۸۲ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ "سمندر آشنا" شائع ہوا حال ہی میں دہلی میر ان سے ایک ملاقات ہوئی جس میں اردو کے حال و مستقبل اور اس کے مسائل کے حوالے سے کچھ سوال جواب ہوئے۔ گفتگو نذر قارئین ہے۔

س : آپ کی نظر میں ہندوستان میں اردو کے اہم مسائل کیا ہیں؟

ج : ہندوستانمیں اردو کا سب سے اہم مسئلہ اس کے حقوق کا مسئلہ ہے۔ کسی ملک میں اس ملک کی زندہ زبان کو جس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بے شمار ہو اور جس کا ادب عالمی ادب سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس کی شیرینی اور فصاحت کے سبھی معترف ہوں اسے زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کا حق ملنا چاہئے۔ اس کے پڑھنے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے بچوں کو اس زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت ہونی چاہئے۔ اس زبان کے ذریعے تعلیم سے فارغ ہونے والوں کو روزگار ملنا چاہئے۔ یہ سارے مطالبا

اس کے حقوق ہیں اور افسوس کہ اردو کے معاملے میں زبردست حق تلفی ہو رہی ہے۔

س : کیا سرکار اردو کی حق تلفی کی ذمہ دار ہے؟

ج : صرف سرکار یا حکومت ہی نہیں خود اردو والوں کی بے حسی اور کوتاہ اندیشی بھی اس کی حق تلفی کی ذمہ دار ہے۔ زبانیں حکومت کے بل پر زندہ نہیں رہتیں اس کے بولنے والے اس کی زندگی اور ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ حکومت کے تعاون سے ترقی کی رفتار میں تیزی آجاتی ہے۔ میرے نزدیک اردو کے معاملے میں دونوں ہی اپنی اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں کوتاہی برت رہے ہیں۔

س : کیا یہ پورے ہندوستان کا مسئلہ ہے؟

ج : نہیں یہ شمالی ہندوستان کا مسئلہ ہے آزادی سے قبل شمالی ہندوستان اردو کا گڑھ سمجھا جاتا تھا آزادی کے بعد یہی علاقہ سب سے زیادہ بے حسی اور حق تلفی بلکہ جہاں تک اردو کا تعلق ہے سیاسی بغض و عناد و عتاب کا شکار ہوا، ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں علاقائی زبانوں کا رواج پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے وہاں اردو سے کوئی تعصب یا ٹکراؤ نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ یہ صورتحال صرف ہندی بولنے والے علاقوں میں پیدا کی گئی ہے حالانکہ نسلی اعتبار سے ہندی اور اردو دونوں حقیقی بہنیں ہیں۔ دونوں کی قواعد ایک ہے افعال یکساں ہیں۔ دوران گفتگو دونوں زبانوں کے مابین امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دشواری صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی و فارسی کے دقیق الفاظ و اصطلاحات شامل کر لئے جاتے ہیں ورنہ رسم الخط کے علاوہ دونوں میں کوئی تفریق نہیں۔

غیر ہندی علاقوں میں اردو دوسری یا تیسری زبان کے حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور ان علاقوں میں اردو بڑی مقبول ہے۔ شمالی ہند میں جو اردو کے علاقے تھے انہیں ہندی علاقہ قرار دیدیا گیا چنانچہ پورے ہندوستان میں کشمیر کے علاوہ اور کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اردو سرکاری کام کاج میں اپنی دوسری بہنوں کی طرح شریک نظر آتی ہو اور اردو کا المیہ یہ بھی ہے کہ وہ وطن میں بے وطنی اور گھر میں بے گھری کا شکار ہے۔ ہندوستان میں صوبوں کی تقسیم لسانی بنیاد پر کی گئی تھی۔ ہر زبان کا اپنا ایک صوبہ یا ہر صوبے کی ایک زبان ہے۔ جہاں کوئی علاقائی یا صوبائی زبان نہیں تھی ان صوبوں کو ہندی صوبے تسلیم کر لیا گیا۔ یہی اردو کے بھی علاقے تھے۔ اردو کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ہر صوبے میں موجود ہے گویا بے پناہ ہے

اس لئے اس غریب کو کہیں پناہ نہ مل سکی اور وطن عزیز میں جہاں اس نے جنگ آزادی کے سب سے زیادہ اور سب سے خوبصورت ترانے گائے آزادی کے نعرے بلند کئے غریب الوطن کردی گئی۔ آج اگر اس کا اپنا کوئی علاقہ یا صوبہ ہوتا تو علاقائی اور صوبائی زبانوں کو جو مراعات حاصل ہیں اسے بھی مل جاتیں۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوسکا۔ آج صورتحال یہ ہے کہ اردو بولنے والے اپنے بچوں کو اردو پڑھانے سے گریز کرتے ہیں اگر وہ خود گھروں میں اپنے بچوں کو اردو پڑھانا چاہیں تو حکومت قطعی ان سے باز پرس کرنے نہیں آئے گی۔ سرکاری اسکولوں میں بھی اردو کی تعلیم کا بندوبست ہوسکتا ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ ان نامساعد حالات کے باوجود اردو زبان یہاں نہ صرف زندہ ہے بلکہ پھل پھول بھی رہی ہے۔ نئی نئی کتابیں چھپ رہی ہیں۔ رسائل اور اخبارات کا کوئی شمار نہیں۔ مجھے یہاں اپنے ہم زبان ہم وطنوں سے شکایت ہے کہ وہ اردو اخبار ورسائل خرید کر پڑھنے کے بجائے اعزازی کاپیوں کے خواہش مند رہتے ہیں اس کے برعکس دوسری زبانوں کے اخبار ورسائل خریدنے میں انہیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ احساس کمتری کا یہ مرض ان اردو والوں میں زیادہ ہے جو اردو کے ذریعہ عزت اور روزی کمارہے ہیں اور اعلی تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کے مبارک پیشے سے وابستہ ہیں۔

گزشتہ دو دہائیوں میں حکومت ہند اور کچھ صوبائی حکومتوں نے اردو کے لئے کچھ عملی اقدامات بھی کئے ہیں جن سے بڑے فائدے ہوئے ترقی اردو بیورو کا قیام عمل میں آیا کئی صوبوں میں اردو اکیڈمیاں قائم ہوئیں اور انہیں خطیر رقم دی گئی اور اب اردو یونیورسٹی کے چرچے ہیں۔ مگر بنیادی اور ٹھوس کام اسکولوں کے ذریعہ ہوتے ہیں۔ کسی بھی زبان کی جڑیں کالج اور یونیورسٹیوں میں نہیں اسکولوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہاں سے جو پودے نکلتے ہیں وہ اعلی تعلیمی اداروں میں پہنچ کر برگ و بار لاتے ہیں۔ اس وقت ہندوستان میں اردو کی جڑیں دینی مدارس میں ہیں۔ یہی مدارس اس کی بقاء کے ضامن اور امین ہیں لیکن انہیں اوپر آنے کے مواقع حاصل نہیں۔ اگر ایک طرف عصری علوم کے دلدادہ دینی علوم سے نابلد ہیں تو دوسری جانب دینی مدارس کے طالب علموں کو عصری علوم حاصل کرنے کے مواقع نہیں ملتے اور وہ ان علوم سے ناواقف رہتے ہیں۔ لیکن اردو بہر حال ان تمام لوگوں کا ذریعہ تعلیم ہے۔

س : اردو کے سلسلے میں اس بے حسی اور حق تلفی کی بنیاد کہاں ہے؟

ج : تقسیم کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں کے ساتھ اردو کے سلسلے میں بھی یہ رائے قائم کرلی گئی کہ یہ زبان تقسیم وطن کی ذمہ دار ہے۔ یہ غلط اور گمراہ کن تصور چند شر پسند متعصب سیاسی ذہنوں کی پیداوار تھااور بھولے بھالے عوام ان کی باتوں میں آگئے بے گناہ اردو بھی اسی منفی پروپیگنڈے کے زیراثر معتوبین کی صف میں کھڑی کردی گئی پھر جب تک اردو والوں کا اعتماد بحال ہو سارا منظر نامہ بدل چکا تھااور اردو کافی نقصان اٹھاچکی تھی۔ اب جبکہ اردو کے لئے فضا نسبتاً سازگار ہے اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے دلوں میں اس کے لئے نرم گوشے پیدا ہونے لگے ہیں تو اس کے ہم نفس اور سچے طلبگار اس کی افادیت اور شیرینی کے واقف کار، اس کے جاں نثار اتنے کم رہ گئے ہیں کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ باقی وہی ہیں جن کا ابھی ذکر ہوا ہے اور جو اردو کے نام پر نام اور پیسے کمارہے ہیں مگر اسی کی کمائی اس پر خرچ کرنے کو تیار نہیں اور جن کے بچے اردو سے نابلد ہوتے جارہے ہیں اس سلسلے میں قصوروار یا تو ان کے والدین ہیں یا اردو اساتذہ کہ یہ دونوں اردو پڑھانے کو تیار نہیں۔ اول تو والدین بچوں کو اردو دلاتے ہی نہیں ہیں اور اگر کچھ والدین زبان کی محبت میں اردو بحیثیت مضمون دلادیں تو استاد سنجیدگی سے پڑھاتے نہیں۔ غرض یہ زبان ہر طرف سے مجرمانہ لاپرواہی کا شکار ہے۔ اب یہ اس کی اپنی طاقت ہے کہ اس قدر نظر انداز ہونے کے باوجود اس کی کشش کم نہیں ہوئی اور امید ہے کہ یہی قوت اور کشش اسے آئندہ بھی زندہ و تابندہ رکھنے میں مددگار ثابت ہوگی۔ آج اردو غریب عوام کی زبان ہے اور وہی اسے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں۔ کسی بھی زبان کی ترقی میں سرکاری سرپرستی بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن عوامی مقبولیت کے بغیر نہ کوئی زبان زندہ رہ سکتی اور نہ ترقی کرسکتی۔ اردو کی جڑیں عوام میں ہیں۔ خدا تعالیٰ اردو والوں کے متوسط تعلیم یافتہ طبقے کو عقل سلیم دے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس زبان کا مستقبل مایوس کن اور غیر یقینی ہو۔

بشکریہ: اردو ٹائمز۔ جدہ
۱۹/اکتوبر ۱۹۹۴ء

O

خالد محمود کے نام

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں یکم اکتوبر ۱۹۸۳ء

حیدر آباد۔ سندھ پاکستان

عزیز گرامی قدر سلمہ اللہ تعالیٰ

بہت بہت دعا و سلام مسنون

آپ میرے لیے بہت پیارے ہیں، بہت ہی عزیز ہیں۔ آپ کی نیکی اور سعادت مندی کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے۔ کیا عرض کروں، بہت جی چاہا کہ قبلہ بھائی کپتان محمد الیاس خان صاحب علیہ الرحمۃ کی زندگی میں ایک بار سرونج حاضر ہو جاؤں۔۔۔ لیکن اب میں سفر کے قابل نہیں رہا۔ بڑا افسوس ہے۔

تاریخ اسلاف میں قبلہ ماموں کپتان محمد زماں خان صاحب کے انتقال کی صحیح تاریخ نہیں ہے۔ بعد میں ایک صاحب نے بڑا کرم فرمایا۔ وہ ٹونک گئے اور صحیح تاریخ معلوم کی یعنی ۷/اکتوبر ۱۹۳۴ء میں نے آپ کے والد صاحب کو لکھا تھا کہ سرونج میں ریکارڈ ہوگا تو قبلہ ماموں کپتان محمد ایاز خان صاحب، قبلہ ماموں حافظ محمد امان خان صاحب، قبلہ ماموں شاہ زمان صاحب، بھائی عبد الوہاب خان صاحب (عرف نوشہ میاں) کی وغیرہ کی صحیح تاریخ انتقال معلوم ہو سکے گی۔ اور یہ معلومات آپ تاریخ اسلاف کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کر سکیں گے۔

آپ کے والد صاحب اور سب عزیزوں کو بہت بہت سلام مسنون قبول ہو۔ فقط والسلام

شفیقہ فرحت بھوپال

یکم/اکتوبر ۹۵ء

خالد دعائیں

تمہاری ترقی، شہرت، مقبولیت، عزت، گھر، بیوی اور بیٹیاں سب کو دیکھ کر بیحد

خوشی ہوئی۔ خدا کرے ہر چیز قائم رہے اور اس میں اضافہ ہوتا رہے۔

شعبے میں بھی تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کیا جاتا ہے اور ادبی دنیا میں بھی اپنا مقام بنا چکے ہو۔ لیکن سفر جاری رہے۔ بلند سے بلند تر کی جانب کہ انتہا تو کسی چیز کی ہے نہیں

جامعہ کے یہ دو دن یادگار ہیں۔ اور اتنے ہی اہم جتنا قیام چین۔

الگ الگ سب کو خط لکھنا اس وقت مشکل ہے۔ میری طرف سے ہر ایک کو فرداً فرداً دعا کہنا اور شکریہ ادا کرنا۔

وقار فاطمی (مرحوم) بھوپال

۴ر دسمبر ۹۲ء

عزیزی خالد، دعائیں

تم بھی غضب کرتے ہو، تمہارے خلوص کے قائل ہیں اور رہیں گے، مگر ہر بار اسے پہلے سے زیادہ project کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا تمہیں اپنے خلوص اور میرے اعتبار میں کوئی کمی نظر آتی ہے یا شک، بھائی دوا تو corior سے کچھ پیسے خرچ کر کے آسانی سے بھجوائی جا سکتی تھی آخر بابو[1] کو زحمت دینے کی کیا ضرورت تھی، میں جب بھی اس بارے میں سوچتا ہوں، بڑی شرمندگی ہوتی ہے، میں تو ہسپتال میں تھا، بابو عصمت[2] کے اسکول کوئی نو بجے پہنچ گئے، عصمت رخصت پر تھی اور میرے ساتھ ہسپتال میں تھی، ویسے بھی اگر وہ اسکول جاتی تو گیارہ بجے جاتی، چپراسی یا چوکیدار نے بابو کو عصمت کا گھر کا پتہ بتایا وہ خود ساتھ نہیں آسکا، بابو آئے اور رفعت کو شاید دوا دے گئے، مجھے یقین ہے کہ ان کو سرونج جانا ہوگا اور وہ صرف میری دوا کی خاطر بھوپال آئے، (تمہارے خلوص سے زیادہ ان کی شفقت کا قائل اور احسانمند ہوں، آخر ہیں تو وہ تمہارے باپ،) مجھے اس کا اندازہ ہر طرح سے ہوتا ہے کہ وہ اگر بھوپال میں رکے ہوتے تو وہ ہسپتال میں ضرور آتے، یعنی وہ دوا کیلئے بھوپال آئے اور اسی دن دوا دینے کے فوراً بعد سرونج کیلئے روانہ ہوگئے ان کے ساتھ شاید اماں بھی تھیں۔ مجھے پوری بات تو نہیں معلوم مگر عصمت سے جو باتیں ہسپتال میں ان کے گھر والے کر رہے تھے اس سے ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ بابو، اماں کو کہیں چھوڑ کر آئے ہیں یا چھوڑنے

---

[1] خالد محمود صاحب کے والد مرحوم [2] وقار فاطمی مرحوم کی اہلیہ

جارہے ہیں۔ بہر حال بابو کو تکلیف دے کر تم نے اچھا نہیں کیا۔ بابو کو جب خط لکھو تو میری طرف سے بہت بہت شکریہ ادا کرنا۔ تم سے کہنا تو بیکار ہے مگر کیا یہ نہیں ہو سکتا اس بار تم لوگ جب آؤ تو ہمارے ساتھ قیام کرو۔

(۲)

۸ر نومبر ۹۳ء

ڈیر خالد۔ دعائیں

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے۔ کم از کم پندرہ منٹ سے یہ مصرعہ گنگنا رہا ہوں۔ بابوگیری کرتا جارہا تھا اور یہ مصرعہ گنگناتا جارہا تھا نہ جانے کیوں یاد آیا نہ جانے کیوں اس وقت بہت ہی زیادہ مزہ دے رہا ہے کمرے میں steno بھی نہیں ہے تو اپنی گنگناہٹ مہدی حسن کی آواز کی طرح پیاری لگ رہی ہے۔ نتیجہ میں ہر فائل پر جو حکم لکھا ہے وہ ملازمین کے حق میں ہی لکھا ہے اسی لئے شاعر اچھے adminstrator ہو ہی نہیں سکتے، میرے معاملہ میں بھی یہ صرف پیٹ سے سمجھوتا ہے ورنہ یقین مانو مجھے تو authority کو impose کرنے میں ہمیشہ کوفت ہوتی ہے۔ خیر یہ مصرعہ دھراتے ہوئے تم یاد آگئے اور تمہارا خط یاد آگیا اس لئے کام بند کر دیا گیا اور تمہیں خط لکھنے بیٹھ گیا، تمہیں کیونکہ کوئی فارمل خط تو لکھتا نہیں بلکہ تم سے بات چیت ہی کرتا ہوں اس لئے وہ بھی لکھ دیتا ہوں جو عموماً خطوں میں نہیں لکھا جاتا۔ ورنہ اوپر لکھی گئی ہر بات بہت ہی نجی ہے جس کے اظہار کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی اور نہ ہوتی، مگر دوستوں کیلئے تو میری ہر نجی بات بھی ان کی بات ہے۔ اب رہی دوسری کتاب کی بات دل کی بیماری اور حفاظت شاید یہی نام ہے اس کا (اس کا صحیح نام ہے "اپنے دل کی حفاظت کیجئے") کیونکہ ایک نظر کے علاوہ وہ پھر ابھی تک دیکھنے کو نہیں ملی۔ بھائی آخر مجھ سے ایسا کیا قصور سرزد ہوا تھا جو یہ دشمنی تم نے نکالی ہے۔ کتاب عصمت کے ہاتھ پڑ گئی ہے اور میری زندگی عذاب ہو گئی ہے روزان کے بیگ میں رہتی ہے روز اسکول لیکر جاتی ہیں اور آتے ہی ایک لیکچر جھاڑتی ہیں۔ بس وہ ہیں اور میری سگریٹ صرف ایک سگریٹ پیتا ہوں اور وہ بھی باتھ روم میں۔ کھانے کا تیل بدل گیا ہے، گوشت بند ہو گیا ہے، قیمہ جس پر جان دیتا تھا وہ میتھی کی بھاجی آجانے کے باوجود نصیب نہیں ہو رہا ہے، فرمایا جاتا ہے کہ کتاب میں لکھا ہے کہ سرخ گوشت بالکل بند کر دیا جائے، گلابی گوشت کم دیا جائے اور صرف سفید گوشت ہی کھایا جائے اب کیا مرغ اور مچھلی کے قیمہ میں

میتھی کی بھاجی ڈال کر کھاؤں کھانے کے بعد اتنا آرام کرو صرف وقت ناشتہ میں یہ لو اور حد تو یہ ہو گی کہ سب کی موجودگی میں، کچھ دیر بعد موصوفہ تشریف لاتی ہیں اور حکم صادر فرماتی ہیں کہ کتاب میں لکھا ہے کہ کم بولئے، یار تم نے غضب کیا ہے بھائی میں پہلے ہی Heart Federation کا ممبر ہوں اور یہ سب کچھ پڑھ چکا ہوں کتاب بھی انگریزی میں موجود ہے آخر آپ کو ایسی کیا ہمدردی تھی میری بیماری سے کہ اس کا Translation بیوی کو سونپ دیا پہلے ہی پابندیاں بہت تھیں اب تو ان کی ہر لحہ ہدایت اور تاکید پر رونا آتا ہے اور تم پر غصہ۔ ایسا ہی کوئی غداب جمیلہ کے ذریعہ تمہارے پیچھے لگا کر بدلہ تو ضرور لیتا، خیر خدا نہ کرے کہ کوئی بیماری تمہیں ہو مگر کاش تمہاری کوئی کمزوری ہاتھ آئے۔ احباب کو سلام

(۳)

بھوپال
۳۰ر اگست ۹۰ء

ڈیر خالد میاں۔۔۔۔۔ دعائیں

اس تعلق سے ایک بات اور یاد آتی ہے۔ میرے درد سے تڑپنے والی رات اور تمہارے ہاتھوں اس درد پر مرہم رکھنے والی بات۔ خالد دنیا میں مجھ سے زیادہ کون خوش قسمت ہو گا۔ لوگوں کو ایسے بھائی نصیب نہیں ہوتے جیسے خدا نے مجھے دوست دے رکھے ہیں۔ تمہارا خاموشی سے آنا اور میرے پاؤں دبانا کیا ایسی بات ہے جسے زندگی میں بھلایا نہ جا سکے۔ مجھے تو تکلیف اور درد کی شدّت کی وجہ سے ہوش نہیں تھا جب تم نے سر دبانا شروع کیا تب معلوم ہوا کہ یہ تم ہو۔ صبح اظہار تشکر کرنا چاہتا تھا مگر الفاظ کہاں سے لاتا۔ اور اب کون سے الفاظ مل پائیں گے کہ تمہارے خلوص و محبت کا احاطہ کر سکوں۔ تم عزیز تو ہمیشہ سے رہے ہو، مگر اب .... مگر اب.... کیا؟ ایسے موقعہ پر ہی تو اظہار کیلئے الفاظ کو محدود پاتے ہیں۔ دل میں جو کچھ ہے اس کے اظہار کیلئے الفاظ نہیں اور دل چیر کر دکھایا نہیں جا سکتا۔ اس دشواری میں تم ہی میرا ساتھ دے سکتے ہو، میرے احساسات کا اندازہ لگاؤ، اور اپنے لئے جو اچھے جملے اور "صفات" adjectives سوچ سکتے ہو، سوچ لو۔ ہاں میں صرف ایک یقین ہی دلانے کی کوشش کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ زندگی کے ہر موڑ پر مجھے اپنے بڑے بھائی کی طرح پاؤ گے، خدا سے دعا گو بھی ہوں کہ مجھے اس وعدہ اور عہد کی لاج رکھنے کی توفیق عطا کرے۔ (آمین) تمہارا۔۔۔ ذوقلد

(۴)

بھوپال
۱۷/ اگست ۹۳ء

ڈیر خالد۔ سلام ورحمت

خط لکھتے رہا کرو خوشی ہوتی ہے۔ خدا نیت سے واقف ہوتا ہے۔ مراسم میں جتنا خلوص ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی صورت اور کبھی نہ کبھی ابھر کر آتا ہے اور نیا رنگ دکھاتا ہے جب تک تم مخلص ہو دنیا تمہیں خلوص دیتی رہی گی۔ اچھائیاں بیکار نہیں جاتی ہیں، ہمیں ثواب کے علاوہ بھی بہت کچھ دے کر جاتی ہیں۔ یہ کارگاہ عمل ہے عمل ہمارے جیسے ویسا ہی اجر یہاں بھی اور وہاں بھی۔ تمہیں بھی رسول اللہ سے بہت محبت ہے صرف ایک سنت پر عمل کر کے ہم بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں، یعنی آپ کا کوئی عمل رحمت سے خالی نہیں۔ زبان، عمل، قلم غرض کسی طرح آپ نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جو دوسرے کی تکلیف یا شر کا سبب بنا ہوا، خالد یقین مانو اس پر عمل کرنے کی بہت کوشش کرتا ہوں، مگر دس بیس فیصد بھی کامیابی نہیں ہو پاتی، شیطان تو کیا اپنی انا (جھوٹی) خود غرضی اور دنیاداری بیچ میں آجاتے ہیں۔ ہاں کوشش ضرور کرتا رہتا ہوں، اگر سوچنے کا وقت مل جاتا ہے تو اپنے عمل کو check بھی کر لیتا ہوں مگر بروقت تو غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ تمہارے اور افتخار کے علاوہ شاید میں کسی کو کھل کر نصیحت نہیں کرتا اور نہ ان کی خامیوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں مگر تم دونوں سے نسبت بھی زیادہ ہے اور حق بھی اس لئے جو اپنے لئے اچھا سمجھتا ہوں اس کی توقع تم سے بھی کرتا ہوں اور اس کی تلقین بھی، تو بھائی اگر کوئی ایسی ویسی بات کہہ جایا کروں یا لکھ جایا کروں تو اپنا سمجھ کر درگذر کر دیا کرو معاف کر دیا کرو۔

میری طبیعت خدا کے فضل سے ٹھیک ہے، بنو کو بخار آرہا ہے۔ پورے بھوپال میں بخار کی وبا ہے جمیلہ، آفرین اور فائزہ کو دعائیں۔

تمہارا۔۔۔ وقار

تاجدار احتشام (مرحوم)
بمبئی۔ ۔ دہران
یکم ستمبر ۱۹۷۹ء

ڈیر خالد محمود

ایک خط پہلے بھیجا تھا، عید پر ایک کارڈ بھی بھیجا۔ بھائی میرے ایسی بھی خاموشی کس کام کی۔

اب ایک افسوس ناک خبر سنو۔ (ناک پر زور دینا) میں ۱۴ر ستمبر جمعہ کی شام کو پنجاب میل کے ذریعہ دہلی آرہا ہوں۔ پنجاب میل دہلی غالباً شام کو پہنچتا ہے وقت تم معلوم کر لینا۔ اب یہ بتاؤ کہ مجھے کہاں اترنا ہے دہلی یا نئی دہلی یعنی کہاں سے دور ہے منزل اور کہاں سے دور نہیں۔ ٹکٹ ریزرو کروا چکا ہوں۔ ۱۵ کی شام کو دہلی پہنچ جاؤں گا اور ۱۵ر ستمبر والی سنیچر کی رات تمہارے ساتھ گزاروں گا۔ تم ۱۵ر ستمبر کی شام کو کہاں مطلب کون سے اسٹیشن پر آؤ گے بواپسی لکھو۔ یا پھر ان تاریخوں میں میرے دہلی آنے کی وجہ سے اگر تمہارے وہاں رہنے یا نہ رہنے کے امکانات پر بھی بواپسی روشنی ڈالو تو ٹکٹ واپس کرنے میں سہولت رہے۔ کیا خیال ہے۔ دہلی آؤں یا نہ آؤں۔

اس خط کے پوسٹ کرنے کے بعد سے ہی تمہارے خط کا منتظر رہوں گا۔ باقی باتیں ملنے پر۔ ان دنوں بے حد مصروفیت ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا لکھنا ہے اور کیا لکھوں۔

امید کہ تم دہلی کی فضاؤں میں اچھے ہو گے۔

(۲)

بمبئی

۱۸ر اکتوبر ۱۹۷۹ء

ڈیر خالد

ایک مہینے کے سفر کے بعد ۱۴ر اکتوبر کو بمبئی پہنچا۔ سفر کی تھکن تو نہیں خمار باقی ہے۔ نہ اتنے حسین دنوں کی یادیں یوں اتنی جلدی ختم نہیں ہوا کرتیں۔ جب تک حسین خواب امانتوں کی صورت میں سینوں میں محفوظ رہیں گے۔ "رفاقتوں کے نئے رنگ" جگمگاتے رہیں گے۔ تمہاری آواز اور تمہاری غزل میں سفر کی سوغات ہے جو میں ساتھ لایا ہوں۔

امید کہ تم حسب معمول اپنے معمولات میں مصروف ہو گے۔ بمبئی پہنچنے پر ایک بات اور یاد آئی کہ تمہاری سسرال میں دعوت باقی رہ گئی اور تم دہلی بھی چلے گئے۔ ہم لوگوں

کے لئے اب وہ دعوت اتنی ہی دور ہے جتنی دلی۔

باقی باتیں آئندہ

(۳)

۲۴/اکتوبر ۱۹۹۰ء بمبئی

جناب والا

آپ، ہم سے زیادہ سیاسی شعور رکھتے ہیں، تسلیم یہ ادا مگر سمجھ میں نہ آئی کہ کیوں اس سزا کے مستحق ٹھہرے کہ محبتوں سے محروم ہیں۔ کچے مکانوں میں رہنے والے ہم لوگ پکا عشق کرتے ہیں۔ زندگی کی دوپہر شباب پر ہے تیز گرمی ہے، چاروں طرف جنس ہے ایسے میں کہیں پیار کی چھاؤں ملے تو دم لینے کو ٹھہر جاتے ہیں۔ اونچی اڑان ہمارے بس کی بات کہاں۔

انسانوں کے جنگل میں اس شام کی صدائیں بازگشت کرتی ہیں کہ جو دوستوں کے شہر میں گذریں۔ یہاں نہ بادلوں کا قافلہ ہے اور نہ وہ شامیں۔ خود کو روتے ہیں بلکہ خود پہ روتے ہیں۔

صاحبو! بہت برا اور بہت کڑا وقت آن لگا ہے۔ وعدوں کو نبھانے کا موسم ہے۔ کمال احمد صدیقی بھلے آدمی ہیں۔ شرفا کی یادگاروں میں سے ہیں ان سے مل کر طبیعت میں انبساط پیدا ہوتا ہے۔ ملو کچھ فائدہ ہی ہوگا۔ جمعہ کی نماز سے فراغت پا کر آل انڈیا ریڈیو میں کمال صاحب سے ملاقات دنیا سنوارنے کے باب میں شامل ہے۔ دین جمعہ کی نماز سے یوں بھی سدھرا سدھرا یا رہتا ہے۔

ادھر دو تین دن سے شام گئے کچھ خنکی شروع ہو جاتی ہے۔ ایک ہفتہ بعد دہلی میں گلابی جاڑوں کا موسم شروع ہو جائے گا۔ تم عید الضحیٰ پر بھوپال جاؤ گے۔ ہم نہ ہوں گے۔ کوئی حرج بھی نہیں، چاند ہوگا، چاندنی ہوگی، چاند چاند چہرہ ہوگا، ستارہ ستارہ آنکھیں ہوں گی۔ اس عالم میں غلطی سے اگر ہم یاد آ جائیں تو بھابی سے چپکے سے ہمارا آداب کہہ دینا۔ نہ بھی کہو تو اس عالم میں سات خون معاف۔ ان جملوں میں اگر کہیں کوئی گستاخی محسوس ہو تو گردن حاضر، ثواب بھی آپ ہی لیجئے۔

ہاں، بھوپال سے رخصت ہوتے ہوئے وہاں کے گلی کوچوں اور وہاں بسنے والے ہمارے پیاروں کو سلام کہئے۔

جناب مظفر حنفی اور حنیف کیفی صاحبان کو بھی ہمارا آداب پہنچائیے۔ ان حضرات کو یاد دلائیے کہ ان پر میرے خطوں کا جواب باقی ہے۔

(۴)

۲۰/ نومبر ۱۹۷۹ء

ڈیر خالد

دلی والوں نے مصدقہ اطلاع دی کہ تم بھوپال میں ہو، بکرے اور ان کی امائیں کب تک خیر مناتیں۔ بھوپال والوں نے اطلاع دی کہ تم بہ خیریت دلی لوٹ چکے ہو۔ ان دونوں اطلاعات کے بیچ میں نے ایک خط جو کہ تمہارے دلی سے مراجعت اور تمہارے خط کے جواب میں تھا بھوپال کے ہیڈ کوارٹر یعنی محترم قوی صاحب کے پتہ پر بھیجا۔ اب دو سوال بالترتیب مجھے پریشان کیئے ہوئے ہیں۔

۱.　تمہارے نام بھوپال کے پتہ پر بھیجا ہوا میرا خط تمہیں ملا یا نہیں؟

۲.　(الف) تم کیسے ہو؟ (ب) کہاں ہو (ج) خط کیوں نہیں لکھتے۔

نوٹ:-　دونوں سوال لازمی ہیں۔ صفائی کے کوئی نمبر نہیں۔ ان سوالوں کو حل کرو اور انعام پاؤ۔ آخری تاریخ تمہاری اولین فرصت۔ رپور تاژ میں تمہاری تعریف اب اور زیادہ ہو گئی۔ اب سہ بارہ لکھنے کی ہمت نہیں۔ تمہاری ہدایت کے مطابق نعمان خان سے دریافت کیا تھا کہ آفتاب جدید کے لئے لکھ بھیجوں۔ اس کا جواب آیا ہے چھاپنے کو تیار نہیں اگر چھاپا تو صرف دلی والا حصہ اس سلسلہ میں اپنی ہدایات سے تفسیرات و تفصیلات جاری کرو۔

میں کلکتہ نہ جا سکا۔ جیب و دامن کی رفوگری میں مصروف رہا۔ مظفر حنفی صاحب کے تلوؤں میں کھجلی ان دنوں زیادہ ہے، امید کہ کلکتہ سے مع جوتوں کے واپس آچکے ہوں گے۔ وہاں سے رس گلے اور بنگالی مٹھائیاں بھی ساتھ لائے ہوں گے۔ یاد آیا۔ تم مٹھائی نہیں کھاتے، اس طرح کیفی صاحب فائدے میں رہے ہوں گی۔ کیفی صاحب کا خط آیا ہے جواب لکھوں گا۔ کچھ سانس لے لوں۔ ان دنوں رپور تاژ کی مرمت کر رہا ہوں پریم چند کی مٹی پلید کر رہا ہوں اور صورت یہ ہے کہ جناب مظفر حنفی کے جوتے ہواؤں میں معلق نظر آتے ہیں۔ اپنے سر کی حفاظت بھی مقصود ہے سوچتا ہوں کہ مظفر حنفی بھی کہاں اتنے خوش نصیب ہیں کہ ان کے سب جوتے غائب ہوتے رہیں۔ (تم نے کوئی نیا جوتا خریدا یا نہیں اگر

ہاں تو اس جوتے کے ساتھ اپنی خیریت بھی لکھو)

دہلی کا بین الاقوامی میلہ بمبئی کے ٹی وی پر دیکھا۔ لڑکیاں بہت تھیں، اسٹال خوبصورت تھے۔ تم نہ لڑکیوں میں نظر آئے نہ اسٹال میں کیسے پٹھان ہو۔؟ کیفی صاحب کے ساتھ جاتے فائدے میں رہتے۔ کیف وسرور کے عالم میں رنگینیاں بڑھ جاتی ہیں۔

محترم شکیل صاحب اور برادرم کرمانی صاحب کس عالم میں ہیں۔ آج تک اس بات کا دکھ ہے کہ کرمانی صاحب کے ہاں چائے نہ پی سکا۔ معلوم نہیں ایسے کتنے دکھ اپنا مقدر ہیں۔

بمبئی میں "شاعر" جشن شاعر اور سیماب اکادمی کے کام زوروں پر ہیں اور اسی تناسب سے میری مصروفیات بھی۔ اپنا مزاحیہ مضمون "بس والا" شگوفہ میں بھیج دو ان لوگوں کے پاس اچھا مواد جمع نہیں ہو پاتا۔ یہ ذاتی مشورہ ہے۔ وہاں بھیجنے سے پہلے دہلی ریڈیو پر سنا کیوں نہیں دیتے کچھ دنیا سنوار لو۔ وہاں کے آنے والے پیسے جمع کر لینا میں آکر خرچ کروادوں گا۔

میں جن دنوں وہاں تھا تو ایک صاحب کہ جن کا نام عزیز اندوری تھا اور جو اپنی شرافت کی بنا پر پریشان اور پریشان رہنے کی صلاحیتوں والے انسان تھے وہ ان دنوں کہاں ہیں۔ تمہارے فلیٹ پر ان کے نام کتابوں کا ایک پیکٹ چھوڑ آیا تھا، اس پیکٹ کا کیا ہوا۔؟

رات بہت ہو گئی ہے اب اجازت دو۔

(۵)

۲۸/ مارچ ۱۹۸۰ء، بمبئی

ڈیر خالد

تمہارا خط مل گیا تھا۔ سب دوستوں کے خط جمع ہو گئے تھے۔ کل سے جوابات دینا شروع کیا ہے۔ محترم قوی صاحب کو، نعمان کو، اقبال کو، لکھ چکا ہوں اب تم سے مخاطب ہوں۔ جواب میں تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ سب دوستوں کے خطوں سے لطف اٹھا رہا تھا۔ جواب دے دیتا تو پھر مزا کیا آتا۔ جواب اگر بروقت دے دیا تو پھر کاروباری خط اور دوستوں کے خط میں فرق ہی کیا رہا۔ یوں بھی تم دو خطوں کے جواب میں ایک خط لکھتے ہو۔ مجھ جیسے نحیف و نزار انسان پر ظلم کرتے ہو۔ ہم ہیں کہ تمہارا نام لے لے کر جیتے ہیں۔ ورنہ اب جینے کو بمبئی میں کچھ بچا نہیں۔ اب تو مرنے کو بھی بمبئی میں جی نہیں چاہتا۔ پہلے سے بہتر ہوں۔

بیمار نہیں، بیماروں جیسا لگتا ہوں۔

ان دنوں سنا ہے جامعہ والے پورے ادب کو سر پر اٹھائے ہیں۔ مدد کے لئے وزیر آغا کو بھی بلوالیا ہے اور انور سجاد کو بھی۔ وزیر آغا سے بہت سال پہلے مل چکا ہوں۔ انور سجاد کو دیکھا بھی نہیں۔ اگر ان لوگوں سے تھک چکے ہو تو انہیں بمبئی بھجوادو۔ دونوں کو ذرا قریب سے دیکھنے کی خواہش ہے۔

۱۸/ اپریل کو برادرم ناظر نعمان کی شادی ہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں سے لوگوں کی شرکت متوقع ہے۔ اس موقع پر اگر میں سب دوستوں کو ڈھونڈوں تو کیا غلطی ہو گی اور اگر اس موقع پر تم سب لوگ نہ آئے تو کیا ہو گا۔ دونوں کا فرق سمجھاؤ، مثال دے کر سمجھانے میں مزید نمبر ملیں گے۔ صفائی کے پانچ نمبر تو ہیں ہی۔ تم نے بمبئی کو اچھی طرح دیکھانہ بمبئی نے تمہیں۔ پھر آؤ دیکھو بمبئی کتنی اچھی ہے۔ محترم حنیف کیفی کی صدارت میں مشاعرہ کا اہتمام بہت اچھا ہو سکتا ہے۔ مہمان خصوصی قوی صاحب ہوں گے۔ تصور کرو کتنا اچھا لگے گا ایک طرف قوی صاحب دبکے بیٹھے ہیں شیروانی کی بٹن ٹھیک کر رہے ہیں دوسری طرف مظفر حنفی تلوار تلوار کر رہے ہیں اور اور حنیف کیفی درخواست کر رہے ہیں کہ مجھے میرے خوابوں میں مست رہنے دے۔ تم لوگ تینوں حضرات دہلی سے آؤ، بھوپال سے بھی سب دوست آجائیں گے سبھی سے نسیم اور ودود صاحب۔ لکھنؤ سے تسنیم فاروقی اور ملک زادہ منظور احمد، مالے گاؤں سے عتیق احمد عتیق اور سلطان سبحانی، اکولہ سے محبوب راہی اور شکیل اعجاز، احمد آباد سے جمال قریشی، بروڈہ سے خلش بروڈوی بتاؤ اور کتنے نام گناؤں۔ لدھیانہ سے مہمان آرہے ہیں کلکتہ سے بھی۔ اب تم لوگ اپنی منظوری کی اطلاع دو۔ یقین مانو بہت لطف آئے گا۔

ظفر صہبائی آئے ہوئے تھے شاید لوٹ گئے۔ پانچ چھ دن سے پتہ نہیں وہ بھی آرہے ہیں۔ حنیف کیفی اور مظفر حنفی کو بھی خطوط لکھ رہا ہوں۔

تازہ شاعر میں تمہاری غزل شائع ہو رہی ہے۔ پرچہ پریس جا رہا ہے۔ غزل پسند آئی۔ تمہاری ہے اس لئے نہیں بلکہ واقعی اچھی ہے۔

شاعر کا تازہ شمارہ دیکھا۔ پسند آیا یا نہیں۔ کچھ تو ہماری محنت کی داد دیا کرو۔ امید کہ تم حسب معمول صحت مند ہو گے (امید نہیں یقین)

(۶)

دہران
۱۹؍اگست ۱۹۸۰ء

ڈیر خالد

تم سے ہزاروں میل دور تمہیں یاد کرتے ہوئے بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ یہ سوچ کر ڈر لگتا ہے کہ شاید دو تین سال تک تم سے مل بھی نہ پاؤں۔ بہت جی چاہا تھا کہ سب دوستوں کو بمبئی بلالوں اور اس سے پہلے کہ پھر شاید کبھی خوابوں میں ملیں سب سے خوب جی بھر کے مل لوں۔ کاش کہ ایسا ہی ہوا ہوتا۔ اب تو یوں لگتا ہے کہ وہ باسی پھول ہوں کہ جو کسی کتاب کے بیچ رکھے رکھے سوکھ گیا۔ یہاں سعودی عرب میں ہر طرح کا آرام ہے مگر دل نہیں ٹھہرتا۔ خط لکھنے کی عادت مدھم ہو گئی ہے۔ وجہ فیض کی زبانی سنو۔

اب کوئی پوچھے تو کیسے شرح حالات کریں
دل ٹھہرے تو درد کہیں درد تھمے تو بات کریں

چپکے سے ایک بات بتاؤ۔ مجھ سے ناراض تو نہیں ہونا۔ ہم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اس میں پل پل جینا اور پل پل مرنا مقدر رہے۔ سوچو اب تک ہم زندہ رہنے کے لئے کتنی جد و جہد کرتے رہے ہیں اور نہ جانے کب تک اسی طرح زندگی سے لڑتے رہیں گے۔ زندگی کچھ اور چاہتی ہے اور ہم لوگ سسکتی ہوئی راتوں اور اجڑی ہوئی صبحوں میں شبنمی قطرے اور پھولوں کی مسکان دیکھتے ہیں۔ میں وہاں بہت تھک گیا تھا اس لئے یہاں چلا آیا تاکہ اپنے آپ سے بھی لڑ سکوں اور ان بے شمار سوالوں کے جواب ڈھونڈھوں جو آنے والے کل میں قطار در قطار میرے سامنے کھڑے ہوں گے۔ یہاں سخت محنت ہے۔ پیسے کے لئے ہر شخص پاگل ہے جو کچھ کرنا ہے وہ آج کرو۔ جتنا کھانا ہے آج کھالو۔ کل کی کسی کو خبر نہیں۔ کل ہندوستان میں بھی بے چین کئے ہوئے تھا اور آنے والا کل یہاں بھی پریشان کرتا ہے۔ بہترین قسم کے کھانے، پھل، آرام دہ بستر لیکن نیند نہیں۔ ناشتہ کی تفصیل سنو جام، مکھن، انڈے، سلائس، چائے کھانے میں بہترین قسم کے چاول، روٹی، گوشت، مرغ، ترکاری اور پھل۔ پھلوں میں تربوز، خربوز، انگور، سیب، آڑو وغیرہ وغیرہ۔ کیا چیز ہے جو یہاں میسر نہیں۔ (اتنا کھانے پر فی کس دو ہزار ریال اور ہندوستانی رقم میں تقریباً ساڑھے

چار ہزار روپے خرچ آتا ہے۔ تقریباً ۲ ریال میں نفیس سگریٹ کا ایک پیکٹ مل جاتا ہے۔ وہ سگریٹ جو ہندوستان میں دیکھے بھی نہ تھے وہ یہاں دستیاب ہیں۔ میں اب تک 555 اور Rhthmass Dun Hill پی پی کر بور ہو سکا ہوں۔ Craven-A بھی بہت استعمال کی۔ Benson استعمال کرتا۔ ان دنوں BensonHedge کی طرف سے بنائے ہوئے Special Hild سگریٹ پی رہا ہوں۔ ان باتوں سے یہ مطلب نہ لینا کہ میں خدانخواستہ تمہیں مرعوب کر رہا ہوں۔ ہم جیسے لوگوں کے لئے یہ باتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ مجھے اپنا گھر یاد آتا ہے۔ اپنے لوگ آتے ہیں ان کی محبتیں یاد آتی ہیں۔ وہ باتیں یاد آتی ہیں جن پر کبھی ہنسے تھے اور وہ باتیں بھی جن پر آنسو نکل پڑے تھے۔

اب یہ بتاؤ کہ کس حال میں ہیں یاران وطن۔ بہار کا موسم ہے۔ چائے کے کپ کے ساتھ مئے ارغوانی کی باتیں چلتی ہوں گی۔ گھٹائیں جھوم جھوم کے برستی ہوں گی۔ ساون کے جھولے تو گئے اور ساتھ ہی ان جھولوں میں جھولنے والیاں اب بھی مگر ان کے آنچل سے پانی ٹپکتا ہوگا۔ ہائے کیسی آگ لگتی ہوگی۔ بلبل پکارتی ہوگی صاحب پرے پرے اس موسم میں سنا ہے دلی والے لڑ بیٹھے ہیں، مرنے مارنے پر تلے ہیں، کرفیو لگا ہے۔ ہائے رے دلی کیسا سسک سسک کر جیتی رہی ہے اور اب بھی کون سا ایسا دن ہوا ہوگا کہ اس کی آنکھ نہ بھیگی ہوگی۔ اب کے جو بھیجو پتیاں لکھو دلی کی کچھ بتیاں۔

بھوپال کے حسین نظاروں کی باتیں لکھو اپنے پیاروں کی باتیں لکھو۔ قوی صاحب کے چشمے کے پیچھے مسکراتی ہوئی آنکھوں کا حال۔ اقبال مسعود کی صحت کا راز لکھو۔ نعمان خاں کی خاموشی کی مطلب بیان کرو۔ آفاق کے پان کی رفتار لکھو۔ خورشید کے گفتار لکھو۔ ڈاکٹر عبدالودود کے سنجیدگی کی کچھ باتیں ہیں۔ نسیم شہنوی (بقول تمہارے ناشتہ چلا آرہا ہے حوالے کے لئے وہ رات یاد کرو جس رات ہم سب محترم ودود صاحب کے مہمان تھے) کے یوپی طرز کے انداز لکھو۔ سب سے آخر میں اپنے بارے میں کچھ لکھو بھابی اور بچے کے احوال لکھو۔ نیند سے بوجھل بوجھل آنکھیں میری تنہائیوں کی امین ہیں اور میں ان طویل لق ودق صحراؤں میں ایک ایک چہرا اتکا کرتا ہوں۔ دو شعر یاد آرہے ہیں تنہائیوں پر شعر سنو۔

تجھ سے بچھڑ کر ہم اپنا مقدر ہوگئے
اس قدر تنہا ہوئے صحرا کا منظر ہوگئے

عرب تہذیب کے پس منظر میں موجودہ عربی حضرات کی حالت یوں ہے۔

موم بن کر جو پگھل جاتے تھے خود اپنی آگ میں
دیکھتے ہی دیکھتے وہ لوگ پتھر ہوگئے

اور اب بقول فراقؔ

غم کا فسانہ سننے والے آخر شب آرام کرو
اب یہ کہانی پھر چھیڑیں گے، ہم بھی گھڑی بھر سو لے ہیں

یہاں ڈاک کا انتظام انتہائی نامعقول ہے۔ڈاک کے ٹکٹ جنرل اسٹور وغیرہ سے بلیک میں ملتے ہیں۔ مجبوری ہے۔ محترم مظفر حنفی صاحب کا خط ان تک پہنچا دینا۔ جناب محترم حنیف کیفی کو الگ سے لکھ رہا ہوں۔ جناب شکیل صاحب، کرمانی صاحب اور اپنے دیگر ساتھیوں کو میرا آداب۔

(۷)

دہران (سعودی عرب)

۷؍اکتوبر ۱۹۸۰ء

برادران حنیف کیفی، مظفر حنفی اور خالد محمود

آداب و تسلیمات۔

صاحبو! ہم پردیسیوں سے یہ چھیڑ کیسی؟ نہ آپ ہوں آئے نہ بھیجی پتیاں۔ اتنی جلدی بھلا دینے کی رسم۔ پہلے تو چلن کچھ ایسے نہ تھے۔ بھوپال والے بھولے اب دلی والوں نے بھی بھلا دیا؟ دلی والے پہلے تو کبھی ایسے نہ تھے؟ یہ ظلم و ستم کا انداز کہاں سے سیکھا۔ نہ خط نہ پتر، اور تو اور خطوں کے جواب سے بھی محروم رکھا۔ کچھ تو کہو، کچھ تو بتاؤ۔ موم بن کر پگھل جانے والے لوگ دیکھتے ہی دیکھتے پتھر کیسے ہو گئے۔

کچھ اپنا حال احوال لکھو، کچھ اپنے وطن کی بات لکھو۔ سنا ہے وہاں پات ہرے ہیں، پھول کھلے ہیں کم کم بارو باراں ہے یہاں ایک ویرانی سی ویرانی ہے۔ دور دور تک صحرا ہی صحرا، ریت ہی ریت۔ اپنی ہی آواز پلٹ کر چلی آتی ہے۔ کس سے کہیں، کیسے کہیں، اپنی ہی تنہائیاں ڈستی ہیں۔ کچھ تو لکھو۔ پیار بھرے خط کے جینے کا سامان بنے۔ یہاں روح بھی دم توڑتی ہے سسکتی ہے۔

کچھ ادب کی بات لکھو۔ کس حال میں ہیں یاران چمن، کتنا لکھا۔ کیا کچھ لکھا؟ کتنے ادبی ہنگامی۔ کتنی محفلیں جمیں کتنی اجڑیں۔ کس کس کے دن منائے کس کس کو زندہ کیا کس کو آباد کیا۔ کون پدماشری بنا کون ادب سے دور ہوا۔

کچھ تذکرے گھریلوں قسم کے۔ بیوی بچوں کی باتیں۔ روٹھنے منانے کے انداز میرے آنسو، میری دعائیں سب کے لئے۔ خط لکھو کرم کرو، کب تک لوٹوں کون جانے، انتظار میں آنکھیں تھک سی چلی ہیں۔ اب اور نہ ستاؤ، کچھ اور نہ ترساؤ۔

(۸)

دہران

۲۱/اکتوبر ۱۹۸۰ء

ڈیر خالد

آج دوپہر کو کھانا کھاتے وقت تم ساتھ تھے کھانے کا وقت تھا، تمہارا ساتھ لازمی ٹھہرا۔ خط پانچ اکتوبر کو لکھا مان لیا۔ جی نہیں چاہتا کہ یہ غلطی مان لیا جائے کہ بھابی کے ہوتے ہوئے تم نے اتنی مستعدی کے ساتھ یہ خط اسی دن پوسٹ بھی کر دیا۔ اگر واقعی پوسٹ کر دیا ہوتا تو چار پانچ دن پہلے مل جانا ضروری تھا۔ بھابی سے متعارف نہیں اس لئے انہیں الزام نہ دوں گا۔ قصور تمہاری ہی ہے اب اگر نہ مانو تو بھی تم سے اتنی دور ہوں کہ کچھ نہیں کر سکتا۔

اس وقت دوپہر کا ڈیڑھ بجا ہے۔ تمہاری گھڑی میں شام کے چار بجے ہوں گے۔ آج باسی عید ہے ہندوستان میں اور تم بھوپال میں بھنے ہوئے گوشت کو حلال کرنے کے بعد آرام کر رہے ہو گے۔ تمہاری انگلیوں میں گوشت اور پلاؤ کی مہک باقی ہو گی۔ سب ساتھی ملے ہونگے۔ مسکراہٹیں ہو نگی۔ قہقہے بکھرے ہوں گے۔ ہم ان تمام باتوں سے بہت دور اپنے دفتر میں بیٹھے ہوئے تمہیں خط لکھ رہے ہیں۔ ابھی یہاں آئے صرف چار ماہ ہوئے ہیں مگر لگتا ہے کہ نہ جانے کتنا زمانہ بیتا تم سب سے ملے ہوئے۔ اپنی ہی تنہائیاں دھیرے دھیرے ڈستی ہیں اور ہر وقت ایک عجیب سی سوگوار تھکن گھیرے رہتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ کوئی آئے، دھیرے سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے اور کہے کہ آؤ اب لوٹ چلیں۔ ایسا مگر نہیں ہو گا۔ دامن اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگتا رہے گا اور آنکھوں میں انتظار کی لو کبھی مدھم کبھی تیز ہوتی رہے گی۔ سکون وہاں بھی نہ تھا۔ سکون یہاں بھی نہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔

اقبال مسعود والد بزرگوار بن گئے اطلاع ملی تھی ساتھ ہی یہ اطلاع بھی تھی کہ تم اقبال مسعود کی دعوت میں کھانے کے بعد ناشتہ دان سمیت پکڑے گئے۔ اقبال کو مبارکباد بھیج دی تھی۔ اس نے پلٹ کر خط بھی نہ لکھا۔

امید کہ اچھے ہو گے۔ بھابی کو بہت بہت آداب اور بچوں کو ڈھیروں پیار۔ اگر کبھی خط لکھو تو اپنی غزلوں کے کچھ شعر ضرور بھیجنا

(۹)

دہران

۲۳؍نومبر ۱۹۸۰ء

میرے بھائی

کل شام کی ڈاک کے ذریعے تمہارے خط نے یہاں کی سردی میں کچھ حرارت پیدا کی۔ آج جواب لکھ رہا ہوں کل روانہ کروں گا شاید پہلی تاریخ کو تنخواہ کی گرمی کے ساتھ ساتھ یہ خط بھی لہو کو گرم کرے۔ تم کافی سرد وگرم دیکھے ہوئے ہو خطوں کی گرمی سے کیا متاثر ہو گے۔

محترم قوی صاحب اور برادرم اقبال مسعود دہلی آئے تھے۔ میں چشم تصور میں وہاں کے ہنگاموں، تمہارے فلم شگاف قہقہوں اور قوی صاحب کی زیر لب مسکراہٹ کو دیکھ رہا ہوں۔ ہم جیسے لوگ اگر یاد آنے لگتے ہیں تو اس میں قصور ہمارا نہیں تمہاری محبت اور شرافت کا ہے۔ ہچکیوں کے مقابلے میں بس آخری ہچکی کے قائل ہیں اور اس پر یقین بھی کہ ساری شرارت لہو کی تھی۔

تم سرما کی چھٹیوں میں بھوپال اور سرونج جاؤ گے۔ ہائے کتنے ظالم ہو۔ وہاں اپنے یاروں سے کہنا کہ ہزاروں میل دور تمہیں کوئی یاد کرتا ہے۔ تمہیں کوئی سلام کہتا ہے۔ انہیں بھی جو بالکل ہی بھول گئے۔ انہیں بھی جو کہیں کہ ہاں یاد تو کم کم آوے ہیں۔ سردیاں ہوں گی، رات دیر گئے مزے مزے کی باتیں ہونگی، صبح بھی دیر گئے لحاف میں دبکے ہوئے گرم گرم چائے ہو گی، میں تمہارے لئے آنے والے اتنے حسین دنوں کو سلام کرتا ہوں۔ خدا کرے تمہارے لئے ہر نئی صبح خوبصورت سجی اور نکھری ہوئی ساعتیں لائے۔

اقبال مسعود سے کہنا کہ شریفوں کا یہ شیوہ تو نہیں۔ شناخت نہ بھیجانہ سہی، میری

کہانی کی کٹنگ ہی بھیج دیتا۔ مجھے شناخت کے زر سالانہ کے بارے میں اطلاع ہی دے دیتا۔ میں تمام اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہوں اس کی خاموشی نے جان لے لی ہے بدن میں گرمی تو صرف حرارت لہو کی ہے۔

برادرم ناظر نعمان تمھیں میری ایک کہانی کا مسودہ بھیجیں گے۔ یہ کہانی میں نے بچوں کے لئے مہاتما گاندھی ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی دعوت پر لکھی تھی۔ اس کی اشاعت کی منظوری کی اطلاع بھی مجھے مل گئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اب وہ لوگ میری کہانی شائع نہیں کر رہے ہیں۔ شائع نہ ہونے کی وجوہات میں اہل کرم کا کرم شامل ہے۔ ایسا ہی علم قوی صاحب کو ہے۔ بہر حال بہ شرط فرصت یہ کہانی پڑھ لینا اس پر مجھے اپنی رائے بھیجنا اور اس کہانی کو محترم شاہد علی خاں صاحب کو دے دینا۔ ان سے بات کرنا کہ کیا وہ اسے کتابی شکل میں اپنے ادارہ کی طرف سے شائع کرنا پسند کریں گے۔ جو بھی صورت حال ہو مجھے اس کی اطلاع دے دینا۔

مظفر حنفی صاحب کیسے ہیں۔ انہیں خط کا جواب دیئے ہوئے بھی ایک عرصہ بیت چکا۔ محترم کیفی صاحب بھی یاد آتے رہتے ہیں۔ انہیں بھی خط لکھا تھا۔ اُنھوں نے جواب ہی نہ دیا۔

اس خط کے ساتھ اپنی تازہ ترین تصویر بھیج رہا ہوں۔ یہ میرے ذاتی دفتر کی ہے۔ اس تصویر پر سب کا مشترکہ حق ہے۔ تصویر پسند نہ آنے کی صورت میں مجھے واپس کی جا سکتی ہے۔

تم سے تازہ غزل بلکہ غزلوں کی فرمائش باقی ہے۔ پورا کرو۔ دوستوں کی ادبی مصروفیت سے باخبر رہنا اچھا لگتا ہے۔ یہ احساس باقی رہتا ہے کہ کبھی ہم بھی قلم رکھتے تھے۔

اب اجازت دو۔ بھابی کو آداب۔ اپنی بچی کو (مجھے نام نہیں بتایا) بہت بہت پیار۔ اہل دہلی و بھوپال کو محبتیں۔

(۱۰)

دہران (سعودی عربیہ)

۲۴؍جنوری ۱۹۸۱ء

ڈیر خالد

نسیم شہنوی صاحب کے خط کے ذریعہ یہ علم ہوا کہ تم ڈاکٹر عبدالودود کے آخری سفر میں شامل تھے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے حادثہ سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ شاید ہی تم یقین کرو لیکن میں اس اطلاع کے ملنے کے بعد سے رات کو پوری طرح سو نہیں پاتا۔ اکثر ایسا ہو رہا ہے کہ جیسے ہی آنکھ لگتی ہے تو محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بھیانک شخص بندوق تانے میرے سینے پر سوار ہے اور مجھے گولی سے اڑا دینا چاہتا ہے۔

ان دنوں بڑے عجیب و غریب عالم سے گذر رہا ہوں۔ زندگی کا احساس ختم ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ جیسے بھیانک تاریک رات ہے ایک بڑے ویران کھنڈر میں میں تنہا ہوں، تیز ہواؤں کے جھکڑ چل رہے اور میں اس دیے کی طرف بڑھ رہا ہوں جس کی لو اس تیز آندھیں میں پھر پھرا رہی ہے۔ کبھی یہ گمان گذرتا ہے کہ میری روح اسی جلتے ہوء چراغ کے لو کی طرح بے چین ہے، بے قرار ہے۔ تم کیا جانو تنہائیوں سے لڑنا کتنا کٹھن ہے۔

اگر موڈ بنے، جی چاہے، اگر میں اپنے کسی بے جان سے لمحے جملے یا لفظ کی بنا پر یاد آجاؤ تو خط ضرور لکھو نہ آنے کی وجہ سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ میں اس قابل بھی نہیں کے کوئی مجھے یاد کرے۔ جون کے وسط تک ہندوستان لوٹوں گا۔ رمضان سے پہلے کچھ وقت تم سب کے ساتھ گذارنے کو جی چاہتا ہے۔ میں یہاں سے بھوپال تک جا،اجنوں گا کیا تم، محترم مظفر حنفی اور محترم حنیف کی گی کے ساتھ نہ آسکو گے۔ سنا ہے بارشں کی ہلکی ہلکی پھواروں میں روح کو تازگی ملتی ہے۔ یہاں کا موسم سرد ہے رات کے آخری پہر اداس اداس ٹھنڈک پون میں اسیر ہو کر ویرانیوں میں آگ لگاتی ہے میں گلشن کی سلامتی کی دعائیں کرتا ہوں۔

زحمت نہ ہو تو یہ خط مظفر حنفی اور حنیف کیفی صاحبان کو ضرور دکھا دینا۔ ان کو علیحدہ خط اس لئے نہیں لکھ رہا ہوں کہ خط کا مضمون یہی ہے۔ اضافہ صرف اصرار کا ہے۔ بھوپال تمہارے لئے گھر آنگن تم سے اصرار کیا معنی۔ مظفر حنفی اور حنیف کیفی کا ساتھ نہ ہو تو بہاروں میں کیف کہاں، وہ کیفیت کہاں جس کے لئے جی ابھی سے مچلتا ہے۔

اپنا سناؤ اپنی کہو اور خط لکھو

اختر سعید خاں، بھوپال

۲۴ر نومبر ۱۹۹۷ء

برادرم سیفی صاحب تسلیم مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ انتساب کا خالد محمود نمبر

شائع کر رہے ہیں۔ خالد محمود نے اردو ادب میں اپنے لئے بہت تھوڑے عرصے میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ان کی پیشانی پر جلی حرفوں سے اردو زبان و ادب کے ارتقا کی خوش خبری لکھی ہوئی ہے۔ ان کی نثر اور نظم دونوں کے وسیع امکانات سے مجھے یقین ہے کہ ان کا سفر شرر سے ستارے اور ستارے سے آفتاب تک جاری رہے گا۔ کیسا جی چاہتا ہے کہ خالد محمود کی تصانیف اور شعری کاوشوں پر تفصیل سے گفتگو کروں مگر پانچ سال سے مختلف عوارض نے مار رکھا ہے۔ ہاتھ کے رعشے اور ذہن کے بکھراؤ نے سوچنے اور لکھنے کے قابل نہیں رکھا۔ یہ چند سطریں بھی اس طرح لکھ رہا ہوں کہ دائیں ہاتھ کی کلائی کو بائیں ہاتھ سے گرفت میں لئے ہوئے ہوں اور قلم کو جنبش دئے جا رہا ہوں۔ میں خالد محمود نمبر کے لئے دل کی گہرائیوں سے آرزو مند ہوں کہ یہ نمبر اہل بینش کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں پورے طور پر کامیاب ہو اور آپ کی مساعی جمیلہ انتساب کا نام روشن کریں۔

شکیل گوالیاری

سلام مسنون

آپ کا خط ملا۔ معلوم ہوا کہ آپ انتساب کا ایک شمارہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب کے لئے وقف کر رہے ہیں۔ یہ انتہائی مسرت کی بات ہے۔ آپ اپنے چند دوستوں سے بھی لکھوانا چاہتے ہیں اور ان دوستوں میں ایک میں بھی ہوں۔ خالد محمود صاحب میرے لئے ایک محترم شخص ہیں ان سے ایک ملاقات بھی ہو چکی ہے۔ ان کی تخلیقات اکثر و بیشتر نظر سے گذرتی رہتی ہیں۔ وہ اپنا کام خاموشی سے کئے جا رہے ہیں افسوس کہ ان کا شعری مجموعہ سمندر آشنا میرے مطالعہ میں نہیں ہے۔ آپ نے جو مختصر سا انتخاب بھیجا ہے اس کا ہر شعر دامن دل کھینچ رہا ہے۔ ان اشعار کو پڑھ کر مجھے ظ انصاری صاحب کا قول یاد آ گیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"ایک تاریخی دور کا نمائندہ اور بیش قیمت ادب زندگی کی ایسی نعمت ہے جو نہ اپنے ورثہ سے بیزار ہے اور اگلے تجربہ سے۔ ہاں ان دونوں میں پیوند کاریاں طلب کرتا ہے"

خالد محمود قدیم و جدید میں پیوند کاری کا ہنر جانتے ہیں، اس طرح نمائندہ اور بیش قیمت ادب میں ان کی تخلیقات کی نمایاں حصہ داری کا اعتراف کیا جانا چاہئے۔ وہ ان جدید شعراء کی صف میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں جن کی جدت کو بعد کے کسی ادبی نظریہ نے

نقصان نہیں پہنچایا۔ ناقدین ادب انہیں کسی بھی خانے میں رکھیں اور کوئی بھی لیبل ان پر چسپاں کریں، خالد محمود ایک ایسے فنکار ہیں جن کے پاس Raw Material بھی ہے اور Workmanship بھی ان کی تخلیقات ان کی ذہنی تربیت تہذیبی وراثت عالمی شعور اور فکر و نظر کی گہرائی کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے یہاں تمام تر جدید فکریات کیساتھ عمل کا تہذیبی رچاؤ ہے جو مجھ جیسے "غزلیت" کے متلاشی کو نئے کیف و سرور سے آشنا کرتا ہے۔

ڈاکٹر عزیزاللہ شیرانی (ٹونک)

عزیزم۔۔۔۔۔۔ تسلیمات

انتساب کا آئندہ شمارہ خالد محمود نمبر ہوگا اس کے لئے پیشگی مبارکباد قبول کیجئے یقیناً اس میں بہت کچھ ہوگا۔ ایک شاعر کے لئے ہی نہیں بلکہ اس ادبی حلقے کے لئے بھی یہ شمارہ قابل ستائش ہوگا جو ادب و تحقیق کے لئے سرگرم عمل ہے جناب خالد محمود ۷۸ء کی اردو کانفرس میں ٹونک تشریف لائے تھے میں نے کانفرس کی رپورٹ مرتب کی تھی جو شائع ہوگئی تھی۔ اسی پروگرام کے ایک مشاعرے میں اپنی شاہکار غزل پڑھی تھی جس میں موجودہ دور کے تجربات اور انسان کی مختلف حیثیتوں کو پیش کیا تھا گویا وہ ضمیر کی آواز تھی ان کا یہ شعر ٹونک کے مشاعرے میں کافی پسند کیا گیا تھا اور رپورٹ میں بھی یہ غزل شائع ہوئی تھی۔

شاید کہ مر گیا مرے اندر کا آدمی
آنکھیں دکھا رہاہے برابر کا آدمی

○

خالد محمود
کی تحریر کے رنگ

انشائیے، خاکے، تجزیے، مضامین،
جائزے، ترجمہ

سٹی بس کا سفر

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب دتی میں ابھی ہم نئے نئے وارد ہوئے تھے اور شہر بھوپال میں چلنے والی سرکاری اور نیم سرکاری بسیں اپناوقار کھو چکی تھیں اوران کی جگہ نئی نئی پرائیویٹ بسوں نے لے لی تھی اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب بھوپال کی چمکتی ہوئی نئی پرائیویٹ بسوں کے مروت دار کنڈکٹروں کا مہذب برتاؤ ہماری رگ رگ میں سمایا ہوا تھاان شائستہ کنڈکٹروں میں سواریوں کی عزت اور پاسداری کا آپ اس بات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب تک ان کی بس کا ایک ایک مسافر بس میں سوار ہو کر اس قدر اطمینان سے نہ بیٹھ جائے کہ اس کے اطمینان پر بے اطمینانی کا گمان گزرنے لگے۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر بس سے نیچے کھڑے رہتے مجال ہے کہ مسافروں سے پہلے بس کے اندر قدم بھی رکھ لیں سوئے اتفاق سے بس کے اندر پہلے سے موجود ہیں تو اس وقت تک بس کو آگے نہ بڑھائیں گے جب تک مسافر بس سے نیچے اتر کر پیدل چلنے کی پوزیشن میں نہ آجائیں مسافروں کو بھی حالات نے اتنی عقل دے دی ہے کہ اگر نجی اور فوری کام کو جانا ہے تو سٹی بس کا سہارا تلاش کرنے کی جگہ چہل قدمی کرتے ہوئے آرام سے چلے جاتے ہیں سرکاری کاموں کے لئے البتہ یہ بسیں نہایت موزوں اور مناسب ذریعہ آمدورفت ہیں بھوپال کی سٹی بسوں کے کنڈکٹروں کو "پیاسا خود کنویں کے پاس آتا ہے کنواں پیاسے کے پاس نہیں جاتا" والے مقولے کی عزت کا اس قدر پاس رہتا ہے کہ بنفس نفیس ہر فرد کے پاس پہنچ کر ٹکٹ دیتے ہیں میں چشم دید گواہ ہوں کہ ایسے ہی ایک موقع پر جب کنڈکٹر نے سب کے ٹکٹ کاٹ دیئے تو بس کو چلنے کی سیٹی بجائی لیکن بس ابھی چلنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ سامنے سے ایک مسافر نما آدمی تیز قدم آتا دکھائی دیا اب ڈرائیور کی شرافت نفس دیکھئے سوچا شاید بس میں بیٹھنا

چاہتا ہے چنانچہ بس روک دی گئی دور سے آنے والا قریب پہونچا تو اس کا چہرہ سمجھ دار قسم کے لوگوں کا سا نکل آیا نتیجتاً وہ بس کے قریب سے تیزی کے ساتھ نکلتا چلا گیا کنڈکٹر نے گھریلو زبان میں ایک دو باتیں کہیں اور بس اب واقعی چل پڑی پھر رکی پھر چل پڑی اس طرح ایک بس اسٹاپ سے دوسرے بس اسٹاپ کے درمیان دس بارہ نئے بس اسٹاپ تعمیر کرتی راہ گیروں کو سلام کرتی رک رک کر دعوت نشست دیتی منزل کی جانب جس کی آج تک انکوائری نہ ہو سکی روانہ ہوئی راستہ میں کچھ محتاط قسم کے دور اندیش لوگ حفظ ماتقدم کے طور پر بس میں سوار ہو گئے مبادا بس والے انتقامی کاروائی کر بیٹھیں۔

بھوپال کی بس کے ڈرائیور اور کنڈکٹر صاحبان کے علم قیافہ میں مہارت کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے یقین جانئے دور سے دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں شخص ایک گھنٹے یا آدھے گھنٹے بعد بس میں ضرور سوار ہو گا پھر اگر موڈ ہوا تو آدھا گھنٹہ اس کے پیچھے بس لگائے رہیں گے ورنہ کسی جگہ بس روک کر انتظار کر لیں گے اور آپ کو تعجب ہو گا جس شخص کے بارے میں ڈرائیور کا قیاس ہوتا ہے وہ شخص ایک نہ ایک دن بس میں ضرور سوار ہوتا ہے ہر ہر قدم پر ڈرائیور اور کنڈکٹر کی قوت ارادی اور مسافروں کی قوت برداشت کی داد دینی پڑتی ہے یہ تھا وہ قابل رشک قسم کا لائق ستائش ماحول جس کے اثرات ہماری رگ و پے میں سرایت کر چکے تھے۔

اس کے بعد جب ہم نے دہلی میں پہلی بار قدم رنجہ فرمایا تو ہمارے ہاتھ میں سفر کی ایک جیتی جاگتی علامت یعنی سوٹ کیس بھی تھا اس کے باوجود جب ایک سٹی بس ہمارے قریب سے گزرنے لگی تو ہم نے ازراہ احتیاط و نوازش ہاتھ سے رکنے کا اشارہ بھی کیا مبادا ڈرائیور کی نظر بیگ پر نہ پڑے۔ جبکہ بھوپال میں سوٹ کیس ساتھ ہو تو بس کو روکنے کا اشارہ کرنا ڈرائیور کی توہین ہے لیکن اے لوگو! کیا تمہیں یقین آجائے گا کہ بس بالکل نہیں رکی اور ایک مسافر کے پاس سے اسی طرح نکلی چلی گئی جس طرح بھوپال میں بس کے قریب سے مسافر نکلا چلا جاتا ہے ڈرائیور کی اس قدر شناسی پر ذہن کو زبردست جھٹکا لگا ہندوستان کا ایک وفادار باشندہ ہونے کی حیثیت سے یہ احساس بھی ہوا کہ بس والوں کے اس رویے سے ملک کی اقتصادیات پر کس قدر منفی اثر پڑے گا۔

بہر حال ہم گرتے پڑتے اس محشرستان پر پہونچے جسے دہلی والے بس سٹاپ کے

نام سے پکارتے ہیں اس مقام پر پہنچ کر ایسا معلوم ہوا جیسے یہاں برسوں سے کوئی بس نہ آئی ہو لیکن بہت جلد یہ خیال غلط ثابت ہو گیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے سو پچاس بسیں آئیں بھی گزر بھی گئیں مگر لوگوں کے تعداد میں کمی واقع نہ ہو سکی جب کوئی بس آتی لوگ پاگلوں کی طرح دوڑتے کچھ اس کا نمبر دیکھ کر واپس آجاتے کچھ اناج کے بوروں کی طرح اپنے آپ کو اس میں ٹھونس لینے یا لٹکا لینے میں کامیاب ہو جاتے مگر اس سے یہ نہ سمجھ بیٹھئے کہ خدا نخواستہ دلی میں قطار میں کھڑے ہونے کا رواج نہیں رواج یقیناً ہے جب تک بس نہیں آتی لوگ نہایت صبر و سکون کے ساتھ صف بنائے کھڑے رہتے ہیں جیسے ہی بس پر نظر پڑی پتھروں کے زمانے کی تہذیب جاگ اٹھتی ہے مہذب لوگ زمانے کے فرق کے باوجود قدیم تہذیب سے اپنا ناتا کبھی نہیں توڑتے مساوات کا یہ عالم کہ محمود و ایاز بس کے ایک ہی دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور ایک ہی دروازے سے اترتے ہیں۔

دلی والوں کو بس میں چڑھنے کا فن بھی خوب آتا ہے بس میں نقب لگا کر داخل ہو جاتے ہیں دلی کے رکشا والوں کے بارے میں مشہور ہے کہ جہاں سے ان کے رکشے کا صرف ہا پہیا گزر جائے پورا رکشا گزار دیتے ہیں دریا گنج میں بالعموم اور چتلی قبر، جامع مسجد رچاندنی چوک میں بالخصوص راہ گیروں کی دونوں ٹانگوں کے درمیان سے رکشوں کے زرنے کے مناظر آئے دن دیکھنے کو ملتے ہیں یہی حال سٹی بسوں میں سوار ہونے والے یالوں کا ہے کہ بس پر چڑھنے میں مدد کرنے والا ڈنڈا ان کے ہاتھ میں آگیا تو سوئی کے ناکے کے برابر جگہ سے بھی اپنے آپ کو نکال دیتے ہیں اور اس کارروائی میں چند سکنڈ سے زیادہ قت صرف نہیں ہوتا یوں بھی سرکاری سٹی بس کو سوار ہونے والوں کی بہ نسبت اترنے :الوں کی زیادہ فکر رہتی ہے جیسے ہی لوگ اترے اور بس آگے بڑھی لوگ اترتے بھی اس طرح ہیں جیسے بس کے اندر فرقہ وارانہ فساد ہو گیا ہو بار بار بس میں سوار ہونے اور اترنے کی بھاگ دوڑ میں حصہ لینے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے قیمتی سوٹ اور ٹائی والے وجیہہ اور پروقار آفیسر قیمتی ساڑیوں والی ہر سائز اور ہر رنگ کی خواتین کالج کی طرار لڑکیاں نوجوان ہیرو شیروانی پاجامے اور ریش والے بزرگ علماء برقعے پوش مستورات ساتھ ساتھ کم عمر بچے شریف نیک معصوم نیز چور اچکے بد معاش جیب کترے ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں اور یہ ایک دوسرے میں اس طرح گڈ مڈ ہوتے ہیں کہ شناخت مشکل ہو جاتی ہے دلی

میں زندگی کا بڑا حصہ لوگ بس اسٹاپ پر گزارتے ہیں۔

ہم بھی عرصہ دراز سے ایک بس کا انتظار کر رہے تھے خدا خدا کر کے بس آئی ہم آگے بڑھے ساتھ ہی بھیڑ میں ایک خاتون بہتی ہوئی آگے چلی آئیں ہم بھوپال کی تہذیب کے پروردہ سوچا انہیں پہلے سوار ہو جانے دیں اس خیال نے ایک سکینڈ کو قدم روک دیئے خاتون ہمیں دھکا دے کر بس میں سوار ہو گئیں بس بھاگ گئی اور ہم کھڑے کھڑے غبار دیکھتے رہے تھوڑی ہی دیر میں ایک دوسری بس کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا اس بار ہم نمبر دیکھے بغیر آگے بڑھے پیچھے سے مسافروں کا ایک ریلا آیا اور ہم بغیر کسی کوشش کے بس کے قریب ہوتے چلے گئے قریب پہنچ کر کنڈکٹر سے معلوم ہوا کہ یہ ہماری بس نہیں ہے پیچھے پلٹنے کی کوشش نے سعی لاحاصل کا پریکٹیکل کرادیا پیچھے والوں نے اتنے زور سے دھکا مارا کہ باہر نکلنے کی جدوجہد میں بس کے قریب اور دوسرے ریلے کے ساتھ بس کے اندر تھے بس آگے بڑھ گئی دلی میں عام طور پر لوگ اسی طرح بسوں میں سوار ہوتے ہیں بس کی شان یہ ہے کہ ڈی ٹی سی کا کنڈکٹر مہاراجا ہے پچھلے دروازے کے پاس سیٹ پر جلوہ افروز رہتا ہے اس کو سلامی دیجئے پھر آگے بڑھیے لیکن ہم تو اس کے عادی نہ تھے اطمینان سے آگے نکلے چلے گئے سوچا کنڈکٹر کو غرض ہو گی تو خود ٹکٹ لے کر ہماری خدمت میں حاضر ہو گا اب سوال یہ تھا کہ ہمیں کہاں اترنا ہے اور بس کہاں تک جائے گی سب کچھ تاریکی میں تھا بس میں سوار ہوتے وقت اتنا یاد تھا کہ اس کا منہ ہماری منزل کی طرف ہے اور بس۔ بس چلتی رہی چلتی رہی لوگ سوار ہوتے رہے بیٹھتے رہے اترتے رہے ہم نے بھی کئی بار بیٹھنے کا ارادہ کیا جہاں کھڑے تھے اس کے قریب کئی مرتبہ سیٹ بھی خالی ہوئی لیکن جب بھی ہم نے بیٹھنے کی کوشش کی وہاں کسی کو بیٹھا ہوا پایا ہم حیران و پریشان تھے کہ یا خدا ہم سے اس قدر دور کھڑے ہوئے افراد ہم سے پہلے اس سیٹ پر آکر بیٹھ جاتے ہیں جس سے ہم عرصہ ہوا چپکے کھڑے ہیں آتش کی محفل تو ہم نے دیکھی نہیں مگر اپنے تجربے کی بنیاد پر یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ ؎

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ بھی کھڑے ہوئے
میں سیٹ ڈھونڈتا ہی تری بس میں رہ گیا

ہاں تو قارئین با تمکین! میں عرض کر رہا تھا کہ بس چلتی رہی چلتی رہی ہم آشرم

سے سوار کیے گئے تھے اور جامعہ نگر ہماری منزل تھی مگر بس نے صفدر جنگ پہونچا دیا قسمت پر شاکر ہو کر بس سے اترے ہی تھے کہ ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ طلب کیا اور ٹکٹ کی عدم موجودگی میں مبلغ دس روپے سکہ رائج الوقت کا مطالبہ کیا ہم نے لاکھ سر مارا کہ کنڈکٹر نے جب ٹکٹ دیا ہی نہیں تو ہمارا کیا قصور مگر وہ ظالم ٹس سے مس نہ ہوا قہر درویش بر جان درویش یہ سانحہ بھی برداشت کرنا پڑا۔

ایک واقعہ یاد آیا کچھ احباب کے ساتھ سٹی بس میں سوار تھے دو افراد والی ایک سیٹ پر دو اشخاص براجمان تھے ہماری پاؤں کی تکلیف کے بہانے پر ایک شخص نے ازراہ عنایت کسمسا کر اپنی دانست میں سیٹ پر جگہ دیتے ہوئے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

حسب معمول بھیڑ اپنے شباب پر تھی ہم اس جگہ کو غور سے دیکھ رہے تھے جوان کے سرکنے پر نیچے سے نکلنے والی تھی ان کی انتھک کوشش کے بعد وہ بہ دقت تمام سیٹ کی ایک چار انچی لکیر پہلی رات کے چاند کی طرح نمودار ہوئی اور ہم یہ سوچ کر اس پر بیٹھنے کی پوزیشن میں آگئے کہ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس جگہ کو بیٹھنے کے قابل بنالیں گے مگر اب حالت یہ تھی کہ وہ جگہ تو بیٹھنے کے قابل کیا بنتی ہم اٹھنے کے قابل بھی نہ رہے کچھ لوگ ہم پر اس طرح جھک گئے تھے کہ ہم جنبش کرنے کے محتاج ہو گئے۔

دس پندرہ منٹ اسی طرح اٹکے ہوئے گزرے تھے کہ ایک کرم فرما کی آواز آئی موصوف ہمارا نام لے کر کہہ رہے تھے کہ ارے بھئی انہیں تو بیٹھنے کی جگہ مل گئی اس آواز نے گویا ہمارے کانوں میں گرم سیسا انڈیل دیا اور ہم غصے کی طاقت کے تعاون سے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی اس جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے جہاں سے اٹھنے کی لمحہ اول سے کوشش کر رہے تھے۔ ایشیاڈ میں کھلاڑیوں کو سہولت پہنچانے والی میناڈوروں نے سٹی بسوں کا روپ دھارن کر کے دلی کے غریب مسافروں کے ساتھ جو کھلواڑ کی ہے اس کی کہانی اس قدر عبرت ناک ہے کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ذرا تصور کیجئے کہ ایک چھوٹی سی بس میں جس کی چھت کی اونچائی بیٹھے ہوئے مسافروں کے سر سے خوش فعلیاں کرتی ہو دس بیس لوگ کھڑے ہو کر سفر کر رہے ہیں۔ مذکورہ بسوں میں قلیل اور طویل بر قسم کے مسافر کھڑے ہو کر سفر کرتے ہیں ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس کی چھت کا سارا بوجھ انہیں پر آن پڑا ہے۔ کھڑے ہیں مگر یوں جیسے رکوع میں ہوں ان

کے آس پاس بیٹھے ہوئے مسافر کیا سوچتے ہیں اور کن کن امتحانات سے گزرتے ہیں یہ بعضوں کے نزدیک اختلافی اور بعضوں کے نزدیک اخلاقی مسئلہ ہے اس لئے اس بحث کو آگے بڑھنے سے روکتے ہوئے عرض ہے کہ اس قبیل کے سیکڑوں واقعات دلّی کی سٹی بسوں میں روز کا معمول ہیں چنانچہ ہم نے سوچا کہ اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں دلّی کی سٹی بسوں کے سفر سے متعلق چند فنون اور آداب از راہ کرم آپ کو بھی سکھادیں تاکہ سند رہیں اور وقت ضرورت کام آئیں۔

نمبر ۱: بس اسٹاپ پر کھڑے ہونے کا فن

اس سلسلے میں عرض ہے کہ سب سے پہلے آپ اپنی بس کا نمبر بس اسٹاپ پر لگی ہوئی تختی میں پڑھ لیجئے۔ لیکن یاد رکھیئے یہ ضروری نہیں کہ ہر بس اسٹاپ پر تختی لگی ہو۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اگر تختی لگی ہے اور اس تختی پر بہت سارے نمبر لکھے ہیں تو ان سارے نمبروں کی بسیں اس بس اسٹاپ پر آجائیں گی اور آگئیں تو رک جائیں گی اور رک گئیں تو آپ سوار ہو جائیں گے۔ دلی کی سٹی بسوں کا تمام سفر یعنی اسٹاپ پر بس کی آمد اور آپ کا اس میں سوار ہو کر منزل مقصود پر پہنچنا سبھی کچھ کرکٹ کے کھیل کی طرح ''بائی چانس'' ہوتا ہے۔

بس کا ڈرائیور جوان ہے تو لڑکیوں کے پاس کھڑے ہونے کی کوشش کیجئے اور بوڑھا ہے تو کہیں بھی کھڑے ہو جایئے۔ لیکن بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر یہ نہ سمجھ لیجئے کہ بس اپنے اسٹاپ پر ہی رکے گی۔ وہ قطعی طور پر آزاد ہے۔ اسٹاپ سے بہت آگے اور بہت پہلے کہیں بھی رک سکتی ہے۔

نمبر ۲: بس میں سوار ہونے کا فن

بس آنے پر کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو مجمع کے آگے پہنچانے کی کوشش کیجئے اور آگے پہنچنے پر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیجئے اب آپ کی ذمہ داری ختم۔ پیچھے والے آپ کو بس میں سوار کرائیں گے۔ ابتدا میں یہ عمل آپ کو عجیب سا لگے گا۔ آپ اچھلیں گے، کودیں گے، کسی کو ڈانٹیں گے، کبھی چہرہ غصے سے سرخ ہو جائے گا۔ کبھی گھبرا کر چیخ اٹھیں گے۔ لیکن رفتہ رفتہ آپ کی عادت پڑ جائے گی۔ اور پھر تمام مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ غالب

دہلوی نے آپ ہی کے لئے کہا ہے۔ع ''مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں'' زیادہ بھیڑ نہ ہو تو سوار ہوتے وقت بس کے پچھلے دروازے میں لگا ہوا بائیں ہاتھ والا ڈنڈا اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیجئے۔ چلتی بس میں چڑھتے وقت اس بات کا بطور خاص خیال رکھیئے ورنہ ہاتھ سے محروم ہو جائیں گے۔ایک بات کا اور دھیان رہے کہ بس کا نمبر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا مستحسن ہے۔

نمبر ۳: ٹکٹ خریدنے کا فن

آپ بس میں سوار ہو گئے تو ٹکٹ خریدنے کا جہاد آپ پر فرض ہو جاتا ہے ٹکٹ لے لیا تو غازی ورنہ ٹکٹ چیکر آپ کو شہید کر دے گا۔ بس کے اندر ایک جان ہزار قالب ہو جانے کے بعد ٹکٹ کے لئے جیب سے پیسے نکالنے سے قبل مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل کرنا آپ کے حق میں مفید ہو گا۔

(الف) ہاتھ کو نہایت احتیاط کے ساتھ جیب کی طرف لے جائیں۔

(ب) اپنی ہی جیب میں ہاتھ ڈالیں۔

ا(ج) ریزگاری نکالنے کی کوشش کریں۔

(د) اگر رقم پتلون کی بیک پاکٹ میں ہو تو گھڑی والا ہاتھ پیچھے نہ لے جائیں۔

(ہ) ٹکٹ خریدتے وقت پیسوں والا ہاتھ کنڈکٹر کے منہ کے قریب لے جا کر ایک ٹکٹ فلاں مقام کا ایک ٹکٹ فلاں مقام کا والی گردان دہراتے رہیں۔ تا آں کہ ٹکٹ آپ کے ہاتھ میں آجائے۔کچھ پیسے واپس لینے ہوں تو ٹکٹ لینے کے بعد بھی اپنا ہاتھ کنڈکٹر کے منہ کے قریب ہی رکھیں۔

نمبر ۴: بس کے اندر کھڑے ہونے کا فن

ٹی بس کے اندر ڈرائیور کی سمت اپنا منہ اور کنڈکٹر کی جانب پشت کر کے ہرگز ہرگز نہ کھڑے رہیے ورنہ کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہ سکیں گے۔بس سے اترنے والے دھکے اور گالیاں ایک ہی رفتار سے عطا کرتے ہیں۔ کھڑے ہونے کا بہتر اور آزمودہ طریقہ یہ ہے کہ اپنا منہ سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافروں کی جانب اس طرح کر لیجئے کہ آپ کی اور دوسری جانب منہ کیے کھڑے مسافروں کی پشت کے درمیان ایک گلی سی تعمیر ہو جائے کوشش کیجئے

کہ کسی سیٹ کے ڈنڈے کے نزدیک کھڑے ہونے کی سعادت نصیب ہو، تاکہ بیٹھنے کے امکانات پیدا ہو سکیں اگر ممکن ہو اور بیٹھا ہوا مسافر مرد ہو تو اس کے پیچھے اور آگے والی سیٹ کے دونوں ڈنڈوں کو پکڑ کر خمیدہ کمر والی پوزیشن میں اس طرح کھڑے ہو جایئے گویا بیٹھے ہوئے مسافر کی زندگی خطرے میں ہے اور آپ چوکنا ہو کر اس کی حفاظت پر کمربستہ ہیں۔

نمبر۵: سیٹ پر بیٹھے کا فن

اگر آپ کے قریب والا شخص اپنی حرکات و سکنات سے اٹھتا ہوا معلوم ہو رہا ہو تو بالکل اسی طرح ہوشیار ہو جائیں جس طرح مچھلی کے شکار کے وقت ڈور ہلنے پر ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ مچھلی کے شکار سے نابلد ہیں تو اس طرح ہوشیار ہو جائیں جس طرح لائن میں کھڑے لوگ سینما ہاؤس کے ٹکٹ کی کھڑکی کھلنے پر ہو جاتے ہیں۔

اور اس سے پہلے کہ بیٹھا ہوا شخص اپنی جگہ سے پورا اٹھے اپنے آپ کو اس کی جگہ پر گرادیں پھر اطمینان سے اپنی دونوں ٹانگوں کو اتنا اوپر اٹھائیں کہ ٹانگیں آپ کے سر کے قریب پہنچ جائیں اس طرح اس کو باہر آنے کی جگہ دیتے ہوئے ٹانگوں کو نیچے گرالیں اب آپ سیٹ پر بیٹھ چکے ہیں بیٹھنے کے عمل میں ذرا سی بھی چوک آپ کو ساری زندگی نہ بیٹھنے دے گی۔ دلی میں یوگا کی ٹریننگ کا ایک بڑا مقصد سٹی بس میں سیٹ حاصل کرنے کا فن سکھانا ہے۔ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد داد طلب نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے کی بالکل زحمت گوارانہ فرمائیں۔ چہرے پر انتہائی لاتعلقی کے آثار پیدا کرلیں بلکہ زیادہ مناسب ہوگا کہ قریب بیٹھے ہوئے شخص سے خواہ مخواہ باتیں کرنے میں اس حد تک منہمک ہو جائیں کہ کسی جان پہچان والے کی آواز بھی گویا آپ کے کانوں میں نہیں پہنچ رہی ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض ناتجربہ کار لوگ دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھ کر بیٹھنے کی لذت سے بہت جلد محروم ہو جاتے ہیں۔

نمبر۶: بس میں آگے بڑھنے کا فن

جب آپ بس کے اندر مجمع کو چیرتے ہوئے آگے کی جانب رواں دواں ہوں تو اس بات کی بالکل فکر نہ کریں کہ آپ کا ہاتھ کس کے سر پر اور پاؤں کس کس کے پاؤں پر پڑ رہا ہے۔ ہر قسم کی چیخ پکار اور آہ و بکا کو ہنگامۂ شادی اور گالیوں کو داد شعر سے تعبیر کریں گالیاں کھا کے بے مزہ ہونے کی کوشش نہ کریں نہ پیچھے پلٹ کر جواب دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں

آگے بڑھتے وقت چنگیز خانی خصائل اور لوگوں کے رد عمل پر صبر و تحمل کی عادت اکسیر بھی ہے اور مجرب بھی۔

نمبر ۷: بس سے اترنے کا فن

یہ بڑا نازک فن ہے اس میں تھوڑی سی بے احتیاطی یا کاہلی یا اندازے کی ذرا سی غلطی گھر سے بہت دور کر دیتی ہے۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ شطرنج کے گھوڑے کی چال یاد رکھیے اور اپنی منزل سے ڈھائی اسٹاپ قبل سیٹ چھوڑ دیجئے پھر بتدریج آگے بڑھنے کی کوشش کیجئے۔ اس کوشش میں آپ پر سات خون معاف ہیں۔ لوگوں کو روندتے کچلتے بڑھتے چلے جائیں، اترتے وقت بس کے انجن کی جانب زمین پر چھلانگ لگائیں اور اترنے میں پھرتی دکھائیں ورنہ یہاں پیچھے والوں کا تعاون آپ کے حق میں مفید نہ ہوگا۔

یہ تھے وہ فنون جن کا سیکھ لینا آپ کے لئے فنون لطیفہ سے زیادہ مفید ہوگا لیکن یہ فنون بھی اس وقت تک ناکافی ہیں جب تک آپ مندرجہ ذیل ہدایات پر عمل پیرا نہ ہوں۔

ہدایاتا (برائے مسافران ڈی۔ ٹی۔ سی)

(اوّل) یہ کہ سٹی بس میں سفر کرنے کے لئے کبھی اکیلے گھر سے نہ چلیں کسی کو ساتھ رکھیں تاکہ آپ کے اسپتال یا پولیس چوکی پہنچنے کی گھر والوں تک بر وقت اطلاع پہنچ جائے۔ **(دوم)** صاف کپڑے پہن کر نہ چلیں اگر چلیں تو کپڑے قیمتی نہ ہوں۔ **(سوم)** زیادہ رقم ساتھ لے کر نہ چلیں البتہ بس کے کرایہ کے علاوہ دس بیس روپے فاضل ضرور رکھیں تاکہ ٹکٹ خریدنے سے چوک ہو جانے پر کام آسکیں۔ **(چہارم)** سامان اور خواتین کو ساتھ لے کر نہ چلیں خاص کر ان خواتین اور اس سامان کو جو برقع میں یا آپ کو بہت عزیز ہوں۔

نوٹ: اس جملے میں لف و نشر مرتب یا غیر مرتب یا شاید دونوں موجود ہیں۔ **(پنجم)** بچوں کو لے کر نہ چلیں، **(ششم)** بزرگوں کو لے کر نہ چلیں۔ **(ہفتم)** اپنوں کو لے کر نہ چلیں۔ **(ہشتم)** غیروں کو لے کر نہ چلیں۔ **(نہم)** یہ سوچ کر نہ چلیں کہ فلاں وقت فلاں جگہ اور فلاں وقت گھر پہنچ جائیں گے۔ **(دہم)** بس میں سیٹ پر بیٹھ کر چلنے کے ارادے سے کبھی نہ چلیں ورنہ ارادوں کی شکست و ریخت آپ کو مایوسی کے تاریک غار میں پھینک دے گی بہتر ہے کہ بس میں کھڑے ہونے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلیں اس طرح ممکن ہے آپ کو زیادہ

مایوس نہ ہو، دلی کی سٹی بسوں میں کھڑے ہونے کی جگہ بھی الیکشن میں کھڑے ہونے والوں کی طرح نصیب کا کام ہے ورنہ عام طور پر لوگ لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔(**یازدھم**) اگر آپ کو سٹی بسوں کے اسٹاپ پر آنے جانے کا وقت معلوم ہے تو اس معلومات پر گھمنڈ یا بھروسا ہرگز نہ کریں۔ دلی میں سٹی بسوں کا بس اسٹاپ پر آنے کا ٹائم تو ضرور ہوتا ہے مگر جس طرح ایڈیٹر کا مصنف کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں اسی طرح بس کا ٹائم ٹیبل کی رائے سے اتفاق کرنا بھی ضروری نہیں۔(**دوازدھم**) بس میں سوار ہو کر ڈرائیور، کنڈکٹر یا جیب کتروں سے آنا کانی کرنا دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کرنے کے مترادف ہے۔ان تمام اصحاب کا احترام آپ کے اہل و عیال پر لازم ہے اہل و عیال پر یاد آیا کہ اہل و عیال کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو بس کے سفر سے گریز کریں ورنہ باہم وگر عداوت، رقابت، ہمدردی اور غصہ کے جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ آخر میں التماس ہے کہ غیرت، خودداری، مروت اور شرم و حیا کو سٹی بس کے سفر میں اپنے ہمراہ نہ رکھیں ان کے بجائے بے حسی، بے مروتی، توتا چشمی اور سنگ دلی والے ہتھیار اس میدان میں آپ کے بہترین رفیق ہوں گے۔

اگر آپ نے ان ہدایات پر عمل کئے بغیر دلی کی سٹی بسوں میں سفر کرنے کی کوشش کی تو مستقبل کا مورخ آپ کا جغرافیہ خراب کر دے گا۔

○

آخری افطار

ہم نے ابھی گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ ’’کال بیل‘‘ کی آواز نے الٹے قدموں واپس لوٹنے کے محاورے کو عملی جامہ پہنا دیا۔ اس وقت کسی کی بھی مداخلت ہمیں گوارہ نہ تھی، یہ ہمارے مسجد جانے کا وقت تھا۔ رمضان کی وجہ سے دن بھر کے لہو ولعب سے ہم نے قریب قریب توبہ ہی کرلی تھی دن بھر میں دس پندرہ گالیوں کی جگہ دو چار ہی سے کام چلا لیتے۔ جھوٹ یا تو ’’مصلحت آمیز‘‘ ہوتا کہ اسے ’’فتنہ انگیز‘‘ راستی سے بہتر کہا گیا ہے یا پیشے سے وفاداری کے طور پر مجبوراً بولنا پڑتا جھوٹ بولنا ہماری معاشی، معاشرتی اور منصبی ضرورت اور ذمہ داری ہے۔ اور ہم اپنے فرائض منصبی سے غفلت برتنے کے قائل نہیں۔ چونکہ ہمارا ہر جھوٹ ’’مصلحت آمیز‘‘ اور ہر ’’راستی فتنہ انگیز‘‘ ہوتی ہے، اس لئے ہم اول الذکر کو ترجیح دیتے رہے ہیں۔ دن بھر میں قسموں کی تعداد اب اتنی کم رہ گئی تھی کہ پوروں والی انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی نماز کے لئے حکم ہے کہ دکھا کر پڑھو اس لئے جہاں دیکھنے والے زیادہ جمع ہو جاتے ہم ضرور پڑھتے۔ روزے کے مسائل میں ہم نے پڑھا تھا کہ اپنا منہ روزے داروں جیسا بنائے رکھو۔ بالکل ویسا ہی بنائے رکھتے۔ ایسا اچھا دین داری کا ماحول تھا کہ حور و غلماں کی مسکراتی ہوئی نظریں ہمہ وقت ہمیں اپنے تعاقب میں نظر آتیں اس ماحول میں اور اس وقت ’’کال بیل‘‘ کی آواز استغفر اللہ! بہر حال ’’کال بیل‘‘ کی آواز کا تیر کھا کر ہم جیسے ہی کمیں گاہ یعنی دروازے پر پہنچے تو ’’اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی‘‘ ہمیں ٹوپی میں دیکھتے ہی ایک چیخا۔ ’’کیوں میاں آج کل بڑی نمازیں چل رہی ہیں‘‘ دوسرے نے طنز کیا لگتا ہے روزے بھی پورے گئے ہیں ہم نے منکسرانہ اقرار میں کچھ اس انداز سے اپنا سر ہلایا جیسے ارتکاب گناہ میں رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر اعتراف جرم کر رہے ہوں۔ عصر کی نماز سے

فارغ ہو کر ہم ابھی ابھی گھر آئے تھے۔ اور اپنے انہیں دوست کی طرح رمضانی مسلمان بنے رہنے کی سعیٔ حاصل کر رہے تھے جو سحری کے وقت نہایت اہتمام کرتے قورمہ، بریانی میٹھا چاول، نمکین چاول، دودھ، دہی، فیرنی، پھینیاں، مٹھائیاں، پھل اور نہ جانے کیا کیا نعمت ہائے مترقبہ اور غیر مترقبہ دستر خوان پر سجی ہوتیں۔ سحری میں آنکھ کھلنے کے لئے گھڑی میں الارم بھرنے کے علاوہ مختلف لوگوں کو ہدایتیں کرنا بھی نہیں بھولتے۔ سحری کے وقت پابندی سے اٹھتے، جم کر سحری کرتے، مسواک کرتے اور پھر نہایت اطمنان سے چادر تان کر سو جاتے، رہا روزے رکھنے کا سوال تو یہ گھر کے دیگر افراد کی ذمہ داری تھی۔ ایک روز ان کی اہلیہ نے پوچھا۔ کیوں جی! میں کہتی ہوں جب آپ روزہ رکھتے ہی نہیں تو آخر اس قدر پابندی سے سحری پر اٹھنے کی بھی کیا ضرورت ہے جھنجلا کر بولے۔ واہ بھئی واہ! سحری بھی نہ کروں؟ کیا بالکل ہی کافر ہو جاؤں؟ تو قارئین با تمکین! بالکل کافر ہونے کا ہمارا بھی کوئی ارادہ نہ تھا۔ بس ان کے اور ہمارے مذہبی جذبات میں اتنا سا فرق تھا کہ وہ سحری میں چوکنا رہتے اور ہم افطار میں۔ ہم بہر حال فائدے میں تھے۔ ایک جانب تو اللہ میاں کی ہم سائیگی کے طفیل مصارفِ طعام کی دسترس سے باہر ہو گئے تھے، دوسری طرف اجتماعی افطار کے یقینی ثواب سے بہرہ مند۔ گویا "ہمارے دونوں ہی میٹھے" تھے افطار سے قبل سائرن کا صبر آزما انتظار ضرور ہمیں شاق گزرتا تھا۔ دراصل ہم انتظار کے بالکل عادی نہ تھے۔ اس لئے کہ اس "ماڈرن ایج" میں اور تو اور معشوقانِ مجاز نے بھی لذتِ انتظار سے محروم رکھنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ فی زمانہ اسی ایک موقع پر وقت سے پہلے وعدہ نبھانے کا فیشن ہے ورنہ عام معاملات و حالات میں تو آگ لگنے کی اطلاع پر ایک سال بعد یہ جواب موصول ہونے کا ریکارڈ موجود ہے کہ بجھانے کا جلد انتظام کیا جا رہا ہے خیر یہ تو عبارت معترضہ یعنی لکھتے لکھتے بہک جانے یا بھٹک جانے کی ایک مثال تھی ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ رمضان میں ہمارا معمول یہ تھا کہ عصر کی نماز پڑھ کر گھر آئے پھر فوراً یعنی عصر و مغرب کے درمیاں (عصر کے قریب مغرب سے دور) پڑوس کی مسجد میں جا پہنچتے۔ خوش قسمتی سے ہمارا دولت کدہ (معاف کیجئے دولت کدہ ہم از راہ تکبر نہیں از راہ مصلحت کہتے ہیں۔ دراصل ہم کرائے کے مکان میں رہنے کے شوقین ہیں اور دوسرے کے مکان کو "غریب خانہ" کہنے میں تامل ہوتا ہے) ایک ایسے محلے میں واقع ہوا ہے جہاں کے مسلمان بڑے خدا ترس، عبادت گزار، وسیع القلب اور افطار شناس

ہیں انہیں صفات کی وجہ سے ہمارے پڑوس کی مساجد کے دستر خوان برتنوں کی افراط و تفریط کا ایسا منظر نامہ پیش کرتے ہیں کہ یزید و بایزید دونوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کا مشاہدہ ہمیں اس ولایتی کیمرے کی بدولت ہوا جو ایک دوست لے کر آئے تھے۔ افطار و نماز کے موقع پر مسلمانوں کی تصاویر کھینچنے کا اشتیاق انہیں کے بطن سے پیدا ہوا۔ اس تقریب میں جب ہم پہلی مرتبہ مسجد پہنچے تو عجیب و غریب اور ناقابل یقین سا منظر سامنے تھا اب اسے آپ ہمارا حلفیہ بیان سمجھ لیں تو بھی ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا کہ ایک ہی دستر خوان پر کھانے پینے کی اتنی ورائٹیز کو یوں دست و گریباں اور گتھم گتھا ہوتے ہوئے ہم نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا، ہمارے تو چہرے سے زیادہ شکم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ دستر خوان پر انواع و اقسام کا ایک جم غفیر تھا اور تمام روزے دار حواس خمسہ کو دستر خوان اور سائرن کی جانب مبذول کئے ہمہ تن صبر و استقلال کی سعیِ لاحاصل میں اس طرح منہمک تھے گویا کسی بہادر فوج کے دلاور سپاہی غنیم پر ٹوٹ پڑنے کے لئے سپہ سالار کے اشارے کے منتظر ہوں۔ اس کثرتِ سامانِ افطار نے ہمارے جوش ایمان کو اتنی زور سے للکارا کہ ہم نے بھی اس جہاد میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا اس پروگرام کا وہ منظر جسے کلائمیکس کہنا چاہئے یعنی جب سائرن کی آواز پر مقابلہ شروع ہوا ناقابل فراموش تھا اگر دستر خوان کو ایک نہر تصور کر لیا جائے تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ نہر سوئز کی جنگ کا منظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے بعض آزمودہ کار ہاتھوں کی مہارت دیکھ کر ہمارے منہ سے داد (معہ افطاری) نکل جاتی مثلاً سامنے سے ذرا بائیں ہٹ کر تازہ انار کے سرخ سرخ رسیلے دانے بکھرے پڑے ہیں ان سے قدرے فاصلے پر چند انگوروں کا ایک خوشہ بھی نہ جانے کیسے ابھی تک باقی رہ گیا ہے معاً کچھ نگاہیں اس پر پڑیں چوطرفہ حملے کے امکانات پیدا ہوئے کہ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ یکایک ایک مردِ ضعیف نے اپنے دائیں ہاتھ کا مال بائیں ہاتھ میں۔ بائیں ہاتھ کا منہ میں اور منہ کا سالم مال حلق سے اتارتے ہوئے مولانا آزاد کے مشہور چڑے موسوم بہ ''قلندر'' کی یاد تازہ کر دی۔ اس صفائی اور بے باکی سے جھپٹا مارا کہ چشم زدن میں سارے انگور ان کے قبضہ ٔ قدرت میں تھے شاعر نے کہا ہے ''جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں خوشہ اسی کا ہے''۔ اب ایک اور مشاقی ملاحظہ فرمایئے۔ دائیں جانب سے ایک گلگلہ لڑھکتا ہوا آیا اور سامنے سے نکل جانا ہی چاہتا تھا کہ ایک جیالے نے بائیں ہاتھ کو کیچ کی پوزیشن میں لا کر

اسے نہایت آسانی سے اس طرح دبوچ لیا جیسے شہباز، ممولے کو دبوچ لیتا ہوگا تب ہمیں معلوم ہوا کہ دستر خوان پر اقبال کے کردار اور کرکٹ کے اسٹار بھی موجود ہیں۔ بہت دنوں کی بات ہے ہم نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی، نام تھا "ون ملین ایرس بی سی" یعنی دس لاکھ سال قبل مسیح۔ اس فلم میں "قبل مسیح" کی اس گونگی تہذیب کی عکاسی کی گئی تھی جسے تاریخ کی زبان میں پتھر کے زمانے کی تہذیب کہا جاتا ہے۔ ہماری غیر ناقص رائے میں پتھر کے زمانے والوں کا اپنا شکار کرنے اور کھانے کا انداز ہمارے پیش نظر افطاری کھانے والوں کے انداز سے بہت زیادہ مختلف نہ تھا۔ اسی یکسانیت کی بدولت ہمیں اس نظریے یا نقطہ نظر کی معقولیت مشکوک نظر آتی ہے کہ پتھر کے زمانے والے ہمارے زمانے سے کم تہذیب یافتہ تھے۔ خیر ہمارا موضوع تاریخ نہیں، افطار ہے اس لئے اس گفتگو کو "جملہ معترضہ" قسم کی کوئی چیز سمجھ لیجئے مگر یہ نہ بھولیے کہ تاریخ ہمیشہ اپنے آپ کو دہراتی ہے اسی لئے اس روز بھی دہرا رہی تھی۔ بہر نو قصہ مختصر یہ ہے کہ اس دن کے بعد سے ہم نے بھی مسجد میں روزہ افطار کرنے کا باقاعدہ آغاز کر دیا اور عہد کر لیا کہ سحری خواہ کہیں بھی ہو افطار یہیں کریں گے (افتتاحی تقریب میں یعنی پہلے روز افطاری کی ایک چھوٹی سی پڑیا ہم اپنے ساتھ لے جانا نہیں بھولے تھے) ہم نے ایک دوروز میں ہی عید کی نماز والی کنکھیوں سے مسجد کے افطار والے ماحول کا بڑی گہرائی اور دوراندیشی سے مکمل جائزہ لے لیا تھا۔ اب ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ دستر خوان کے کس حصے میں کون سی شے کس طرح اور کب اتاری جاتی ہے۔ چاند میاں ٹھیکیدار کے گھر کی افطاری کس وقت آتی ہے اور حاجی الٰہی بخش صاحب مدظلہ کیا بھیجتے ہیں اور یہ کہ ہمیں کچے گوشت کے کباب حاصل کرنا ہیں تو کب اور کہاں بیٹھنا چاہئے اور فروٹ چاٹ اور دہی بڑا معہ میٹھی چٹنی بھیجنے والے صاحب ثروت اصحاب خیر مسجد کے کس دروازے سے ملحق ہیں اور یہ بھی کہ کن حضرات کی خواتین کون سی ڈش بنانے میں ید طولی رکھتی ہیں (ید طولی کا معاملہ یہ ہے کہ ہم اسے صرف تحریر ہی میں استعمال کرتے ہیں) یہ دوسرا جملہ معترضہ تھا ممکن ہے آگے ایک آدھ اور بھی جملہ معترضہ ہو مگر ہمیں فی الوقت اتنا یاد ہے کہ ہم آپ کو دستر خوان پر پوزیشن سنبھالنے کے آداب یا گر سکھا رہے تھے اور یہ بتانے والے تھے کہ ہم دستر خوان کے کسی ایک کنارے پر بیٹھ کر افطاری اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر کھسکانے کے فن سے بھی بڑی حد تک واقف ہو چکے تھے مثلاً یہ کہ اگر ہم

دستر خوان کے کسی ایسے مقام پر بیٹھنے کے لئے مجبور ہیں جہاں خزاں ہی خزاں ہے اور اطراف وجوانب میں بہار آئی ہوئی ہے یعنی ہمارے آگے ابلے ہوئے چنے، تلے ہوئے پاپڑ، پکوڑیاں (وغیرہ) قسم کا پیٹ بھراؤ مال ہے اور مٹھائیاں یا پھلوں کے قبیل کی اشیائے خوردنی غیروں کے سامنے اور ہم سے فاصلے پر ہیں تو ہم قدرے فیاضانہ بلند آواز میں ''یہاں بہت ہے، ادھر سے لیجئے'' کہتے ہوئے چنے پکوڑیاں وغیرہ اِدھر اُدھر سرکائیں گے اور دھکا دیتے ہوئے دور تک اس طرح لے جائیں گے کہ ہمارے سامنے نہ رہنے کے برابر رہے پھر گویا منصفانہ انداز میں حساب برابر کرتے ہوئے جب ہمارا ہاتھ دستر خوان پر گھسٹتا ہوا واپس آئے گا تو دستر خوان کا نقشہ ہی دوسرا ہوگا۔ دیکھا آپ نے ہاتھ کی ایک ذرا سی صفائی کے نتیجے میں ہم خدا کی کتنی مترقبہ اور غیر مترقبہ نعمتوں سے محروم رہنے سے بحمد اللہ صاف بچ گئے مگر یاد رہے کہ یہ تمام گر صرف ان دستر خوانوں کے لئے ہیں جن میں کھانے کی ساری اشیا آپس میں گڈمڈ ہو کر اتحاد باہمی کا وہ قابل رشک نمونہ پیش کرتی ہیں کہ محمود وایاز کو پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے۔ ڈونگوں، ڈشوں اور پلیٹوں والے دستر خوان کے آداب ان سے مختلف ہیں اگرچہ وہاں بھی نفسی نفسی کا ''یہی نقشہ ہے و لے اس قدر آباد نہیں۔''

وہاں کی صورت حال کو واضح طور پر دو خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک خانے میں تو رکابی دار (رکابدار نہیں) یعنی پلیٹ والا اپنی پلیٹ ہاتھ میں لے کر ڈونگے یا ڈش کے پاس بہ نفس نفیس جاتا ہے اسے ''کھڑا کھانا'' کہنا چاہئے مگر بوفے سسٹم کے نام سے مشہور ہے دوسرے میں ڈونگے اور ڈشیں ہاتھوں ہاتھ پلیٹ والے کے پاس پہنچتے ہیں اور میاں ذرا وہ ڈونگا بڑھانا، یہ پلیٹ اٹھایئے۔ بھائی ذرا ادھر دیجئے قسم کی آوازوں کے بیچ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر تھرکتے اور مسلسل گردش کرتے ہوئے ڈونگے مستقل ہوا میں معلق رہتے ہیں تا آنکہ ان کا مال ختم نہ ہو جائے۔ ڈونگوں کو معلق رکھنے کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ پلیٹ والا دائیں ہاتھ سے پلیٹ اور منہ کے درمیان رابطہ قائم رکھتا ہے اور بائیں ہاتھ سے اپنا ڈونگا کسی اور کے بائیں ہاتھ میں تھما کر کسی اور کے بائیں ہاتھ کا ڈونگا پھر اپنے بائیں ہاتھ میں تھام لیتا ہے۔ اس عمل میں چوکنا رہنے کی بڑی ضرورت ہے مبادا جس مال کی ڈش آپ نے ابھی سپلائی کی ہے کوئی شخص اسی مال کی ڈش آپ کو دوبارہ نہ تھما دے۔ پہلی قسم یعنی کھڑے کھانے کے آداب الگ ہیں اس میں پلیٹ والا اپنے مقدر کا سارا کھانا ایک ہی وقت

میں اپنی پلیٹ میں اتارنے کی کوشش کرتا ہے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اگر ممکن ہو تو ہاتھ کی خالی پلیٹ ڈونگے کی جگہ رکھ کر بھرا ہوا ڈونگا اٹھا لے لیکن بوجوہ اس خواہش کی تکمیل نہیں ہوتی اس لئے ڈونگے کو پلیٹ سے تبدیل کرنے کی جگہ ڈونگے کا سارا مال پلیٹ میں منتقل کرلیا جاتا ہے اس کاروائی کے دوران باقی پلیٹوں والے صبر کھاتے اور لہو پیتے ہیں پھر جب کوئی نئی ڈش آتی ہے تو اجمیر والے خواجہ صاحب کی دیگ کے لٹنے کا منظر پیش کرتی ہے کھڑے کھانے میں قسمت والے ہی پیٹ بھر کر گھر آتے ہیں۔ سنا ہے انگریزوں نے شام کی چائے کے ساتھ پلیٹ میں ڈرائی فروٹس یعنی سوکھے میوے رکھ کر لان میں ٹہلتے ہوئے اور دوسرے ٹہلنے والے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے جس کھانے کا رواج ڈالا تھا یار لوگوں نے اسے مرغ و بریانی کے حوالے کر دیا ذرا تصور کیجئے کہ ایک بھاری بھر کم پلیٹ میں مرغ کی چار رانیں چھ دہی بڑے ایک پاؤ چاول معہ بوٹیاں چار سیخ کباب اور سو گرام سلاد ایک ہاتھ میں اور دبیز و گداز (ربر کی) تندوری روٹی دوسرے ہاتھ میں ہو تو بھلا آپ روٹی کس طرح توڑیں گے اور بوٹی کس طرح کھائیں گے مگر ہم نے دیکھا ہے اور باہوش و حواس دیکھا ہے کہ ایک ماہر فنکار نے جو بائیں ہاتھ میں پلیٹ نما ڈونگا تھامے کھڑا تھا اپنے دائیں ہاتھ کی روٹی نہایت اطمنان سے بائیں بغل میں اس طرح داب رکھی تھی جس طرح سودا نے "تضحیک روزگار" میں اپنا گھوڑا بغل میں داب لیا تھا۔ اس کھانے کے اور بھی بہت سے ہنر ہیں مگر یہاں انکے بیان کا موقع نہیں یہاں تو ہم دستر خوان پر براہ راست رکھ کر کھانے والی افطاری کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے مندرجہ بالا جملے کو تیسرا یعنی وہی "جملہ معترضہ" سمجھ لیجئے جس کی ہم نے قبل از وقت پیشین گوئی کردی تھی۔ پچھلی بات وہاں ختم ہوئی تھی کہ ہاتھ کی اک صفائی کے نتیجے میں ہم خدا کی بہت سی نعمتوں سے محروم رہنے سے بحمد اللہ صاف بچ گئے "اور اب بات یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ اس طرح دستر خوان کی شطرنج کے اور بھی بہت سے گر ہم نے نسبتاً بہت جلد سیکھ لیے۔ دو چار کمزور قسم کے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر خاص خاص چوکیوں پر قبضہ جمانے کا گر آزمانے کے سلسلے میں ایک بار ہماری درگت بنتے بنتے رہ گئی۔ ہوا یوں کہ ایک خاص چوکی پر جو وضو کرتے ہوئے ہماری نظر میں آئی تھی اور جو مسجد کے "فیض رساں" دروازے سے اس قدر ملحق تھی کہ محلے سے آنے والی افطاری کے سارے خوان سب سے پہلے اسی کو رسد فراہم کرتے تھے ایک صاحب اپنے یتیم صورت بچے

کو بٹھا کر وضو فرمانے چلے گئے۔ ہم نے موقع غنیمت جانا اور قصر نماز کی طرح قصر وضو کرتے ہوئے بعجلت پہنچے اور بچے کو ایک جانب کھسکا کر اسی چوکی پر قبضہ جمالیا۔ موصوف جب واپس تشریف لائے تو وہاں ہماری نشست کو ہیچ سمجھ کر نہایت غیر مہذب انداز سے بولے "اے مسٹر ذرا اٹھیے تو! ہم لہجے کی جانب ان کی توجہ مبذول کرانے کی غرض سے پلٹے ہی تھے کہ ان کے ورزشی جسم پر نظر پڑی اور ہماری فطری شرافت عود کر آئی (جو ایسے موقعوں پر اکثر عود کر آتی ہے) ہم نے سوچا میاں چھوڑو بھی لڑائی بھڑائی سے کیا حاصل؟ پھر ہم ایک ایسے ملک کے باشندے ہیں جہاں عدم تشدد پر بے شمار تقریریں ہو چکی ہیں اور آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے برداشت کا ثبوت دیتے ہوئے انہیں معاف کر دیا اور اسی وقت سے "امن پرائز" کا انتظار کر رہے ہیں ہم نے یہ بھی سوچا کہ مسجد میں بات بڑھنے سے مسجد کی بدنامی ہوگی ہو سکتا ہے لوگ افطاری بھیجنا بھی بند کر دیں یا کم از کم افطاری میں تخفیف تو لازماً ہو جائیگی۔ مسجد سے باہر ہوتے تو ہم انہیں بتاتے کہ اب ہم اتنے بھی کمزور نہیں کہ اگر وہ دو چار ہاتھ جھاڑ دیں تو ہم دو چار گالیاں بھی نہ دے سکیں۔ انہوں نے طاقت کے زعم میں منہ پکڑ لیا تو ہم نے بھی دل ہی دل میں دیں مگر گالیاں ضرور دیں۔

مجھے اسیر کریں یا مری زباں کو بند کریں
مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے

بظاہر ہم نے انہیں معاف کر دیا تھا اس لئے ان سے دور جا کر بیٹھ گئے۔ اس سے آپ ہماری دور اندیشی، چشم سیری اور دریادلی کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس ایک " Not to be Quated" واقعہ کے علاوہ ہم آپ کو بتائیں کہ دروازے کے ساحل سے دستر خوان کے سمندر تک افطاری کی کشتیاں در آمد کرنے کے وسیلے سے ہم اہل دستر خوان کی نظروں میں خاصی اہمیت اور عزت و احترام حاصل کر چکے تھے۔ دستر خوان کے لوگ ہمارا اسی طرح احترام کرتے جس طرح سائنس کے طلبا اپنے اساتذہ کا اور آرٹس کے اساتذہ اپنے طلبا کا کرتے ہیں۔ مسجد سے باہر بھی دستر خوان کے غازی نہایت خصوع و خضوع سے ملاقات کرتے۔ ہوتے ہوتے ہم اس دستر خوان کے سینئر ممبر ہو گئے اور بزرگوں کے اس قول پر کہ مسجد میں جانے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے ہمارا یقین پختہ ہو گیا۔ جس روز سے ہم نے مسجد میں جا کر افطار کرنے کا آغاز کیا تھا دل کے ساتھ ہوٹل کا بل بھی ہلکا ہو گیا تھا۔

اس لئے "کال بیل" بجانے والے دوستوں نے جب ہمیں فلم دیکھنے کی دعوت
ؤ ہم چراغ پا ہو گئے۔ آج تو ہم کسی بھی صورت میں اور کسی بھی تفریح میں دوستوں کا
ہ نہیں دے سکتے تھے وہ یوں کہ افطار کے نقطہ نظر سے آج کا دن بڑی اہمیت کا حامل تھا۔
مل آج جمعہ کا دن تھا اگر مذہبی طور پر جمعہ کی اہمیت مسلم ہے تو افطاری کے نقطہ
سے "مرغ مسلم" ہے پچھلے تجربات و مشاہدات نے ہمیں افطار جمعہ کی عظمت کا قائل
یا تھا۔ ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ مسلم خواتین خواہ اپنے مردوں کو نماز کے لئے مسجد نہ بھیج
ں مگر مسجد میں افطاری بھیجنے کے ثواب سے محروم رہنا ہرگز پسند نہیں کرتیں۔ آج کے
ی کی ایک اور اہمیت بھی تھی آج کا جمعہ نہ صرف جمعۃ الوداع یعنی رمضان کا آخری جمعہ تھا
ہ آخری روزہ بھی تھا یہ تو وہ موقع ہوتا ہے جب مساجد کے دستر خوان ندی اور نالے نہیں
لماری کے دریا بن جاتے ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ان میں طغیانی بھی آجاتی ہے۔
ا نچہ ہم نے صاف لفظوں میں دوستوں سے کہہ دیا کہ ہم رمضان جیسے مبارک اور پاک
ہینے میں فلم جیسی نامبارک اور ناپاک چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم انہیں بھی یہی مشورہ
ینا چاہتے تھے کہ اس خیال سے باز رہیں معاً خیال آیا کہ انہوں نے ہمارا مشورہ مان لیا اور باز
ہ کر اسی مسجد میں چلے آئے تو ہماری لیڈر شپ میں بادھا آجائے گی اس لئے ہم نے یہ مشورہ
بھی نہیں دیا اور انہیں اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ جب دوست رخصت ہو گئے تو ہم بھی بن ٹھن
کر آج ذرا جلدی ہی مسجد میں جا پہنچے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ تجربہ کار نمازی یا نماز کے نئے
نئے شوقین جمعہ کی اذان سے پہلے مسجد پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی حال جمعہ کے افطار کا
ہے مسجدوں کے افطار کی تاریخ میں آج کا دن بڑی اہمیت کا حامل ہے اگر آپ نے بھی ہماری
طرح کسی مسجد کے دستر خوان پر روزے رکھے بغیر پابندی کے ساتھ روزے افطار کئے ہوں
تو آپ کو آج کے افطار کی اہمیت مسجد کے دستر خوان کی عظمت، اشیائے خورد و نوش کی
برکت، بے روزہ روزے داروں کی کثرت اور صاحبان افطار کی نقل و حرکت کا نہ صرف
اندازہ ہو گا بلکہ آپ معترف بھی ہو سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ ہم اپنی دانست میں جلد ہی مسجد پہنچ
گئے اور اس یقین کے ساتھ پہنچے کہ اگلی صف میں جگہ مل جائیگی۔ (یہاں اگلی صف سے مراد
دستر خوان کی اگلی صف ہے۔ نماز کی نہیں) جی ہاں! اس دستر خوان پر صفیں بھی ہوتی ہیں
جن کی ترتیب کچھ یوں ہوتی ہے کہ سب سے آگے والی صف دستر خوان کے "تقریباً" اوپر

ہوتی ہے اور اس طرح کہ بیٹھنے والوں کے پیروں کے انگوٹھے افطار ی کی خواہش میں ایڑیاں فرش کو چھوڑ رہی ہوں۔ نشست کی حالت یعنی ایمر جنسی میں اس سے بھی آ گئے۔ اشیائے خوردنی کے تقریباً اوپر بڑی ایمر جنسی میں ''تقریباً'' کا رسمی پردہ بھی اسی طرح اتار دیا جاتا ہے جس طرح پردہ نشین لڑکیاں کالج پہنچ کر اپنا نقاب اتار دیتی ہیں۔

دستر خوان کی دوسری صف پہلی صف سے متصل اور اس قدر متصل کہ مسجد کے علاوہ کہیں اور متصل ہو جائے تو اگلی صف والے ''ازالہ حیثیت عرفی'' کا دعوی کر بیٹھیں اور نقص امن کا خطرہ پیدا ہو جائے۔ آپ حیران ہوں گے کہ دوسری صف والے اپنا رزق کیونکر حاصل کرتے ہیں۔ اس منظر کی منظر کشی آسان ہے بشر طیکہ آپ نے کسی مشہور تماشے کے موقع پر شائقین کو ٹکٹ خریدتے دیکھا ہو۔ نہیں دیکھا تو اسے ضرور دیکھ لیجئے۔ آپ کی نالج میں حیرت انگیز اضافہ ہوگا۔ دستر خوان کی تیسری اور آخری صف کے لوگ کھڑے کھڑے روزہ افطار کرتے ہیں۔ یہ حضرات اگلی صفوں میں بیٹھے ہوئے افراد کے سروں پر سے جھک کر دستر خوان پر حملہ کرتے ہیں اور مٹھی میں اپنا رزق لیکر سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر کھڑے کھڑے ہاتھ میں دبا ہوا اپنا رزق پورا کرتے ہیں۔ ختم ہونے پر پھر جھک جاتے ہیں اس عمل میں ان کے گھٹنے پچھلی صف والوں کی پشت پر، پیٹ ان کی گردن پر اور سینہ اگلی صف والوں کے سروں پر ہوتا ہے اور ہاتھ دستر خوان پر جھول جاتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جن کے سروں پر یہ حضرات لٹکے ہوتے ہیں انہیں احساس بھی نہیں ہوتا مگر اس وقت بڑی دشواری پیدا ہو جاتی ہے جب وہ گردن سیدھی کرنے کی غرض سے اپنے سر اونچا کر لیتے ہیں ایسا کرنے سے سروں پر جھکے ہوئے لوگوں کے پیر بھی زمین سے اوپر اٹھ جاتے ہیں اور وہ ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں مگر ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے اس لئے کہ یہ ''شاذ'' خود بھی ''نادر'' ہے ہاں تو قارئین با تمکین میں عرض کر رہا تھا کہ کھڑی صف والوں کا تھوڑے تھوڑے وقفے سے جھکنے، رزق حاصل کرنے اور سیدھے کھڑے ہو کر اسے پورا کرنے کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک دستر خوان موجود رہے اور دستر خوان اس وقت تک موجود رہتا ہے .. چھوڑئے! خواہ مخواہ بات طویل ہو جائے گی اور اختصار میں خلل پڑے گا۔ اجمالاً یوں سمجھئے کہ کچھ لوگ مغرب کی اذان شروع ہونے کے بعد دستر خوان چھوڑتے ہیں اور کچھ نماز شروع ہونے کے بعد۔ کچھ اذان ختم ہونے کے بعد اور کچھ نماز ختم ہونے کے بعد (براہ کرم

اس جملے میں جہاں جہاں لفظ کچھ آیا ہے اس کے آگے بطور احتیاط ایک لفظ تقریباً اور چپکا لیں ورنہ بات حرف بہ حرف صحیح ہو جائے گی اور آپ کو معلوم ہے کہ "راستی فتنہ انگیز" ہو تو "دروغ مصلحت آمیز" سے بہتر نہیں) آیئے! اب وہیں واپس چلتے ہیں جہاں ہم نے کہا تھا کہ ہم مسجد پہنچے۔ یہاں سے ہماری داستان خوں چکاں کچھ یوں شروع ہوتی ہے کہ جب ہم مسجد پہنچے تو وہ خیال صریحاً غلط ثابت ہوا جس کے بل پر ہم اگلی صف میں بیٹھنے کا خواب دیکھ رہے تھے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں قصے کو ایک ذرا سا بریک دیکر ہم آپ کو یہ قیمتی معلومات ضرور فراہم کر دیں کہ آگے بیٹھنا کتنا بھی تکلیف دہ ہو اس میں مالی نقصان کا اندیشہ کم سے کم رہتا ہے (نوٹ مالی نقصان سے ہماری مراد "مال غنیمت" یا مال المومنین یعنی دستر خوان کا مال ہے) صفوں اور چوکیوں کے حالات دیکھ کر ہم ابھی مایوس ہونے کا اردہ کر ہی رہے تھے کہ ایک شنا سا چہرے نے ڈھارس بندھائی اور ہم پرامید ہو کر باشتیاق ان تک پہنچے مگر جب ان تک پہنچے تو وہ توتے بن چکے تھے ہمیں سخت صدمہ ہوا اور دوستوں کی بے وفائی اور بے اعتنائی پر سیکڑوں اقوال زریں اور ان سے بھی زیادہ اشعار ذہن میں کلبلانے لگے مگر، ہمیں غالب کے اس شعر میں سکون نصیب ہوا اس میں غالب نے کمال ذہانت سے زمانے کے ہر آزار پر پانی پھیر کر رکھ دیا کہتا ہے۔

زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے

ہمیں یاد آیا کہ پچھلے جمعے کی ایمر جنسی میں ہم نے جن صاحب کو اپنی پشت والی صف میں جگہ دلوائی تھی وہ آگے بیٹھے ہیں اور آج کی ان کی باری ہے مگر انہوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں خیر انہیں ہم اگلے رمضان میں دیکھ لیں گے فی الحال تو کہیں جگہ تلاش کرنی چاہیے یہ سوچ کر ہم ادھر ادھر نگاہیں دوڑانے لگے مگر کہیں کسی صف میں داخل ہونے کا ایک سوراخ بھی نظر نہیں آیا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سارا کا سارا مجمع جڑواں پیدا ہوا ہے۔ ہم ابھی تلاش معاش کے "بحر ناپید کنار" میں غوطہ خوری ہی کر رہے تھے کہ سائرن کی آواز نے حواس باختہ کر دیا۔ تمام "غازیان افطار" بیک وقت دستر خوان پر ٹوٹ پڑے۔ ہم بھی بے محابہ اور بے تحاشہ لپک کر اسی "ہجوم مشتاقاں" میں گھسنے کی کوشش کرنے لگے۔ دستر خوان کے نزدیک ایک بزرگ صورت انسان کا فرشتوں جیسا معصوم چہرہ نظر آیا ہمیں یہ جگہ نسبتاً

محفوظ اور بزرگ بے ضرر معلوم ہوئے چنانچہ انہیں کے قریب کھڑے ہو کر دستر خوان پر جھکنے کی جسارت کر بیٹھے۔ قریب تھا کہ ہمارا ہاتھ ساحل دستر خوان کی اشیائے خورد ونوش کے ذائقے دار لمس سے لذت یاب ہو کہ اس فرشتہ صورت بزرگ نے اس زور سے ہمیں دھکا دیا کہ ہم ایک دوسرے بزرگ پر جا پڑے اس کے بعد ہماری دست درازی تو دھری کی دھری رہ گئی مگر وہاں ان دونوں بزرگوں نے زبان درازی شروع کر دی اور ایسی زبان درازی کی کہ خدا کی پناہ! کچھ باتیں تو چنوں کے ساتھ "نقطے ہٹا کر" بھی ان کے منہ سے نکل گئیں ہمارے پیچھے کچھ نوجوان تھے جنہیں ابھی تک جگہ نہیں ملی تھی انہوں نے اس سچویشن سے بھر پور فائدہ اٹھایا اور بزرگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ ہمیں صف سے باہر کر دیا اور خود پوزیشن سنبھال لی۔ دونوں بزرگوں نے ان کے کارنامے سے متاثر ہو کر انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور مال غنیمت سے ان کی بھر پور تواضع کرتے رہے۔ ادھر ہمارا یہ حال تھا کہ غصہ، ندامت، ملامت اور افسوس کی شدت نے ذہنی توازن کے ساتھ ہمارا جسمانی توازن بھی بگاڑ دیا تھا۔ یہ حال زار دیکھ کر ہماری جیسی مصیبت کے مارے دو چار اللہ کے بندے، خدا انہیں جنت میں خوب افطاری کھلائے، ہمارے نزدیک آئے اور ہمیں دلا سا دینے لگے۔ سچ ہے مصیبت میں مصیبت والا ہی کام آتا ہے۔ مصیبت والا مصیبت والا بھائی بھائی۔ ہم سب مل کر پانی کے مٹکوں تک پہنچے اور پانی سے روزہ کھولنے کی سنت ادا کر کے ان سے زیادہ ثواب حاصل کیا۔ ادھر وہ سب دنیاو مافیہا سے بے خبر ہو کر انواع و اقسام سے بھرے پڑے دستر خوان پر طالع آزمائی کر رہے تھے اور اِدھر میں سوچ رہا تھا کہ احباب معلوم نہیں کون سی فلم دیکھنے گئے ہیں۔

O

جب اچانک میکے سے بیوی آجائے

کسی بیاہتا شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ

یہ مصرعہ سن کر ہمیں بھی اپنا زمانہ یاد آگیا سبحان اللہ کیا اچھے دن تھے۔ ہم سینکڑوں نگاہوں کا مرکز تھے۔ ہر وقت کچھ حسینوں کی اور کچھ ان کے والدین کی نظریں ہمارا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ گھر گھر آؤ بھگت ہوتی پیار محبت کے ڈونگرے برستے اور ہماری تعریف و توصیف میں وہ ساری باتیں کہی جاتیں جو ہمارے اندر نہ پہلے تھیں اور نہ آج ہیں۔ پھر کچھ ایسا وقت پڑا کہ اس چرخ کج رفتار کو ہماری یہ مقبولیت ایک آنکھ نہ بھائی اور ہمیں بھی اپنے بزرگوں کی تقلید میں ایک عدد بیوی کا شوہر بننے پر مجبور ہونا پڑا۔ (اگرچہ ایک عدد بیوی سے بزرگوں کی تقلید کا بھی "حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا"۔) یوں تو ہم اتنے نالائق کبھی نہیں رہے کہ بزرگوں کی برابری کا خیال بھی...... دل میں لاتے مگر ایک تو خود انہیں کا اصرار دوسرے ہم نے یہ بھی سوچا کہ بھلا ایک دو شادیوں سے بھی کسی نے بزرگوں کی برابری کی ہے جو ہم کریں گے۔ یہ خیال آتے ہی ہم اپنی شادی خانہ اولادی پر راضی ہو گئے شادی سے پہلے زندہ دلوں کے تمام شوق ہمارے اندر موجود تھے۔ شادی کے بعد ہماری بیوی ہمارے جملہ اعمال و افعال سے تو ہرگز خوش نہ تھیں مگر کچھ عادتوں سے بڑی مسرور اور مطمئن رہتی تھیں مثلاً گھر کے اندر سے دوستوں کی آواز سنکر کہلا دینا کہ گھر میں نہیں ہیں یا ان کے سسرالی مہمانوں کی ہر زاویے سے حوصلہ شکنی کرنا وغیرہ ہمارے کھیلنے کودنے پر بھی انہیں کوئی اعتراض نہ تھا بس ایک شرط تھی کہ دنیا بھر کے تمام کھیلوں میں ہماری پارٹنری کا حق صرف بیوی کو حاصل ہوگا۔ ہماری چند عادتیں تو انہیں بہت زیادہ عزیز تھیں۔ مثلاً ہمارے

کھانا پکانے، برتن صاف کرنے اور کپڑے دھونے کے شوق کو وہ بہت سراہتیں اور اپنی سہیلیوں کے درمیان ہماری ان خصوصیات کا بیان کچھ ایسے فخریہ انداز میں کرتیں کہ ان کی سہیلیاں احساس کمتری کا شکار ہو کر کچھ حسد اور کچھ رشک کرنے لگیں۔ بعض سہیلیوں نے ہمیں حسرت بھری نگاہوں سے بھی دیکھا۔ ہم اپنی بیوی کی زبان سے اپنی تعریف سن کر ریشہ خطمی ہو جاتے اور کبھی کبھی ان کے کپڑے بھی دھو ڈالتے۔ ہمارے گھر میں یہ کبھی کبھی روز کا معمول تھا۔ بس ہمارے شعر و شاعری والے شوق فضول سے وہ بہت بیزار تھیں۔ اس لئے ہمیں چوری چھپے یا ان کی غیر موجودگی میں اس شوق فروزاں کی پرورش کرنی پڑتی۔ چنانچہ آج بھی کچھ ایسا ہی ماحول تھا۔ بیوی کو میکے گئے ہوئے ابھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے ہمارے محتاط اندازے کے مطابق انہوں نے میکے لے جانے والا جیب خرچ ابھی واپس لوٹ آنے کی حد تک ختم نہیں کیا ہو گا۔ اس خیال کی حوصلہ افزائی اور کچھ نئی غزلوں کی ترغیب پر ایک شعری نشست کا اہتمام کر لیا تھا۔ چند احباب شام ہی سے ہمارے دولت کدے پر جمع تھے۔ (دولت کدہ ہم نے از راہ مصلحت کہا ہے۔ دراصل ہمیں کرائے کے مکان میں رہنے کا شوق ہے۔ اور دوسرے کے مکان کو غریب خانہ کہنے کی جرات نہیں ہوتی) خیال خاطر احباب کے ساتھ ساتھ خیال داد شعر بھی تھا اس لئے ان کے آبگینوں کو ٹھیس سے بچانے کی خاطر مدارات پر یوں کمربستہ ہوئے کہ گھر کے بجٹ کے تمام آبگینے خوابوں کی طرح ٹوٹ گئے۔

کھانے سے فارغ ہو کر نشست شروع ہوئی جو بہت جلد شباب پر آ گئی۔ بیاض میں انگلی دبائے ہم اپنی باری کے منتظر تھے کہ ہمارے نام کا اعلان ہوا۔ ادھر یہ اعلان ہوا، ادھر کال بیل نے کسی کی آمد کا اعلان کر دیا۔ صاحب خانہ ہونے کی وجہ سے صدر مجلس کی اجازت حاصل کر کے ہم بہ نفس نفیس دروازے پر پہنچے اور اس بے وقت کی آمد پر ناگواری اور جھنجلاہٹ کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ لیکن جیسے ہی دروازہ کھلا اور آنے والے پر نظر پڑی شاعری کی ڈائری ہمارے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گئی اور ہم پہلے ہکا بکا ہوئے پھر حواس باختہ ہو گئے۔ جی ہاں آپ نے صحیح اندازہ لگایا۔ یہ ہماری بیوی ہی تھیں جو ہماری ہیئت کذائی پر خود بھی پہلے حیران پھر مشکوک ہو گئی تھیں۔ ابھی ہم اپنے ہوش و حواس ٹھکانے کرنے کی جدو جہد میں مصروف ہی تھے کہ بیوی کی آواز گویا دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی۔

"اجی کیا میرا گھر آنا آپ کو ناگوار گزرا یا نصیب دشمناں طبیعت ناساز ہے۔"
ہم نے بدقت تمام موزوں الفاظ کے ساتھ خوش مزاجی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ! بخدا آپ" یعنی کہ بیوی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ ہمیں تو آپ کو دیکھ کر یقین کیجئے ایسی مسرت ہوئی ہے کہ بیان نہیں کر سکتے۔ دراصل آپ خود سوچیئے۔ دیکھئے نا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ اس وقت یکایک، اچانک یعنی کہ یوں آ جائیں گی۔ دراصل اس وقت آپ کا آنا معجزہ نہیں تو کرامت ضرور ہے۔ کل ہی میں نے آپ کو خواب میں یاد کیا تھا۔ سچ ہے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔"

بیوی ہماری ان اول فول باتوں پر شاید مسکرانا چاہتی تھیں کہ معاً ہماری شاعری والی ڈائری پر نظر پڑ گئی بس پھر کیا تھا۔ اچانک موڈ بدل گیا۔ مسکراہٹ ہونٹوں پر آنے سے پہلے ہی غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔ زہر خند ہو کر بولیں۔

"اچھا تو یوں کہو کہ شاعری فرمائی جا رہی ہے۔ جب ہی تو میں کہوں کہ آج یہ خوشامد کس لئے ہو رہی ہے۔ اس مختصر تمہید یا تشبیب کے بعد گریز سے گریز کرتے ہوئے براہ راست مدح پر آ گئیں۔ "کیوں جی میں نے آپ سے کتنی بار کہا ہوگا کہ اس آفت ماری کا پیچھا چھوڑو۔ مگر خدا جانے اس کم بخت میں ایسے کون سے لعل لٹکے ہوئے ہیں کہ جو دیکھو اس کے پیچھے دیوانوں کی طرح واہ واہ کر رہا ہے۔"

ہم بیوی سے واقف تھے کہ اب وہ کسی صورت بند نہیں ہو سکتیں اس لئے جلدی سے ان کا ہولڈال اٹھایا اور مکان کے دوسرے حصے کی طرف چل دیے بیوی بھی بڑبڑاتی ہوئی ہمارے پیچھے چلی آئیں۔ غصہ ندامت اور خوف سے ہمارا خون کبھی ٹھنڈا اور کبھی گرم ہو رہا تھا۔ ہولڈال رکھ کر خاموشی سے مشاعرہ گاہ میں پہنچے اور انتہائی غمزدہ چہرہ بنا کر بیوی کے آنے کی اطلاع دی اور ان کے ایک قریبی عزیز کے انتقال کی دکھ بھری خبر سنا کر سب سے معذرت کی۔ سب نے انگریزی طرز پر ہمارے غم میں شرکت کا اعلان کیا اور ہمارا کلام بلاغت نظام سنے بغیر خوشی خوشی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ہم نے اچٹتی سی نظر اپنے گھر پر ڈالی۔

عجیب منظر تھا۔ ہر چیز اپنے مقام سے محروم نظر آئی۔ یہاں آپ کو یہ بتانا از بس

ضروری ہے کہ "ہماری بیوی "شامت اعمال ما" انتہائی سلیقہ شعار واقع ہوئی ہیں۔ کیا مجال جو ماچس اپنا کام کر کے جگہ پر واپس نہ آئے یا فرش پر تنکا نظر آجائے۔ انتہا تو یہ ہے کہ پانی کے برتنوں کے ڈھکن ٹیڑھے ہوں یا کتابیں بکھرنا تو کجا آگے پیچھے بھی رکھی نظر آئیں تو انہیں اختلاج ہونے لگتا ہے جب کہ ہمیں ایسا نہ ہونے پر یہ بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ خیر ہم تو شادی کے بعد ہی سے اختلاج کے ایسے عادی ہو چکے ہیں کہ اگر نہ ہو تو بیمار نظر آنے لگتے ہیں مگر آج گھر کا حلیہ بیوی کا ہارٹ فیل کرنے کے لئے کافی سے بھی زیادہ ہی تھا مثلاً باورچی خانے کے سارے جھوٹے برتن پانی کے مٹکوں کے پاس تھے۔

کتابیں تخت کے اوپر بکھری تھیں اور بستر پلنگ کے نیچے سگریٹوں کے ٹکروں نے فرش کی خاصی بے حرمتی کی تھی۔ دروازے کی چلمن میں بنا ہوا روشن دان، یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ آگ کی چنگاری کا مرہون منت تھا کہ سگریٹ کے کسی جلے ہوئے ٹکڑے کا۔ گھر کا سارا بستر دوسرے کمرے میں مشاعرے کا فرش بنا ہوا تھا۔ لحافوں کو گول کر کے گاؤ تکیے بنائے گئے تھے۔ گھر کی یہ درگت دیکھ کر ہم سہم گئے اور بیوی کو ہارٹ اٹیک سے بچانے کی فوری تدبیریں سوچنے لگے۔

فرسٹ ایڈ کے طور پر ہم نے جلدی جلدی سب سامان اپنے مقام پر پہنچانے کی ناکام کوشش کی ہمارا یہ اضطراری عمل ایسا ہی تھا جیسے کوئی چور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سامان باندھ کر لے جانا چاہتا ہو۔ چنانچہ ایسے غیر فطری عمل کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ جو سامان اپنی جگہ بر قرار تھا وہ بھی بیقرار ہو گیا اور جو چیزیں اب تک کسی طرح محفوظ رہ گئی تھیں وہ بھی خطرے میں پڑ گئیں۔

اس کارروائی سے فارغ ہو کر ہم بیوی کے پاس پہنچے.. اور ایک نسوانی ماہر نفسیات کے بتائے ہوئے نسخے کے مطابق ان کے میکے کے حالات پوچھنے لگے۔ بیوی جو پہلے ہی سے منہ پھلائے بیٹھی تھیں بھنا کر بولیں۔

"آپ کو کسی کے مزاج سے کیا سروکار کوئی کیسا بھی ہو۔ آپ تو بس اپنی شاعری سے مطلب رکھیئے!"

ہم نے کہا بیوی! آخر آپ کو شاعری جیسی عظیم شے سے اتنا بیر کیوں ہے؟ آپ کو نہیں معلوم۔ شاعروں نے تو بیوی کو حور کہا ہے۔ کیا آپ نے وہ گانا نہیں سنا۔

"کیسی بھی ہو بیوی شوہر کے لئے حور ہے"

بیوی ابھی تک اندر کے حالات سے بے خبر تھیں اس لئے ہماری باتوں میں آ گئیں اور موڈ میں آ کر بولیں۔

"اس گانے میں یہ کہاں ہے کہ شوہر کے لئے اپنی ہی بیوی حور ہے!"

ہم نے کہا "بیوی! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ اس کا پہلا مصرعہ بھی تو دیکھئے! صاف کہا ہے ؎

اپنی اپنی بیوی پہ سب کو غرور ہے

کہنے لگیں۔ "شاعر کے دل میں چور ہے ورنہ آخر اپنی اپنی کہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ہم بیوی کی اس دلیل پر جل کر رہ گئے مگر مصلحتاً خاموش رہے۔ بیوی اٹھ کر گھر کے اس حصے میں جانے لگیں جہاں سے ایک سیل بے اماں گزر چکا تھا۔ ہم نے نہایت ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "اب اس وقت کہاں جا رہی ہیں؟ چھوڑیے صبح دیکھئے گا اس وقت آرام کیجئے۔ کافی تھک گئی ہوں گی۔"

ہماری اس خلاف معمول اور خلاف توقع ہمدردی نے جو بوکھلاہٹ میں ہم سے ہمیشہ ناوقت سرزد ہوتی ہے، بیوی کو کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ ہم انہیں زیادہ سوچنے کا موقع دے کر اور زیادہ شکوک و شبہات میں نہیں ڈالنا چاہتے تھے، اس لئے انتہائی پیار بھرے لہجے میں بولے۔

"آپ کو نہیں معلوم۔ آپ کی غیر موجودگی میں سارا گھر ہمیں کھانے کو دوڑتا ہے کسی نے سچ کہا ہے کہ گھر کی رونق بیوی ہی کے دم سے ہوتی ہے۔ اتفاق دیکھئے کہ لفظ "بیوی" میں جو حروف آتے ہیں ان سے کتنے اچھے معنی نکلتے ہیں جیسے "ب" سے "بیوٹی" (سارے گھر کی) "ی" سے "یاد" (جو ہمیشہ بیوی سی وابستہ رہتی ہے) "واؤ" سے "وسیلہ" (ساری خوشیوں کا) دوسری "ی" سے دوسری مرتبہ "یاد"۔

ہم نے کھینچ تان کر اچھے معنی تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ بیوی بھلا کہاں چوکنے والی تھی۔ فوراً تنک کر بولی۔ "مگر عملاً تمام شوہر اپنی اپنی بیوی کو "ب" سے "باندی" "ی" سے "یمدوت" "واؤ" سے "وبال" اور دوسری "ی" سے "یخنی" سمجھتے ہیں۔"

ہم نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "بیوی! آپ بہت زیادتی کر رہی ہیں۔ آپ نے شوہر اور شاعر دونوں کی توہین کی ہے۔ جب کہ دونوں رحمت ہیں۔ شاعروں نے عورت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملادیے ہیں !"

جھٹ سے بولیں "جی ہاں! غیر عورت کی تعریف میں۔ اپنی بیوی کی تو آج تک کسی نے تعریف نہیں کی۔"

ہم نے کہا۔ "یہ سراسر تہمت ہے۔ الزام ہے۔ بہتان ہے۔ دور کیوں جاتی ہیں۔ لیجئے ہماری ہی غزل سنئے!"

کس قدر کیف بداماں ہیں ہماری بیوی
ایسی کیا ہوں گی کسی اور کی پیاری بیوی

اپنے میکے کی ہیں گر راج دلاری بیوی
تو ہیں سسرال کی بھی آنکھ کی تاری بیوی

بات بے بات پہ ناراض ہوئی جاتی ہیں
کیا ہی دلچسپ ہیں اللہ ہماری بیوی

ہم کو بھاتی ہے اسی وقت سے صورت ان کی
اپنے میکے میں تھیں جس وقت کنواری بیوی

سب عزیزوں نے بیک ٹنگ کہا ہے ہم سے
خوب سیرت بھی ہیں واللہ تمہاری بیوی

کبھی خوش ہیں تو نظر آتی ہیں پوری شوہر
کبھی غصے میں وہ بن جاتی ہیں ساری بیوی

ہماری مرصع غزل سن کر بیوی مسکراتی ہوئی تیزی سے مڑیں اور گھر کے اس حصے

میں چلی گئیں یعنی "دل جس سے ڈر رہا تھا وہی بات ہو گئی"۔ ہم بھی ہڑبڑا کر ان کے پیچھے دوڑے مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ گھر کا حلیہ دیکھ چکی تھیں اور ان کے دل و دماغ کے ہیرو شیما اور ناگاساکی پر بمبارڈمنٹ ہو چکا تھا۔ گھر دیکھ کر ان پر سکتہ طاری ہو گیا۔ ہم سوچ رہے تھے ؂

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت نہ وہ در کی صورت

اور ان کی یہ حالت تھی کہ ؂

کبھی وہ ہم کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتی تھیں

ساری فضا خاموش تھی مگر اس خاموشی میں اتنے سوالات گونج رہے تھے کہ تصور کے کان بہرے ہونے کا اندیشہ لاحق ہو گیا تھا۔ بیوی کا عالم یہ تھا کہ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور ؂

ہر سمت پڑھ رہی تھیں وہ اہل جفا کے نام

ہماری یہ حالت تھی کے سر جھکائے ؂

ہم بھی کھڑے ہوئے تھے گنہگار کی طرح

پھر نہ جانے کیسے ناگاہ بیوی کی نگاہوں سے ہماری نگاہیں ٹکرا گئیں ہمیں ایسا لگا جیسے بیوی رونے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ ہم بوکھلا گئے اور بوکھلاہٹ میں بلا ارادہ بے ساختہ ہماری زبان سے نکلا ؂

اور نکھر آتی ہیں غصے میں ہماری بیوی

بیوی پر اس مصرعے کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ روتے روتے اچانک ہنس پڑیں۔ اور آنسو جو رونے کے ارادے سے آنکھوں میں آئے تھے ہنسی میں شامل ہو گئے ایسا معلوم ہوا جیسے پانی برستے برستے یکایک دھوپ نکل آئی ہو۔

○

بہشت آنجا کہ مہمانے نہ باشد

(گھر جنت ہے اگر بن بلائے مہمان نہ آئیں)

معزز سامعین اور قارئین! دنیا میں یوں تو سیکڑوں قسم کی آفات ارضی وسماوی موجود ہیں مثلاً آندھی کا آنا، اولے پڑنا، یا آپ جنگل میں ہیں تو اچانک شیر یا چیتے سے مڈ بھیڑ ہو جانا۔ یہ سب مصائب ہیں مگر ان میں سے کوئی آفت ایسی نہیں جس کی پیش بندی یا تدارک ممکن نہ ہو لیکن ان میں سے کوئی شے اس لئے زیادہ خطرناک اور خوفناک نہیں کہ پہلے سے ان کا علم، قیاس یا اندازہ ہو جاتا ہے یا کیا جا سکتا ہے اور انسان ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار اور خبردار کر دیتا ہے۔ آندھی اور اولوں سے قبل ان کے آثار نظر آنے لگتے ہیں اس لیے آپ بھاگ کر کسی پناہ گاہ میں پہنچ سکتے ہیں۔ شیر اور دوسرے جنگلی جانور اول تو خواہ مخواہ ستانا خود ہی پسند نہیں کرتے۔ پھر انسان جانتا ہے کہ ان سے ملنے کا امکان کب اور کہاں ہو سکتا ہے اور اگر مل بھی جائیں تو انسان ان سے بچنے بچانے کی ترکیب کر لیتا ہے لیکن بن بلایا مہمان ایک ایسی بلائے ناگہانی ہے جس کے بارے میں کوئی بھی قیاس آرائی کار محال ہے۔

ذرا آپ تصور کیجئے آپ اپنے اہل وعیال کے ساتھ کہیں باہر جانے کا پروگرام طے کئے بیٹھے ہیں۔ دفتر سے چھٹی لے لی ہے۔ ناشتہ تیار ہو چکا ہے۔ ضروری سامان باندھ کر رکھ دیا ہے۔ بچے کپڑے بدلنے میں مصروف ہیں کہ اتنے میں اچانک کال بیل کی آواز آتی ہے۔ ٹررن ٹررن آپ کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ دروازے کی جانب بڑھتے ہیں دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھل کر باہر جھانکتے ہیں اور پھر باہر کا منظر --- آپ کے کوئی دور کے عزیز یا دوست یا دوست کے دوست یا وطن کے شناسا اپنی ایک عدد بیوی اور چار عدد بچوں کے ساتھ موجود ہیں۔ اگر ایسا ہو تو کہئے آپ کیا کریں گے؟ ان کو ڈانٹیں گے، بھگا

دیں گے۔ اپنے کپڑے پھاڑ لیں گے۔ چیخیں گے۔ سر پیٹنے لگیں گے۔ کیا کریں گے میرا خیال ہے کچھ نہیں کریں گے۔ جی ہاں ایسا کچھ نہیں کریں گے۔ آپ ان کو دیکھ کر مسکرائیں گے حالانکہ آپ کا دل رو رہا ہو گا۔ گھر میں لا کر خوشی کا اظہار کریں گے جو بالکل نقلی اظہار ہو گا۔ خیریت دریافت کریں گے اور وہ سارا ناشتہ جو آپ کی بیگم نے ابھی تیار کیا ہے ان کے آگے رکھ کر ناشتے اور پروگرام کی تباہی کا منظر دیکھیں گے اس پر طرہ یہ ہے کہ اپنے پروگرام کے سبوتاژ بلکہ چوپٹ ہو جانے کا بلند آواز سے ماتم بھی نہیں کر سکیں گے اس طرح اپنی تہذیب و روایات، اخلاق و آداب کے تقاضوں کی منھ بھرائی کرنے کے لئے بچوں کے ارمانوں کا خون ناحق کرتے رہیں گے۔ کسی نے جنت کی تعریف یہ کی ہے کہ وہاں بن بلایا مہمان نہیں آئے گا گیا ''بہشت آنجا کہ مہمانے نہ باشد'' ہماری دنیا اسی لئے جنت نہ بن سکی کہ اس میں بن بلائے مہمان ہی زیادہ آتے ہیں۔

خواتین و حضرات! آپ بڑے سے بڑے نجومی سے ملیے وہ آپ کے ماضی حال اور مستقبل کے بارے میں سب کچھ بتا سکتا ہے یہ کہ آپ کب پیدا ہوئے، کیوں پیدا ہوئے کس دن داغ مفارقت دے بیٹھیں گے اور یہ بھی کہ پیدائش اور موت کے ان دونوں حادثات کے درمیان کتنے بچے اور کتنی بیویاں آپ کے نصیب میں ہوں گے۔ امیر بننے عرب جائیں گے یا یہیں کہیں بن جائیں گے۔ تعلیم ڈگری والی ہو گی یا علم والی، پیسہ اپنا ہو گا یا سسرال کا۔ مکان خود بنوائیں گے یا بنا ہوا پائیں گے الغرض جو کچھ آپ معلوم کرنا چاہیں گے وہ بھی اور جو نہ معلوم کرنا چاہیں گے وہ بھی دست شناس آپ کو بتا دے گا مگر ایک بن بلایا مہمان کس دن آپ کے گھر وارد ہو گا آج تک کسی اختر شناس یا قیافہ شناس نے بتایا نہ بتا سکتا بس اتنا کہہ سکتا ہے کہ جب ستارے گردش میں ہوں تو یہ واقعہ ظہور پذیر ہو سکتا ہے مگر موت اور بن بلائے مہمان کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ انسان جو ہر مصیبت کی پیش بندی کرنے میں مہارت حاصل کر چکا ہے بن بلائے مہمان کی در آمد روکنے کی سبیل تا حال بر آمد نہ کر سکا۔ مثال کے طوف پر بچوں کو مختلف بیماریوں کے حملے سے بچانے کے لیے پیشگی انجکشن دیدئے جاتے ہیں۔ قحط اور سیلاب کے خوف سے اناج کا ذخیرہ اور مکان کا پشتہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ جنگ کا خطرہ ہو تو دفاع کا مکمل بندوبست کر لیا جاتا ہے۔ سردی، گرمی اور بارش سے قبل موسم کی سختیوں کے بچنے کا انتظام کر لیا جاتا ہے، ۶۲ ان تمام کاموں میں انسان کی کامیابی اس لیے ممکن ہو جاتی ہے کہ اسے ان سب چیزوں کا پہلے سے

کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جاتا ہے لیکن چونکہ بن بلائے مہمان کی آمد کا کوئی وقت ہی مقرر و متعین نہیں ہوتا اس لیے کسی پیش بندی کا سوال بھی نہیں پیدا ہوتا، بلکہ میں تو اپنے تجربے کی بنیاد پر یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ بعض وقت تو پہلے سے علم ہونے کے بعد بھی کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کہیں گے گھر سے ٹل جائیں۔ میری گزارش ہے کہ یہ بھی کر کے دیکھ لیا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک خیر خواہ نے اطلاع دی کہ فلاں صاحب معہ اہل و عیال تشریف لانے والے ہیں قیام آپ کے گھر ہو گا میں یہی کہنے کے لئے حاضر ہوا تھا ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور حسب استطاعت تواضع بھی کی۔ اطلاع دینے کے معاوضے میں انہوں نے چار روز ہمارے ساتھ قیام فرمایا دوران قیام آنے والے مہمان کی آمد کے بعد پیش آنے والی دشواریوں کے خطرات سے صبح و شام خوف زدہ کرتے رہے۔ موصوف اپنی دوکان کا کچھ سامان خریدنے کی غرض سے دہلی تشریف لائے تھے۔ ہمیشہ ہوٹل میں ٹھہرتے تھے مگر اس بار ہم پر جو رحم آیا تو ایک احسان کرنے سیدھے یہیں چلے آئے خدا کی زمین نیک بندوں سے کبھی یکسر خالی نہیں ہوتی۔ خدا اپنے نیک بندوں کو امتحان میں بھی ڈالتا ہے اور ان کی مدد بھی کرتا ہے ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انہیں جس دکان سے سامان خریدنا تھا وہ دوکاندار بقول ان کے کہیں باہر گیا ہوا تھا اس سے ادھار چلتا تھا اس لے زیادہ رقم بھی نہیں لائے تھے۔ اب یا تو اس دوکاندار کی واپسی کا انتظار کریں یا ہم ان کے لیے پیسے کا انتظار کریں تا کہ وہ دوسری جگہ سے سامان خریدنے کے لائق ہو سکیں ہم شاید دوسرا راستہ اختیار کر لیتے مگر وہ ہماری بساط سے باہر تھا مجبوراً بہ ہزار شرمندگی ہم نے معذرت کر لی لیکن جب چار روز کے بعد بھی ان کا دوکاندار واپس نہیں آیا تو قرض لے کر انہیں قرض دیا۔ جاتے جاتے انہوں نے اپنے تجارتی نقصانات اور اپنے چار دن خراب ہونے کی کچھ اس انداز سے شکایت کی کہ ہمیں ایک بار پھر شرمندہ ہونا پڑا ان کا یہ کہنا شاید بجا تھا کہ جو قرض آج لیا ہے وہی اگر ہم نے چار روز پہلے لے لیا ہوتا تو ان کا اتنا نقصان نہ ہوتا بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا دوکاندار کہیں نہیں گیا تھا۔ در اصل وہ پچھلا حساب بے باق کئے بغیر انہیں تازہ مال دینے پر رضامند نہیں ہوا۔ بہر حال ان کے جانے کے بعد اہل و عیال والے مہمان کی آمد کا کچھ ایسا خوف سوار ہوا کہ ہم بستر بوریا باندھ کر چند روز کے لیے فوراً سسرال جا پہنچے پھر جب اہل و عیال والے مہمان کے آنے اور اپنے حساب سے واپس چلے جانے کی تاریخ بھی نکل گئی تو گھر واپس لوٹے۔ ہاتھ منھ دھو کر کھانا کھایا اور تکان اتارنے کی غرض سے بستر پر دراز ہو گئے۔ لیٹتے ہی نیند نے آدبوچا خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک

بہت بڑے پنڈال میں سیکڑوں لوگ جمع ہیں خوبصورت اسٹیج پر کچھ معزز ہستیاں براجمان ہیں پنڈال کی اگلی صف میں چند کرسیاں سلیقے سے بچھی ہیں انہیں میں سے ایک پر ہم بیٹھے ہیں معلوم ہوا کہ یہ خصوصی انعامات کی تقسیم کا جلسہ ہے۔ انعامات دو اصحاب کو دیئے جائیں گے۔ ایک سائنس داں جس نے کینسر کا کامیاب علاج دریافت کیا ہے اور ایک سماجی کارکن جس نے بن بلائے مہمان سے بچنے کا طریقہ معلوم کر کے شہر والوں پر احسان عظیم کیا ہے اس دوسرے انعام کے لیے جب ہمارا نام پکارا گیا تو سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا ہم نہایت شان سے چلتے ہوئے اسٹیج پر پہنچے صدر نشین نے ہمارے گلے میں ہار ڈال کر پہلے مصافحہ اور پھر معانقہ کیا تو تمام لوگ تالیاں بجاتے ہوئے اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوگئے مگر صدر نشین نے مصافحہ اتنی زور سے کیا کہ ہمیں اپنی انگلیاں ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

ہم درد کی شدت سے چیخ اٹھے اور پھر اچانک ہماری نیند کھل گئی۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے ایک بے تکلف دوست نہایت مضبوطی سے ہمارے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے ہیں ان کے بچے تالیاں پیٹ رہے ہیں اور دوست تمسخر آمیز لہجے میں کہہ رہے ہیں۔ اماں یار غضب کی نیند ہے تمہاری۔ کب سے اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اٹھنا تو کجا کروٹ بھی نہیں بدلی اماں اس شور و غل میں تو مردے بھی جی اٹھتے ہیں۔ اٹھو۔ دیکھو کون آیا ہے۔ ہم نے محسوس کیا کہ ان کا ایک بچہ ہمارے سینے پر لیٹا ہے اس کے ہاتھ ہماری گردن میں ہیں اور انکل انکل کر رہا ہے۔ نیند سے بیدار ہونے میں جتنا وقت لگا ہوگا اس سے کہیں زیادہ پچوشن کو سمجھنے میں لگا۔ پھر جب ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ وہی مہمان ہیں جن کے خوف سے ہم بھاگے بھاگے پھر رہے تھے تو جی چاہا کہ دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیں پھر قہقہے لگا کر ہنسیں تاکہ لوگ ہماری صحیح ذہنی کیفیت سے واقف ہو سکیں لیکن وائے افسوس کہ ہم ایسا کچھ نہ کر سکے۔ نقلی ہنسی کے ساتھ انہیں خوش آمدید کہا اور معذرت کرتے ہوئے ان کے سفر کا حال چال پوچھنے لگے۔ انہوں نے کہا یار تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہونا پڑا۔ ہمیں جب یہ معلوم ہوا کہ تم کسی ضروری کام سے کچھ روز کے لیے باہر جانے والے ہو تو اپنی پروگرام ملتوی کر دیا رزرویشن کی تاریخ آگے بڑھوائی اس نقصان کی ذمہ داری بھی تم پر عائد ہوتی ہے۔ بچوں کی تعطیلات اور ملازمت کے جھمیلوں کی وجہ سے ایک ایک دن کا حساب رکھنا پڑتا ہے بہر حال کل یہ سوچ کر چلے تھے کہ اگر تم اب بھی نہیں ملے تو آگے نکل جائیں گے اور پھر واپسی میں

تمہارے ساتھ قیام کریں گے۔یار بات یہ ہے کہ تمہارے بغیر بالکل مزا نہیں آتا۔ مبارک ہو سنا ہے تم نے گاڑی بھی خرید لی ہے پھر مسکرانے لگے مگر یار تم تو محض ٹیچر ہو پھر یہ گاڑی کہاں سے مار دی جو کچھ بھی ہو میرے بچے بہت خوش ہیں کہ انکل کی گاڑی میں گھومیں گے ماشاءاللہ گاڑی ہے خوبصورت بچے کبھی اس کی چھت پر لیٹتے ہیں کبھی بونٹ پر ذرا اٹھ کر دیکھو تو کس قدر خوش ہیں ہم ان کی خوشیاں دیکھنے کے لئے روتے ہوئے اٹھے مگر اس طرح کہ ہمارے آنسو کسی کو نظر نہ آئیں۔ ہم نے کہا یہ تم نے اچھا کیا کہ سیدھے یہیں چلے آئے اگر کہیں اور ٹھہرتے تو یہاں ہمیں شکایت ہو جاتی مگر یہ تو کہو تمہیں یہ کیونکر معلوم ہوا کہ ہم کہیں باہر جانے والے ہیں۔ جواب میں بولے ارے یار اسی غریب نے بتایا تھا جو تم سے کچھ رقم بھی قرض لے گیا ہے اور شاید ایک دو روز تمہارے ساتھ بھی رہا۔ کہہ رہا تھا کہ تم مانے ہی نہیں۔ ہوٹل سے اس کا سامان بہ اصرار گھر منگوا لیا۔ تمہاری تعریف کر رہا تھا مگر سنا ہے تمہارے یہاں بڑے مچھر اور کھٹمل ہیں اس غریب کا حال خراب کر دیا۔

قارئین وسامعین کرام! آپ جو بھی ہوں!

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

ہمارا صرف اتنا قصور ہے کہ ہم دلی میں رہتے ہیں جہاں دنیا بھر کے سفارت خانوں کے ساتھ پاکستانی سفارتخانہ بھی ہے۔پاکستان اور ہندوستان کے خوشگوار سفارتی تعلقات ان حکومتوں کے حق میں مفید ہیں یا غیر مفید یہ تو سفارت کار ہی سمجھ سکتے ہیں مگر ہمارے لئے اکثر بڑے ناخوشگوار ہو جاتے ہیں۔ جب دیکھو پاکستانی ویزا کے متوالے جماعت در جماعت دہلی میں موجود ہیں اس پر ستم ظریفی یہ کہ معہ اہل و عیال اس انداز سے آتے ہیں جیسے ویزا آفیسر ویزا لیے بس انہیں کے انتظار میں بیٹھا ہے پھر جتنے جانے والے ان سے زیادہ وداع کہنے والے۔ کبھی یہ لوگ اس خیال سے بھی دو چار روز قبل دہلی آجاتے ہیں کہ اس بہانے دہلی کی سیر بھی ہو جائے گی اور بچوں کی شاپنگ بھی گویا آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ اب یہ عازمین پاک، ان کے لواحقین اور ہم ---- تینوں ایک مگر تینوں کی کہانی جدا جدا۔ ہماری کہانی کا طربیہ جسے آپ المیہ بھی کہہ سکتے ہیں یہ ہے کہ بلا مبالغہ بیسیوں ٹیمیں براہ غریب خانہ پاکستان گئیں ہوں گی۔ جاتے ہوئے کوئی ایک دن ہمارے ساتھ رہا کوئی ایک ہفتہ کوئی ایک مہینہ اور کوئی اس سے بھی زیادہ۔ ہم نے حسب توفیق و استطاعت ان کی پذیرائی بھی کی

اور خاطر داری بھی مگر واپسی میں کسی نے دلی سے گزرنے کی اطلاع دینے کی بھی زحمت گوارہ نہ کی۔ سب کے سب خاموشی سے گزرے چلے گئے۔ گھر پہنچ جانے کے بعد کسی اور ذریعے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا رکھے فلاں صاحب جو بصد خرابی روانہ ہوئے تھے بہ ہزار عافیت (لدے پھندے) گھر پہنچ کر عزیزوں کو تحائف تقسیم کر رہے ہیں (حالانکہ اب پاکستان سے تحائف لانا اور تقسیم کرنا بھی گئے وقتوں کے یادگار قصے ہیں اسی لیے آمد و رفت میں بھی وہ جوش و خروش باقی نہیں رہا) ہمارا ایک ارمان تھا کوئی مسافر پاکستان سے واپسی میں بھی ہمارے گھر آنے کی تکلیف گوارہ فرمائے۔ دیکھئے کب پورا ہوتا ہے۔ شاید اب ہو جائے۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ مہمان خدا کی رحمت ہے مگر آج کا یہ بن بلایا مہمان ایک عجیب و غریب مخلوق ہے کہ اس کے بہت سے سچے واقعات بھی مافوق الفطرت عناصر کے واقعات کی طرح ناقابل یقین معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً کیا آپ یقین کریں گے کہ ایک مرتبہ موسم سرما کی چھٹیاں گزار کر جب ہم اپنے گھر پہنچے تو اپنے ہی گھر کے سامنے ایک شناسا سے ملاقات ہو گئی انہیں دیکھ کر تعجب ہوا۔ پوچھا آپ اس وقت یہاں کیسے؟ کیا آپ کو معلوم تھا آج ہم آنے والے ہیں۔ ہنس کر فرمایا میں تو آٹھ روز سے یہیں آپ کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ ہم نے مزید سوالات کئے تو معلوم ہوا موصوف ایک انٹرویو میں تشریف لائے تھے گھر میں تالا دیکھ کر مایوس ہوئے۔ تالوں میں اپنی چابیاں آزمائیں تو ایک چابی سے تالا کھل گیا اور مایوسی جاتی رہی تب سے یہیں براجمان ہیں۔ پڑوسی ان کی بے تکلفی اور اعتماد کو دیکھ کر سمجھے کہ یہ عزیز ضرور گھر سے چابی لے کر آئے ہوں گے، انہیں شکایت تھی کہ ہمارا مکان گراؤنڈ فلور پر نہ ہونے کی وجہ سے انہیں چڑھنے اترنے میں خاص زحمت ہوئی۔

ایک اور مہمان اپنے سال بھر کے بچے اور اس کی والدہ یعنی اپنی بیوی کے ساتھ آئے رمضان کا مہینہ تھا ہم نے خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ گھر کی تمام چیزوں پر عقابی نظر ڈالتے ہوئے بولے فریج نظر نہیں آتا۔ ٹھیک ہونے گیا ہوگا۔ ہم نے نفی میں سر ہلایا اور کہا ہمارے گھر میں فریج نہیں ہے۔ دونوں میاں بیوی تقریباً چیخ اٹھے اوہ گاڈ! پھر ہماری طرف اس طرح دیکھنے لگے جیسے ہم انسان نہیں کچھ اور ہیں پھر کہا آپ کس طرح زندہ رہتے ہیں ہمارا تو فریج کے بغیر گرمیوں میں ایک منٹ گزارا نہیں ہو سکتا۔ ہم نے بظاہر ندامت سے اپنا سر جھکا لیا مگر دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ اگر یہ فرج کے بغیر ایک منٹ نہیں رہ سکتے تو

بس دو ر چار منٹ کے ہی مہمان ہیں۔ اتنے میں ان کے بچے نے صوفے پر شو شو کرنا شروع کر دیا ہم نے گھبرا کر ان کی توجہ مبذول کرائی مگر وہ نہایت اطمینان سے بچے کی جانب دیکھ کر ہنستے ہوئے بولے۔ یہ شریر ہمیشہ صوفے یا ڈائننگ ٹیبل ہی پر ایسا کرتا ہے۔ دیکھئے ابھی نہ روکئے ورنہ مچل جائے گا اور بچے کو نقصان بھی ہو سکتا ہے غالب نے سچ کہا ہے۔

ڈرتا ہو "کال بیل" سے مہماں گزیدہ ہوں

رات ہوئی تو ہمارے مہمان ناشتے سے لے کر لنچ اور ڈنر تک کا پورا مینو بتانے کے بعد ہمارے بستر پر دراز ہو گئے صبح چائے طلب کی ہم نے رمضان کا ذکر کیا تو سفر کی رعایت کا مسئلہ بتا کر ہمیں یوں دیکھا گویا ہم مذہبی معاملات سے ناواقف محض ہیں۔ اس طرح تقریباً ایک ہفتہ ہمیں فریج کے بغیر شرف میزبانی عطا کرنے کے بعد بھی جب انہوں نے جانے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا تو ہم نے جھجکتے ہوئے عرض کیا کہ عید پر ہم گھر جانے والے ہیں آپ کا کیا ارادہ ہے فرمایا اب نکلے ہیں تو عید یہیں کر لیں گے آپ چابی دے جائیں جاتے وقت پڑوسی کے حوالے کر دیں گے۔ اتنے روز آپ کے گھر کی دیکھ بھال ہماری، ذمہ داری ہے۔ آپ بالکل اطمینان سے جائیں اور ہماری فکر بالکل نہ کریں۔ ہمیں یہ تکلیف ضرور ہوگی کہ بھابی کے ہاتھ کا لذیذ کھانا نہیں ملے گا مگر کچن میں سامان ہے ہم لوگ کچھ نہ کچھ کر ہی لیں گے۔ اور ہاں آپ کو ایک زحمت یہ کرنی ہوگی کہ ہم نے کل جو اچیاں خریدی ہیں انہیں لیتے جایئے ہمارے گھر پہنچا دیجئے گا۔ ایک اٹیچی میں کانچ کا سامان ہے ذرا سی احتیاط کرنی ہوگی۔ قہر درویشی بر جان درویش انہیں چابی دے کر چلے گئے۔

عید کے بعد جب ہم گھر واپس آئے تو گھر میں داخل ہوتے ہی ایسا لگا جیسے یا تو کسی غلط جگہ آ گئے ہیں یا چوروں نے گھر کی تلاشی لی ہے۔ گھر کی کوئی شے اپنی جگہ برقرار نہ تھی۔ بستر پلنگ اور زمین پر مساوی تھا اور اس پر جگہ جگہ مختلف ممالک کے پیشابی نقشے بنے ہوئے تھے۔ تمام برتن گندے تھے اور ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ کتابوں کا غالباً بچے نے مطالعہ کیا تھا۔ گھر کی حالت دیکھ کر دوستوں نے ہمارا حال پوچھا تو ناطق مالوی یاد آ گئے ؎

ہمارا حال بڑے مسکرا کے پوچھتے ہیں کرام نوازیٔ احباب کا جواب کہاں

القصہ مختصر قسما قسم کے مہمانوں سے فیضیاب ہونے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

بہشت آں جا کہ مہمانے نہ باشد
گھر جنت ہے اگر بن بلائے مہمان نہ آئیں

ذکر اس پری وش کا

فلسفی مورخین کو شبلی (نعمانی) اعظمی، ترقی پسندوں کو کیفی اعظمی، مشاعرہ بازوں کو ساغر اعظمی اور فلم بینوں کو شبانہ اعظمی مبارک! ہماری نگاہ کوتاہ بیں عبداللطیف اعظمی سے اوپر نہیں اٹھتی۔ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہاداری" والا معاملہ ہے۔

لطیف اعظمی صرف ایک شخص کا نام نہیں بلکہ ایک ادارہ، ایک انجمن، ایک مکتبۂ تحقیق ایک تحریک، ایک آندھی اور ایک طوفان کا نام ہے۔ قارئین یا سامعین (آپ جو کچھ بھی ہوں) میں نے یہ باتیں ازراہ عنایت یا ازراہ تذکرہ نہیں کہی ہیں بلکہ اپنے ان دعووں کے ثبوت کے لئے مضبوط دلائل سے آراستہ و پیراستہ ہوں۔ میرے منطقی استدلال جن پر فلسفے کے اثرات بھی نمایاں ہیں لطیف صاحب پر عائد کئے گئے الزامات کی تصدیق کریں گے۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ میں نے سب سے پہلے لطیف صاحب کو ایک ادارہ کہا ہے جس طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ ایک ادارہ ہے۔ جامعہ ملیہ کو ادارہ بنانے میں گاندھی جی کے علاوہ مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا آزاد وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں اور اسے ادارہ بنائے رکھنے میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین اور شفیق الرحمٰن قدوائی جیسی ہستیوں کا ذکر کیا جاتا ہے یعنی یہ تمام حضرات یہاں رہے تو جامعہ ادارہ بنا میری دلیل یہ ہے کہ یہ تمام ہستیاں مولانا محمد علی سے لے کر پروفیسر محمد مجیب تک جامعہ میں تو اب موجود نہیں لیکن لطیف صاحب کے اندرون میں بہر حال موجود ہیں۔ سب کی روحیں عالم ارواح کو چلی جاتی ہیں ان حضرات کا عالم ارواح لطیف صاحب ہیں۔ جامعہ ملیہ میں یہ آٹھ دس افراد بیک وقت کبھی نہ رہے ہوں گے مگر ان کی محبت نے لطیف صاحب کو ایک مستقل ادارہ بنا دیا ہے۔ بعض فیکلٹیز مثلاً ماس کمونیکشن وغیرہ ممکن ہے

لطیف صاحب اپنے ادارہ میں نہ کھول سکے ہوں کہ یہ ان کی یادوں کے نہاں خانے میں نہیں بلکہ عیاں خانے کا ایک حصہ ہے پھر لطیف صاحب کا ذوق بھی مختلف ہے اس لئے ماس کمو نیکیشن کی جگہ ندوہ ٹائپ کے چند شعبہ جات لطیف صاحب نے اپنے اندر کے ادارہ میں قائم کر رکھے ہیں۔ اور یہ ان کے اندر کی صنعت تضاد ہے کہ مختلف الخیال اور متضاد المزاج اہل خیر حضرات کو اپنے اندر کے ادارہ میں یکجا کرنے کے بعد خود شیخ الادارہ بنے بیٹھے ہیں۔ جامعہ میں تو لطیف صاحب (وی. سی کے) پی اے تھے۔ وہاں سب پی اے ہیں میرے ان روشن دلائل سے لطیف صاحب کی ادارگی یا اداریت ثابت ہو جاتی ہے اور اس مسئلے پر اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی، اختلاف صرف اس نکتہ پر ہو سکتا ہے کہ لطیف صاحب خود بلا شرکت غیرے ان حضرات پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں یا انہوں نے لطیف صاحب کو دبوچ رکھا ہے۔

دوسرا الزام انجمن کا ہے۔ میرے اس الزام کا سب سے بڑا ثبوت لطیف صاحب کی شخصیت معہ تکلم ہے آپ یقین کیجئے انجمن ناز کی ناز آرائی سے انجمن اساتذہ کی معرکہ آرائی تک سارے گر لطیف صاحب اچھی طرح جانتے ہیں مثلاً آج کل کی انجمنیں اپنی بات منوانے کے لئے قوت بازو کا مظاہرہ کرتی ہیں لطیف صاحب قوت زبان سے کام لیتے ہیں اور دوران گفتگو پینترے بدل بدل کر ایسے حملے اور جوابی حملے کرتے ہیں اور دلائل کا وہ نیو کلیائی اسلحہ استعمال کرتے ہیں کہ ہٹلر کے اچھے دور کی بنرد آزمائیاں اور مسلمان بادشاہوں کے برے وقتوں کی کابکی معرکہ آرائیاں" ٹیلی ویژن کی تصاویر کی طرح آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں اور حریف کی آئی سائٹ اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ راہ فرار نظر نہیں آتی۔ لڑائی یک رخی ہو کہ چو مکھی بحث میں لطیف صاحب کو شکست دینا بوکسنگ میں محمد علی کلے، ایکٹنگ میں دلیپ کمار، کرکٹ میں اظہر الدین اور سیاست میں کانگریس آئی کو شکست دینے کے مترادف ہے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ لطیف صاحب ہر موضوع پر ہفتوں اور بعض موضوعات پر مہینوں بول سکتے ہیں اور برسوں سے بولتے چلے آرہے ہیں۔ دوران بحث پانی بھی نہیں مانگتے حریف کو البتہ پانی مانگنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

الزام نمبر ۳ میں انہیں مکتبۂ تحقیق کہا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ مکتبہ کا تعلق کتابوں سے ہوتا ہے۔ لطیف صاحب کی یادداشت اور گھر کی الماریاں کتابوں سے بھری پڑی ہیں

جب کہ ان گھروں میں جہاں لطیف صاحب کی آمد و رفت زیادہ رہتی ہے الماریاں کتابوں سے خالی ہو چکی ہیں۔ سنتے ہیں قدیم زمانے میں شہزادے یا راجکمار جہاں سے گزرتے تھے شریف لوگ اپنی بہو بیٹیاں چھپا لیا کرتے تھے لطیف صاحب گزرتے ہیں تو لوگ کتابیں چھپا لیتے ہیں تحقیق کے سلسلے میں بھی لطیف صاحب کا یہی رویہ ہے تاریخ پیدائش سے متعلق پیدا ہونے والے شخص کا دعوی بھی غلط ثابت کر دکھاتے ہیں اگر آپ بد قسمتی سے ادیب یا شاعر واقع ہوئے ہیں تو ان کی چاہے جتنی خوشامد کریں لاکھ قسمیں کھا کر اپنی پیدائش کی تاریخ کا یقین دلانا چاہیں مگر لطیف صاحب کے پتھر دل پر ذرا اثر نہیں ہو گا وہ انتہائی محتاط قسم کے محقق ہیں تاریخ ولادت کی تصدیق کے لئے صاحب ولادت کے والدین کا نکاح نامہ طلب کر لیتے ہیں کبھی اس قسم کی دلیل لاتے ہیں کہ فلاں ادیب کی بائیں آنکھ میں دائیں جانب سرخ رنگ کا تل ہے اور ایسے لوگ دسمبر کی پندرہ سے پچیس تاریخ کے درمیان پیدا ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے اگر خدانخواستہ کسی ایسے شخص کے میونسپل کے کاغذات ڈاکٹر کا سرٹیفکیٹ اور اسکول کی سند یا خود موصوف یعنی صاحب ولادت دسمبر میں پیدا ہونے کا دعوی کریں تو لطیف صاحب ان کی پچھلی سات پشتوں اور آئندہ سات نسلوں کو دسمبر میں پیدا نہ ہونے دیں گے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ احتیاط نہ برتی جائے تو پھر میونسپل کارپوریشن اور ایک محقق میں کیا فرق رہ جائے گا۔ معلوم کو نا معلوم اور نا معلوم کو معلوم، موجود کو معدوم اور معدوم کو موجود یعنی ادھر کا ادھر اور ادھر کا ادھر کرنا تحقیق کا کام ہے سو وہ کرتی رہے گی۔ میونسپل بورڈ اور ڈاکٹر ایک عام آدمی کو اپنی مرضی کے مطابق پیدا کر سکتے ہیں لیکن شاعر اور ادیب کی زندگی اور موت لطیف صاحب کے ہاتھ میں ہے جب اور جہاں چاہیں پیدا کریں جس تاریخ کو چاہیں مار دیں۔ نہ جانے کتنے شاعروں اور ادیبوں کو اپنی پیدائش اور وفات کے معاملے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر رکھا ہے لطیف صاحب کی موجودگی میں نہ کوئی سکون سے پیدا ہو سکتا ہے نہ چین سے مر سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے قیامت کے دن تاریخ وفات کے اندراجات پر ملک الموت سے ان کا جھگڑا قیامت کے میدان کو پانی پت کا میدان بنا دے گا اور وہاں مقدمے والے حالی بھی بے بس نظر آئیں گے۔

ان پر ایک الزام تحریک کا بھی ہے۔ جن صاحبان نے لطیف صاحب کو متحرک دیکھا ہے وہ اس الزام پر کسی ثبوت کے خواستگار نہ ہوں گے۔ میں نے "کبک دری" کو اپنی

آنکھوں سے چلتے پھرتے نہیں دیکھا صرف اس کی چال کے بارے میں شاعروں سے سنا ہے اگر کسی صاحب نے اس کی چال بچشم خود دیکھی ہے تو براہ کرم لطیف صاحب کی رفتار بھی دیکھ لیں یا مجھے کبک دری کی چال دکھادیں بغیر دیکھے قیاس آرائی کرنا تحقیق کے دائرے کی چیز ہو جائے گی اور میں لطیف صاحب کی برابری کے تصور سے بھی خائف ہوں۔ بہر حال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ لطیف صاحب جب متحرک ہوتے ہیں تو سراپا تحریک نظر آتے ہیں بلکہ دیکھنے والوں میں بھی تحریک پیدا کر دیتے ہیں میں نے اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑے ہو کر سیکنڈوں لطیف صاحب کو چلتے دیکھا ہے۔ سیکنڈوں اس لئے کہ لطیف صاحب چلتے وقت سیکنڈوں سے زیادہ نظر ہی نہیں آتے وہ تو بس ایک چھلاوا ہیں چشم زدن میں اپنے گھر سے اردو گھر (جسے وہ اپنا ہی گھر سمجھتے ہیں) اردو گھر سے جامع مسجد، جامع مسجد سے مکتبہ جامعہ پہنچ جاتے ہیں۔ اگر آپ نے انہیں غالب اکیڈمی میں چائے پیتے دیکھا ہے اور تھوڑی دیر بعد ایوان غالب کے کسی فنکشن میں بسکٹ کھاتے نظر آجائیں تو حیرت زدہ یا خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ انہیں ایک ہی وقت میں مختلف مقامات پر دیکھے جانے کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ و اللہ اعلم باالصواب۔

لطیف صاحب پر تحریک ہونے کا الزام سن کر بعض ناعاقبت اندیش انہیں تحریک ولی اللہی یا ترقی پسند تحریک قسم کی کوئی چیز سمجھے ہوں گے تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس قسم کی نہ جانے کتنی تحریکیں لطیف صاحب چائے میں گھول کر پی چکے ہیں۔ ان کی تحریک حرکت سے مستعار ہے خواہ وہ حرکت پیروں کی ہو جس کے سلسلے میں اوپر خاطر خواہ بحث ہو چکی ہے۔ یا جسم کے کسی اور حصے بالخصوص حرکت زبان ہی کیوں نہ ہو ان کی تحریک بہر حال حرکت سے مستعار ہے کسی مذہبی، سیاسی یا ادبی مسئلہ پر گل افشانی گفتار کی خاطر جب لطیف صاحب اپنی زبان کو حرکت میں لاتے ہیں تو ان کے پر زور دلائل اور پر شور جذبات کے بہاؤ میں ہر قسم کی تمام مخالفتیں اور اعتراضات تنکوں کی طرح بہتے نظر آتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ لطیف صاحب خدانخواستہ ہمہ وقت غیظ و غضب کی تصویر بنے رہتے ہیں ہر گز نہیں بلکہ لطیف صاف تو مجموعی طور پر اسم با مسمیٰ ہیں ہر وقت چھیڑ چھاڑ، خوش گپیاں، خوش فعلیاں، شوخی اور شرارت گویا ان کا مزاج بن گیا ہے۔ لطیف صاحب کی ہر بات ایک لطیفہ ہوتی ہے سوائے اس بات کے جسے وہ لطیفہ کہہ کر سناتے ہیں۔

جامعہ برادری میں لطیف صاحب اپنے ہم عمروں کے علاوہ چھوٹوں اور بڑوں سے بھی بے تکلف ہو جاتے ہیں اس عادت نے انہیں حضرات ہی نہیں خواتین میں بھی خاصا مقبول بنا دیا ہے وہ سب کو چھیڑتے ہیں سب انہیں چھیڑتے ہیں اور یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔ لطیف صاحب جامعہ کی روایات کے اس حد تک امین ہیں کہ انہوں نے جامعہ کی ساری امانتیں اپنے پاس محفوظ کر لی ہیں تاکہ خیانت کا خطرہ ہی باقی نہ رہے۔

اب رہے آندھی اور طوفان کے الزامات تو وہ میں نے بس یوں ہی ازراہ مذاق کہہ دیا ہو گا ورنہ لطیف صاحب تو بادِ صبا اور موج نسیم ہیں بشرطیکہ آپ ان سے کسی معاملے میں اڑنے کی کوشش نہ کریں ورنہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ آندھی اور طوفان بھی صبا اور نسیم کے گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

○

صغرا آپا وظیفہ یاب ہوئیں

(نوٹ: ۲۹ اگست ۹۷ء کو پروفیسر صغرا مہدی کے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونے پر شعبہ اردو کے وداعیہ جلسے میں پڑھا گیا خاکہ نما انشائیہ)

لیجئے صغرا آپا بھی وظیفہ یاب ہو گئیں۔ وظیفہ یاب ہم نے جان بوجھ کر لکھا ہے وہ اس لئے کہ ہم کئی سال سے اس لفظ کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مگر موقع ہی نہیں ملتا تھا پچھلے دنوں جامعہ کے حیاتی رکن مجتبیٰ حسین زیدی صاحب (مرحوم) کا سوانحی خاکہ لکھتے ہوئے ایک موقع ہاتھ آیا اور ہم نے محترم طیب صاحب کی موجودگی میں بآواز بلند لکھا کہ مجتبیٰ زیدی صاحب جامعہ سے ۱۹۷۲ء میں وظیفہ یاب ہوئے۔ طیب صاحب نے ہمیں ٹوکا اور فرمایا سبکدوش لکھئے۔ جامعہ میں اس وقت وظیفہ کہاں ملتا تھا جو وظیفہ یاب ہوتے۔ ہم نے فوراً اپنی اصلاح کی اور وظیفہ یاب کاٹ کر سبکدوش لکھ لیا۔ اس لفظ کے معنی بھی ہم پر اسی دن آشکار ہوئے۔ اب چونکہ صغرا آپا کو وظیفہ بھی ملے گا اس لئے ہمیں ایک بار پھر یہ موقع ہاتھ آگیا ہے کہ ہم وظیفہ یاب لکھنے کی اپنی حسرت نکال لیں حالانکہ آج بھی ڈر ہے مبادا کوئی بزرگ کہہ اٹھیں میاں وظیفہ یاب ہوں آپ اور آپ کے لواحقین اور وظیفہ ملے صغرا کے دشمنوں کو ہماری صغرا تو اللہ رکھے پنشن پاویں گی۔ صغرا وظیفہ یاب نہیں پنشن یافتہ ہونے والی ہیں۔ اگر یہاں بھی ایسی نوبت آئی تو ہم چپ چاپ کان دبا کر لکھیں گے کہ صغرا آپا سبکدوش ہو گئیں یوں بھی لفظ وظیفے نے کچھ ایسی شکل و صورت اختیار کر لی ہے کہ اس سے ناداری اور افلاس ٹپکتا ہے گویا کوئی رحم کھا کر نوازش کر رہا ہو۔ اس کے برعکس لفظ پنشن اپنا حق جتاتا ہوا معلوم ہوتا ہے اب اس وضاحت کے بعد تو صغرا آپا پنشن یافتہ ہی ہو سکتی ہیں۔

صغرا آپا کے سبکدوش ہونے کا ہم سب کو سچ مچ بہت افسوس ہے حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ جو ملازم ہوا ہے اسے ایک نہ ایک دن سبکدوش ہونا ہے اس کے باوجود یقین نہیں آتا کہ صغرا آپا اتنی جلدی سبکدوش ہو جائیں گی۔ ابھی تو ان کے پڑھنے پڑھانے کے دن تھے مگر انہوں نے بڑی عجلت کی۔ کیا صغرا آپا ساٹھ سال کی ہو گئیں یا یہاں بھی انہوں نے کوئی شرارت کی ہے ممکن ہے اپنی عمر دس بارہ برس بڑھا چڑھا کر لکھوادی ہو اور سوچا ہو کہ ادبی سرگرمیوں کی طرح اس کام میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے یا عذرا طلبا کی نے کہا ہو صغرا جب ہم ساٹھ کے ہوگئے تو پھر تم پچاس کی کیوں ہو چلو ہو جاؤ ساٹھ کی۔ اور وہ ہو گئیں۔ یوں دیکھا جائے تو صغرا آپا ساٹھ سال کی تو اسی دن ہو گئی تھیں جب ان کے مربی اور مشفق ماموں[۱] جان اور ممانی[۲] جان انہیں چھوڑ کر چل دیئے تھے۔ ناز برداریاں کرنے والے نہ ہوں تو انسان فوراً ساٹھ کا ہو جاتا ہے خیر یہ تو ایک جملہ غیر معترضہ تھا مگر حقیقت حال یہ ہے کہ صغرا آپا کو دیکھ کر بالکل نہیں معلوم ہوتا کہ وہ سبکدوش ہونے والی ہیں انہوں نے سبکدوشی کا کوئی اثر ہی نہیں لیا ہم نے کئی لوگوں کو دیکھا ہے کہ جب وہ ساٹھ سال کی عمر میں سبکدوش ہوتے ہیں تو ان کی شکلوں پر ستر برسنے لگتے ہیں۔ صغرا آپا پچاس کی نظر آنے لگی ہیں۔

پورے شعبے کی خواہش تھی کہ صغرا آپا توسیع لے کر سال دو سال اور ہمارے ساتھ رہیں تاکہ طلبہ کو ان کی محنت، مشقت اور لیاقت نیز ساتھی اساتذہ کو ان کی سخاوت سے جو فیض پہنچتا رہا ہے وہ کچھ دن اور پہنچتا رہے۔ شعبے کو ابھی صغرا آپا کی سخت ضرورت ہے ان کے رکنے سے سبھی کا فائدہ تھا مگر عجیب دستور زمانہ ہے، جن کے رکنے سے فائدہ ہوتا ہے وہ تو رکتے نہیں، جن کے جانے سے فائدہ ہوتا ہے وہ رک جاتے ہیں۔ صغرا آپا بضد ہیں کہ میں تو جاؤں گی میں کیوں توسیع کا وظیفہ مانگوں میں تو ہرگز نہیں مانگوں گی، انھیں لاکھ سمجھایئے کہ قانون و قاعدہ بھی تو کوئی چیز ہے اس کا لحاظ تو کرنا ہی ہوگا مگر ان کا اپنا بھی قانون و قاعدہ ہے اور وہ اس کا لحاظ ضروری سمجھتی ہیں۔

صغرا آپا کے جانے کا مجھے اور میرے ہم عمروں کو ذاتی غم بھی ہے وہ شعبے میں ہماری ایک ایسی دوست بن کر رہیں جس میں بڑی بہن کی شفقت کوٹ کوٹ کر بھری تھی کبھی وہ ہم سے لڑتیں کبھی ہمارے لئے دوسروں سے۔ کبھی ڈانٹتیں کبھی سمجھاتیں اگر انہیں یہ احساس ہو جاتا کہ ان سے زیادتی ہو گئی ہے یا کسی کو ضرورت سے زیادہ ڈانٹ دیا ہے تو بے چین

ہو جاتیں اور اس وقت تک بے چین رہتیں جب تک اس کی تلافی نہ کرلیں ان کی تلافیاں اکثر بڑی خوش ذائقہ، رسیلی اور خوشبودار ہوتیں کبھی کبھی گرما گرم نمکین تلافیاں بھی چائے یا کافی کے ساتھ نظر آجاتیں۔ پتا نہیں ان سے جواب طلب کرنے والے پوری تنخواہ کا حساب لیتے ہیں یا نہیں اور اگر حساب لیتے ہیں تو صغرا آپا انہیں کس طرح مطمئن کرتی ہیں۔

صغرا آپا کو اردو، شعبہ اردو اور اردو کے طلبہ تینوں چیزیں بہت عزیز ہیں تینوں کے وقار ترقی اور نفع و نقصان کا انہیں ہر وقت خیال رہتا تھا۔ کلاس لینے میں ایسی پابند کہ موسم کی سختیاں تو کس کھیت کی مولیاں ہیں انتہائی ناساز گار حالات نے بھی انہیں کلاس لینے سے باز نہیں رکھا۔ طالب علم ایجی ٹیشن چلارہے ہیں ساتھی طلبہ کو کلاس روم میں جانے سے روکے ہوئے ہیں اساتذہ کے ساتھ بدتمیزیاں کرنے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔ ایک جارحیت کا عالم ہے مگر صغرا آپا ہیں کہ کلاس روم میں اپنے طلبہ کو گھیرے بیٹھی ہیں۔ ایجی ٹیشن والے آتے ہیں، روکتے ہیں تو ان کے آگے سینہ سپر ہو جاتی ہیں اور چیخ چیخ کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہیں کہ تم غلطی پر ہو اور تمہیں خبر نہیں کے تم اپنا کتنا نقصان کررہے ہو۔ صغرا آپا حق پر ہوں تو کبھی ہار نہیں مانتیں اور اکثر و بیشتر حق پر ہی ہوتی ہیں۔ آفریں صغرا آپا آفریں۔ واقعی آپ کا خلوص ایثار، حق گوئی، بیباکی سب لائق ستائش اور قابل تقلید ہے مگر یہ سارے کام اتنے مشکل ہیں کہ ان کی تقلید بھی آپ ہی کرسکتی ہیں۔ آپ پر ناطق مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

غیر پابندی آئین وفا کیا کرتا
میری تقلید کوئی میرے سوا کیا کرتا

صغرا آپا جامعہ ملیہ کی ملازمت سے سبکدوش ہونا چاہتی ہیں شوق سے ہو جائیں شعبہ میں نہیں رہنا چاہتیں نہ رہیں مگر یاد رکھیں شعبے کے باہر بھی ایک دنیا ہے یہاں آپ نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا باہر کی دنیا میں کیسے چھوڑیں گی دیکھتے ہیں کہاں کہاں سے بھاگتی ہیں۔ آپ اگر آپ ہیں تو ہم بھی آخر ہم ہیں۔

صغرا آپا ناول نگار، افسانہ نگار، طنز و مزاح نگار، سفر نامہ نگار اور اس قدر نگار ہیں کہ ”نگاراں“ بن چکی ہیں۔ ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہم نے ان کے سفر ناموں پر ایک طویل مضمون قلم بند کیا تھا۔ جو صغرا آپا نے از راہ حوصلہ افزائی اپنی کتاب ”سیر کر دنیا کی غافل“ میں

مقدمہ کے طور پر شامل کر لیا۔ ہم نے اس کتاب کی خوب تشہیر کی۔ ہم چاہتے تھے کہ لوگ اس کتاب کو اس لئے پڑھیں کہ اس میں ہمارا مضمون شامل ہے کتاب کے پبلشر اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب کو شاید ہماری نیت کا پہلے ہی سے اندازہ ہو گیا تھا چنانچہ انہوں نے ہمارا مقدمہ کتاب کے آخر میں چھاپا ہماری وجہ سے یوسف ناظم صاحب جیسے بزرگ کو بھی آخر میں جگہ ملی اس صورت حال سے یوسف ناظم صاحب نے کیا اثر لیا یہ تو ہمیں نہیں معلوم مگر ہم نے صبر کر لیا کہ صبر کے علاوہ اور ہم کر بھی کیا سکتے تھے آپ نے سنا ہو گا کہ ایک شخص سے کسی نے پوچھا اگر تم جنگل میں اکیلے اور نہتے ہو اور تمہیں شیر مل جائے تو کیا کرو گے؟ اس شخص نے جواب دیا۔ میں تو کچھ بھی نہیں کروں گا جو کچھ کرے گا شیر ہی کرے گا۔ پس شاہد صاحب کے ساتھ ہمارا بھی کچھ یہی معاملہ ہے۔ شاہد صاحب کے مذکورہ عمل کے بعد ہم نے اپنی عزت بچانے کے لئے لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوشش ضرور کی کہ یہ کتاب مع مقدمہ دراصل دیوناگری میں چھپ رہی تھی اور اسی لحاظ سے کتاب کو مرتب کیا گیا تھا یعنی پہلے ہمارا لکھا ہوا مقدمہ اس کے بعد یوسف ناظم صاحب کا لکھا ہوا تعارف پھر اصل کتاب مگر اچانک فیصلے نے کروٹ بدلی اور کتاب فارسی رسم خط میں چھاپ دی گئی۔ عجلت میں ترتیب بھی نہیں بدلی جا سکی یوں سب کاروبار الٹا ہو گیا۔

صغرا آپا کی شوخیاں اور شرارتیں جامعہ بھر میں مشہور ہیں صغرا آپا اور عذرا باجی کی جوڑی کو خدا سلامت رکھے۔ ایک زمانے میں قیامت برپا رکھی تھی کون تھا جو ان کی زد سے بچا ہو۔ آج بھی یہ دونوں مل جائیں تو شریر سے شریر بچے کے کان کاٹتی ہیں مشاعروں میں یہ دونوں پیچھے بیٹھ کر وہ ہو ٹنگ کرتی ہیں کہ اللہ میاں بھی شاعروں کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ مرنے کے بعد تو شاعروں کو دوزخ میں جانا ہی ہے مشاعروں میں یہ دونوں ان کی زندگی بھی دوزخ بنا دیتی ہیں اور صرف یہی نہیں کہ یہ دونوں خود ہو ٹنگ کرتی ہوں دوسروں کو بھی ہو ٹنگ کرنے پر اکساتی رہتی ہیں۔ بھیا ذرا کھڑے ہو کر یہ کہہ دینا بھیا ذرا وہ کہہ دینا۔ اگر یہ کسی جلسے یا مشاعرے میں پیچھے بیٹھی ہوں تو انہیں آگے بلا لینا چاہئے ورنہ سامعین کا شعرا کے جذبات و احساسات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ اس معاملے میں ہم بڑے دور اندیش ہیں ہم نے پہلے ہی تاڑ لیا تھا کہ میاں اگر شاعری کرنی ہے تو صغرا آپا سے دوستی ضروری ہے چنانچہ ایسا ہی کیا۔ اب خدا کے فضل سے شاعری اور دوستی دونوں سلامت ہیں اس کے

باوجود ہم نے ایک دانشمندی کا کام اور کیا کہ ازراہ احتیاط صغرا آپا کو کبھی اپنے اشعار ہی نہیں سنائے مبادا ان کی رگ ظرافت پھڑک اٹھے اور دوستی دیکھتی کی دیکھتی رہ جائے۔

صغرا آپا آج آپ شعبہ اردو میں اپنی بہترین صلاحیتوں سے خوب صورت یادوں کے انگنت چراغ روشن کرنے اور خلوص کا چمن مہکانے کے بعد رخصت ہو رہی ہیں۔ آپ سے پہلے بھی اسی طرح لوگ جاچکے ہیں اور آپ کے بعد بھی جائیں گے۔ پہلے جانے والے بھی بہت اچھے تھے اور بعد میں جانے والے بھی ضرور اچھے ہوں گے کہ سب میں اپنی اپنی خوبیاں ہوتی ہیں۔ آپ خوبیوں کا شفاف دریا ہیں۔ آج کے بعد شعبے کے در و دیوار آپ کی آواز کو ترسیں گے۔ طلبہ طالبات اور اساتذہ شدت سے آپ کی کمی محسوس کریں گے۔ آپ طلبہ کے لئے شفیق استاد اور ساتھیوں کے لئے پیکر خلوص و مروت بن کر رہیں۔ ہم سب آپ کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنے شعبے کو کبھی نہ بھولیں مگر ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں کو ضرور بھول جائیں کہ یہی آپ کی جانب سے ہمارے لئے سب سے بڑا تحفہ ہوگا۔ شکریہ!

○

ڈاکٹر عزیز اندوری پر ایک ننھا منا خاکہ

ممکن ہے مجھ سے پہلے بھی کسی نے یہ بات کہی ہو کہ اندور کی دو چیزیں زیادہ مشہور ہیں ایک تو اندوری توس (پاپے) اور دوسرے عزیز اندوری۔ یوں تو اندور میں مضطر اندوری، راحت اندوی، نور اندوری اور بہت سے اندوری موجود ہیں مگر عزیز اندوری کی بات الگ ہے۔ اندور کے توس (پاپے) چائے میں بھگو کر کھائے جاتے ہیں۔ چائے میں بھیگنے کے بعد ان توسوں یا پاپوں کی شکل دیکھ کر عزیز اندوری بہت یاد آتے ہیں۔

عزیز کبھی دہلی میں تھے۔ وہاں بھی اندوری بن کر رہے اور خوب رہے۔ پھر ان پر نام کا لاحقہ ایسا لاحق ہوا کہ آج تک اندور سے ملحق ہیں۔ دہلی نے انہیں برباد و بدنام کیا اور اندور کو خود انہوں نے لیکن یہ بدنامی بڑی نام والی نکلی۔ "جو ہے نام والا وہی تو بدنام ہے"

ان کے ادبی مشاغل اقتصادی مشاغل اور دلچسپ مشاغل ایک ہی ہتھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ انہوں نے بہت لکھا مگر دوسروں کے لئے زیادہ اپنے لئے کم۔ مختلف ناموں سے چھپے ہوئے نہ جانے کتنے ڈزرٹیشن اور مقالے آپ نے پڑھے ہوں گے اور آپ کو خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ یہ عزیز اندوری کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں مصحفی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنے بے شمار شاگردوں کو غزلیں لکھ کر دیا کرتے تھے اس سخاوت کے دوران اکثر یوں بھی ہوا ہے کہ اچھی غزلیں شاگردوں کو دیدیں اور کمزور خود رکھ لیں۔ عزیز اندوری بھی اپنے عہد کے مصحفی ہیں۔ ان کی شاعری تو خیر کوئی کیوں لیتا البتہ نثر میں انہوں نے وہ ایثار دکھایا کہ مصحفی کو بھی شرمندہ کر دیا۔ اچھی تحریریں دوسروں کو دیکر کمزور تحریریں خود رکھ لینا کوئی معمولی بات نہیں۔ اسلام نے کہا ہے جو چیز تم اپنے لئے پسند کرو وہی اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرو۔ عزیز اندوری نے اسلام کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

عزیز اندوری کے بہت سے پلس پوائنٹ ہیں مثلاً یہ کہ وہ عزیز ہیں سب کو عزیز، مخلص ہیں، انتہائی مخلص، دوست دشمن دونوں کے دوست ہیں مگر سب سے بڑا پلس پوائنٹ ان کی بیگم ہیں۔ اللہ میاں نے انہیں ایسی نیک صابر اور سلیقہ شعار بیوی دی ہے کہ رشک آتا ہے اللہ میاں کے معاملات انسان کی سمجھ سے باہر ہیں۔ عزیز اندوری جیسے کو ایسی بیوی دیدیتے ہیں اور جو عزیز اندوری جیسے نہیں ہوتے انہیں ویسی بیوی دیتے ہیں خدا کی مشیت خدا ہی جانے۔ ممکن ہے یہ عزیز اندوری کے ایثار تحریر کا نتیجہ ہو یا ممکن ہے اللہ میاں بھابی کا امتحان لینا چاہتے ہوں یا ممکن ہے سہواً نعوذ باللہ سہو تو صرف انسانوں سے سرزد ہوتا ہے مگر بھابی کے والدین بھی تو انسان ہی تھے۔

○

مکالمۂ جبریل وابلیس ۔۔۔ اقبال

ایک تجزیابی مطالعہ

سورۃ البقر کی چونتیسویں آیت میں باری تعالیٰ جل شانہ ارشاد فرماتا ہے۔

واذ قلنا للملئکۃ اسجدوا لآدم فسجدوا الا ابلیس ط

(ترجمہ)اور جب ہم نے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔

یہ ہے وہ نافرمان باغی ابلیس جسے علامہ اقبال کی نظم "جبریل وابلیس" میں حضرت جبریل علیہ السلام نے "ہمدم دیرینہ" کہہ کر مخاطب کیا ہے اور جس سے "جہان رنگ وبو" کی کیفیت دریافت کی ہے۔

یہ کم بخت ابلیس بھی عجیب شے ہے۔اس کے عہد عروج کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ یہ ملعون اپنے زوال کے بعد بھی "عالم آب وگل" کو بلندیوں سے ہم کنار کرنے کا سب سے بڑا وسیلہ بن گیا۔

صوفیانہ ادب میں ابلیس کی بابت جو تصورات ملتے ہیں ان میں اس مغرور ملعون کو مردود کہنے کی بجائے سب سے بڑا موحد قرار دیا گیا ہے ایک ایسی اخلاقی جرات رکھنے والا موحد جس نے اللہ کے حکم کے باوجود غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔

ابلیس نے آدم کو سجدہ نہ کرنے پر منطقی استدلال بھی کیا ہے اس کی عقلی دلیل یہ تھی کہ، آدم خاکی ہے، میں ناری ہوں نار خاک سے افضل ہے اس لئے میں آدم سے افضل ہوں۔ افضل اور کمتر کے پروٹوکول کا ابلیس نے جو معیار قائم کیا تھا بد قسمتی سے وہی معیار آج تک جاری و ساری ہے۔اس کے برعکس اللہ نے فضیلت کا جو معیار قائم کیا ہے کہ تم میں جو سب سے زیادہ متقی ہے وہی سب سے زیادہ افضل ہے۔اس کی جانب اللہ کے بندے کم توجہ کرتے ہیں۔

دراصل ابلیس کی ماہیت اور حقیقت کا مسئلہ خیر و شر کا مسئلہ ہے دنیا کی ہر شے اپنے مقابل سے پہچانی جاتی ہے۔ خیر و شر بھی باہمی تقابل ہی سے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اس کلیے کے مطابق ابلیس جو شر کا بانی ہے، خیر کی پہچان کا سب سے بڑا ذریعہ بن جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے ابلیس کی اس حقیقت کو مختلف مقامات پر مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔

"تسخیر فطرت" میں ابلیس سجدۂ آدم سے انکار کی وجہ نہایت جوش و خروش سے بیان کرتا ہے۔ اپنے آپ کو حرکت کا سر چشمہ بتاتا ہے اور خدا سے کہتا ہے کہ زندگی کی تمام ہمہ ہمی اور گہما گہمی میری وجہ سے ہے میں نہ ہوتا تو یہ کائنات بالکل سنسان اور بے جان ہوتی۔

"جاوید نامہ" میں ابلیس سے متعلق دو نظمیں ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "نمودار شدن خواجۂ اہل فراق ابلیس" اور دوسری نظم کا عنوان "نالۂ ابلیس" ہے ان دونوں نظموں میں ابلیس کی تحقیر کی جگہ کہیں کہیں اس کی ستائش کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ ابلیس کے لئے "خواجۂ اہل فراق" کا خطاب بھی نہایت معنی خیز ہے۔ دراصل اقبال انسان کی خودی کو اس بلندی پر دیکھنا چاہتے تھے جہاں خدا بندے سے کچھ کہنے اور کوئی حکم دینے کی بجائے بندے کی رضا معلوم کرے۔

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال جہاں جہاں ابلیس کا ذکر کرتے ہیں اپنا سارا زور اسی کے پلڑے میں ڈال دیتے ہیں "مکالمہ جبریل و ابلیس" میں کئی باتیں غور طلب ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مکالمہ دو پرانے دوستوں کے درمیان ہے نمبر ۲ گفتگو کا آغاز جبریل کی طرف سے ہوتا ہے نمبر ۳ جبریل دنیا کے تعلق سے اولاً ایک معلوماتی سوال کرتے ہیں نمبر ۴ جبریل ہماری دنیا کو "جہان رنگ و بو" سمجھتے ہیں اور نمبر ۵ یہ کہ جبریل کے لہجے سے اپنائیت ظاہر ہوتی ہے جو نظم کے آغاز کو معنی خیز بنا دیتی ہیں۔ نظم شروع ہوتی ہے۔ جبریل کی آواز

"ہم دم دیرینہ کیسا ہے جہان رنگ و بو؟"

نظم کے پہلے مصرعے کا پہلا ہی لفظ یعنی "ہمدم دیرینہ" جبریل و ابلیس کی قدیم و طویل رفاقت کے اظہار کا بہترین ذریعہ بن کر سامنے آتا ہے۔ مصرعے کے آغاز میں اس لفظ کی ادائیگی سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جبریل کو ابلیس کی جدائی کا قلق ہے۔ وہ اپنے

پرانے دنوں کو یاد کرتے ہیں اور ابلیس کو بھی دیرینہ ہمدمی کے ماہ و سال یاد دلاتے ہیں۔ اس لفظ کے معنی میں ماضی کی طویل داستان پوشیدہ ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ ابلیس جو ناری ہے انکار سے پہلے بھی بہت شرارتیں کرتا ہوگا۔ فرشتوں کو بہکانے اور ورغلانے کی کوشش بھی اس نے ضرور کی ہوگی مگر چونکہ فرشتوں میں بہکنے کی صلاحیت ہی نہیں اس لئے اس کی مایوسی اور جھنجھلاہٹ دیکھنے کے لائق ہوتی ہوگی اس کے دم سے ہلچل ضرور رہتی ہوگی کہ وہ ناری ہے اور ناری صفات تو اس میں ازل ہی سے اپنا کام کرتی رہی ہوں گی۔ ما قبل انکار بھی یہ بڑا شری ہوگا۔ پرانی باتوں کو یاد کر کے حضرت جبریل جب اسے پکارتے ہیں تو ان کی پکار کے لہجے اور لفظوں سے پیار، ہمدردی اور درد کا اظہار ہوتا ہے۔ ”ہمدم دیرینہ“ سے مخاطبت کا آغاز ہوا تو قرینہ کہتا ہے کہ حضرت جبریل اپنے پرانے رفیق ابلیس سے اس کی خیرت دریافت کریں گے اور اس کا حال چال پوچھیں گے مگر جبریل نے ایسا نہیں کیا کیونکہ جبریل کو ابلیس کے بارے میں خوب معلوم تھا کہ وہ نافرمان، ملعون و مردود ہے اس لئے اگر اس کا حال چال پوچھتے تو ابلیس سمجھتا کہ جبریل اس پر طنز کر رہے ہیں۔ کسی معلوم چیز کے بارے میں معلوم کرنا بعض اوقات طنز کے مترادف ہوتا ہے اور شکوک و شبہات بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اس طرح پہلے ہی مرحلے میں بات چیت ٹوٹ جاتی یا دوسرا رخ اختیار کر لیتی جب کہ حضرت جبریل کا مقصد بالکل دوسرا تھا۔ وہ اپنے ”ہمدم دیرینہ“ کو معافی مانگنے پر راضی کرنا چاہتے تھے یہ الگ بات ہے کہ وہ ضدی ناری پھر بھی راضی نہ ہوا اور حضرت جبریل کی کوشش رائگاں چلی گئی مگر حضرت جبریل کی کوشش کا انداز ایسا فطری ہے کہ اس میں صحیح الجہتی کا ہر تصور سمٹ کر آ گیا ہے۔

اس مصرعے میں دو باتیں مزید دعوت فکر دیتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت جبریل دنیا کے بارے میں اپنا ایک زاویہ نگاہ رکھتے ہیں اور اپنے سوال کے ساتھ ہی اس کا اظہار بھی کر دیتے ہیں کہ ان کی نظر میں ہماری یہ دنیا ایک ”جہان رنگ و بو“ ہے۔ حضرت جبریل نے اس دنیا کو دور سے دیکھا ہے۔ اسے برتا نہیں ہے اور اپنی اوپری سطح پر یہ دنیا واقعی ”جہان رنگ و بو“ ہے یہاں وہ کہاوت یاد آئی کہ ”دور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں“ ابلیس کا جواب اس کہاوت پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے لیکن ابلیس کے جواب کی وضاحت سے قبل یہ گفتگو ضروری ہے کہ جب حضرت جبریل نے دنیا کے تعلق سے اپنی رائے قائم کر لی اور ”جہان

رنگ و بو" کہہ کر اس کا اظہار بھی کر دیا تو اب سوال کی کیا اہمیت باقی رہ جاتی ہے بادی النظر میں یہ بات کچھ غیر منطقی ہی معلوم ہوتی ہے کہ اب بھی سوال کیا جائے۔ مگر جب ہم اس مصرعے کے لب و لہجے پر غور کرتے ہیں تو یہ منکشف ہوتا ہے کہ "ہمدم دیرینہ" تمہارا یہ جہان جو ہمیں (دور سے) "جہان رنگ و بو" نظر آتا ہے تم کہو کیسا ہے؟ یعنی اس کی حقیقت کیا ہے۔ کیا یہ ویسا ہی جیسا ہمیں نظر آتا ہے یا اس سے مختلف ہے یہ ساری باتیں جبریل کے سوال میں پوشیدہ ہیں جو غور کرنے پر ایک کے بعد ایک سامنے آتی رہتی ہیں۔ ابلیس بھی ان سب باتوں کو سمجھ گیا ہے اس لئے ایک ہی مصرعے میں دنیا کا مکمل تعارف کرا دیتا ہے۔

"سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو"

اقبال کا یہ مصرع جو ابلیس کی زبان سے ادا ہوا ہے دنیا کی تعریف و تعارف میں ایسا جامع، بلیغ اور معنویت سے بھرپور ہے کہ عالم انسانی کی ہر شے اس میں سمٹ کر آگئی ہے اردو زبان کے پیرایہ اظہار میں دنیا کی اس سے بہتر اور جامع تعریف ممکن نہیں۔ بظاہر یہ مصرع صرف چھ الفاظ یعنی "سوز، ساز، درد، داغ، جستجو، آرزو کا مجموعہ ہے لیکن سارے عقلی اور نقلی انسانی علوم انہیں چھ الفاظ کی تشریح و توضیح تعبیر اور تفسیر معلوم ہوتے ہیں مثلاً ایک لفظ سوز ہی کو لیجئے عشق اور متعلقات عشق، شریعت طریقت تصوف اور روحانیت کے تمام مسائل و مراحل اس ایک لفظ میں طے ہو جاتے ہیں، سوز میں ساز شامل کر لیجئے تو رنگ و آہنگ کیف و مستی اور رقص و سرود و شوق کے علاوہ حسن فطرت بھی سمٹ آتا ہے۔ درد سوز کی آواز بھی ہے، راز بھی اور انکشاف راز بھی۔ یہ بھی عشق کا نتیجہ ہے۔ عشق جو تمام کائنات میں جاری و ساری ہے اور اس کائنات کے لئے کشش ثقلی کی حیثیت رکھتا ہے کہ اسی کے دم سے نظام عالم قائم ہے کچھ یہی صورت درد کی ہے اور ایک درد، وہ بھی ہے جو کبھی دوا سے ٹھیک ہو جاتا ہے اور کبھی خود دوا بن جاتا ہے جیسا کہ غالب نے کہا ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد لادوا پایا

اس کے بعد داغ کی شکل اور کیفیت ملاحظہ کیجئے۔ داغ جو کبھی درد کا حاصل ہوتا ہے اور کبھی بے دردی کا، داغ کی ایک عبرت ناک صورت وہ تھی جو حکم الٰہی سے انکار کی وجہ سے ابلیس کے حصے میں آئی اور ابلیس مرض متعدی کی طرح اس داغ کو خدا کی مخلوق میں

تقسیم کر رہا ہے۔ لفظ ''جستجو'' میں ارضی، سماوی، خلائی، بحری، برّی غرض ذرات ارضی سے فلکیات تک تمام تحقیقات کا عطر موجود ہے آخری لفظ آرزو ہے آرزو جو تمام الفاظ کا جزو اعظم ہے۔ آرزو ہو تو یہ عالم لاہوت عالم ملکوت بن کر رہ جائے۔ ہماری دنیا انہیں تمام چیزوں کا مجموعہ ہے۔

حضرت جبریل کا دوسرا سوال ہے۔

ہر گھڑی افلاک پر رہتی ہے تیری گفتگو
کیا نہیں ممکن کہ تیرا چاک دامن ہو رفو

اس سوال میں حضرت جبریل اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ اس سوال سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ پہلا سوال دراصل ایک قسم کی تمہید تھا اور اس کے ذریعے جبریل نے اصل سوال کے لئے فضا بندی کی تھی اس سوال سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ تمام ملائکہ ابلیس کے انکار اور انکار کی پاداش میں راندۂ درگاہ کئے جانے سے ملول ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا ''چاک دامن رفو'' ہو جائے اور اسے وہی مقام تقرب حاصل ہو جائے جو پہلے حاصل تھا مگر ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب ابلیس اپنی گستاخی پر شرمندہ ہو کر بارگاہ رب العزت میں توبہ واستغفار کر لے

لاتقنطو من رحمة الله ط ان الله يغفر الذنوب جميعا

(ترجمہ) اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ بیشک اللہ گناہ بخش دیتا ہے۔

حضرت جبریل کی ہمدردانہ گفتگو سن کر ابلیس کے منھ سے ایک آہ نکلتی ہے۔ ''آہ اے جبریل'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کفِ افسوس مل رہا ہے اور اس حالت زار پر کرب میں مبتلا ہے اور یہ کہ اپنے ہمدرد جبریل کی تسلی بخش اور ہمدردانہ گفتگو سے اس کا دل بھر آیا ہے اور یہ آہ اس کے احساس نافرمانی کی علامت ہے۔ ع

''آہ اے جبریل تو واقف نہیں اس راز سے''

یہاں تک بھی یہی خیال قائم رہتا ہے کہ جبریل کو مخاطب کر کے ابلیس اپنے درد نہاں کا اظہار کرنا چاہتا ہے مگر جب آگے بڑھتے ہیں ؎

''کر گیا ہے سر مست مجھ کو ٹوٹ کر میرا سبو''

تو سارا منظر نامہ تبدیل ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس اپنے ہمدرد جبریل

کی معصومیت اور کم علمی پر اظہار افسوس کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ تو میرا ہمدرد ضرور ہے مگر نادان ہے تجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے "سبو" کے ٹوٹنے پر کیسا سر مست ہو گیا ہوں بظاہر یہ بات عام روش کے خلاف ہے۔ عام حالات میں جب سبو ٹوٹتا ہے اور شراب گر جاتی ہے تو رندوں کی مستی اتر جاتی ہے اور سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے مگر اس مصرعے میں اقبالؔ نے رمز و کنایہ اور استعارات کا ایسا جادو جگایا ہے کہ مصرع میں غضب کی دلکشی اور معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ ابلیس کہنا چاہتا ہے کہ اگرچہ انکار و نافرمانی کی وجہ سے قرب الٰہی کی عظمت کا سبو ٹوٹ کر مجھے بیشک مردود و ملعون کر گیا ہے مگر اس کی بدولت مجھے اپنی خدائی کا ایسا شدید احساس وادراک ہو گیا کہ جس کا نشہ قیامت تک زائل نہیں ہو سکتا۔

اب یہاں میری گزر ممکن نہیں ممکن نہیں
کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو

اے جبریل جس جگہ تو مجھے واپس لے جانا چاہتا ہے اب وہاں میرا گذر نہیں ہو سکتا۔ مصرع اول میں ممکن نہیں کی تکرار کے ذریعے اقبالؔ نے ابلیس کے انکار میں زور پیدا کیا ہے اور اسی کے ساتھ شعر میں صوری حسن بھی پیدا ہو گیا ہے۔ دوسرے مصرع میں ابلیس اپنے مقام ابلیسیت پر متمکن نظر آتا ہے۔ یہاں وہ اس عالم کا مذاق اڑا رہا ہے جہاں حضرت جبریل اور دوسرے ملائکہ کے ساتھ رہا کرتا تھا

"کس قدر خاموش ہے یہ عالم بے کاخ و کو"

اُس عالم خاموش میں نہ محل ہیں نہ ایوان نہ کوچے نہ درودیوار کچھ بھی نہیں ہے ہر طرف خاموشی، سناٹا اور سکوت و سکون کا عالم ہے۔ یہ بھی کوئی عالم ہے یہ صحیح ہے کہ میں پہلے اسی عالم میں رہتا تھا مگر اب تو ہنگامہ ہائے نو بہ نو کا ایسا عادی ہو گیا ہوں کہ میرے لئے اس کو چھوڑنا ممکن نہیں، اب رہا امید و نومیدی کا سوال تو اے جبریل میری بات غور سے سن۔

جس کی نومیدی سے ہو سوز درون کائنات
اس کے حق میں تقنطوا اچھا ہے یا لا تقنطوا؟

میری "نومیدی" تو امید سے کہیں بہتر ہے۔ مجھے نومید ہی رہنے دے مجھے معلوم ہے کہ قل یا ایہا الذین اسرفو علی انفسہم لا تقنطو من رحمۃ اللہ ط ان اللہ یغفر الذنوب جمیعا۔

(ترجمہ) آپ کہہ دیجئے کہ اے وہ لوگوں جنہوں نے گناہ کیے ہیں اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو بیشک اللہ سب گناہ بخش دے گا۔

لیکن اے جبریل تجھے معلوم نہیں کہ اس کائنات کے لئے میری ناامیدی کی اہمیت کیا ہے۔ میری ناامیدی ہی تو ہے جس کی وجہ سے اس عالم آب و گل میں سوز و ساز ہے اس لئے خدا کی اس کائنات کے حق میں میرا ناامید رہنا بہتر ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے۔ اقبال نے ابلیس کی زبان سے مشیت ایزدی کی ایک بڑی حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ کائنات کے بہت سے رازوں کی طرح خدا اور ابلیس کا راز بھی پردہ خفا میں ہے۔ خدا نہ چاہتا تو ابلیس کی کیا مجال تھی کہ وہ انکار سجدہ کا ارتکاب کرتا اور خدا نہ چاہے تو ابلیس کی کیا طاقت کہ کسی کو گمراہ کر سکے پس اللہ کی بھید اللہ ہی جانتا ہے۔

حضرت جبریل کا آخری سوال طنز و تنبیہ کے انداز میں تھا۔ جب حضرت جبریل نے دیکھا کہ ابلیس کسی بھی بات کو ماننے پر آمادہ نہیں ہے تو انہوں نے مقامات بلند کے حوالے سے اسے غیرت دلانے کی کوشش کی اور ملائکہ کی عزت و آبرو کا سوال اٹھایا۔

کھو دیئے انکار سے تو نے مقامات بلند
چشم یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو

تیری نافرمانی سے صرف یہی نہیں ہوا کہ تو مقامات تقرب خاص سے محروم ہو گیا بلکہ تیرے اس باغیانہ عمل کی وجہ سے چشم یزداں میں تمام فرشتوں کا وقار مجروح ہو گیا۔ تیرا کبر ایک فرشتے کی حیثیت سے ہمیں بھی بے آبرو کر گیا۔ تیرا انکار نہ تیرے حق میں بہتر ثابت ہوا اور نہ ہمارے حق میں تو نے نہایت فاش غلطی کی ہے۔

اس طنز آمیز سرزنش کا جواب ابلیس قدرے تفصیل سے دیتا ہے یہاں اس کی رگ ابلیسیت بھی پھڑک اٹھتی ہے اس کا کبر و نخوت اور برتری کا احساس بھی بیدار ہو جاتا ہے۔ اب وہ حضرت جبریل کو بھی اپنے مقابلے میں کمتر سمجھنے لگتا ہے۔ اپنی تعریف و توصیف اور طاقت و قدرت کا نہایت زور و شور سے اظہار کرتا ہے جبریل پر طنز کے تیر برساتا ہے اور پر غرور لہجے میں کہتا ہے۔

ہے مری جرأت سے مشت خاک میں ذوق نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
خضر بھی بے دست وپا، الیاس بھی بے دست وپا
میرے طوفاں یم بہ یم، دریا بہ دریا، جو بہ جو!
گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟
میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط، اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو!

اے جبریل نادان تو مجھے میرے گذشتہ مقامات بلند یاد لاتا ہے اور فرشتوں کی عزت و آبرو کی دہائی دیتا ہے۔ ذرا میرے موجودہ مقامات کو دیکھ اور میرے مقابلے میں اپنے حال زار پر غور کر۔ میرا مقام اور میرا معاملہ یہ ہے کہ اگر مجھ میں جرأت انکار نہ ہوتی اور میں بروقت اس کا مظاہرہ نہ کرتا تو یہ جہان ''آرزو'' جو تجھے ''عالم رنگ و بو'' نظر آتا ہے تیرے ہی عالم کی طرح ''بے ذوق نمو'' اور عالم بے کاخ و کو'' بن کر رہ جاتا۔ میں اگر اپنی عزت و وقعت اور مقامات بلند کی قربانی نہ دیتا تو یہاں بھی کسی میں ایسی جرات ہرگز پیدا نہ ہوتی کہ اپنی شخصیت، اپنی ہستی اور اپنے وجود کو ثابت کرنے، منوانے اور اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش کر سکے۔ کائنات میں یہ جرات میری اور صرف میری بدولت ہے۔ ساری رونق اور ساری حرارت میرے دم سے ہے اور میرے ہی ایثار کا ثمرہ ہے دنیا میں عقل و خرد کا تانا بانا بھی میرے ہی فتنوں کا رہین منت ہے۔ یہاں ذوق نمو ہے جبکہ جنت میں ملائکہ کی تمام اطاعت شعاری غیر مشروط ہے جنت کی ''بے پیکار'' زندگی میں عقل کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی جب کہ یہاں عقل کی بڑی گنجائش ہے اور اس کے استعمال کی بڑی آزادی ہے میرے فتنوں نے عقل کو مزید متحرک اور چالاک بنادیا ہے۔

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟

ابلیس کہتا ہے۔ اے جبریل تیرا اور میرا کیا مقابلہ تیری حیثیت تو ان تن آسان تماشائیوں کی سی ہے جو کہیں دور کسی محفوظ کنارے پر کھڑے ہو کر خیر و شر کی جنگ کا نظارہ

کرتے ہیں بھلا "سبکساران ساحل" کو کیا معلوم کہ طوفان کے طمانچوں میں کیا تکلیف اور کیسی لذت ہے۔

"کجا دانند حال ماسبک ساران ساحل ہا"

جبریل اپنی کمالات وجسارت کی تعریف و توصیف کے ذکر کو اسی طمطراق سے جاری رکھتے ہوئے کہتا ہے۔

خضر بھی بے دست دپاالیاس بھی بے دست دپا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بہ جو

اے جبریل تیرا کیا ذکر تیرا اور میرا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں ہو سکتا میری طوفان خیزیوں کے آگے تو خضر والیاس جیسے جہاں گشت وجہاں بیں پیغمبر بھی بے دست دپا ہیں۔ میری طوفانی قوتوں کی حشر سامانیاں جو ئبار سے بحر ناپید کنار تک پھیلی ہیں۔ (اس شعر کا مصرع ثانی اس قدر رواں دواں اور مترنم ہے کہ قاری اور سامع دونوں مست ہو جاتے ہیں)

اپنی مدح وستائش اور قصیدہ گوئی کے بعد ابلیس حضرت جبریل کو اپنی دانست میں گویا ایک مخلصانہ مشورہ دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے اے جبریل اگر تجھے کبھی تنہائی میں خدا سے ملاقات کا شرف حاصل ہو تو ایک بات ضرور پوچھنا۔ خدا سے پوچھنا کہ یہ آدم کا قصہ کیا ہے؟ اور اس قصے کو آخر اس قدر رنگین کس نے اور کیوں کر کیا ہے؟ یہ ایک ایسا معنی خیز مشورہ ہے جس کے ایک سوال میں بے شمار سوال پوشیدہ ہیں۔ پہلی اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ابلیس نے خدا سے تخلیے میں جبریل کی ملاقات کو "فرصت" اور "اگر" کے ساتھ مشروط کر دیا ہے در اصل ابلیس بڑا شاطر ہے اور وہ خوب سمجھتا ہے کہ خدا کی غیر مشروط اور فرصت نہ دینے والی مسلسل اطاعت کی وجہ سے ملائکہ کو اتنا وقت ہی کہاں مل سکتا ہے کہ وہ خدا سے بات کریں اور بالفرض محال اگر وقت مل بھی جائے تو انہیں اتنا قرب خاص کیونکر حاصل ہو گا۔ جبریل خود بھی ایک خاص مقام تک ہی پہنچتے ہیں اور اس کے بعد وہ بھی کہہ اٹھتے ہیں۔

اگر یک سر موئے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم

اگر کسی طرح قریب پہنچ جائیں تو خدا کے سامنے منھ کھولنے کی ہمت کہاں سے

لائیں گے اور ہمت بھی اس سوال کی کہ "قصہ آدم کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟" فرشتوں کی یہی وہ لاچاری اور بے چارگی ہے جس کی ابلیس تحقیر کر رہا ہے ابلیس کے مطابق اس کے سوال کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ آدم کے قصے کو اسی کے انکار وایثار نے رنگین بنایا ہے۔ یہی مشیت خداوندی ہے اور خدا کی اس مشیت سے خدا کے سوا دوسرا کوئی واقف نہیں اگر چہ ابلیس بھی اپنے لب و لہجے میں اس واقفیت کا دعویدار بنا ہوا ہے۔

آخری شعر میں ابلیس احتیاط واستدلال کی تمام حدیں توڑ دیتا ہے اور بغیر کسی پاس ولحاظ کے نہایت متکبرانہ لہجے میں حضرت جبریل سے مخاطب ہوتا ہے۔

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو

اے جبریل! میں نے خدا کے حکم سے انکار کیا تو میرا انکار خدا کو ایسا گراں گذرا کہ مجھے راندۂ درگاہ کر دیا اس کے باوجود خدا کے دل پر میرے انکار کا اثر باقی رہا خدا کو آج بھی میرا انکار برابر کھٹکتا ہے۔

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح

مگر اے جبریل تیری حیثیت تو کچھ بھی نہیں تو صرف اطاعت شعاری کر سکتا ہے تو مجبور محض ہے تو میرے اور خدا کے معاملات کو نہیں سمجھ سکتا اس لئے اپنے کام سے کام رکھ اور اللہ اللہ کرتا رہ جیسا کہ ترا معمول ہے اے جبریل! مجھے کاروبار حیات میں روح پھونکنے دے، ذوق نمو پیدا کرنے دے کیونکہ میں ہی اس "تگاپوئے دمادم" کا بانی اور کارزار خیر و شر کی رستخیزی کا ضامن ہوں اور اس کارگہ حیات میں یہی "تگاپوئے دمادم" زندگی کی دلیل ہے۔ مگر تو اس حقیقت کو سمجھ ہی نہیں سکتا کہ۔

"تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو"

حسینؑ اور انقلاب ۔۔۔ جوشؔ

اردو زبان میں مرثیے کی روایت نہایت مستحکم ہے۔ اس خاص موضوع کے تعلق سے دنیا میں کسی بھی زبان کی شاعری اردو کا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ مرثیے نے اردو میں رزمیہ نگاری کی کمی کو بھی بڑی حد تک پورا کیا ہے۔ انیسؔ و دبیرؔ نے اپنے کمال فن کے ذریعے اس صنف شاعری کو مختلف کلاسیکی اصناف سخن کی خصوصیات سے مالا مال کر دیا ہے۔ غزل کا سوز و گداز، رمزیت، معنویت، مثنوی کا لطف بیان، جزئیات نگاری اور منظر کشی، قصیدے کی شوکت الفاظ، علوئے تخیل اور نزاکت خیال ڈرامے کی جذبات نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ سب کچھ سمیٹ کر مرثیے کے دامن میں ڈال دیا ہے۔

میر انیسؔ نے ایک اور اضافہ یہ بھی کیا کہ مرثیہ لکھنے کے علاوہ اس کی قرأت کو بھی ایک فن بنادیا۔ اور لکھنے اور پڑھنے میں ایسے کمالات اور جوہر پیدا کئے کہ پڑھنے اور سننے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ اردو میں مرثیہ نگاری اور خصوصاً انیس و دبیر کی مرثیہ نگاری پر ان گنت مضامین اور درجنوں کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ ناقدین سخن نے اس فن کو ہر زاویہ سے پرکھنے کی کوششیں کرتے ہوئے تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس ضمن میں صرف مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم ہی کی خدمات عالیہ کا جائزہ لیا جائے تو یہ دیکھ کر مسرت انگیز حیرت ہوتی ہے کہ اردو زبان نے ایسے افراد بھی پیدا کئے ہیں جن کے انفرادی کارنامے اداروں کے اجتماعی کاموں کو شرمندہ کر سکتے ہیں۔

مرثیے کے تعلق سے انیس و دبیر کے حوالوں کے بعد جوشؔ کی مرثیہ نگاری پر گفتگو کرنا بادی النظر میں بے سود سا معلوم ہوتا ہے، مگر ایسا ہے نہیں۔ جوش کی مرثیہ نگاری خصوصاً ان کے مرثیے "حسین اور انقلاب" کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہ سچ ہے کہ مرثیے

کے فنی لوازمات اور معرکہ رزم و بزم میں جوش اپنی ساری زبان دانی کے باوصف انیس و دبیر کے حریف نہیں ہو سکتے۔ جوش الفاظ کے بادشاہ ہیں اور ایک ایک بات کو سو سو طرح کہنے کا فن جانتے ہیں۔ نت نئی تشبیہات کے استعمال سے نئی فضابندی میں بھی جوش کا ثانی نہیں۔ لیکن انیس و دبیر پھر انیس و دبیر ہیں اور جب میدان بھی انہیں کا ہو تو اس فن میں ان کی سی بلندی تک پہنچنا کارِ محال ہے۔

جوش کے مرثیے "حسین اور انقلاب" پر گفتگو سے پیشتر یہ بات واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ یہاں ان کے مرثیے کا انیس و دبیر اور دوسرے مرثیہ گویوں سے مقابلہ یا موازنہ مقصد نہیں بلکہ معرکہ کربلا، شہادت حسین اور غم حسین کے تعلق سے "حسین اور انقلاب" میں جوش کے نقطۂ نظر کی تلاش مقصود ہے۔ اس زاویۂ خیال کے ساتھ فن مرثیہ گوئی سے قطع نظر کر کے اردو مرثیے کی ساری روایت کا عطر کشید کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس طویل روایت میں تمام مرثیہ گویوں کا عین مقصد امام حسین اور ان کے رفقاء، ان کی معصوم شخصیت اور ان پر کئے گئے ظلم کو یاد کر کے ان کی عظیم قربانیوں کو خراج عقیدت پیش کرنا ہے اور ایسے دُرِ بے بہا کی شہادت کو اسلام اور انسانیت کا سانحۂ عظیم سمجھ کر اس پر آنسو بہانا اور ماتم کرنا ہے۔ باقی تمام باتیں اسی جذبۂ ماتم کو ابھارنے اور اس کے نتیجے میں ثواب حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں۔ جیسے

ہاں مومنو بپا ہوا محشر بکا کرو
تن سے جدا ہوا سر سرور بکا کرو

حالانکہ ایسا بھی نہیں کہ تمام مرثیہ گویوں نے مقصد شہادت کو یکسر صرف نظر کر دیا ہو۔ مگر مرثیے کے لاکھوں اشعار کے نایاب ذخیرے میں شہادت عظمی کے بنیادی جذبے اور اولین مقصد پر فریاد و ماتم اس درجہ حاوی نظر آتا ہے کہ امام حسین اور ان کے رفقاء کے ایثار و قربانی کے بنیادی مقاصد کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے اور اس پر ایک غلاف سا پڑ جاتا ہے۔ جوش نے اسی غلاف کو ہٹانے کی کوشش کی ہے۔ یہی کوشش جوش کے "مرثیے حسین اور انقلاب" اور دوسرے روایتی انداز کے مرثیوں کے درمیان حد فاصل مقرر کرتی ہے۔ جوش غم حسین میں شور شین کرنے اور ماتم کناں ہونے کو غیر مستحسن تو نہیں سمجھتے مگر ان کی نظریں امام حسین کے اس مقصد شہادت پر جمی رہتی

ہیں جس کے نتیجے میں یہ حشر برپا ہوا اور وہ عظیم ترین مقصد باطل کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی جرأتِ انکار سے عبارت تھا جس کے لازمی نتیجے کے طور پر کلمۂ حق کی بنیاد استوار ہوئی اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجری اجمیری نے فرمایا:

شاہ است حسین بادشاہ است حسین
دین است حسین دین پناہ است حسین
سرداد، ندا دد دست دردست یزید
حقا کہ بنائے لاالہ است حسین

جوش کے مرثیے "حسین اور انقلاب" کی بنیاد اسی عقیدے، اسی خیال اور اسی نظریے پر قائم ہے، وہ کہیں بُکا کرنے کی تلقین نہیں کرتے۔ کیوں کہ ان کے خیال میں امام حسین کی شہادت نے اسلام اور ساری انسانیت کو جو سر بلندی عطا کی ہے وہی اس شہادت کا حاصل ہے کربلا کے تعلق سے اپنی ایک مشہور نظم "ذاکر سے خطاب" میں جوش اس بات پر چراغ پا نظر آتے ہیں کہ پیشہ ور ذاکر شہادت حسین کے نام پر رونے رلانے کا کاروبار کرتا ہے۔ اس نظم میں جوش کا لہجہ اس قدر تلخ ہو جاتا ہے کہ وہ ذاکر کو "مرد منفعل" "ماتم پسند" اور افسردہ فطرت" جیسے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ اس نظم میں کربلا کے سلسلے میں وہ اپنا نقطہ نظر ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں:

کربلا سے واقفیت بھی ہے مرد منفعل — کربلا درپردہ بشاش اور بظاہر مضمحل
جس کی رفعت سے بلندی آسمانوں کی خجل — جس کے ذروں پر دھڑکتے ہیں جوانمردوں کے دل
خندہ زن ہے جس کی رفعت گنبد افلاک پر — مہر تکمیل نبوت ثبت ہے جس خاک پر

اس نظم کے کچھ اور اشعار بھی ملاحظہ کیجیے۔ ان اشعار کے مطالعے سے جوش کے ذہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

سوچ تو کچھ جی میں اے مشتاق راہ مستقیم — مومنو کے دل ہوں اور واماندہ امید و بیم
شدت آہ و بکا سے دل ہوں سینے میں دو نیم — کیوں یہی لے دے کے تھا کیا مقصد ذبح عظیم
خوف ہے قربانی اعظم نظر سے گر نہ جائے — ابن حیدر کے لہو پر دیکھ پانی پھر نہ جائے

اس نظم میں جوش امام حسین کو اس محبت اور اس فخر سے یاد کرتے ہیں کہ امام حسین کی غیرت، رحمت، شرافت و نجابت اور ایثار و قربانی کے ساتھ بے بدل شجاعت

اور بے مثل صبر کی یاد تازہ ہو جاتی ہے ۔

جو دہکتی آگ کے شعلوں پہ سویا وہ حسین
جس نے اپنے خون سے عالم کو دھویا وہ حسین
جو جواں بیٹے کی میت پر نہ رویا وہ حسین
جس نے سب کچھ کھو کے پھر کچھ بھی نہ کھویا وہ حسین

خون نے جس کے دو عالم میں اجالا کر دیا
مرتبہ اسلام کا جس نے دوبالا کر دیا
ہنس کے جس نے پی لیا جام شہادت وہ حسین
مر گیا لیکن نہ کی فاسق کی بیعت وہ حسین

ہے رسالت کی سپر جس کی امامت وہ حسین
جس نے رکھ لی نوع انسانی کی عزت وہ حسین
مسکرایا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر
وہ کہ سوز غم کو سانچے میں خوشی کے ڈھال کر

بظاہر یہ دونوں بند مرثیے کے معلوم ہوتے ہیں۔ حالانکہ "ذاکر سے خطاب" کا حصہ ہیں۔ جوش نے جہاں بھی امام حسین کو یاد کیا ہے شہادت کے بنیادی مقصد کو سامنے رکھ کر اتباع حسین میں عمل کو تحریک دی ہے اور غیرت ایمانی کو للکارا ہے۔ ذاکر سے کہتے ہیں:

ہاتھ ہے ماتم میں تیرا سینہ افکار پر
اور حسین ابن علی کا ہاتھ تھا تلوار پر

یا

ذہن کو بیچارگی سے انس پیدا ہو گیا
اشجع عالم کے پیرو یہ تجھے کیا ہو گیا

جوش اسی فکر و نظر کے ساتھ "حسین اور انقلاب" میں نمودار ہوئے ہیں مرثیے کا عنوان ہی جوش کے نقطہ نظر کا مکمل تعارف ہے جوش نے امام حسین کی ہستی موجود کو جو اگرچہ ہماری ظاہر بین نگاہوں سے روپوش ہے اور ان کے انقلاب آفریں پیغام کو اس کے بنیادی مقصد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ امام حسین کی ذات گرامی پوری انسانیت بالخصوص اہل ایمان کے لئے تاقیامت مشعل راہ بنی رہے گی۔ ان کی عظیم قربانی زندگی کی تمام تر تیرہ و تار راہوں میں مینارہ نور کی مانند روشن و تابناک ہے۔ "حسین اور انقلاب" سے یہی تاثر ملتا ہے۔ اڑسٹھ بندوں پر مشتمل اس مسدس کا نقطہ ارتکاز "اعلان امر حق" ہے۔ کربلا کے وسیلے سے یہی اعلان حق فکر جوش کی تعمیر کا سنگ بنیاد بن گیا ہے "حسین اور انقلاب" میں جوش اسی مرکزی نقطے کی تعبیر و تشریح کرتے ہیں۔ "اعلان حق" کے راستے کی دشواریاں، سفر کے

آغاز و اختتام کے نتائج، منزل کی ظاہری اور باطنی کیفیات اور ان کیفیات کا بیان جوشؔ کے مطمح نظر کی وضاحت کرتا ہے۔

زیر بحث مرثیے کا آغاز، جوشؔ کے عام انداز میں ''حیات کی ناپائیداری'' کے ''فسانہ آہ و فغاں'' اور ''تلخی حیات کی ہولناک داستان'' کے بیان سے ہوتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی کا یہ نقشہ مثنوی زہر عشق کے وصیت نامے ''جائے عبرت سرائے فانی ہے'' کی یاد تازہ کر دیتا ہے مگر اس سے کم اثر انگیز ہے۔ آٹھویں بند تک یہی صورت حال ہے۔ نویں بند سے جوشؔ مرثیے کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں اور اس موقع پر وہ صائب کو بھی یاد کرتے ہیں جو ان کا ہم خیال ہے:

یوں تو غم معاش کا سوز نہاں ہے اور — تکلیف جاں گدازی عشق بتاں ہے اور
لب تشنگی شیب و عذاب خزاں ہے اور — اعلان امر حق کی مگر داستاں ہے اور
''چوں حرف حق بلند شود دار می شود — گفتارِ صدق مایہ ٔ آزار می شود''

اس کے بعد مسلسل تین بندوں میں ''اعلان امر حق'' کی سختیوں کا اظہار ہے۔ تیسرے بند کا آخری شعر اس خیال کو پوری طرح اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے:

ہر گام پر حیات کے چہرے کو فق کرے
مرنا جو چاہتا ہو وہ اعلان حق کرے

''اعلان امر حق'' سے متعلق بندوں کے اختتام کے ساتھ شاعر انسانی نفسیات کی ان گتھیوں کی جانب توجہ مبذول کرتا ہے جو ماحول و وراثت کی طویل روایات اور عادات واطوار کے وسیلے سے انسانی مزاج کا جزو لاینفک بن جاتی ہیں۔

کیسے کوئی عزیز روایات چھوڑ دے — کچھ کھیل ہے کہ کہنہ حکایات چھوڑ دے
گھٹی میں تھے جو حل وہ خیالات چھوڑ دے — ماں کا مزاج باپ کے عادات چھوڑ دے
ورثے میں جو ملے ہیں وہ اصنام توڑ دے — کس جی سے کوئی رشتہ اوہام توڑ دے

اس کے باوجود کوئی جیالا یہ جرات دکھائے اور اوہام و اصنام توڑنے کی جسارت کرے تو۔

اٹھتا ہے غلغلہ کہ یہ زندیق نامراد
کج فکر و کج نگاہ وکج اخلاق و کج نہاد
پھیلا رہا ہے عالم اخلاق میں فساد
اے صاحبان جذبہ دیرینہ جہاد
ہاں جلد اٹھو تباہی باطل کے واسطے
جنت ہے ایسے شخص کے قاتل کے واسطے
اور بالخصوص جب ہو حکومت کا سامنا
رعب و شکوہ وجاہ وجلالت کا سامنا
شاہان کج کلاہ کی ہیبت کا سامنا
قرنا وطبل وناوک ودرایت کا سامنا
لاکھوں میں ہے وہ ایک کروڑوں میں فرد ہے
اس وقت جو ثبات دکھائے وہ مرد ہے
اور بالخصوص بند ہو جب ہر در نجات
حق تشنہ لب ہو دشت میں باطل لب فرات
دست اجل میں ہو زن وفرزند تک کی ذات
حائل ہو مرگ وزیست میں لے دے کے ایک رات
یہ وہ گھڑی ہے کانپ اٹھے شیر نر کا دل
اس تہلکے کو چاہئے فوق البشر کا دل

کربلا کی رات کی مرقع کشی میں جوشؔ اپنے مخصوص فارم میں نظر آتے ہیں۔ الفاظ جو ان کے دست قلم میں کٹھ پتلیوں کی طرح ہیں مناسب ترین تراکیب میں قاری کو مطلوبہ کیفیات سے دو چار کر دیتے ہیں۔ ''ڈراؤنی ظلمت''''مرگ بے پناہ''''پرہول خامشی''''موت کی چاپ''''بے ... چراغ''''ارض وسما کی رکی ہوئی سانس''اور ؎

بکھرے ہوئے ہوا میں وہ گیسو رسول کے
تاروں کی روشنی میں وہ آنسو بتول کے

اس رات میں امام حسین کے بے مثال کردار کا لاثانی واقعہ جوشؔ کی زبانی سنئے:

وہ رات جب امام کی گونجی تھی یہ صدا
اے دوستان صادق و یاران باصفا
باقی نہیں رہا ہے کوئی اور مرحلہ
اب سامنا ہے موت کا اور صرف موت کا
آنے ہی پر بلائیں ہیں اب تحت وفوق سے
جانا جو چاہتا ہے چلا جائے شوق سے

''دوستان صادق ویاران باصفا'' بھی آخر حضرت حسین کے رفقا تھے۔ جواباً عرض کرتے ہیں ؎

قرباں نہ ہو جو آپ سے والا صفات پر
لعنت اس امن وعیش پر تف اس حیات پر
پتلے ہیں ہم حدید کے پیکر ہیں سنگ کے
انساں نہیں پہاڑ ہیں میدان جنگ کے

یہی وہ تاریخ ساز رات ہے جسے جوشؔ کے الفاظ میں:

شبیر نے حیات کا عنواں بنادیا
اس رات کو بھی مہر درخشاں بنا دیا

حضرت حسینؑ کی مدح میں جوشؔ نے جو اشعار کہے ہیں، ان میں اور معرکہ دشت کرب وبلا میں جذبہ شوق ایک قدر مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس نے حضرت حسینؑ کو اعلان حق کا حوصلہ بخشا اور دشت بلا و غم" کو "دشت ثبات و عزم" بنادیا مرثیے کے مدحیہ بندوں میں جوشؔ نے حضرت حسینؑ کو صاحب مزاج نبوت، وارث ضمیر رسالت، خلوتی شاہد قدرت، فخر مشیت، آئین جدید کا بانی، کاروان عزم کا رہبر، منارہ عظمت، دلیل شرافت اور روح انقلاب کا پروردگار جیسے القاب سے یاد کیا ہے بعض اشعار کی والہانہ وارفتگی، جوشؔ کے مخصوص لب و لہجے اور پر جوش انداز بیان کے ساتھ معنی خیز اشارے بھی کرتی ہے مثلاً:

ہاں وہ حسینؑ جس کا ابد آشنا ثبات — کہتا ہے گاہ گاہ حکیموں سے بھی یہ بات
یعنی درون پردہ صد رنگ کائنات — اک کارساز ذہن ہے اک کارساز ذات
سجدوں سے کھینچتا ہے جو مسجود کی طرف — تنہا جو اک اشارہ ہے معبود کی طرف
طاقت سی شے کو خاک میں جس نے ملادیا — تختہ الٹ کے قصر حکومت کو ڈھادیا
جس نے ہوا پہ رعب امارت اڑادیا — ٹھوکر سے جس نے افسر شاہی گرادیا
اس طرح جس سے ظلم سیہ فام ہوگیا — لفظ یزید داخل دشنام ہوگیا
جس کی جبین پہ کج ہے خود اپنے لہو کا تاج — جو مرگ وزندگی کا ہے اک طرفہ امتزاج
سر دے دیا مگر نہ دیا ظلم کو خراج — جس کے لہو نے رکھ لی تمام انبیا کی لاج
سنتا نہ کوئی دہر میں صدق و صفا کی بات — جس مرد سرفروش نے رکھ لی خدا کی بات

یا مثلاً یہ اشعار ؎

مردانگی کے طور کا تنہا کلیم ہے — تو سینہ حیات کا قلب سلیم ہے
غازہ ہے تیرا خون رخ کائنات کا — ہر قطرہ کوہ نور ہے تاج حیات کا
رہتی ردائے شام کی ظلمت ہی دین پر — ہوتا نہ تو تو صبح نہ ہوتی زمین پر

تو ہے وہ مہر دفتر عزم و ثبات پر اب تک چمک رہی ہے جو پشت حیات پر
واحد جو اک نمونہ ہے ذبح عظیم کا شاہد ہے جو خدا کے مذاق سلیم کا

"حسین اور انقلاب" میں جو عزم حسین اور روح انقلاب کار فرما ہے جوش نے اسی حسینی عزم اور انقلابی روح کو ایک بار پھر آواز دی ہے:

پھر حق ہے آفتاب لب بام اے حسین پھر بزم آب وگل میں ہے کہرام اے حسین
پھر زندگی ہے سست و سبک گام اے حسین پھر حریت ہے مورد الزام اے حسین
ذوق فساد و ولولہ شر لئے ہوئے پھر عصر نو کے شمر ہیں خنجر لئے ہوئے
مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائب یزید ہیں دنیا کے شہر یار پھر کربلائے نو سے ہے نوع بشر دو چار
اے زندگی جلال شہ مشرقین دے اس تازہ کربلا کو بھی عزم حسین دے

مرثیے کے اختتام کے ساتھ اول اول تو جوش دامن حسین تھامنے کی تلقین کرتے ہیں، لیکن آخری تین چار بندوں میں "مارلو ساتھی جانے نہ پائے" قسم کے اشعار پر اتر آتے ہیں۔ حسینی انقلاب یکایک ترقی پسندوں کے انقلاب میں بدل جاتا ہے۔ مثلاً

عفریت ظلم کانپ رہا ہے اماں نہ پائے دیو فساد ہانپ رہا ہے اماں نہ پائے
تلوار شمر عصر کے سینے میں بھونک دو ہاں جھونک دو یزید کو دوزخ میں جھونک دو
الٹے رہو کچھ اور یونہی آستین کو الٹی ہے آستیں تو پلٹ دو زمین کو

آغاز و اختتام کے ان کمزور پہلوؤں کے باوجود جوش کا نقطہ نظر واضح اور حقیقی ہے اور ایک مثبت فکر کی ترجمانی کرتا ہے۔ مرثیے میں نہ روایتی انداز کا چہرہ ہے نہ سراپا نہ رخصت ہے نہ آمد نہ رجز ہے، نہ جنگ، نہ شہادت نہ بین۔ اس کے باوجود سب کچھ ہے اس کی اثر آفرینی، انفعالیت آمیز نہیں، حوصلہ انگیز ہے اور یہی اس انقلابی مرثیہ کا بنیادی مقصد بھی ہے۔

O

غالب اور نعت گوئی

تعریف و توصیف اور مدّاحی کے لئے اگرچہ قصیدہ کی صنف مخصوص ہے لیکن قصائد میں ممدوحین کے مرتبے کے پیش نظر کچھ حدیں مقرر و متعین کرلی گئی ہیں چنانچہ خدا کی تعریف و توصیف کو "حمد" کہاجاتا ہے محبوب خدا کے اوصاف کا بیان "نعت" کہلاتا ہے۔ خلفاء اور ائمہ کی مدح کے لئے منقبت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور دیگر قصائد کو مدح کہتے ہیں۔ ان میں آخری دو اصطلاحات "منقبت" اور "مدح" کے استعمال پر ناقدین میں اختلاف ہو سکتا ہے! لیکن اول الذکر دونوں اصطلاحیں اپنی جگہ مستند ہیں۔ چنانچہ "حمد" سے ہمیشہ مراد خدا کی تعریف لی جاتی ہے اور "نعت" سے مراد حضرت رسول اکرم صلعم کی مدح۔ قصیدہ کے لئے اگرچہ ایک خاص ہیئت مقرر ہے۔ لیکن "نعت" کسی ہیئتی حد بندی کی پابند نہیں ہے! اس صنف کے لئے مثلث، مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، مثنوی، نظم۔ غرض کسی بھی ہیئت کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ تقریباً ہر شکل میں "نعت" کے نمونے دستیاب ہیں۔ لیکن موضوع کے لحاظ سے یہ بھی مداحی ہے۔ اس لیے قصائد کا اثر اس پر بہت نمایاں ہے قصیدہ کی عام تصنع آمیز فضا کے برعکس نعت میں جذبے کی صداقت اور خلوص کی گہرائی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ عقیدہ اور عقیدت کا امتزاج اس میں کشش حسن پیدا کرتا ہے تخیل اور احساس اس کی آرائش کرتے ہیں۔ تغزل کی جلوہ فرمائی اور مبالغے کی بلند پروازی جو شاعری کی آن بان اور شان ہیں "نعت" میں اپنے عجز کا اظہار کرتے ہیں۔

نعت گوئی بظاہر جس قدر آسان معلوم ہوتی ہے۔ اتنی آسان نہیں ہے اس میں شاعری کے فن کی تمام نزاکتیں اور پیچیدگیاں تو موجود ہی ہیں لیکن نعت گوئی مداحی کا "پل صراط" بھی ہے جس پر سے کامیابی کے ساتھ گزر جانا بیحد شوار ہے۔ اس کے لئے نہ تو

صرف عقیدہ کام آتا ہے اور نہ عقیدت بلکہ فن کاری اور طبع سلیم لازم ہے۔ نعت میں ممدوح کا مرتبہ اس قدر بلند ہے کہ خود خدا نے اپنے کلام میں ان کی مدح کی ہے۔ اور کبھی نام لیکر مخاطب نہیں کیا ہے۔ عقیدت کے ساتھ میں عبد و معبود کے نازک فرق کا لحاظ رکھنا حفظ مراتب پر نظر رکھنا۔ تخیل کو حقائق کا پابند رکھنا۔ وہ دشوار گزار مراحل ہیں جن میں بقدر استعداد شاعروں نے کسی نہ کسی صورت میں نعت گوئی کی ہے۔ نعت گوئی اظہار عقیدت کے طور پر شعرا میں دوسری اصناف کے ساتھ مقبول رہی ہے۔ چنانچہ جہاں بادشاہوں کی قصیدہ گوئی حصول انعام واکرم کے لئے کی گئی ہے۔ وہیں حصول ثواب آخرت کے لئے نعت بھی لکھی گئی ہے غالبؔ کے یہاں بھی نعت کی یہی آخر الذکر صورت ملتی ہے۔ ان کے اردو دیوان میں نعت نہیں ہے۔ غالبؔ نے اردو کو کیوں اس لائق نہیں سمجھا کہ ان میں نعت کہتے۔ اس کا سبب بظاہر کچھ سمجھ نہیں آتا لیکن اس کی توجیح اس طرح کی جاسکتی ہے کہ غالبؔ اردو زبان کو "بے رنگ من است" کہتے رہے اور انہوں نے اپنی طبیعت کے نقش ہائے رنگارنگ فارسی ہی میں پیش کئے ہیں۔ نعت کا موضوع بھی ان کے لیے بے رنگ اور خیر اہم نہ تھا! اس لیے اس صنف کو انہوں نے فارسی میں اظہار کے لئے مخصوص کر لیا جس میں ان کی جولانئ طبع کو اظہار کے لئے زیادہ وسیع میدان میسر تھا۔

غالبؔ کے فارسی کلام میں نعتیں مختلف اصناف میں بکھری ہوئی ہیں انہوں نے غزل قصیدہ مثنوی وغیرہ میں نعتیں لکھی ہیں۔ صنف غزل میں ان کی ایک نعت دستیاب ہے!

حق جلوہ گرز طرز بیان محمدؐ است
آرے کلام حق بہ زبان محمد است
آئینہ دار پر تو مہرست ماہتاب
شان حق آشکار زشان محمد است
تیر قضا ہر آئینہ دردتر کش حق است
اما کشاو آں زکمان محمد است
دانی اگر بمعنئ لولاک وارسی
خود ہر چہ از حق است از آن محمد است
ہر کس ختم بدانچہ عزیز است می خورد

سو گند کرد گار بجان محمد است
واعظ حدیث سایہ ٔ طوبیٰ فرو گزار
کا اینجا سخن زسرو روان محمد است
بنگر دونیمہ گشتن ماہ تمام را
کاں نیمہ جنبشے زبنان محمد است
درخود ز نقش مہر نبوت سخن روی
آں نیز نامور زفشاں محمد است
غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

اس نعت میں غالب نے اپنے جذبات عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ اس کا ہر شعر خلوص دل کا مظہر ہے غالب نے اس میں خارجی پہلوؤں کو موضوع سخن نہیں بنایا اس لیے، اور چہرہ، سراپا۔ لباس اور گفتار کی تعریف و توصیف کی بجائے۔ صرف صفات و کمالات سے ممدوح کی حقیقی عظمت و بزرگی کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے بڑی ہی صاف گوئی سے ممدوح خدا کی تعریف میں اپنے عجز و قصور کا اعتراف یہ کہہ کر کر لیا ہے۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

غالب کے کلیات فارسی میں قصیدہ اول کا موضوع "حمد" ہے قصیدہ دوئم و سوئم نعت میں ہیں جن کے مطلع حسب ذیل ہیں۔

قصیدہ دوم:۔

مرادے است بہ پس کوچہ گرفتاری
کشادے روئے اتر؟ شاہدان بازاری

قصیدہ سوئم:۔

آں بلبلم کہ درچمنستان بشاخسار
بود آشیان من شکن طرہ ٔ بہار

قصیدہ چہارم میں نعت اور منقبت مشترک ہے اس کا مطلع یوں ہے

چوں تازہ کنم در سخن آئین بیاں را
آواز دہم شیوہ رباہم نفساں را

ایک مثنوی "نعتیہ" ہے جس کا عنوان "بیان نموداری شان نبوت و ولایت کہ در حقیقت پر تو نور الانوار حضرات الوہیت است" ہے۔ اس کے علاوہ مثنوی "ابر گہر بار" میں نعت اور بیان معراج پر مشتمل اشعار کی تعداد قابل لحاظ ہے

غالب اگرچہ نعت گو شاعر نہ سہی، ان کی شہرت کا دارومدار ان کی غزل گوئی اور خطوط نویسی ہی سہی لیکن اس صنف میں بھی غالب کا نام محسوب ہوتا ہے۔ غالب کی شاعری کے اس پہلو پر ابھی کم لکھا گیا ہے۔ نعت گوئی ابھی تک ادبی سے زیادہ مذہبی صنف شمار ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا کوئی بھرپور جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ لیکن اگر مستقبل میں اس طرح کا کوئی جائزہ لیا گیا تو غالب کا نام اس میں بھی نمایاں ہوگا اس لئے کہ غالب کی قوت تخئیل جس نے شاعری میں رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ اس نے نعت گوئی میں بھی گہرے نقوش بنائے ہیں۔ ان نقوش میں عقیدہ اور عقیدت کا امتزاج بھی ہے اور شاعرانہ پیکر تراشی کے نمونے بھی۔

○

غزل کے اداشناس اختر سعید خاں

غزل کی تہذیب کا فکری اور فنی مطالعہ کرنے والوں کو اختر سعید خاں کے اس خیال سے اختلاف نہیں ہوگا کہ بنیادی طور پر:

"غزل کا فن نرم آنچ سے جلا پاتا ہے، بھڑکتے ہوئے شعلوں سے نہیں۔ قدیم غزل ہو یا جدید اس کی اپنی ایک تہذیب ہے وہ اشاروں اور کنایوں میں بات کرتی ہے، اونچی آواز میں نہیں بولتی، اس کا کمال گویائی برہنہ حرفی نہیں ہے، پیام زیرلبی ہے۔ غزل کا فن نہ سینہ کوبی ہے نہ قہقہہ لگانا وہ ایک آنسو ہے پلکوں پر ٹھہرا ہوا، ایک تبسم ہونٹوں پر پھیلا ہوا۔ کبھی اس کے تبسم میں اشکوں کی نمی ہوتی ہے اور کبھی اشکوں میں تبسم کی جھلک۔"

یہ الگ بات ہے کہ غزل کی اس تہذیبی میراث کے امین، پیام زیرلبی کے واقف کار، اس رکھ رکھاؤ اور سلیقے سے نباہ کرنے والے اب ذرا مشکل سے ملتے ہیں۔

حالانکہ غزل کا چلن آج بھی کم نہیں جو رسالہ اٹھائیے، جو پروگرام سنئے ہر طرف غزل ہی غزل ہے۔ یہ پرُفن صنف سخن سب کا دل لبھاتی ہے مگر قابو میں کسی کے نہیں آتی۔ بظاہر ایسی معصوم و سادہ کہ ہر شخص کہنے پر آمادہ۔ کہیے تو ایسی مشکل کہ لوہے کے چنے بھی اس کے مقابلے میں ملائم معلوم ہونے لگیں کلاسیکل غزل کہنا اور بھی دشوار معلوم ہوتا ہے۔ کم و بیش ساری باتیں کہی جا چکیں۔ ساری زمینیں از کار رفتہ ہو گئیں۔ لب و لہجے کی سرگوشیاں، صوت و آہنگ اور لفظ و معنی کی طلسمی فضا بندی ایک عام خیال یہ ہے کہ اگلے لوگوں کا حق تھا سو وہ ادا کر کے چل دیئے مگر یہ خیال یوں غلط ہو جاتا ہے کہ اگر سچ ہوتا تو نہ فیضؔ و فراقؔ ہوتے نہ مجروحؔ و اختر سعید خاں، اختر سعید خاں کے نام پر چونکئے نہیں تنقید نے

بے اعتنائی نہ کی ہوتی یا اختر سعید خاں خود اشتہاریت کے فن سے واقف ہوتے تو فیض و مجروح کی صف کے شاعر تھے۔ برسوں تک ترقی پسند تحریک سے متاثر و منسلک رہے، آج بھی ہیں مگر اپنی غزل کو تحریکی مقاصد کا وسیلہ اشتہار کبھی نہیں بنایا۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتے تھے۔ ایسا کرتے تو انہیں غزل کے علاوہ خود اپنے مزاج سے بھی بغاوت یا منافقت کرنی پڑتی اس لئے کہ غزل اور اختر سعید خاں کے مزاج میں ایسی حیرت انگیز مماثلت، مناسبت اور ہم آہنگی ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا پرتو معلوم ہوتے ہیں۔

اختر سعید خاں ہمارے عہد کے نہایت شائستہ فکر، شائستہ مزاج اور شائستہ زبان شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنی غزل میں نرم آنچ کی روایت کو فروغ دیا ہے۔ غزل کی تہذیب ان کی اپنی تہذیب بھی ہے وہ غزل کے تبسم میں اشکوں کی نمی اور اشکوں میں تبسم کی جھلک کے راز آشنا ہیں۔ غزل جو رازوں کو منکشف کرنے اور انکشاف کو راز بنانے کا فن جانتی ہے۔ اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ اختر سعید خاں کے اشعار میں جلوہ گر ہے۔ ان کی غزل میں رچاؤ اور وہ وارفتگی ہے جو پیرایہ بیان کی شستگی زبان کی صفائی، ذوق کی پاکیزہ نفسی اور لب و لہجے کے لطیف البیلے پن سے عبارت ہے۔ اب ذرا یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ہر ایک غم سے سلامت گزر گیا ہے دل
خدا کرے کہ محبت کی تاب لے آئے

کس کی آہٹ یہ آتی ہے پچھلے پہر
تیرے ہمراہ باد صبا کون ہے

نہ جانے بزم حریفاں میں تذکرے کیا تھے
کہ آج جو بھی ملا ہم سے ناصحانہ ملا

بارہا دیکھ لیا تجھ کو بھلا کر ہم نے
خیر سے وہ بھی تری یاد کا ہے اک پہلو

چھٹکے نہیں ہیں آج تلک ریزہ ہائے دل
ٹوٹے تعلقات کا رشتہ عجیب ہے

قریب و دور کچھ پرچھائیاں سی ساتھ چلتی ہیں
نہ جانے یہ تمہاری یاد کے سائے ہیں یا تم ہو

اب یہ بیاض دل کے ساتھ چھیڑ سی کیا ہوا کی ہے
کوئی ورق اڑا گئی کوئی پلٹ کے رہ گئی

غزل میں حیات و کائنات کے وسیع تصور، عصری آگہی، احساس تنہائی اور سماجی سیاسی اور سائنسی شعور کی بات بھی کی جاتی ہے غزل ان تمام تجربات کو اپنے طرز پر ایجاز و اختصار، رمز و کنایہ اور علامت و استعارے کی زبان میں پیش کرتی ہے۔ ۷۲ سالہ اختر سعید خاں نے جو ایک کامیاب وکیل بھی ہیں ان تمام حوالوں کو اپنے مخصوص نرم لب و لہجے میں

نہایت خوبی کے ساتھ اشعار میں ڈھالا ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

خموش رہئے تو کیا کیا صدائیں آتی ہیں
پکاریئے تو کوئی مڑ کے دیکھتا بھی نہیں

صبح سفر سے شام سفر تک اپنی تو روداد یہ ہے
صحرا صحرا دھوپ بہت تھی گلشن گلشن دام بہت

گم ہوں اپنی گرد سفر میں سمت سفر کا ہوش کہاں
ایک بیاباں زیر قدم ہے ایک بیاباں آنکھوں میں

جن راہوں میں لٹتے رہے ہم وہ راہیں منزل کہلائیں
جن میں ڈوبے لاکھ سفینے وہ سب دریا ساحل ٹھہرے

کون سی وہ زمین ہے تو جس کو
آسمانوں میں ڈھونڈ تا ہے میاں

اٹھا رہا ہوں ایک ایک پردہ کائنات کا
یہ بات اور ہے کہ بے نقاب ہو گیا ہوں میں

سلگتے خوابوں کی بستی ہے رہگزار حیات
یہاں دھواں ہی دھواں ہے ذرا سنبھل کے چلو

ڈھونڈو گے تو شہروں میں بھی وحشت کے ساماں ہیں بہت
اہل جنوں کیا سر پہ ڈالے دامن صحرا بیٹھے ہو

مکتبہ جامعہ ہمارے شکریے اور مبارک باد کا مستحق ہے کہ اس نے اختر سعید خاں کا دوسرا شعری مجموعہ "طراز دوام" (پہلا مجموعہ "نگاہ" تھا) چھاپ کر نئی نسل کو اختر سعید خاں کے کلام سے متعارف کرایا اور بزرگوں کو یادوں کی بازیافت کا موقع فراہم کیا۔

لہجے کی تمازت کا شاعر -- مظفر حنفی

"پانی کی زبان" سے "پردہ سخن کا" تک نو شعری مجموعوں کے خالق ڈاکٹر مظفر حنفی اپنے منفرد تیکھے انداز اور نکیلے لہجے سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کے شعری سفر کا پہلا سنگ میل "پانی کی زبان" شب خون کتاب گھر الہ آباد سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔ محمد علوی کے پہلے مجموعہ کلام "آخری دن کی تلاش" کا زمانہ اشاعت اور ادارۂ طباعت بھی یہی تھا۔ یہ دونوں مجموعے اپنے شیوۂ گفتار کے انوکھے پن کی وجہ سے اردو کی شعری دنیا میں چونکا دینے والی حیثیت کے مالک تھے۔ "پانی کی زبان" کی غزلوں کی اشاعت کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ یہ "صریر خامہ" اور "تیکھی غزلوں" کے بعد کا کلام ہونے کے باوجود ان سے پہلے زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔

مظفر حنفی کے پہلے مجموعہ کلام میں جدید نظموں اور غزلوں کی مساویانہ تقسیم ہے لیکن ہم اپنے مضمون کو غزلیات تک ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں، حالانکہ غزلوں کا مطالعہ کرتے ہوئے غیر ارادی طور پر دو چار نظمیں بھی پڑھنے میں آگئیں تو بارہا جی چاہا کہ ان پر بھی کچھ لکھنا چاہئے مگر مضمون کی تنگ دامانی سے مجبور ہو کر ان کو نظر انداز کرنا پڑا۔ دوسرا مجموعہ "عکس ریز" مظفر حنفی کی ایک طویل طنزیہ نظم ہے۔ اسی طرح "صریر خامہ" اور "تیکھی غزلیں" خالصتاً طنزیہ کلام پر مشتمل ہیں۔ ہم ان تینوں کتابوں کو بھی زیر بحث موضوع سے خارج کرتے ہیں۔ کہ مظفر حنفی کا حقیقی رنگ اس کے بعد نکھر کر سامنے آتا ہے۔ یہاں اس مختصر سے مضمون میں ان کے شعری سفر کے ارتقائی عمل کو موضوع بحث بنانا یا درجہ بندی اور ادوار کی تقسیم کے ساتھ تدریجی ارتقا کا تفصیلی جائزہ لینا خارج از امکان ہے اس کے لئے ایک مکمل تحقیقی کام کی ضرورت تھی جو اکولہ کے محبوب راہی بحسن وخوبی

انجام دے چکے ہیں۔

زیر بحث مضمون کی تکمیل کے لئے مظفؔر حنفی کے جن چھ شعری مجموعوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں "پانی کی زبان"، "دیپک راگ"، "طلسم حرف"، "یم بہ یم"، "پردہ سخن کا" اور "کھل جا سم سم" شامل ہیں۔ "پانی کی زبان" کو اس لیے شامل کیا ہے کہ یہ مظفؔر حنفی کا پہلا مجموعہ کلام ہونے کے علاوہ ہندوستان میں اردو کے جدید شعری سفر کی پہلی صف میں شریک ہے۔

"پانی کی زبان" اور اس سے زیادہ "صریر خامہ" اور "تیکھی غزلیں" میں مظفؔر حنفی اپنے استاد شاؔد عارفی کے نقش قدم پر چلتے نظر آتے ہیں۔ شاؔد عارفی کی چال کچھ اس درجہ ٹیڑھی ترچھی ہے کہ اس کی تقلید میں بہک جانے کے امکانات زیادہ قوی ہیں، کئی مقامات پر شاؔد صاحب نے جان بوجھ کر بہکنے کی کوشش کی ہے، دراصل وہ خود بہک کر دوسروں کو بہکانے کے فن سے بخوبی واقف تھے۔ اور اس میں لذت محسوس کرتے تھے، ان کے اشعار کہیں اترا اترا کر چلتے دکھائی دیتے ہیں اور کہیں سینہ تانے اکڑتے نظر آتے ہیں۔ مظفؔر حنفی نے ان کی تقلید میں بہت احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے کامیاب تقلید کی ہے، اس کامیابی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مزاجاً مظفؔر حنفی شاؔد صاحب سے بہت قریب ہیں چنانچہ ان کی شاعری کا مزاج اپنے خالق کے مزاج سے ہم آہنگ رہا ہے۔ اس میں شعری پیکر کو بے روح کرنیوالا دوغلہ پن نظر نہیں آتا، ان کا کلام ان کی شخصیت کی فوٹو کاپی ہے۔

ابتدا میں مظفؔر حنفی تیز نکیلے نشتر چلاتے ہیں، جس پر وار کرتے ہیں ان کے بدن کو طنز کے تیروں سے زخمی کر دیتے ہیں، ان کے نشتر عصر حاضر کی روح میں اترتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ "تیکھی غزلیں" اور "صریر خامہ" میں اس قبیل کی تخلیقات کثرت سے موجود ہیں۔ "پانی کی زبان" کی غزلوں میں اسلوب کی تازگی اور گفتار کا نرالا پن اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ "تیکھی غزلیں" اور "صریر خامہ" کی طرح "پانی کی زبان" میں شعری رویہ کا انحصار طنز پر نہیں، طنز ہمرکاب ضرور ہے۔ طنز آمیز گفتار کا نرالا پن ان کے شعری سرمایہ کی جان ہے۔ یہ نرالا پن ٹیڑھی ترچھی اور بانکی سجیلی چال سے عبارت ہے مظفؔر حنفی کو اپنی اس چال پر بڑا ناز ہے۔ بقول ظ۔ انصاری "اسے اپنی ترچھی پرواز پر ناز ہے اور ہمیں بھی اس کے ہاں یہی صفت خوب جچتی ہے۔"

الفاظ کی تکرار سے موسیقیت اور مہمل لفظیات سے مطلوبہ معنویت پیدا کرنا مظفؔر حنفی کا کمال ہے، زندگی کی ناہمواریوں کو مظفؔر حنفی غزل کی چکنی زبان میں پیش کرنے کے قائل نہیں، اس قسم کے موضوعات کو اپنے حقیقی اور فطری رنگ میں ظاہر کرنے کے لئے مظفؔر حنفی کھردرے لفظوں کا بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے۔

ہمارے پاس ابھی زخم ہیں دکھانے کو
تمہارے پاس نمک ہی نہیں رہا۔ دیکھا

قصہ یہ ہے اک شیشہ تھا اک پتھر تھا پھر کیا تھا
اس نے مجھ کو میں نے اس کو چھو کر دیکھا پھر کیا تھا

گرداگردو گردا گردو گردا گردو گردا گرد
جب راہوں کے بندھن ٹوٹے صحرا صحرا اپھر کیا تھا

تاروں کے چلے تیر لگاتار ہمیں پر
اڑا کے گری رات کی دیوار ہمیں پر

سپاٹ لفظوں کو لہجے کی سان پر رکھدے
سیاہ مرچ غزل کی زبان پر رکھدے

منزل و نزل ہم کیا جانیں چلنا ہے سو چلتے جائیں
ہمت چور ڈگر ان جانی ڈگ مگ پاؤں پھسلتی ریت

اودی کلیاں بھینی پنچل اکتا چاند کھنکتا پانی
ہرا سمندر گوپی چندر بولو مچھلی کتنا پانی

سہج سہج اپلوں سے آنچ نکلتی ہے
ترل ترل بہتی ہے نالی رات ہوئی

بعینہ جیسے قعر دریا سے لعل و گوہر نکالتا تھا
وہ شعبدہ باز اپنی ٹوپی سے جب کبوتر نکالتا تھا

ٹہنی گود پسارے رین بسیرے کو
اے پنچھی، او پنچھی رے ، دن ڈوب گیا

ٹیڈی میڈیم جھلمل جھلمل
چھیلا بابو جگمگ جگمگ

پرندہ گدھ ہی سہی علامت ہے ساحلوں کی
افق پہ اک شہرِ بے اماں، ہر طرف سمندر

شہر میں کل سے صفائی کی مہم جاری ہے
کوئی لڑکی تھی۔ کسی اور سڑک پر ہو گی

شعر کا لطف ہو گیا دونا
کچھ زیادہ ہے پان میں چونا

بجھی رہ گئی سبزہ سبزہ امید
وہ ہنستے ہوئے کار پر چڑھ گئی

شاعری میں جدت اور اجتہاد کے قائل ہونے کے باوصف مظفرؔ حنفی غزل کی روایت اور فن کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ ان کے اشعار میں بلا کی روانی ہے اور تو اور وہ تنافر لفظی جیسی معمولی خامیوں سے بھی اپنے شعروں کا دامن بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حرف کا ''گرنا'' یا ''دبنا'' بھی انہیں منظور نہیں وہ اس معاملے میں کافی محتاط ہیں۔ نئی اور تازہ زمینوں کا انتخاب، نادر تشبیہات نئے استعارات اور قرین قیاس علامتوں کی تلاش ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ انہوں نے اردو کی نئی شاعری کو جو صدائیں دیں ہیں اگرچہ دیر تک ان کی بازگشت سنی جاتی رہی ہے لیکن مختلف آوازوں میں مظفرؔ حنفی کی آواز صاف پہچانی جاسکتی

ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے سچ کہا ہے۔"مظفر حنفی نے انتہائی شگفتہ زمینوں میں رواں دواں شعر کہے ہیں، ان کی شاعرانہ چالا کی کہیں مات نہیں کھاتی، طنزیہ شاعر کی بے خوفی اور حاضر جوابی ان کے یہاں موجود ہے مختلف باتوں کو ایک ہی طرح اور ایک ہی بات کو کئی طرح سے کہنے کا ڈھنگ انہیں بخوبی آتا ہے"۔

نئی شاعری میں کلاسیکی شعرا کی سی روانی اتنی عام نہیں لیکن مظفر حنفی کے اشعار بہتے دریا کی مانند ہیں ۔

تجھے خبر ہے کنارے نہیں رہے محفوظ
بہاؤ تیز ہے، مجھ سے نہ دور جا بھائی

جتنی متاع درد تھی ہم نے سمیٹ لی
چادر پھر اس کے دست کرم نے سمیٹ لی

کئی سوکھے ہوئے پتے ہرے معلوم ہوتے ہیں
ہمیں دیکھو کہیں سے دل جلے معلوم ہوتے ہیں

غموں میں مسکرا لیتے ہیں لیکن مسکرا کر ہم
خود اپنی ہی نظر میں چور سے معلوم ہوتے ہیں

اونچا ہوا سر نیزہ بہ نیزہ
یاروں کا احسان، لبیک، لبیک

ایک گل مراد بھی ہاتھ نہ آسکا مرے
آنکھ پہ تیر مارتے ،پھول ہزار چار سو

مزاج کے اعتبار سے مظفر حنفی کھلے دل اور کھری زبان کے مالک ہیں۔ دل و زبان میں تفاوت ان کے بس کی بات نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ جس چیز کو جس طرح محسوس کرتے ہیں اپنے مخصوص انداز میں بے باکانہ کہہ ڈالتے ہیں اور یہی بے باکی ان کے کلام کا جوہر بن جاتی ہے۔ عوام الناس میں مستعمل محاورے، روزمرہ، ضرب الامثال، قصباتی اور

شہری کہاوتیں، قصے، کہانیاں مظفر حنفی اس خوبی سے اپنے رنگ میں ڈھالتے ہیں کہ ایک جہان معانی آباد ہو جاتا ہے غیر معروف اور غیر شاعرانہ الفاظ کا جیسا تخلیقی استعمال ان کی غزلوں میں نظر آتا ہے۔ بہت کم دیکھنے کو ملے گا۔

ستارہ سحری کا جگر جگر کرنا
وہ چاندنی کا کتھک ناچنا درختوں پر

بڑھا ہوا ہاتھ پان جیسا
نظر میں کچھ آسمان جیسا

ٹوٹی ہوئی چوڑی کی مزے دار کہانی
خوابیدہ گلی جاگ پڑی آنکھ مسل کر

رکشا چلا رہا ہوں، ابھی کل کی بات ہے
کاندھے پہ ہل کا بوجھ تھا، آنکھوں میں خواب شہر

میرا منا پپیّ لے کر اتنا آسودہ لگتا ہے
جیسے میری پیشانی پر چاند ستارے ٹانک رہا ہو

کرسیاں کمرے میں ہیٹر کے قریب
دھوپ سکھلاتی ہوئی پرلان میں

احساس گزیدہ مرے اعصاب کشیدہ
اشعار میں کھلتا ہوں کمانوں کی طرح میں

کٹی پتنگ کی مانند اور کچھ بھی نہ تھا
مگر ہمیں بھی اڑاتا رہا ہوا میں کوئی

پھول میلہ سا لگا کر مرے آنگن میں
درودیوار پہ وحشت کا بیاباں لکھنا

مظفر حنفی کی غزل کے دو طاقتور اجزا قافیہ اور ردیف ہیں۔ان کے یہاں شعر کے معنوی جسم کا سارا لہو لفظیات کی شریانوں سے گزر کر قافیہ کے سمندر میں گر جاتا ہے اور ردیف اسے، تہ بہ تہ گہرائی کی طرف لے جاتی ہے قافیہ اور ردیف ایک دوسرے میں اس درجہ پیوست ہوتے ہیں کہ انہیں الگ کرکے دیکھنا محال ہے اسم نکرہ کو علامت بنا کر ردیف کے طور پر استعمال کرنا مظفر حنفی کا پسندیدہ عمل ہے۔ذرا یہ اشعار ملاحظہ کیجئے ؎

جھوٹ کہتے ہو کہ اونچا ہے تمہارا آسماں
ابتدا ہی سے مرے سر پر نہیں تھا آسماں

اک اور وار کہ شہ رگ نہیں ہوئی سیراب
مرے عزیز، مرے دیر آشنا بھائی

جب گاؤں ترقی کے لئے شہر میں آیا
ناپید ہوئے پھول، ٹھکانے لگے جگنو

کم گوئی نے عزت رکھ لی بند ہے مٹھی لاکھوں کی
ورنہ مظفر لطف آجاتا کھلتی سیپ، نکلتی ریت

شکرہ بیٹھا سوچ رہا ہے
یہ جی کے جنجال پرندے

داستانوی فضابندی اور دیومالائی اثرات مظفر حنفی کے غزلوں میں ابتدا سے موجود ہیں۔انہوں نے غالباً سب سے پہلے اس جانب توجہ دی اور آج تک اس کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔یہ اشعار دیکھئے معلوم ہوتا ہے۔"طلسم ہوش ربا" کی روح ان میں حلول کر گئی۔ یا "اندر سبھا" اور "باغ و بہار" نے اپنا لباس تبدیل کر لیا ہے لیکن ہر جگہ وہ اپنی چھاپ ضرور چھوڑ دیتے ہیں ؎

اور پھر پانچویں درویش کی باری آئی
باغ افسانہ میں ندرت کی سواری آئی

چنچل پری کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم
منے کی ضد بھی کم تو نہیں دیوزاد سے

اور وہ مشہور غزل جس کی ردیف "فریب فریب" ہے داستانی فضابندی کی بہترین مثال ہے۔

مشین عہد رواں کی خدا، فریب فریب
یہ ارتقا ہے کہ تحت الثریٰ، فریب فریب

محاصرہ جو کیا آستیں کے سانپوں نے
مراعصانہ بنا اژدہا ، فریب فریب

کھلی جو آنکھ تو اک حجرۂ بلا میں ہوں
نہ وہ فضا ہے نہ وہ مہ لقا۔ فریب فریب

پکارتا تھا کوئی مجھ کو یا اخی کہہ کر
کوئی دریچہ نہ مجھ پر کھلا فریب فریب

مجھے بھی مارا، مرانام تھا انا جادو
طلسم ذات شکستہ ہوا، فریب فریب

اسی طور پر غیر معروف بحروں میں مظفر حنفی کا شیوۂ گفتار، فن شعر پر ان کی مضبوط گرفت اور پختگی کلام کی علامت ہے۔ اس راہ میں ان کے اعتماد کا یہ عالم ہے کہ زمین کیسی ہی سنگلاخ ہو مظفر حنفی اپنے لہجے کی تمازت سے اسے پگھلا کر رکھ دیتے ہیں۔ مثلاً۔

دشمن پیچھے سے آلیں گے دھیمے چلنے میں
تیز چلوں تو ڈر لگتا ہے چھوٹ نہ جائے تو

یہ بھیانک سرد کالی رات
پھر وہی شب خون والی رات

بہت گھٹا ٹوپ تھا اندھیرا مگر خیال آگیا جو تیرا
تو ابر پاروں میں ایک چاندی کا تھال بھی تیرنے لگا ہے

بوڑھے بازو ٹوٹ چکے تھے گھر کا چولہا ٹھنڈا تھا
آنگن میں دیکھا تو بیٹھی کانپ رہی تھی تھر تھر دھوپ

مری لو بلند نہ ہو سکی
مرے سر پہ بوجھ تھا شام کا

کمرے میں قید مجبور شام
دیوار پار وہ روشن چراغ

ہمسائے کی بالکنی میں کھل جاتے ہیں پھول
ایک دریچہ آئینہ چمکاتا رہتا ہے

ہمارے صحن میں برچھی لئے کرنیں اتر آئیں
پڑوسی آنگنوں میں سایہ دیوار پھیلا ہے

اسی قبیل کے اشعار ہیں۔ان اشعار کے توسط سے زبان و بیان پر شاعر کی دسترس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

مظفر حنفی کے شعری رویہ نے اگر ناقدوں کو ناراض کیا ہے تو روشن خیال اور مختلف النظریات لوگوں کو ان کا ہمنوا اور مداح بھی بنایا ہے ناقدوں کی ناراضگی تو سمجھ میں آتی ہے کہ انہوں نے اپنے اشعار خصوصاً مقطعوں میں اس قبیلے پر سخت چوٹیں کی ہیں۔

لاکھ ناقد ہوں مظفر کے مخالف لیکن
شہ سواروں کے لئے بھیڑ بھی چھٹ جاتی ہے

مظفر پستہ قد تنقید سر پر تاج رکھتی ہے
کھرا شاعر کبھی عظمت کے چکر میں نہیں رہتا

کئی　نقاد　عظمت　بانٹتے　ہیں
مظفؔر　سر　بہ　سر　انکار　ہو جا

نئی غزل کے اس نمائندہ شاعر کو ترقی پسندی اپنا ہم خیال یا ہم زبان سمجھنے لگے تو تعجب ہوتا ہے لیکن مظفؔر حنفی کے کلام کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے اور ان کے خیالات کا تجزیہ کرنے کے بعد تعجب کا اثر زائل ہونے لگتا ہے، پھر یوں محسوس ہوتا ہے کہ مظفؔر حنفی ایک شاعر ہیں صرف شاعر، انہیں جو بات جس طرح اور جس زاویہ سے متاثر کرتی ہے اسے اپنے انداز میں کہہ دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ ان کا سوچا ہوا خیال کس نظریہ سے مطابقت رکھتا ہے اور کس تصور کی نفی کرتا ہے، انہیں صرف ایک فکر رہتی ہے کہ خیال اور اظہار خیال دونوں میں ندرت ہو، اگر دونوں میں نہ ہو سکے تو کم از کم اظہار تو ان کا اپنا ہو ایسا اپنا جسے وہ صرف اپنا کہہ سکیں، یہاں تک کہ وہ ان کی پہچان بن جائے لوگ اسے کہیں اور بھی پائیں تو فوراً کہہ اٹھیں۔ یہ مظفؔر حنفی کا لہجہ ہے۔ ان کا شعر ہے ؎

ٹھپہ　لگا　ہوا　ہے　مظفؔر　کے　نام　کا
اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ

مظفؔر حنفی کی تعلیم و تربیت جس ماحول میں ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اپنے اساتذہ سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ شاعری میں شاؔد عارفی سے فیض تلمذ حاصل تھا۔ چنانچہ ان کی ٹھوس خدمت کی، ان پر تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا۔ ان کے کلام کو جمع کر کے زیور طباعت سے آراستہ کرایا اور ان کے فن پر مضامین اور کتابیں لکھ کر ادب میں ان کا صحیح مقام دلانے کی ایسی مخلصانہ اور مسلسل جدو جہد کی کہ حاؔلی کی یاد تازہ کر دی ابتداً مظفؔر حنفی اپنے استاد کی شاعری کو بہت پسند کرتے ہیں اور لاشعوری طور پر ان کا اثر بھی قبول کیا ہے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی انفرادیت استاد کی چھاپ کو بھی گوارہ نہیں کر سکی اور وہ دھیرے دھیرے ان کے اثر سے بھی باہر آگئے۔ شاؔد صاحب کے اشعار میں غصہ، جھنجھلاہٹ او زہرناکی کا احساس ہوتا ہے اس کی وجہ بھی ہے جس شخص نے شاؔد صاحب کی زندگی کا بغو مطالعہ کیا ہے اسے ان کی جھلاہٹ اور غصہ کا جواب اور جواز مل جائے گا۔ مظفؔر حنفی کی زندگ

مختلف ہے، شکایتیں انہیں بھی ہیں مگر مشاہدہ کی ہمہ جہتی، فکر کی بالیدگی اور تجربات کی ہمہ رنگی نے مزاج کی شدت پر قابو پالیا ہے۔ یہی وجہ ہے شاؔد صاحب کے اشعار میں جس مقام پر آتش فشاں پھٹتا ہے وہاں مظفؔر حنفی کے ہاں لاوا بہنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے ؎

گردابی کیفیت میں ہوں خوبی دیکھو قسمت کی
میں طوفانوں کا پروردہ، چاروں جانب ساحل ہے

جی ہاں میں نے بھی دیکھا تھا اس کا کوئی دوش نہیں ہے
جب شعلوں کا ناچ ہوا تھا کافی دور کھڑا تھا پانی

پر سوختہ ہیں ، رات بڑی ، فاصلے بہت
لاکھوں چراغ ایک پتنگا، کہاں کہاں

مزاج باد ہر اک بادباں سمجھتا ہے
مری اڑان کا رخ آسماں سمجھتا ہے

سر پر یہ گھٹا چھائی ہوئی ہے کہ تری یاد
سایہ سا کوئی راہ میں جاتا ہے کہ میں ہوں

احساس کی شدت ماضی کا شعور، حال کی بصیرت، ملکی اور بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی، بلا تفریق جدید و قدیم، علمی اور ادبی کتابوں کا مطالعہ اور زبان و بیان پر دسترس وہ خصوصیات ہیں جو کسی بھی شاعر کو اعلیٰ مرتبے پر فائز کر سکتی ہیں۔ مظفؔر حنفی میں یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔

○

ناطق مالوی

مالوہ جغرافیائی اعتبار سے اپنی خوشگوار راتوں کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ موسم کی اس دلپذیر کیفیت نے یہاں کتنے لوگوں کو تخلیق کار بنادیا۔ اردو کے بیسیوں نامی گرامی ادیب وشاعر اس سر زمین میں پیدا ہوئے اور اپنے ادبی کارناموں سے ایوان اردو کو منور فرما کر خاموشی رخصت ہوگئے۔ انہیں میں سے ایک عرفان محمد خان ناطق مالوی بھی تھے۔ ان کا وطن سرونج جو ماضی میں ریاست ٹونک کی ایک معروف بستی تھا اور اب مدھیہ پردیش کے ودیشہ ضلع کی تحصیل ہے۔ حضرت ناطق اردو کے ان شعراء میں سے تھے جن کے کارناموں سے زمانہ ہنوز متعارف نہیں ہے۔ مجھے ان کو دیکھنے، گفتگو کرنے اور ان کا کلام سننے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ میرے شعور کی ابتدا اور ان کی عمر کا آخری دور تھا۔ انہوں نے خاصی طویل عمر پائی مجھے خوب یاد ہے وہ جب کبھی مشاعرے میں تشریف لاتے سامعین میں نئی روح دوڑ جاتی، جب غزل پڑھتے سامعین ہمہ تن اشتیاق ہو جاتے۔ ہمیشہ تحت میں پڑھتے اور اس طرح کہ بقول میر عرفانی "اگر قریب بیٹھنے والے شعراء شعر کو نہ دہرائیں تو سامعین کے پلے کچھ نہ پڑے۔" سادہ طبیعت سادہ دل اور سادہ لباس انسان تھے۔ رعونت نام کو نہ تھی۔ ادب کا ذوق رکھنے والوں کا احترام کرتے۔ شعری مذاق ہو تو حوصلہ افزائی فرماتے اور ہر شخص کے ساتھ نرم روی کا برتاؤ کرتے سرونج میں انجمن ترقی اردو کی تمام تر سرگرمیاں انہیں کی ذات سے وابستہ تھیں مرکزی انجمن کے کئی اجلاس میں بھی شرکت فرمائی اور جب تک زندہ رہے اردو کی خدمت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ عمر کا آخری حصہ اردو کے بڑے شعراء کی طرح عسرت اور تنگ دستی میں بسر ہوا مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے نہ ہر کسی کے آگے دست طلب دراز کیا۔ اسی زمانے میں اکلوتے نوجوان بیٹے ثاقب کی اچانک

موت نے ناطق کو زندگی کے سب سے مشکل امتحان سے دو چار کر دیا۔ مگر ناطق سر اسیمہ اور حواس باختہ کر دینے والے اس مشکل مرحلے کو بھی کامیابی سے سہار گئے اور اپنے اس دعوے کو صحیح ثابت کر دکھایا کہ ؎

ظرف اہل عشق دنیا کو دکھاتا جاؤں گا
زخم کھاتا جاؤں گا اور مسکراتا جاؤں گا

مگر اس چوٹ کی کسک ساری زندگی باقی رہی۔ اس جاں سوز حادثہ کے بعد ناطق کو صبر آزما مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ اس دور کا کلام ان کے تلخ ایام کی روداد ہے جسے انہوں نے کچھ اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ "جو سنتا ہے اسی کی داستان معلوم ہوتی ہے" تلخ تجربات کے فکری، فنی اظہار کی سچائی نے انکے لہجے کو آفاقیت عطا کی ہے۔ اسی لئے ان کے اشعار دل کے تاروں میں ارتعاش پیدا کرنے میں کامیاب ہیں ؎

شمع کے آنسو شکست جام و مینا کی صدا — جو سمجھتا جائے ہے محفل سے اٹھتا جائے ہے
شرر د شعلہ ملے چاند ستارے نہ ملے — زندگی پائی تو جینے کی سہارے نہ ملے
وہ دل ہے نہ اب وہ سرو سامان تمنا — اے وائے بریں گوشۂ ویران تمنا

کبھی کبھی تم سے تنگ آکر کبھی کبھی خود سے تنگ ہو کر
کچھ ایسا سوچا ہے ہم نے اکثر سنو تو رہ جاؤ دنگ ہو کر
اک ایسا عالم بھی دور غربت میں ہم پہ ناطق گزر چکا ہے
کہ راہ کے پائمال کانٹے چبھے ہیں دل میں خدنگ ہو کر

ناطق کو ایک خود دار اور غیر تمند انسان کی طرح اپنی مجبوریوں کا احساس بھی تھا اور اعتراف بھی حالانکہ "ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے" کسی کو اس سے نجات نہیں۔ مگر فراخ دلی اور غیر معمولی اخلاقی جرأت کے بغیر ناطق یہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے ؎

منت غیر نہ تھا شیوۂ ناطق لیکن
ناموافق تھی زمانے کی ہوا کیا کرتا

ردیف "کیا کرتا" کی معنی خیز برجستگی ایک بے بس اور لاچار انسان کی آہ سرد کا احساس دلاتی ہے۔

انسان پر کبھی کبھی ایسا وقت بھی آپڑتا ہے جب وہ متواتر ناکامیوں سے دل برداشتہ

ہو کر خود کو مجبور محض تصور کر لیتا ہے۔ خدا کے عطا کردہ اختیارات کو فریب سمجھنے لگتا ہے اور مقدر کے آگے سپر ڈال کر قنوطیت کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ ناطق بھی ایسے حالات کا شکار ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے بھی ہزاروں لوگوں کے دل کی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

بخت یاور ہو تو اٹھ جاتی ہے ہر قید محال
اور مقدر نہ ہو ناطق تو پکارے نہ ملے

لیکن ان کے غم میں عزم، حوصلہ، استقلال اور انسانی برتری کا احساس بھی نمایاں ہے۔ ایک طرف ان کے غم میں میر کے غم کا عکس نظر آتا ہے تو دوسری جانب اقبال کے تصور حیات کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ ان کا شیوۂ گفتار اعتماد سے عبارت ہے۔ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں زمانے کی حقیقتوں کا تجزیہ کرتے ہیں اور نتائج کو فکری سانچے میں ڈھال کر شعری قالب عطا کرتے ہیں ۔

جہاں نظر جا کے رک گئی ہے جہاں نظر باز تھک گئے ہیں
ہم ان مقامات سے بھی آگے گئے ہیں اور بے دھڑک گئے ہیں
تمہارے جلووں کی تابشوں نے خبر ہے کیا قہر ڈھا رکھا ہے
زمین پہ نیرنگ دہر بن کر فلک پہ آفاق رنگ ہو کر
مری نگاہ میں شمس و قمر سما نہ سکے
یہ آئینے بھی تمہارا جواب لا نہ سکے
ظلمت کدۂ دہر کا ہر ذرہ ہے خورشید
روشن ہے انہیں ذروں سے ایوان تمنا

ناطق کا فکری معیار بلند ہے۔ ان کے کلام میں الفاظ اور خیال کا توازن ہے۔ جس سے شعر میں ترنم بھی پیدا ہوتا ہے اور تاثیر بھی۔ غم ان کی زندگی کا حقیقی سرمایہ ہے۔ جس کی تلخی فکر میں شامل ہے۔ لیکن یہ تلخی ان کی فطری صلح پسندی پر غالب نہیں آتی۔ ان کی فطرت اس تلخی کی ہمیشہ تہذیب کرتی رہی ہے۔ مگر بعض اوقات تجرباتی زندگی کے تلخ حقائق کو ناطق نے طنز کے نہایت لطیف پیرایہ میں ظاہر کیا ہے ۔

ہمارا حال بڑے مسکرا کے پوچھتے ہیں
کرم نوازی احباب کا جواب کہاں

دردِ دل ہے آج کچھ ٹھہرا ہوا
چارہ ساز بے کساں یہ کیا ہوا
تم سے آنکھ چراتا کیا
تم جیسا ہو جاتا کیا
کل تھا تو کیا تھا آج میسر نہیں تو کیا
صحرا نشیں ہوں بالش و بستر نہیں تو کیا

ناطق کی عمر کا آخری حصہ میر کے انداز میں گزرا۔ اس دور میں یاس و غم انگیزی نے لاشعوری طور پر ان کے لہجے کو متاثر کیا اور شعری آہنگ کو جلا بخشی۔ زندگی کی تلخیوں اور زمانے کے نشیب و فراز سے گزر کر ان کے شاعرانہ مزاج کی تکمیل ہوتی ہے۔

بلا کشان شام غم کی زندگی نہ پوچھئے
گھٹی تو زلف رہ گئی بڑھی تو رات ہوگئی
اس توقع پر تو ہم برسوں جئیں گے چارہ گر
جان لیوا ہے تو کیا ہے ہے تو آزار وفا
سر محفل چھلک اٹھتے ہیں میری تشنہ کامی پر
جسے ساقی نہ سمجھا اس کو پیمانے سمجھتے ہیں
قفس میں تو خوش و ناخوش گزار آیا خداوندا
گلستاں میں رہوں گا کس طرح بے بال و پر ہو کر
حضور حسن غم عشق مستجاب کہاں
چلا ہے لے کے دل خانماں خراب کہاں

شاعر ہو یا ادیب حقیقت کو جتنے قریب سے دیکھتا ہے اسی قدر سچائی کے ساتھ اظہار کرتا ہے۔ حالی نے اپنے مقدمہ میں اس بات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کسی چیز کو قریب و دور سے دیکھنے کا تعلق انسانی مشاہدات سے ہے۔ تجربات کا راستہ اس سے دو قدم آگے اور حقیقت سے نسبتاً قریب ہے۔ اس نگار خانہ شام و سحر میں انسان پر جو کچھ گزرتی ہے وہی اس کے تجربات ہیں۔ ان تجربات کا اظہار اگر صداقت سے کیا جائے تو اس میں خلوص کی تاثیر شامل ہو جاتی ہے۔ صداقت اور خلوص کو اگر اظہار کا بہتر وسیلہ بھی حاصل ہو تو یہ

شراب سہ آتشہ بن جاتی ہے۔ صداقت کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ زود اثر اور دیرپا ہوتی ہے۔ اقبال نے اسی قوت کو "پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے"۔ سے تعبیر کیا ہے یہاں شاعر اپنی بات کچھ اس انداز سے کہتا ہے کہ ہر شخص اسے اپنے دل کی بات سمجھنے لگتا ہے۔ اس میں شاعر کے زور بیان کا راز مضمر ہے جس سے تقریر کی وہ لذت حاصل ہوتی ہے کہ ہر شخص سمجھنے لگتا ہے۔ "گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔"

ساحر نے کہا تھا۔

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

لوٹانے کا یہ عمل جتنا پر خلوص ہو گا اتنا ہی تعمیری ہو گا۔ اور جتنا تعمیری ہو گا اتنے ہی بہتر نتائج بر آمد ہوں گے۔ میر انشا شاعری کو کسی مقصد کا غلام بنانا ہرگز نہیں البتہ اگر شاعری سے تعمیری مقاصد کی تکمیل ہو تو یہ اس کی خامی نہیں خوبی ہے۔ دنیائے آب و گل کا تمام و کمال وجود انسان کے حصول مقاصد کی بدولت ہے اور یہ کائنات تکمیل مقاصد کی ردو قدح کی وجہ سے "سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو" کا گہوارہ ہے لہٰذا بہتر شاعری وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ مقاصد کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ناطق کی شاعری کا وصف یہ ہے کہ وہ انسانی جذبات و احساسات کو اپیل بھی کرتی ہے۔ اور ان کی تہذیب بھی قاری کو ان کے تجربات کے آئینے میں اپنا چہرہ نظر آنے لگتا ہے اور یہیں سے "میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ والا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ عمل قاری کو شاعر سے قریب تر کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ قاری شاعر کو اپنا ہمدرد اور راز داں سمجھنے لگتا ہے اور خیال کی ہم آہنگی کے نتیجہ میں قاری کی تمام ہمدردیاں شاعر سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جہاں شاعر اور قاری کے درمیان ذہنی ہم آہنگی کے رشتے استوار ہوتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں قاری اپنے مافی الضمیر کے بہتر اور مکمل اظہار کے لئے اشعار کا سہارا لیتا ہے۔ اس طرح وہ لاشعوری اور شعوری طور پر شاعر کی عظمت کا اقرار کرتا ہے۔

ناطق کے اشعار میں شاعرانہ تعلّی غم محبت اور کیف تغزل کی بھی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن ذیل کے اشعار مخصوص کیفیت کے حامل ہیں۔

غیر پابندی آئین و فا کیا کرتا
میری تقلید کوئی میرے سوا کیا کرتا
چارۂ درد محبت مجھے تسلیم مگر
دوستو گوشت کو ناخن سے جدا کیا کرتا
مسکراتے ہوئے وہ جام بڑھانا ان کا
کوئی انکار کا پہلو ہی نہ تھا کیا کرتا

جب کبھی میں فارسی کے درج ذیل مصرعے پڑھتا ہوں

دی شب زپئے صدق و صفائے دل من
در میکدہ آں روح فزائے دل من
یک جام مے آورد مرا گفت بخور
گفتم نخورم گفت برائے دل من

میرے ذہن میں ناطق کا مصرع گونج اٹھتا ہے ۔

"کوئی انکار کا پہلو ہی نہ تھا کیا کرتا"

اور یوں خیال کی فنکارانہ ادائیگی کا دیر تک لطف لیتا ہوں ۔ اسی غزل کا مطلع ہے:

غیر پابندی آئین وفا کیا کرتا
میری تقلید کوئی میرے سوا کیا کرتا

اس بلند خیال و بلند آہنگ مطلع میں دعوئ عشق میدان عشق میں مبارز طلبی اور ہر مقابل کو ہزیمت دینے کے بعد شکست خوردہ حریف کے لئے ردیف "کیا کرتا" اپنی مثال آپ ہے۔ "ردیف کا تجزیہ کیجئے۔ لہجہ بدل کر پڑھیے اور دیکھئے معانی کی کیسی دنیا آباد ہے غیر (رقیب) کی بے چارگی، تحقیر اور تمسخر کے ساتھ اپنی شان و عظمت کا سارا ساز و سامان اس میں موجود ہے۔

اچھے شعر کی یہ بھی ایک خوبی ہے کہ وہ قاری کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔ فکر کی بلندی مشاہدہ کی گہرائی، نظر کی وسعت، تجربہ کی کثرت اور اظہار کی صداقت اچھی شاعری کے عناصر خمسہ ہیں لیکن ان تمام چیزوں کو فن کی سرپرستی حاصل ہونا از بس ضروری ہے۔ ناطق کے کلام میں شاعری کے تمام ضروری لوازمات کے ساتھ فن کا احترام ملتا ہے ۔

شمع کے آنسو شکست جام و مینا کی صدا
جو سمجھتا جائے ہے محفل سے اٹھتا جائے ہے
زندگی اپنے مقاصد میں ہے ناکام ابھی
کہہ دو ساقی سے کہ گردش میں رہے جام ابھی
رندوں پہ بھی اب گردش دوراں کی نظر ہے
لانا مرا ٹوٹا ہوا پیمانہ کدھر ہے

ناطق فن کار ہیں لیکن جس طرح انقلابات نے دنیا کے بہت سے قیمتی سرمائے کو تہ خاک چھپا دیا ہے۔ اسی طرح ناطق کا کلام بھی گمنامی کے گوشہ میں پڑا ہوا نقادوں سے انصاف کا طالب ہے۔ مالوہ کی خشک اور بھیگی راتوں کے حسن کو پرکھنے اور ان کی تعریف کرنے والے مالوہ کے ادبی حسن کو نظر انداز کر دیں گے اس کی توقع تو نہیں لیکن وہ وقت کب آئے گا۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

○

جوش کی انقلابی نظمیں

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں اگر چہ ہندوستانی فوجوں کو انگریزوں کے خلاف شکست سے دو چار ہونا پڑااور انگریز حکمراں برسوں اس بغاوت کا انتقام لیتے رہے مگر اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ برطانوی سامراج کے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی کی جو چنگاری روشن ہوئی وہ آہستہ آہستہ شعلہ جوالہ بنتی گئی یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد وطن پرستوں پر ظلم کے جو پہاڑ ٹوٹے اس کی داستان خون چکاں نا قابل بیان ہے مگر اسی عہد کے جیالے انقلابی نوجوان کے کارنامے پڑھ کر ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی اسی عہد میں پیدا ہوئے۔

جوش اردو کے واحد شاعر ہیں جن کے لہجے میں انقلابی جلال کی تہلکہ خیزی دور سے پہچان لی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں شاعر انقلاب کے خطاب سے نوازا گیا۔ یہ خطاب ان کی شاعری اور شخصیت دونوں پر پوری طرح سجتا ہے۔ جوش کی پیدائش اودھ کے ایک جاگیر دار گھرانے میں ہوئی ان کا خاندان آفریدی پٹھانوں کا خاندان تھا جو اپنے علاقے میں بڑے رعب و داب اور اثر و رسوخ کے مالک تھے اس لیے جوش کو اپنے ماحول میں عیش و نشاط کے سارے مواقع میسر آئے مگر ان کی فطرت میں ایک باغی انسان اور انقلابی شاعر کے شعلے بھڑک رہے تھے جنھوں نے بچپن ہی سے اپنی تاب و تب دکھانا شروع کر دیا اور دھیرے دھیرے جوش نے اپنے آپ کو خاندانی اور معاشرتی پابندیوں سے آزاد کر لیا۔ ان کی باغیانہ سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے گھر، سماج، مذہب اور خدا سبھی سے بغاوت کی، ان کے باغیانہ خیالات و نظریات کا اندازہ کرنے کے لیے ان کی ایک نظم بغاوت کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ہاں بغاوت آگ، بجلی، موت، آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل میرے جلو میں قتل عام

زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات
کانپ اٹھتی ہے مری چین جبیں سے کائنات
الامان و الحفیظ! میری کڑک میرا جلال
خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
اے جفا پرور امارت دیکھ ناداروں سے بھاگ
بھاگ دیوانوں کی خوں آشام تلواروں سے بھاگ
حریت کی تند لہروں میں ٹھہر سکتا ہے کون؟
جذبہ ٔ خلق خدا کو فتح کر سکتا ہے کون؟
رعب سلطانی سے یہ چہرہ اتر سکتا نہیں
جو خدائی سے لڑے، شاہی سے ڈر سکتا نہیں

یہی باغیانہ رجحانات وخیالات تھے جنہیں انقلاب اور انقلابی فضا ایسی راس آئی کہ جوش جو ایک رومینٹک شاعر تھے برطانوی سامراج کے خلاف اپنی نظموں میں اس طرح کھل کر سامنے آگئے کہ قلمی جہاد کرنے والوں کے سر خیل بن گئے۔ جوش نے بلاخوف و لحاظ سامراجی نظام پر راست وار کئے اور لہجہ وہ اختیار کیا جیسے کسی آتش فشان کا دہانہ کھل گیا ہو یا شعلے برس رہے ہوں۔ ان کی نظم ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے ایسی ہی ایک نظم ہے۔ میرا خیال ہے ہندوستان کی کسی زبان کے کسی شاعر نے برطانوی عہد حکومت میں حکمراں طبقے کو اس انداز سے نہیں للکارا ہو گا ذرا یہ تیور ملاحظہ کیجئے۔

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوع انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوع انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے
ہندیوں کے جسم میں کیا روح آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی
اپنے ظلم بے نہایت کا فسانہ یاد ہے
کمپنی کا پھر وہ دور مجرمانہ یاد ہے
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولت ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم

اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمن حق تھا سراج؟

کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانہ یاد ہے؟

ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی
یاد تو ہوگا تمہیں جلیان والا باغ بھی

پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے
"ڈائر" گرگ ذہن آلود اب بھی زندہ ہے

آج کشتی امن کی امواج میں کھیتے ہو تم
سخت حیراں ہوں کہ اب کیوں درس حق دیتے ہو تم

دیر سے بیٹھے ہو نخل راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں

گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپ تازی کیا شفا خانے میں ہے

آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیب دشمناں ناساز ہے

ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

جوش کی طبیعت میں شاعری اور انقلاب دونوں کے جوہر فطری تھے۔ آزادی کے قلمی جہاد کے عہد میں جب ہندوستان فکری سطح پر روسی انقلاب سے وابستہ ہوا اور سرمایہ داری اور ملوکیت کے خلاف کسانوں اور مزدوروں میں بیداری کی لہر پیدا ہوئی تو جوش بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے ان دونوں کمزور طبقوں کے لئے بہترین نظمیں لکھیں ان کی نظم "کسان" جو صرف جوش ہی کی نہیں پوری اردو شاعری کی ایک شاہکار نظم ہے جوش کے اسی انداز فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ نظم فنی اعتبار سے بھی اپنا جواب آپ ہے۔ تشبیہات واستعارات کی بہار دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

جھٹپٹے کا نرم رو دریا شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروب آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ
زیر لب ارض سماں میں باہمی گفت و شنود
مشعل گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود

پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی

اس خوبصورت تمہید کے بعد اب جوش ایک کاشتکار کا تعارف کراتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار ۔۔۔ ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار
طفل باراں، تاجدار خاک امیر بوستاں ۔۔۔ ماہر آئین قدرت، ناظم بزم جہاں
ناظر گل، پاسبان رنگ و بو، گلشن پناہ ۔۔۔ ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارث اسرار فطرت، فاتح امید و بیم ۔۔۔ محرم آثار باراں، واقف طبع نسیم
صبح کا فرزند، خورشید زر افشاں کا علم ۔۔۔ محنت پیہم کا پیاں، سخت کوشی کی قسم
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار ۔۔۔ جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرور شہریار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں ۔۔۔ کھیت سے پھیرے ہوئے منھ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل ۔۔۔ سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل

اور اب جب کہ بات ہل پر آکر رک گئی ہے تو ہل کی تعریف میں بھی دو چار اشعار سن لیجئے

کون ہل!؟ ظلمت شکن قندیل بزم آب و گل ۔۔۔ قصر گلشن کا دریچہ سینۂ گیتی کا دل
خوش نما شہروں کا بانی، راز فطرت کا سراغ ۔۔۔ خاندان تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ
جس کے چھو جاتے ہیں مثل نازنیں مہ جبیں ۔۔۔ کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں
پردہ ہائے خاک ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک ۔۔۔ مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک
جس کا مس خاشاک میں بنتا ہے اک چادر مہیں ۔۔۔ جس کا لوہا مان کر سونا اگلتی ہے زمیں

انقلاب کے تعلق سے جوش کے نظریات میں جو وسعت اور تہ داری تھی اس کا اندازہ ان کے اس خطبے سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو انہیں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک جلسے کی صدارت کرتے ہوئے ۱۹۳۷ء میں دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔

''سینۂ ہندوستان میں انقلاب کا جو سرخ شعلہ آہستہ آہستہ تھرتھرا رہا تھا

اسے ہوا دینا شروع کیا جائے۔ انقلاب انقلاب زندگی کے ہر شعبے میں
انقلاب آداب و رسوم میں انقلاب نظریات و معتقدات میں انقلاب،
مسلمات و کلیات میں انقلاب سیاسیات، مذہبیات میں انقلاب یکسر انقلاب،
تمام تر انقلاب"

اس نثری خطبے کے علاوہ شعر میں بھی انہوں نے صاف صاف کہا ہے۔

میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

جوش کی فطرت کو جس طرح انقلاب سے گہرا ربط تھا اسی طرح ان کے منفرد انداز بیان کی قادر الکلامی اور مخصوص شعری روش بھی گویا انقلابی نظموں کے لئے ہی تخلیق کی گئی تھی زبان و بیان کی تہلکہ خیزی، طنطنہ، شوکت الفاظ، جوش و خروش، گھن گرج، خون کو گرم کرنے اور بے اختیار بہالے جانے والی کیفیت جوش کی نظموں کے وہ اجزائے ترکیبی ہیں جو انقلابی شاعری کی انقلابی فطرت سے گہری مناسبت اور مطابقت رکھتے ہیں۔ ان کی مشہور انقلابی نظموں میں سلام و بغاوت، دو نعرے، بیدار ہو بیدار ہو، ناخدا کہاں ہے نظام نو، زوال جہاں بانی، ایسٹ کمپنی کے فرزندوں سے اور شکست زنداں کا خواب جیسی کئی نظمیں ہیں جن میں کہیں کہیں طنز کی زیریں لہریں نظر آجاتی ہیں ورنہ عام طور پر آزادی اور بغاوت کی انقلابی آگ اس طرح بھری ہوئی ہے کہ اس کی لپٹیں دور سے دکھائی دے جاتی ہیں۔

O

سرونج کی کلاسیکی شاعری کے عناصر اربعہ

ناطق، دانش، راھی، میر
(دستیاب کلام کی روشنی میں)

سہانی اور خوش گوار راتوں کی سرزمین مالوہ میں بھوپال سے تقریباً سو کلو میٹر شمال کی جانب ایک چھوٹی سی بستی سرونج، آباد ہے جو آزادی سے قبل ریاست ٹونک کا حصہ تھی۔ تہذیبی اعتبار سے یہ بستی گوناگوں صفات کی حامل ہے۔ اس کی سیاہ چکنی مٹی، گھنے جنگلات چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں اور دامن کوہ میں دور تک بکھرے ہوئے شیریں کنووں کا شفاف اور ہاضم پانی عرصہ دراز تک مقامی آبادی کی صحت اور خوش خوراکی کے محافظ اور مظاہر رہے ہیں۔ ریاست ٹونک کے نیک دل حکمراں مذہبی ذہن رکھتے تھے، نتیجتاً رعایا پر بھی اس کا راست اثر ہوا اور ریاست کے حنفی المسلک باشندے اسی راہ پر گامزن ہو گئے، چنانچہ سرونج کے مدرسۂ ریاض المدارس کا فارغ التحصیل طالب علم سید ھادیوبند جاتا تھا۔ مذہب پسند ہونے کے ساتھ ساتھ اہل سرونج ادب پسند بھی تھے، خصوصاً شاعری سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ آج بھی بڑی حد تک یہی صورت حال ہے یہاں کی پرکیف، رومان پرور فضا نے ان کی وہ ذہنی اور جذباتی تربیت کی ہے کہ کم تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ، صحیح شعر کی تحسین کرتا ہے۔ سرونج کے شاعروں اور شعر پسندوں کا مزاج اردو زبان کے ان کلاسیکی شعرا کے مزاج سے مماثلت اور مطابقت رکھتا ہے جن کی ذہنی تربیت مشرقی ادبیات (عربی و فارسی) کے سایے میں ہوئی تھی۔ اہل سرونج کے مزاج میں استغنا اور خودداری کی جو جھلک نمایاں ہے وہ بھی اسی تربیت کی مرہون منت ہے۔ اہل سرونج سے رسم و راہ رکھنے والا کوئی بھی شخص جب ذہنی تحفظات سے باہر نکل کر دیکھے گا تو یہ بات محسوس کئے بغیر نہیں رہے گا کہ

سرونج کے مزاج میں خود داری، سادگی، تواضع، خلوص اور استغنا کا حسین امتزاج ہے۔ تکلیف ہو یا مسرت غصہ ہو یا محبت اہل سرونج کے چہرے سے ہر جذبہ فوراً عیاں ہو جاتا ہے بہت کم لوگ ہوں گے جو اپنے جذبات چھپانے پر قادر ہوں، یہ سرونج والوں کی صفائی قلب کی دلیل ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی ہے کہ سرونج والے زود رنج اور غیر ضروری حد تک حساس ہونے کے ساتھ چند صفات عالیہ کو بروئے کار لانے میں بسا اوقات غلو کر جاتے ہیں، اس کے نتیجے میں خود پسندی کو خودداری، لاپرواہی کو سادگی اور تساہل و آرام طلبی کو استغنا سمجھنے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں۔ اہل سرونج کی خوش اخلاقی اور خوش مزاجی میں بہر حال کوئی کلام نہیں، ان صفات میں سرونج اپنا ثانی نہیں رکھتا، شوخی اور ظرافت تو گویا اس کا خمیر ہیں، اس خاص معاملے میں ساری بستی مستثنیات سے بھی مستثنیٰ ہے۔ حالی نے غالب کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کے کلام میں شوخی اس طرح بھری ہے جس طرح ستار کے تاروں میں سر ہوتے ہیں۔ سرونج میں آپ کسی عمر کے شخص سے ملاقات کیجئے خواہ سفید ریش ہی کیوں نہ ہو، شوخی اور ظرافت کے میدان میں آپ کو غالب نظر آئے گا۔

سرونج کے اس کھلے ڈلے ماحول کو ذہن رکھئے اور ہندوستانی شاعری کے اس منظر نامے کو یاد کیجئے جب اردو زبان کی دکنی آمیز غزل دہلی میں ریختہ اور پھر رشک فارسی بنتی ہوئی لکھنؤ پہنچتی ہے اور وہاں سے شوخ و شنگ ہو کر حالی کے طعنوں اور سرزنش کے باوجود اپنے آپ کو امیر و داغ کے حوالے کر دیتی ہے۔ لکھنؤ میں اگرچہ ناسخ نے اس کی زبان کو کافی صاف ستھرا کر دیا تھا مگر مزاج ابتدا سے ہوائی پایا تھا، انشا اور جرأت و رنگین کی صحبتوں نے چنچل، طرحدار اور دیدہ دلیر بنا دیا تھا چنانچہ داغ و امیر کے بعد داغ امیر کے شاگرد دلے اڑے اور اپنے اساتذہ کی آواز بازگشت بن کر خوب چمکے یہاں تک کہ چاروں جانب ان کی آواز میں آواز ملانے کی کوششوں کو شاعری کی معراج خیال کیا جانے لگا، ریاست ٹونک بھی انہیں آوازوں کے حصار میں تھی مگر اسی عہد سے ملے ہوئے عہد میں کچھ ایسی آوازیں بھی سنائی دیں جو امیر و داغ کی آوازوں سے قدرے مختلف تھیں اور ان آوازوں میں اپنی الگ شناخت قائم کرنے کا حوصلہ جھلک رہا تھا، حسرت، یگانہ، اصغر، جگر، جوش، فانی، اختر شیرانی، فیض اور فراق وغیرہ انہیں مختلف آوازوں اور منفرد لہجوں کے نام ہیں۔ اسی دور میں وہ آواز بھی سنائی دی جس کے تیور آسمانی آواز کے سے تھے، یہ اقبال کی آواز تھی۔

سرونج کے چاروں شاعر ناطقؔ، دانشؔ، راہیؔ، میرؔ اپنے عنفوان شباب میں یہ ساری آوازیں متواتر سن رہے تھے اور اپنے اپنے ذوق و مزاج کے مطابق ان کا اثر بھی قبول کر رہے تھے۔ سرونج کی کلاسیکی شاعری کے یہ چاروں ستون اپنی اپنی جگہ مضبوط و مستحکم ہیں۔ ان کے رنگ و روغن کا فرق انداز فکر اور شیوۂ گفتار کے فرق کے ساتھ واضح ہو جاتا ہے۔ ان چاروں کو امتیاز و شناخت کی آسانی کے لئے اگر ہم چار آوازیں تسلیم کر لیں اور پھر غور سے سنیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سب سے زیادہ بھرپور اور پراثر آواز عرفان محمد خاں ناطق مالوی کی ہے۔ بلاشبہ ناطق مالوی سرونج کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

ناطق مالوی کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ تقریباً اٹھارہ برس پہلے ناطق مالوی کے فن پر ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا جو انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی کے ہفت روزہ ہماری زبان، میں یکم جولائی ۱۹۷۶ء کو شائع ہوا تھا۔ میں نے وہ مضمون تلاش کیا اور پڑھا تو یہ سوچ کر اطمینان ہوا کہ وہ ایک اچھا مضمون تھا مگر ناطق مالوی کا کلام اس سے زیادہ کا متقاضی ہے۔ ناطق خوددار انسان اور فطری شاعر ہیں، ان کے فن کا معیار بلند اور لہجہ اعتماد سے بھرپور ہے۔ ان کے کلام میں خیال اور الفاظ کا توازن اور خوبصورت امتزاج ہے جو شعر میں ترنم بھی پیدا کرتا ہے اور تاثیر بھی۔ غم ان کی زندگی کا حقیقی سرمایہ ہے جس کی تلخی ان کی فکر میں شامل ہے لیکن یہ تلخی ان کی فطری صلح پسندی پر غالب نہیں آتی اور نہ ان کے حوصلے کو پست کرتی۔ ان کی فطرت اس تلخی کو ہمیشہ گوارہ کرتی رہتی ہے۔ تجرباتی زندگی کے تلخ حقائق کو ناطق نے طنز کے لطیف اور مہذب پیرائے میں بیان کیا ہے۔

ہمارا حال بڑے مسکرا کے پوچھتے ہیں — کرم نوازی احباب کا جواب کہاں
درد دل ہے آج کچھ ٹھہرا ہوا — چارہ ساز بے کساں یہ کیا ہوا
آنکھ میں دو آنسو بھی نہ تھے — روتا کیا چھلکاتا کیا

ناطق مالوی کو فن شعر پر اس درجہ عبور حاصل ہے کہ مشکل سے مشکل زمین میں روانی اور صفائی کو زک پہنچائے بغیر گہری بات کہہ گزرتے ہیں ان کے اشعار سہل ممتنع کی نادر مثالیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بحروں میں بڑی بڑی باتیں ان کا دوسرا کمال ہے۔ غیور شرفا کی طرح ناطق نے اپنی ساری زندگی خصوصاً زندگی کا آخری حصہ عسرت و تنگ دستی میں بسر کیا

مگر کسی کے آگے دست طلب دراز نہ کیا، اپنے سوز دروں کا اظہار ضرور کیا مگر سوز دروں کی قربان گاہ پر عزت نفس کو چڑھانا گوارانہ ہوا فن کے اظہار میں شوخی اور طنز ان کے کلام کے خاص جوہر ہیں۔ چھوٹی بحروں میں یہ جوہر اور زیادہ کھلتے ہیں، ہلکی ہلکی چٹکیوں کے ساتھ شوخی و شگفتگی اور سوز و گداز میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے لیکن اس فنی سلیقے کے ساتھ کہ شستگی اور برجستگی میں چنداں فرق نہیں آتا۔ ذرا یہ اشعار دیکھئے۔

تم سے آنکھ چراتا کیا — تم جیسا ہو جاتا کیا
درد دل ہے آج کچھ ٹھہرا ہوا — چارہ ساز بے کساں یہ کیا ہوا
شام غم تکمیل غم فرما گئی — وہ نہ آئے اور ہمیں نیند آگئی
اس توقع پر تو ہم برسوں جئیں گے چارہ گر — جان لیوا ہے تو کیا ہے، ہے تو آزار وفا
اک سیل اضطراب ہے پہلو میں موجزن — دل ہو تو کوئی دل کو رکھے اختیار میں

اور ذرا اس شعر کے تیور بھی ملاحظہ کیجئے۔

غیر پابندیٔ آئین وفا کیا کرتا — میری تقلید کوئی میرے سوا کیا کرتا

اس بلند آہنگ مطلع میں دعوائے عشق، رقیب کو چیلنج، میدان عشق میں مبارز طلبی اور ہر مقابل کو ہزیمت دینے کے بعد شکست خوردہ حریف کے لئے "کیا کرتا" اپنی مثال آپ ہے۔ ردیف پر جتنا غور کیجئے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں لہجہ بدل کر پڑھیے، استفہامیہ، خطابیہ، ندائیہ، انشائیہ اور پھر دیکھئے معنی کی کیسی دنیا آباد ہے غیر (رقیب) کی بے چارگی، تحقیر اور تسخیر کے ساتھ اپنی شان و عظمت کا سارا ساز و سامان اس شعر میں موجود ہے۔ اسی غزل کے مقطع میں ایک خود دار انسان کی بے چارگی کو ناطق نے نہایت موثر پیرائے میں بیان کیا ہے۔

منتِ غیر نہ تھا شیوۂ ناطق لیکن — ناموافق تھی زمانے کی ہوا، کیا کرتا

اچھے شاعر کی پہچان یہ ہے کہ اس میں خیال کی بلندی، مشاہدے کی گہرائی، نگہ کی وسعت، تجربے کی کثرت اور اظہار کی صداقت، تمام شعری خصائص، فن کی سرپرستی میں پروان چڑھتے ہیں۔ ناطق میں بھی یہ ساری خوبیاں بڑی حد تک موجود تھیں انہوں نے

قدیم موضوعات اور قدیم الفاظ و تراکیب کو اپنے مخصوص انداز میں برتا ہے اور نئی معنویت پیدا کی ہے۔

چارہ گر سنتا ہے دل کی دھڑکنیں کیوں بار بار — دل ہی دل میں بھی نہ لے کوئی کسی کا نام کیا
پا کے مزاج یار کچھ اپنی طرف جھکا ہوا — میں نے کہا زہے نصیب دل نے کہا برا ہوا
ہائے اس گھر کی تباہی کا نہ پوچھو عالم — جو بیاباں بھی نہ ہو اور بیاباں ہو جائے
دن تو جیسے بھی ہوا کاٹ لیا چل پھر کے — فکر اب یہ ہے کدھر جائیں کہاں رات کریں
شمع کے آنسو شکست جام و مینا کی صدا — جو سمجھتا جائے ہے محفل سے اٹھتا جائے ہے

ناطق کی سیاسی بصیرت اور تقسیم کے تناظر میں بھی تین شعر ملاحظہ کیجئے۔

لوگ وہ شاطر کہ بہاروں کی ہوا تک بھی نہ دی — ہم وہ دیوانے کے راز گلستاں کہتے رہے
رات بھر یہ سوچتا رہتا ہوں میں — کل کا سورج دیکھئے دکھلائے کیا
اک مصیبت ہو گیا ہے چند تنکوں کا لگاؤ — ورنہ کوئی دلکشی ایسی نشیمن میں نہیں

پہلے شعر میں بہار، ہوا، دیوانے، گلستان اور تیسرے شعر میں تنکے اور نشیمن میں رعایت لفظی بھی ہے اور تلازمات بھی اور یہ فن اکثر اشعار میں نہایت خوبی سے برتا گیا ہے۔

ناطق مرحوم کا سارا کلام گمنامی کے گوشے میں پڑا تھا۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کا بھلا ہو کہ اس نے کلام ناطق کا کچھ حصہ (جتنا دستیاب ہوا) آج سے چار سال پہلے "سخن معتبر" کے نام سے چھاپ کر اس کی زندگی بچالی ہے مگر ابھی بہت کچھ باقی ہے اور ناطق مالوی پر از سر نو کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ناطق مرحوم کا قرض سارے سرونج، تمام صوبے اور سب سے زیادہ ناطق کے نواسے ڈاکٹر شاہد میر پر ہے۔ دیکھئے کون؟ کتنا؟ اور کب ادا کرتا ہے؟ میرے خیال میں ڈاکٹر مختار شمیم کی یہ رائے نہایت صائب اور مستحسن ہے کہ سرونج میں ناطق مالوی کی یادگار قائم ہونا چاہئے۔

ناطق مالوی کے بعد سرونج کے دوسرے اہم شاعر محمد علی دانش مالوی ہیں۔ دانش مالوی ہاؤ بھاؤ سے بھی شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ عسرت اور تنگ دستی کی گود میں پرورش پانے والے سرونج کے سجیلے شاعر دانش مالوی کی شخصیت میں بڑی والہانہ کشش ہے۔ سرونج کی بیشتر نیک نام، ہستیوں کی طرح دانش بھی "سیلف میڈ" ہیں گورنمنٹ سینئر سیکنڈری اسکول

کے پرنسپل کی حیثیت سے کوروائی میں ریٹائرڈ ہوئے اور وہیں سکونت اختیار کرلی۔ انہوں نے موجودہ مقام اپنے ذوق و شوق اور کڑی محنت و مشقت سے حاصل کیا ہے۔ دانش مالوی سرونج کے ان گنے چنے شاعروں میں سے ہیں جو شاعرانہ مزاج لے کر اس دنیا میں آتے ہیں۔ ایسے لوگ سر تا سر شاعر ہوتے ہیں، یہاں تک کہ شاعری ان کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز و محور بن جاتی ہے۔ یہ حضرات شاعری کی دیوی کے پرستار ہوتے ہیں۔ انہیں نام نمود سے بھی کوئی زیادہ سروکار نہیں ہوتا۔ وہ شاعری سے کماتے کم اور گنواتے زیادہ ہیں۔ دانش نے بھی کبھی اپنی نمائش کا سوانگ نہیں رچایا بس وہ ساری عمر شاعری اور شاعری کی حد تک موسیقی کی پرستش کرتے رہے یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ سرونج میں مذہبی ماحول کے باوصف شاعری کے ساتھ موسیقی کا بھی بول بالا رہا چنانچہ زیر نظر مضمون کے پچھتر فیصد شاعر غزل ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے، ایک شاعر ناطق مالوی اگرچہ تحت اللفظ پڑھتے رہے مگر فن موسیقی کے وہ بھی دلدادہ اور واقف کار تھے۔ دانش مالوی تو ترنم کے ایسے شیدائی تھے کہ شعر کو ترنم سے علیحدہ کر کے سننے میں بھی انہیں زیادہ لطف نہ آتا تھا۔ عجب نہیں کہ انہوں نے اساتذہ کے کلام کا مطالعہ بھی ترنم کے ساتھ کیا ہو۔ ان کے عروج کے زمانے میں کوئی ایسا ترنم جاننے والا نہ ہوگا جسے دانش مالوی کے فیض تربیت نے شاعر نہ بنادیا ہو۔ دانش مالوی کے شاگرد بھی سب سے زیادہ ہیں۔ اس معاملے میں انہیں سرونج کا مصحفی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ وہ عمر بھر کئی آوازوں میں پڑھتے اور ان آوازوں پر وجد کرتے رہے۔ دانش مالوی خود بھی خاصی پاٹ دار آواز کے مالک ہیں اور اپنا منفرد ترنم رکھتے ہیں۔ ان کی آواز میں ایک خاص قسم کی لرزش اور تھرتھراہٹ ہے جو سننے والوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ماضی قریب تک دانش مالوی کے بغیر سرونج میں مشاعروں کا تصور ممکن نہ تھا۔ دانش اور مشاعرہ لازم و ملزوم ہوگئے تھے۔ مجھے بخوبی یاد ہے کہ ان کی ترنم ریز غزلیں سن کر محفل جھوم جھوم جاتی تھی۔ غزل پڑھتے وقت ان کے چہرے پر ایسا جمال اتر آتا تھا کہ بے اختیار جگر کی یاد آجاتی۔ میر عرفانی نے دانش کے کلام میں نزاکت خیال اور رعنائی کا ذکر کیا ہے۔ بلاشبہ یہ دونوں خوبیاں ان کے کلام کی جان ہیں لیکن ان کی بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے غم کو انگیز کیا اور پھر رعنائی کو قائم رکھا ہے۔ زندگی کے سرد گرم سے گزرتے ہوئے اگرچہ انہوں نے بہت دکھ جھیلے مگر وہ کہیں ٹوٹے نہیں۔ ان کی غزلوں میں مایوسی اور

غم، نشاط وامید کے شانہ بہ شانہ چلتے ہیں۔ان کا غم، غم عشق اور ان کا عشق تصوف آشنا ہے کہیں کہیں انہوں نے جدید شاعری کا لب ولہجہ بلکہ لب و لہجے سے زیادہ نئی شاعری کے الفاظ استعمال کرنے کی شعوری کاوش کی ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ اپنے قدیم انداز میں زیادہ خوبصورت معلوم ہوتے ہیں چند اشعار ملاحظہ کیجئے۔

ستم گر جب یہ عالم ہو تو کس دل سے تجھے کوسوں
اٹھاؤں بد دعا کو ہاتھ اور دل سے دعا نکلے

میں چل پڑا ہوں راہ محبت میں ان کے ساتھ
اب میرے انتظار میں عمر رواں رہے

دوستوں ہنسنا ہنسانا کیا ہمیں آتا نہیں
غم سے فرصت کا کوئی لمحہ میسر بھی تو ہو

اٹھا پردہ تو اسرار محبت ہوگئے افشا
حقیقت کی نظر سے جب انہیں دیکھا تو ہم نکلے

زمانہ شوق سے اب اہتمام دار کرے
پکارنا تھا "اناالحق" جسے پکار آیا

تم اگر ہوتے نہ جان زندگی
کون کرتا زندگی کی آرزو

ہر بار تری بزم سے لائے ہیں نیا غم
ناکام محبت کبھی نا کام نہ آئے

کردیا دیوانگی نے محو احساس الم
اب تو رونا چاہتا ہوں اور ہنسی آجائے ہے

بڑی مدت میں ڈرتے ڈرتے آئینہ اٹھایا تھا
نگاہیں ملتے ہی اک اجنبی چہرا نظر آیا

چلچلاتی دھوپ میں بھی نیند سی آنے لگی
اپنے ٹوٹے گھر کی دیواروں کا سایہ دیکھ کر

آپ کے غم میں مراہر ہر نفس
رام کے بن باس میں چودہ برس

دانش مالوی کے ان اشعار کے بعد اس فہرست کے تیسرے نمائندہ شاعر مولانا زبیر احمد راہی قاسمی ہیں۔ راہی قاسمی سرونج کے اساتذہ میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ان کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے دینی علوم کے ساتھ مشرقی شعریات خصوصاً عربی اور فارسی کا راست مطالعہ کیا ہے۔ دیوبند سے فارغ ہوکر عصری تعلیم حاصل کی اور ایک استاد کی حیثیت سے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ راہی قاسمی فن شعر پر عبور رکھتے ہیں۔ان کی یہ خوبی اور علمی مرتبہ انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے۔ راہی قاسمی اردو کے علاوہ فارسی زبان میں بھی شعر کہتے ہیں خصوصاً ان کی فارسی نعتیں عقیدت اور فن کا بہترین امتزاج ہیں۔ اردو میں انہوں نے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے ان کی شاعری میں عشق مجاز اور تصوف کی رنگ آمیزی کے علاوہ سیاست کی بے راہ روی پر بھی لا تعداد اشعار

موجود ہیں۔ ایسے اشعار میں وہ طنز کا سیدھا اور بھرپور وار کرتے ہیں۔ زمانے کی کج ادائی عزیزوں اور دوستوں کی بے اعتنائی اور معشوقان ستم پیشہ کی بے وفائی پر انہوں نے ہزار زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ ابتدا میں انہوں نے بہت سی نظمیں کہی تھیں۔ ان کی اکثر عشقیہ نظمیں اختر شیرانی کے رومانی عہد کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ غزل میں سوز و گداز اور حزن و ملال کی کیفیت ہے۔ لیکن جہاں کہیں طنز کا استعمال کیا ہے کھل کر وار کرنے کو ترجیح دی ہے۔ سیاسی اشعار میں یہ رویہ اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ غزل ترنم سے پڑھتے ہیں اور بقول میر عرفانی، دانش کی بالکل ضد ہیں، مدھم سے کبھی اونچے نہیں جاتے۔" کلام کے سوز و گداز کا رنگ ان کے حزنیہ ترنم سے مل کر مزید گہرا اور پرتاثیر ہو جاتا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں۔

گزر گئے عشق کے مراحل یوں ہی مسلسل خموشیوں میں
نہ اس نے حال تباہ پوچھا نہ ہم نے روداد غم سنائی

چاند تارے سر آسماں سو گئے — آبھی جا رات کے پاسباں سو گئے
ادھر یاد ان کی نشتر بن کے چبھتی ہے رگ جاں میں — گھٹاؤں کو ادھر ضد ہو گئی ہے گھر کے آنے کی
اس شعلہ پنہاں کو لے جائیں گے محشر تک — ہم ہوں گے قیامت میں اور درد جگر ہو گا
آرہی ہے ذرے ذرے سے صدائے الفراق — اشک خونیں دیدۂ تر سے رواں ہونے کو ہے

راہی قاسمی کے مندرجہ ذیل اشعار حسن بیان، ندرتِ خیال اور معنویت کے لحاظ سے بلند پایہ ہیں۔

ہم ان کی بزم سے اٹھ کر تو آگئے لیکن — سوال یہ ہے کہ اب زندگی کہاں گزرے
آج خوش فہمی اغیار کا ٹوٹا ہے طلسم — اس نے اپنوں کو بھی اپنا نہ کہا میرے بعد
اللہ رے یہ جرأتِ یک قطرۂ لہو — بار غم حیات اٹھانے چلا ہے دل
بھروسہ نا خدا پر کرنے والو — بہت اونچا ہے پانی آج سر سے
موت کتنی بھی خوبصورت ہو — زندگی کا بدل نہیں ہوتی

راہؔی قاسمی اپنے تخلص کے استعمال میں مومؔن کے ہم نوا ہیں، ان کے مقطعوں میں تخلص کی رعایت سے راہ سنگ راہ، رہ دشوار، رہ گزر، رہبر، رہزن، کارواں، میر کارواں،

سفر، ہم سفر، شکستہ پا، شجر، سایہ، قدم، نقش قدم، منزل، خضر منزل اور جستجوئے منزل جیسے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں مثلاً

خضر منزل نے بتائے ہیں نشان منزل کے ورنہ راہی کی یہ اوقات کہاں تھی پہلے
میں نے ایسے بھی کئی نقش قدم چھوڑے ہیں دیں گے راہی کو جو منزل کا پتہ میرے بعد

ذاتی تجربات اور مشاہدات کے علاوہ راہی قاسمی اقبال اور ترقی پسندی دونوں سے متاثر ہیں ان کے کلام میں جابجا اقبال کے اثرات اور ترقی پسند تحریک کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔

راہی قاسمی کے بعد اس مجلس کے چوتھے اور اس مضمون کے آخری شاعر میر عرفانی کا ذکر خیر باقی رہ جاتا ہے۔ میر عرفانی کے بارے میں ڈاکٹر شان فخری اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں۔

> ''مرحوم (میر عرفانی) سرونج کے ان ناقابل فراموش شعرا میں تھے جو اپنی شگفتہ مزاجی، یارباشی، پر لطف انداز گفتگو، ہر دلعزیزی اور سراپا اخلاق ہونے کی بناپر مدتوں اپنی کمی کا احساس دلاتے رہیں گے۔''

سرونج کے میر اپنے شعری رویے میں دہلی کے میر کی بالکل ضد تھے سوائے اس ذہنی اشتراک کے جس میں زندگی کے تئیں دونوں کی فکر کا محور اثبات ہے۔ دانش مالوی کی طرح میر عرفانی بھی سرونج کے مشاعروں اور ادبی محفلوں کی جان تھے۔ میر عرفانی کا ایک کمال یہ بھی تھا کہ وہ ہر نشست کو چشم زدن میں شعری نشست بنادیا کرتے تھے۔ کسی ہوٹل میں یاران نشاط چائے پینے بیٹھے کہ چائے کے ساتھ شعر و سخن کا بھی ایک دور ہو گیا قاضی گھاٹ کے نشاط کلب والی بال گراؤنڈ پر ارباب ذوق کھیل شروع ہونے کے انتظار میں بیٹھے ہیں نیٹ باندھا جارہا ہے اور کچھ کھلاڑیوں کا بھی انتظار ہے۔ گویا کھیل شروع ہونے میں ابھی پندرہ بیس منٹ یا نصف گھنٹے کی دیر ہے۔ اب اگر وہاں میر عرفانی موجود ہیں تو یہ وقت ضرور شعر و ادب کے حساب میں جائے گا۔ لیکن یہ غیر رسمی نشستیں ایسی نہیں ہوتی تھیں کہ ان میں سب اپنا کلام بلاغت نظام پیش کرتے ہوں۔ ان میں بیت بازی مصرعے بازی، لطیفے بازی سنجیدہ اور غیر سنجیدہ مباحث، ان گنت گفتنی اور ناگفتنی موضوعات تھے جو زیر بحث آتے۔ بس اتنا ہوتا کہ میر عرفانی گفتگو کے سارے سلسلے شعر و سخن سے منسلک کردیتے اور کسی کو

احساس بھی نہ ہوتا۔ ان کے دم تک سرونج میں شاعری کا وہ چرچا رہا کہ اودھ کی زوال آمادہ حکومتوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ ہماری نسل کو اسی ماحول نے ذوق ادب بخشا ہے میرؔ کو فانی کا حافظہ بھی بلا کا تھا مختلف شعرا کے سیکڑوں اشعار نوک زبان تھے۔ خود بھی سناتے، دوسروں کو بھی ترغیب دیتے بلکہ ترغیب دینے کے لیے ہی سناتے تھے۔ فی البدیہہ شعر کہنے میں ان کا کوئی حریف نہ تھا اور یہ شعر بھی ایسے لاجواب ہوتے کہ سننے والے حیرت زدہ رہ جاتے۔ بلاشبہ مرحوم انتہائی زندہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی شاعری امید و حوصلہ اور سرور و کیف کی شاعری ہے انہوں نے زندگی کو مثبت انداز میں دیکھا تھا۔ خیال کی نشاط انگیزی اور زبان و بیان کا رنگ و آہنگ ان کی شاعری کے حوالے سے زندگی کو حوصلہ بخشتے ہیں۔ فن شعر گوئی میں انہوں نے اکثر کوئی نہ کوئی نیا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ غزل کے فرسودہ مضامین کو بقدر امکان نیا بنانے کی کاوش کرنا۔ بات کو ذرا سا گھما کر بیان کرنا۔ بات میں بات پیدا کرنا ان کی سیماب صفت طبیعت کو بہت راس آگیا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جسے دیکھو خوشی کی جستجو ہے		خوشی اک مستقل غم ہوگئی ہے
یہ ملال خستگی کیوں یہ غم شکستگی کیا		یہی پستیاں بنیں گی کبھی رفعتوں کے زینے
عزم محکم سعی لا حاصل نے بخشا ہے ہمیں		کس طرح پھر سعی لا حاصل کو لا حاصل کہیں
اے ناخدا وہ زعم تفاخر کہاں گیا		ادنی سی ایک موج سفینہ ڈبو گئی
میں نے کہا ہے کون حریف غم دوراں؟		اک جام چھلکتے ہوئے یوں بول اٹھا میں
ہم سفر اپنا تمھیں کیسے بنالوں یارو		بیٹھ جاتے ہو جہاں سایہ دیوار ملے

جا اے قاصد جاکر ان سے سب میری کہانی کہہ دینا
بیتاب ہے دل رکتی ہی نہیں اشکوں کی روانی کہہ دینا

اے میرؔ انھیں خط کیسے لکھوں اب ہاتھ مرے تھراتے ہیں
یہ کورا کاغذ دے دینا پیغام زبانی کہہ دینا

اے شب غم کچھ خبر ہے آج وہ آنے کو ہیں
آج تجھ سے عمر بھر کا ساتھ چھوٹا جائے ہے

آخر میں میر عرفانی کی ایک فی البدیہہ غزل بھی سن لیجیے جسے انہوں نے بطور چیلنج قبول کیا تھا۔ غزل کی ردیف "جنوں ہو جاتی ہے" اس اعتبار سے دلچسپ تھی کہ اس کا پہلا حصہ یعنی "جنوں" مذکر اور دوسرا یعنی "ہو جاتی ہے" مونث ہے۔ میر عرفانی نے اپنی شاعرانہ ذہانت سے قافیہ تلاش کیا اور نہایت کم وقت میں پانچ اشعار کی مندرجہ ذیل غزل کہہ کر اہل محفل کو حیرت انگیز مسرت سے ہم کنار کر دیا۔ غزل ہے۔

جب حد سے محبت بڑھتی ہے تشکیل جنوں ہو جاتی ہے
ہر جرات دل بڑھتے بڑھتے تبدیل جنوں ہو جاتی ہے
کہتی ہے خرد جس کو دنیا ہے ایک چراغ راہ گزر
جب حد میں جنوں کے آتی ہے قندیل جنوں ہو جاتی ہے
اس اہل جنوں کی محفل میں تو ہوش و خرد کا نام نہ لے
دیوانے ایسی باتوں سے تذلیل جنوں ہو جاتی ہے
آغاز جنوں میں اٹھتے ہیں خود ہاتھ گریباں کی جانب
اور فصل بہار آتے آتے تکمیل جنوں ہو جاتی ہے

O

ڈاکٹر ذاکر حسین کا نظریۂ تعلیم

ذاکر صاحب جدید ہندوستان کے ان روشن خیال معماروں میں سے تھے جنہوں نے گاندھی جی کی قیادت میں نئی تعلیم کو ہندوستانی ضروریات کے تقاضوں سے مطابقت پیدا کرنے اور ہندوستانی مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس کی بدولت ہندوستان کی تاریخ میں ذاکر صاحب کی ناقابل فراموش خدمات آب زر سے لکھی جائیں گی گاندھی جی کی جواہر شناس نگاہوں نے نئے ہندوستان کی بنیادی تعلیم کے اہم ترین مگر مشکل کام کی تکمیل کے لئے ذاکر صاحب کا انتخاب کیا تھا جو ذاکر صاحب کی لیاقت اور صلاحیت پر گاندھی جی کے اعتماد کا بین ثبوت ہے یہ اعتماد تعلیم کے میدان میں ذاکر صاحب کی صبر آزما طویل خدمات اور اس سے زیادہ ان کے نظریہ تعلیم کی دین تھا در اصل ذاکر صاحب کے نظریہ تعلیم کی صداقت میں گاندھی جی کو اپنے تعلیمی خواب کی تعبیر نظر آنے لگی تھی اسی کے ساتھ ذاکر صاحب کا خلوص، مستقل مزاجی، سلیقہ کار کردگی، بے پناہ قوت عمل اور کام کو عبادت کا درجہ دینے کے انداز فکر نے گاندھی کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے آزاد ہندوستان میں بنیادی تعلیم کے تعارف سے لیکر تہذیب و تربیت اور اصلاح و فروغ کے سارے کاموں میں ذاکر صاحب کے مشوروں کا احترام کیا اور مشہور واردھا اسکیم کو ذاکر صاحب کی نگرانی میں دیدیا۔

ذاکر صاحب کا نظریہ تعلیم جس نے گاندھی جی کو اس قدر متاثر کیا جن عناصر سے تشکیل پاتا ہے اگر ان کا مختصر ترین انتخاب کیا جائے تو محبت اور عمل کی حیثیت افضل ہوگی وہ ایسی تعلیم کے حامی تھے جو انسان کی شخصیت کو نکھارے اس کی ذہنی تربیت کرے اور انسان کو انسان بننے میں مدد دے ان کا خیال تھا۔

"تعلیم بس کچھ رٹ لینے یا چند باتیں جان جانے کا نام نہیں ہے بلکہ تعلیم اسے کہتے ہیں کہ آدمی جو دماغی قوتیں لیکر پیدا ہوا ہے ان میں ترقی کا جتنا امکان ہو وہ اسے حاصل کرے تعلیم آدمی کے ذہن کی پوری پوری پرورش کا نام ہے۔"

ذاکر صاحب ہم وطنوں کو ایسی تعلیم دینا چاہتے تھے جو ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرے اخلاقی قوتوں کو ابھار کر صالح اقدار کی پاسبانی کرے۔ تعمیر حیات کے لئے اخلاقی ضابطہ حیات اور ضبط و نظم کو اولیت دے قوت عمل پیدا کرے اور تمام جذبوں سے زیادہ جذبہ محبت کی پذیرائی کرے۔ ایک خطبہ میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

میں سمجھتا ہوں کہ تعلیمی نظام کے بنانے میں سب سے اہم اصول یہ پیش نظر ہونا چاہے کہ تعلیم سے خداداد صلاحیتیں درجہ کمال کو پہنچیں، پوری طرح نشو و نما پائیں اس کی انفرادیت میں یکجہتی پیدا ہو اور اس سے ایک یک سو سیرت بنے اور یہ یک سو سیرت اعلی اخلاقی اقدار کی خادم بن کر شخصیت کے مرتبہ بلند تک پہنچ سکے۔ انفرادیت سے سیرت، سیرت سے اخلاقی شخصیت صحیح تعلیم کا یہی راستہ ہے۔"

ذاکر صاحب ہر شے سے محبت کرنے والے ایک عملی انسان تھے ان کے لئے ایسی کوئی تعلیم مکمل اور بامعنی نہیں تھی جس کے ذریعہ جذبہ محبت اور قوت عمل کی آبیاری نہ ہو یہی دو بنیادی عناصر ان کے تعلیمی نظریات کی روشنی اور طاقت کا سرچشمہ تھے اپنے مشہور مضمون "اچھا استاد" میں وہ کھل کر اپنے تعلیمی نظریات کا راست اظہار کرتے ہیں اسی مضمون کا ایک جملہ "استاد کی کتاب زندگی کے سرورق پر علم نہیں لکھا ہوتا محبت کا عنوان ہوتا ہے۔" ایک ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے ایک دوسرے مضمون میں کہتے ہیں۔ "میرا خیال ہے جب ہم تعلیم کے سلسلے میں کام کریں تو پہلے وہی کام دھیان میں رکھنا چاہئے جن سے ذہن کی تربیت ہو، آدمی اچھا بنے۔"

ذاکر صاحب کوئی کام بے مقصد کرنے کے عادی نہ تھے اور تعلیمی کام کو مادی فوائد سے بلند تعمیری کام تصور کرتے تھے۔ ایک موقع پر بنیادی تعلیم کے عنوان پر ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا۔

"کام کو تعلیم کا ذریعہ بنانے والوں کو ہر دم یاد رکھنا چاہئے کہ کوئی کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ کام ہر نتیجہ پر راضی نہیں ہوتا۔ کام بس کچھ کر کے وقت کاٹ دینے کا نام نہیں۔

کام خالی دل لگی نہیں، کام کام ہے با مقصد محنت ہے، کام دشمن کی طرح آپ اپنا محاسبہ کرتا ہے پھر اس میں پورا اترتا ہے تو وہ خوشی دیتا ہے جو کہیں نہیں ملتی۔ کام ریاضت ہے، کام عبادت ہے۔"

خواجہ غلام السیدین ایک مقام پر ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریات کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں

"ذاکر صاحب کا عقیدہ تھا کہ اچھی تعلیم کے بغیر نہ قومی سیرت کی تشکیل ممکن ہے نہ آزادی کا حصول نہ ایک بہتر فرد اور سماج کا ارتقا۔"

اور یہی وہ اچھی تعلیم ہے جس کے ذریعہ ڈاکٹر عابد حسین کے خیال میں ذاکر صاحب فرد کو سنوارنا چاہتے تھے۔ عابد حسین لکھتے ہیں۔

"ذاکر صاحب کی انسان دوستی معلم کی شان رکھتی ہے۔ وہ انسان کو فرد کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اس کی روح سے محبت رکھتے ہیں اور اسے تعلیم وہدایت کے ذریعہ سنوارنا چاہتے ہیں۔"

ذاکر صاحب تعلیم کے اس طریقہ کار کو سخت ناپسند کرتے تھے جس میں صرف کتابیں رٹا کر انسان کو بے عمل بنادیا جاتا ہے ذاکر صاحب متحرک اور فعال انسان تھے۔ وہ اپنا ہر کام خود کرتے تھے وہ نصیحت یا براہ راست رہنمائی کی بہ نسبت ترغیب و تحریص کو زیادہ پسند کرتے تھے طریقہ تعلیم میں کسی کام کو سیکھنے والا عمل انہیں زیادہ عزیز تھا۔ اپنے ایک اہم خطبہ میں تعلیم اور نظام تعلیم سے متعلق قدرے طنزیہ انداز میں اس طریق کار پر چوٹ کی ہے جس کے ذریعہ طالب علم کو کتاب کا اسیر بنادیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"تعلیمی نظام ہمارے ہاتھ میں ہو تو اس وقت بھی کیا مدرسے صرف کتابیں پڑھا دینے کے لئے قائم ہوا کریں گے اور ان کا مقصد بھی اچھے سچے آدمی پیدا کرنے کی جگہ چلتے پھرتے کتب خانے پیدا کرنا ہوگا؟ کیا اس وقت بھی بچوں کی قدرتی صلاحیتوں کا خیال کئے بغیر سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانکا جایا کرے گا اور اس طرح قوم کی ذہنی قوت کو کہ اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے برباد کیا جائے گا۔؟"

دہلی کی جامعہ ملیہ اسلامیہ جسے ذاکر صاحب نے خون جگر سے کشید کیا تھا بہت سے رہنماؤں کی مخلصانہ کاوشوں اور خوابوں کی تعبیر سہی لیکن ذاکر صاحب نے جس موقع پر اور

جس طرح اس کی دستگیری کی تھی اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ یہی وہ جامعہ ہے جہاں ذاکر صاحب نے اپنے تعلیمی نظریات کو مشکل کیا اور ان مقاصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کرتے رہے جو ان کے تعلیمی نظریات کا لازمی نتیجہ تھے۔

آزادی سے پہلے جامعہ بار بار سیاسی اور معاشی خلفشار میں مبتلا ہوئی مگر بقول پروفیسر مجیب ''جامعہ کو ذاکر صاحب کی طبیعت نے بچایا جو صرف آزاد ہی نہیں تھی بلکہ کسی طرح سے کسی کی گرفت میں نہیں آتی تھی۔ انہوں نے نصیحت نہیں کی، براہ راست رہنمائی نہیں کی، بس عقدہ کشا عقل کا امتحان لیتے رہے، اخلاق اور علم کی ایک مثال جس کا حسن ہر دیکھنے والا دیکھ سکتا تھا اور جوہر دیکھنے والے کو اس سوچ میں ڈال دیتی تھی کہ سراب کا جلوہ حقیقت ہے یا حقیقت سراب کا جلوہ۔''

O

یاد فخر مالوہ آید ہمی

۲۹؍ مارچ ۱۹۹۳ء کو روزنامہ قومی آواز کے بالکل آخری صفحے پر یہ خبر ایک گوشے میں سمٹی سمٹائی پڑی تھی "ماہر تعلیم فخر الدین کا انتقال" فخر الدین صاحب کا مختصر تعارف بھی تھا لیکن میرے لئے یہ محض ایک خبر نہ تھی، ایک بجلی تھی جو احساس پر گری اور ایک سانحہ تھا جس نے تھوڑی دیر کے لئے پورے وجود کو منجمد کر دیا۔ میرے علاوہ اور نہ جانے کتنے ہوں گے جنہیں اس خبر نے اسی تجربے سے گزارا ہوگا۔ جس شخص کے انتقال کی خبر اخبار نے آخری صفحے پر غیر اہم انداز میں شائع کی ہے وہ صرف ایک شخص نہیں ایک عہد تھا جس میں شرافت، انکسار اور سادگی کی اعلا انسانی صفات پائی جاتی تھیں۔ وہ ایک ایسا چراغ تھا جس نے سیکڑوں چراغ روشن کئے یہاں تک کہ بھوپال اور اطراف بھوپال کے گھر گھر میں اجالا کر دیا۔

ملا فخر الدین جنہیں اہل بھوپال پیار سے فخرو بھائی کہتے رہے، ایک سماجی خدمت گار، سادہ مزاج شریف النفس اور دلآویز شخصیت کے مالک عظیم انسان تھے۔ ان کا تعلق انسانوں کے اس طبقے سے تھا کہ فی زمانہ جس کی پیدائش کا سلسلہ اگر منقطع نہیں ہوا تو سست اور کمزور ضرور ہو گیا ہے وہ واقعی عظیم تھے مگر اس لئے نہیں کہ ان کی شخصیت میں دلآویزی تھی۔ یہ صفت تو اور بہت سے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ وہ اس لئے بھی عظیم نہ تھے کہ ایک سماجی خدمت گار، کامیاب تاجر، سادہ مزاج اور شریف النفس انسان تھے یہ ساری صفات لائق ستائش ضرور ہیں مگر غیر معمولی نہیں، ہزاروں لوگ فخرو بھائی کی طرح ان صفات سے متصف ہوں گے۔ دراصل جس عمل نے انہیں دوسروں سے مختلف، منفرد اور ممتاز کیا ہے وہ سر سید کے انداز نظر اور طرز فکر کے نتیجے میں بھوپال کے افق سے طلوع ہونے والا ان کا

مشہور تعلیمی ادارہ سیفیہ کالج ہے، سیفیہ کالج جو فخر و بھائی کے تعلیمی شعور ملی ضرورت کے احساس اور مستقبل شناس نگاہوں کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ یہی کالج فخر و بھائی کا تعارف بھی ہے اور ان کی شخصیت کی تعریف بھی۔ سیفیہ کالج سے فخر و بھائی کا رشتہ ایسا گہرا اور قدیم تھا کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا دونوں کو ادھورا کرنا تھا۔

ہندوستان کی کئی اہم شخصیات نے فخر و بھائی کے انتقال کو ملّی اور قومی نقصان کے علاوہ ذاتی نقصان اور ذاتی غم سے تعبیر کیا ہے۔ ان اہم شخصیات میں ملک کے فرد اول یعنی صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کا نام سر فہرست ہے۔ مجھے ذاتی طور پر اس بات کا علم ہے کہ ڈاکٹر شرما کو فخر و بھائی اور سیفیہ کالج دنوں سے قلبی لگاؤ ہے۔ سیفیہ کالج کو رقیبوں اور حاسدوں کی نظر سے بچانے میں ڈاکٹر صاحب نے فخر و بھائی کی بڑی مدد کی ہے۔

سیفیہ کالج کو فخر و بھائی کے والد محترم ملا سجاد حسین صاحب مرحوم نے آزادی سے قبل ایک پرائمری اسکول کی شکل میں قائم کیا تھا اس وقت سے آج تک اس نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا بلکہ ایک درس گاہ اور ایک دانش گاہ کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کا مرکز اور ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کی مثال گاہ بھی بن گیا۔ بانی سیفیہ ملا سجاد حسین مرحوم کو اہل بھوپال سر سید ثانی اور سر سید بھوپال کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ وہ ایک نہایت مخلص، دور اندیش، مستقل مزاج مگر غیر تعلیم یافتہ شخص تھے۔ انہیں اپنے غیر تعلیم یافتہ ہونے کا شدید احساس تھا۔ اپنی اس کمی کی تلافی کے لئے انہوں نے ملک و قوم کے بچوں کو تعلیم دینے کا فیصلہ کیا اور ساری عمر اس کام میں مصروف رہے۔

۱۹۴۷ء میں فخر و بھائی اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر علی گڑھ سے بھوپال واپس آگئے اور اپنے والد کے تعلیمی مشن میں شریک ہوئے۔ فخر و بھائی کو بھی اپنے والد کی طرح عصری تعلیم کی اہمیت اور تعلیم سے مسلمانوں کی بے توجہی اور بے رغبتی کا پورا اندازہ اور احساس تھا چنانچہ انہوں نے بھی سیفیہ کالج کی تعمیر و ترقی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔ بالآخر ۲۷ مارچ ۱۹۹۳ء کو ہزاروں گھروں میں علم کی شمعیں روشن کرنے والا یہ چراغ بجھ گیا مگر بجھنے سے قبل سیفیہ کالج کی صورت میں ایک ایسی قندیل روشن کر گیا کہ اگر ملک و ملت نے اس کی حفاظت کی تو یہ قندیل برسہا برس تک علم کی روشنی سے منور کرتی رہے گی۔

فخر و بھائی نے اپنی محنت اور لگن سے سیفیہ کالج کو اس مقام پر پہنچادیا ہے کہ آج

شمالی ہند میں مسلم اقلیتی فرقے سے تعلق رکھنے والا شاید ہی کوئی غیر سرکاری تعلیمی ادارہ ایسا متحرک اور فعال ہو جو سیفیہ کالج سے آنکھیں چار کر سکے اس درس گاہ میں سائنس، کامرس، آرٹس، قانون اور تعلیم سے متعلق جدید علوم کے بیشتر شعبے موجود ہیں جن میں بیچلرز اور ماسٹرس ڈگریوں کا تو ذکر ہی کیا تحقیقی کام کرنے والوں کی تعداد بھی لائق ستائش ہے۔ ۱۹۸۴ء کے اعداد و شمار کے مطابق ۲۱ طلبا و طالبات صرف ڈپارٹمنٹ آف زولوجی میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے تھے۔ شعبہ کیمیا کے ایم ایس سی درجات (سال اول و دوم میں) دو سو طلبا زیر تعلیم تھے اور بی ایس سی کے طلبا کی تعداد، سیکشن ایچ تک پہنچ چکی تھی۔ ان حوالوں سے دوسری فیکلٹیز کی صورت حال کا آسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سیفیہ کالج کے بیشتر اساتذہ کے تحقیقی کاموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ مختصر ترین تعارف کے باوجود ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اس فہرست میں شعبہ اردو کا صرف نام کافی ہے کہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی نگرانی میں اس شعبے کی علمی و ادبی فتوحات سے ساری اردو دنیا واقف ہے۔

کھیل کا میدان بھی سیفیہ کالج کا خاص میدان ہے خصوصاً ہاکی کے وسیلے سے سیفیہ کالج کو بڑی شہرت حاصل ہے۔ اس کے کھلاڑیوں میں انعام الرحمٰن، اسلم شیر، آفاق، سہاش، رفعت، مصباح، محبوب، سرجیت سنگھ، باسط، غفور، خورشید، شکلا، زاہد نور، وسیم فیروز، سعید انور، جلال الدین اور دوسرے کئی کھلاڑی ہندوستانی ہاکی کے افق پر ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ غفران اعظم اور اسلم شیر خاں نے کھیلوں کے علاوہ قومی سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ صوبائی سطح پر رسول احمد صدیقی، حسنات صدیقی اور عارف عقیل علی الترتیب وزیر اور ایم ایل اے رہے۔ ادب کے میدان میں ڈاکٹر مظفر حنفی اور جاوید اختر کے اسمائے گرامی کسی تعارف کے محتاج نہیں یہ چند نام قلم برداشتہ لکھ دیے ہیں ورنہ سیفیہ کالج کے بے شمار طلبا نے زندگی کے ہر میدان میں قابل ذکر ترقی کی ہے۔

سیفیہ کالج کی کثیر الجہات ترقی اور کثرت طلبا کی وجہ سے کالج کی بلڈنگ تکلیف دہ حد تک تنگ محسوس ہونے لگی تو فخرو بھائی کو نئی زمین حاصل کرنے کی فکر ہوئی۔ ان کی خواہش تھی کہ کسی شاداب جگہ پر نئی عمارت تعمیر ہو۔ خدا نے یہ خواہش بھی پوری کر دی اور وہ بھی اس شان کے ساتھ کہ سابق والئی ریاست بھوپال نواب حمید اللہ خاں کا مشہور محل "قصر سلطانی" سیفیہ کالج کو مل گیا۔ یہ ایک ایسا پر فضا مقام ہے کہ جھیل، جنگل پہاڑ اور آبادی

کے بیچوں بیچ ایسی پر فضا جگہ شاید ہی کسی اور کالج کے پاس ہو۔

فخر و بھائی کی نیک دلی اور ان کے والد کی نیک نیتی کا ایک اور حیرت انگیز کارنامہ یہ ہے کہ اتنے بڑے کالج کی تعمیر و ترقی میں کسی کی ایک پائی بھی خرچ نہ ہوئی۔ کسی فرد یا افراد پر سیفیہ کالج کی ایک اینٹ کا بھی بار نہیں۔ فخر و بھائی اور ملا سجاد صاحب نے اس کالج کو (اِلا حکومت) نہ کسی کا دست نگر بنایا نہ شرمندہ احسان کیا۔ اس کے برخلاف جہاں تک مسلمانوں کی تعلیم کا تعلق ہے بھوپال اور اسکے اطراف و جوانب میں بہت کم ایسے مسلم خاندان ہوں گے جو سیفیہ کالج کے براہِ راست یا بالواسطہ فیض سے محروم رہے ہوں جنہیں اسکول کی تعلیم بھی دشوار تھی وہ سیفیہ کے فیض سے پی ایچ ڈی کر چکے ہیں اور باعزت طور پر روزی کمار ہے ہیں خود مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ آج میں جو کچھ بھی ہوں اس میں فخر و بھائی کے وسیلے سے سیفیہ کالج کا ناقابل فراموش تعاون شامل ہے۔

O

ہندوستان میں اردو مسائل کے دو رُخ

ہندوستان میں اردو زبان کے مسائل پر آج کل بے تکان گفتگو ہو رہی ہے۔ آئے دن رسائل و اخبارات میں ایسے مضامین اور خطوط چھپتے رہتے ہیں جن میں اس مظلوم زبان کے تئیں ہمدردی اور فکر مندی کے جذبات ظاہر کئے جاتے ہیں۔ کانفرنسوں، سیمیناروں اور ورکشاپوں کے شہر دہلی کے علاوہ دوسرے علاقوں کی ایسی خبریں اور رپورٹیں بھی مسلسل شائع ہوتی رہتی ہیں جن سے دردمندان اردو کی تشویش کا اظہار ہوتا ہے۔ الیکشن نزدیک ہو تو سرکاری اور سیاسی درد مندی، اعلانات، امکانات اور مطالبات کی دکانوں کے اشتہارات بھی دیواروں پر اور اخباروں میں نظر آنے لگتے ہیں۔ جا بجا اردو کی "سیل" لگ جاتی ہے بہتوں کی سیاسی تجارت یا تجارتی سیاست چمک اٹھتی ہے، لیکن جمہوریت میں یہی سب ہوتا ہے۔ ووٹوں کی سیاست یوں ہی کی جاتی ہے اس لئے یہ اعمال ایسے قابل اعتراض بھی نہیں اور ایسا بھی نہیں کہ اردو کی حمایت میں بلند ہونے والی ساری آوازیں سیاسی یا تجارتی ہی ہوں، ان آوازوں میں اردو کے مخلصوں اور بہی خواہوں کی آوازیں بھی شامل ہوتی ہیں۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ ان کا پرسان حال کوئی نہیں ہوتا۔ وہ لوگ بھی نہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور وہ لوگ بھی نہیں جنہوں نے اردو کے ذریعہ عزت، شہرت اور دولت حاصل کی ہے اور وہ بھی نہیں جنہیں اردو نے سربلندی عطا کی ہے اور ایک پہچان اور ایک تہذیب سے نوازا ہے اور وہ بھی نہیں جنہیں اسلاف کے قابل فخر کارناموں سے روشناس کرایا ہے اور دینی تعلیمات سے سرافراز کیا ہے۔ مستثنیات سے قطع نظر کوئی نہیں۔ اخلاص کے تعلق سے دیکھا جائے تو چند انفرادی کاوشیں نظر آتی ہیں اور ان پر بھی قوم کی اجتماعی بے حسی کا گہرا مہیب سایہ پڑا ہوا ہے، ایسا گہرا کہ بہی خواہوں کو بھی مایوس کر دے۔

اس موقع پر یہ بات واضح کر دینا مناسب ہوگا کہ راقم کے نزدیک اردو کا مخلص اور بہی خواہ صرف وہی شخص ہے جو اپنے بچوں کو اردو پڑھانے کی فکر کرتا ہے یا اس زبان کی کوئی ٹھوس خدمت کر رہا ہے، یہ فکر اور خدمت کسی اسکول کے وسیلے سے کی جا رہی ہو یا گھریلو طور پر اس سے کوئی بحث نہیں۔ بس عملی اقدام شرط ہے۔

آج یہ حقیقت، سورج کی طرح روشن ہے کہ ہندوستان میں اردو زبان کا سب سے اہم مسئلہ اس کی بقا کا مسئلہ ہے کسی بھی ملک میں اس ملک کی اردو جیسی زندہ زبان کو جس کے بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بے شمار ہو اور جس کا ادب، عالمی ادب سے آنکھیں چار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس کی شیرینی اور لطافت کے سبھی معترف ہوں، زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے پڑھنے لکھنے والوں کی بہر صورت حوصلہ افزائی ہونی چاہئے اور اس زبان کے ذریعے فارغ التحصیل طلبہ کو روزگار کے مواقع بھی حاصل ہونے چاہئیں۔ یہ سارے مطالبات اس عوامی اور ادبی زبان کے حقوق ہیں اور ان حقوق کی تکمیل حکومت کا فرض ہے۔ مگر افسوس کہ اردو کے معاملے میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا، آزادی کے بعد ہی سے اس زبان کی زبردست حق تلفی ہوتی رہی اور آج بھی تھوڑی بہت اشک شوئی کے علاوہ یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مرکزی حکومتیں ہوں یا صوبائی سرکاریں، دونوں نے اردو کے ساتھ ناانصافی اور حقوق سلبی کا رویہ اختیار کیا ہے ایک طویل عرصے تک جھوٹے وعدوں کے سبز باغات کی سیر کرنے کے بعد جب اردو والوں نے پہلو بدلا اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کی تو ارباب اقتدار نے خوش نما اعلانات کے ذریعے ان کا پہلو دبا دیا اور تنگ ظرف آنکھوں پر چھوٹی موٹی بخششوں کے ہاتھ رکھ دئے، کبھی یوں بھی ہوا کہ سرکار نے خود ہی اردو کو مسئلہ بنایا اور پھر خود ہی اس مسئلہ کا حل سمجھا دیا۔ انفرادی انعام واکرام دے کر کبھی مراعات طلب ہونٹوں پر قفل لگا دیئے اور کبھی اعزازات کے قطرے ٹپکا کر تر زبانیں مزید تر کر دیں۔ اس کے بعد ان مراعات واعزازات کا ایسا پروپگنڈہ ہوا جیسے حکومت کے بجٹ کا سب سے بڑا حصہ اردو پر خرچ کر دیا گیا ہو۔ حکومت کی مہربانیوں اور سخاوتوں کا شور سن کر دوسری زبان والوں نے اپنے اپنے مطالبات کی طویل ترین فہرستیں پیش کر دیں اور جو مانگا سو پایا۔ اکثر بغیر مانگے بھی ان کی جھولیاں بھر دی گئیں۔ پچھلے دنوں مولانا آزاد نیشنل اوپن اردو یونیورسٹی کے حیدر آباد میں قیام کا اعلان ہوا تو اسی کے ساتھ

ہندی کی ایک بین الاقوامی یونیورسٹی کا اعلان بھی کیا گیا۔ اب ہو گا یوں کہ آخر الذکر کا قیام عمل میں آجائے گا اور اول الذکر کا اللہ مالک ہے لیکن ہمیں خوش گمان رہنا چاہئے۔ ایک بات پھر بھی متفکر کر دیتی ہے کہ جب اسکولوں میں اردو پڑھنے کا مناسب اور معقول انتظام ہی نہیں ہے تو اردو یونیورسٹی سے استفادہ کرنے والے طلبہ کہاں سے آئیں گے؟ یہ طلبہ دینی مدارس کے تو ہوں گے نہیں، یہ الگ بات ہے کہ موجودہ ہندوستان میں اردو زبان انہیں مدارس کے دم سے زندہ ہے لیکن یہ دینی مدارس جو اردو کی بقا کے امین ہیں عصری (رائج الوقت) علوم سے ناواقف ہیں اس لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوصف اردو یونیورسٹی میں داخلے کی شرائط پوری کرنے سے قاصر رہیں گے، پھر یہ طلبہ آئیں گے کہاں سے،؟ ہر تعلیم یافتہ شخص بخوبی جانتا ہے کہ مختلف علوم و فنون کی طرح زبان کی جڑیں بھی یونیورسٹیوں میں نہیں اسکولوں میں پیوست ہوتی ہیں۔ یہاں سے جو پودے نکلتے ہیں وہ اعلا تعلیم گاہوں میں پہنچ کر برگ و بار لاتے ہیں۔ خیر سے اردو یونیورسٹی قائم ہو بھی گئی اور اسکولوں میں اردو کا معقول انتظام نہ ہو سکا تو یہ بغیر جڑوں کا ایک ایسا درخت ہو گا جس کے مستقبل کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ ادھر اردو یونیورسٹی کے چرچے ہیں اور ادھر اسکولوں سے اردو نکالنے اور اردو پڑھنے والے طلبہ کو اردو پڑھنے سے باز رکھنے کی سازشیں ہو رہی ہیں، نصابی کتب کے مسائل سے قطع نظر کہ اس موضوع پر ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے، اسکولوں میں مختلف مضامین کی درجہ بندی اور ترتیب اس طور پر قائم کی جاتی ہے کہ جو طالب علم بحیثیت مضمون اردو لینا چاہتا ہے اسے ریاضی یا انگریزی جیسے اہم مضامین کو اردو کی قیمت پر خیر باد کہنا پڑتا ہے ظاہر ہے ایسی صورت میں وہ مجبوراً اردو چھوڑ دیتا ہے۔ بعض علاقوں میں اردو سے مقابلہ کرنے کے لئے ہندی کے ساتھ ساتھ اب سنسکرت کو بھی میدان میں اتار دیا گیا ہے۔ "آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا"۔ اردو یونیورسٹی کو طلبہ فراہم کرنے کے نقطۂ نظر سے فی الوقت ایک اچھی خبر یہ ہے کہ نیشنل اوپن اسکول نے اپنے تمام کورسیز میں سال رواں سے اردو میڈیم کو متعارف کرانے کا اعلان کیا ہے یہ اسکول سارے ملک میں اپنے سینٹر قائم کرے گا۔ اردو والوں نے اس جانب توجہ مبذول فرمائی تو اردو یونیورسٹی کو طلبہ کی خاطر خواہ تعداد میسر آسکتی ہے۔ خدا کرے نیشنل اوپن اسکول کا تازہ اعلان دوسرے سرکاری اعلانات کی طرح صرف اعلان ثابت نہ ہو۔

اردو کی حق تلفی کا ایک سنگین پہلو یہ ہے کہ تقسیم ہند سے پیشتر جو علاقے اردو کے تھے تقسیم کے بعد ان علاقوں کی زمین اردو پر تنگ کر دی گئی۔ شمالی ہند کے مسلمانوں کے ساتھ اردو کے سلسلے میں بھی یہ غلط رائے قائم کر لی گئی کہ یہ زبان تقسیم وطن کی ذمے دار ہے یہ گمراہ کن پروپیگنڈہ چند شر پسند، متعصب اور شر یر سیاسی ذہنوں کی شعوری کوششوں کا نتیجہ تھا۔ بھولے بھالے عوام بھی ان کی باتوں میں آ گئے۔ اسی منفی اور شرارت آمیز تصور کے زیر اثر بے گناہ اردو بھی معتوبین کی صف میں کھڑی کر دی گئی۔ یہ سازش کچھ ایسے شاطرانہ انداز سے رچی گئی تھی کہ اردو اور مسلمان برسوں تک اپنی صفائی پیش کرتے رہے اور اپنی بے گناہی اور وفاداری کا ثبوت دیتے رہے۔ لیکن حملہ کچھ ایسا نفسیاتی اور منظم تھا کہ اردو والے حواس باختہ ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ جب یہ دھند چھٹی اور غبار بیٹھا اور مسلمانوں کا اعتماد بحال ہوا تو خاصی دیر ہو چکی تھی اور ہندوستان کا سارا منظر نامہ بدل گیا تھا۔ اردو ناقابل تلافی نقصان برداشت کر چکی تھی۔ اس تاریکی میں ایک روشن پہلو ضرور تھا کہ یہ پورے ملک کی صورت حال نہیں تھی۔ ہندوستان کے غیر ہندی علاقوں میں (جہاں علاقائی زبانوں کا راج پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے) اردو کے ساتھ کوئی تعصب یا تصادم، کرناٹک کے اس واحد سیاسی اور نقلی تصادم کے سوا جو حال ہی میں ٹیلی ویژن کے اردو بلیٹن کو بہانہ بنا کر پیدا کیا گیا تھا، نہ پہلے کبھی تھا نہ اب ہے یہ تصادم صرف انہیں ریاستوں پر تھوپا گیا ہے جو ہندی ریاستیں کہی جانے لگی ہیں۔ حالانکہ نسلی اور لسانی اعتبار سے ہندی اور اردو دونوں حقیقی بہنیں ہیں۔ دونوں کی قواعد ایک ہے۔ افعال ایک ہیں، لفظیات کے بڑے حصے میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جب تک ہندی میں سنسکرت اور اردو میں عربی و فارسی کے غیر مانوس الفاظ اور اجنبی اصطلاحات شامل نہ کر لئے جائیں۔ دونوں زبانوں کے مابین امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے۔ غیر ہندی علاقوں میں اردو دوسری یا تیسری زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے اور ان علاقوں میں پسندیدہ اور مقبول بھی ہے۔ شمالی ہند میں اردو کے علاقے چونکہ ہندی کو دے دیئے گئے ہیں اس لئے باستثنائے کشمیر اب پورے ملک میں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اردو سرکاری کام کاج میں اپنی دوسری بہنوں کے شانہ بشانہ نظر آتی ہو۔ یہ خوبصورت مگر بدنصیب زبان وطن میں بے وطن اور گھر میں بے گھر ہو گئی ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک صوبہ یا ہر صوبے کی ایک زبان ہے جہاں کوئی علاقائی زبان نہیں تھی ان صوبوں کو ہندی صوبے

بنادیا گیا۔ اردو کے سلسلے میں یہ خوش خبری سنائی گئی کہ یہ ہر صوبے میں موجود ہے۔ گویا بے پناہ ہے، اس لیے اردو غریب کو کہیں پناہ نہ مل سکی اور وطن عزیز میں آزادی کے گیت گاتے ہوئے بے وطن کردی گئی مگر اس کی قوت دیکھئے کہ اس قدر نظرانداز کیے جانے کے باوجود کشش زائل نہیں ہوئی۔ اردو والوں نے ایک بڑا کارنامہ یہ ضرور انجام دیا کہ اپنی زبان کے رسم الخط کو بدلنے کی سازش کامیاب نہ ہونے دی ورنہ اس کا وجود ہی ختم ہوگیا ہوتا اپنی فطری کشش اور مٹھاس کی وجہ سے اردو آج بھی محفلوں کی جان ہے۔ فلموں اور گیتوں کی مقبولیت کا راز ہے اور ہندوستانی مزاج کا جزولاینفک ہے۔ بعض حضرات اردو کے خلاف سازش کرنے والے اور اسے نظرانداز کرنیوالے سیاست دانوں اور صاحب اقتدار لوگوں کی اردو کے تئیں زبانی ہمدردی، زبانی تعریف اور اس کی خوبیوں کے زبانی معترفین کا ذکر بڑی دلجمعی اور چاؤ سے کرتے ہیں، ان سادہ دل افراد کو یاد رکھنا چاہئے کہ منافقانہ تعریف و اعتراف ، معاندانہ تنقید و اختلاف سے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں اردو کا ہمدرد اور دوست وہ ہے جو اردو کے حق میں عملی اقدام کرے، برے وقت میں اس کے کام آئے، آج مظلوم اردو کو اپنی تعریف و توصیف سے کہیں زیادہ ٹھوس عملی تعاون کی ضرورت ہے اور حکومتیں اسی ٹھوس عملی تعاون سے دامن کشیدہ رہتی ہیں۔

اردو کے مسائل کی تصویر کا دوسرا رخ اس سے زیادہ تکلیف دہ اور عبرت ناک ہے۔ اس رخ کا تعلق خود اردو والوں کی ذات والا صفات سے ہے، اردو زبان کی بدحالی، کسمپرسی، لاچاری اور بے بسی کی جتنی خونچکاں داستانیں ہیں ان میں حکومت کی لاپرواہی اور حق تلفی سے کہیں زیادہ اردو والوں کی کوتاہ اندیشی، بے حسی اور غفلت شعاری کا ہاتھ ہے۔ اردو بولنے والے حکومتوں سے شکوے شکایات کے عادی ہوچکے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اردو کی بقا کا سارا انحصار حکومت کی سرپرستی پر ہے حالانکہ زبانیں حکومتوں کے بل پر زندہ نہیں رہتیں حکومت کی سرپرستی سے ان کی رفتار میں تیزی ضرور آجاتی ہے مگر ان کے بولنے والے ہی دراصل ان کی زندگی اور ترقی کے ضامن ہوتے ہیں۔ عوامی مقبولیت کے بغیر نہ کوئی زبان زندہ رہ سکتی ہے اور نہ ترقی کرسکتی ہے۔ اردو بولنے والے اس بدیہی حقیقت سے آنکھیں چرانے کی کوشش کررہے ہیں۔ کیا وہ جانتے نہیں کہ اردو زبان کی بقا صرف ایک زبان کی بقا نہیں۔ ایک تہذیب ایک تاریخ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک شناخت کی بقا

ہے۔اردو بولنے والوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ہندوستان میں اردو ان کی مذہبی زبان کی حیثیت بھی اختیار کر چکی ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہر مسلک کا لٹریچر اردو زبان میں منتقل ہو چکا ہے اور مسلمان جو عربی فارسی سے تقریباً نابلد ہو گئے ہیں۔ اس وسیلے سے اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے روشناس کرا سکتے ہیں۔اردو بولنے والے مسلمانوں کو شاید اس بات کا بھی صحیح اندازہ نہیں کہ وہ اپنے بچوں کو اردو سے دور رکھ کر کیا کھو رہے ہیں۔اردو کی بقا آج بوجوہ ان کی تہذیبی، تاریخی اور مذہبی ذمہ داری بن گئی ہے۔ اسکولوں میں انتظام نہ ہونے کی صورت میں اگر وہ اپنے بچوں کو گھروں میں اردو پڑھائیں گے تو کوئی حکومت ان سے باز پرس کرنے نہیں آئے گی۔ ایک زمانہ تھا کہ ہندو مسلم سبھی مل کر اردو زبان پڑھنا لکھنا سیکھتے تھے۔اب زمانہ بدل گیا ہے۔ آج اردو زبان سیکھنے والے غیر مسلم بچوں کی تعداد غیر ملکی زبانیں سیکھنے والے بچوں سے بھی کم رہ گئی ہے۔اس طور پر اہل وطن نے اردو کی بقا کی ساری ذمہ داری عملاً مسلمانوں کے سر ڈال دی ہے۔ کچھ سینئر غیر مسلم اردو پڑھنے لکھنے والے، خدا ان کا سایہ اردو کے سر پر تادیر قائم رکھے، اس زبان کو اپنے سینے سے لگائے بیٹھے ہیں ورنہ اسکولوں سے لے کر کالج اور یونیورسٹیوں تک نگاہیں دوڑاتے رہتے کہیں کوئی بھولا بھٹکا غیر مسلم طالب علم اتفاق سے اردو کی کلاس میں نظر آ جاتا ہے تو اساتذہ کے چہرے خوشی سے کھل اٹھتے ہیں۔ مگر یہ خوشی بھی بہت کم اردو درجات کے حصے میں آتی ہے۔اپنوں کی اس بے رخی، موقع پرستوں کی بے توجہی اور نامساعد حالات کی ستم ظریفی کے باوجود یہ سخت جان اردو آج بھی زندہ ہے نہ صرف زندہ ہے بلکہ پھل پھول بھی رہی ہے۔ نئی نئی کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اخبارات و رسائل کا شمار نہیں مگر یہاں بھی اردو والوں کی خطاؤں کا سلسلہ جاری ہے۔اردو مطبوعات خریدنے میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں خرید کر پڑھنے کے بجائے اعزازی کاپیوں کے طلبگار رہتے ہیں۔اردو والوں کے احساس کمتری کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ دوسری زبانوں، خاص کر ہندی اور انگریزی کے ایسے اخبارات و رسائل خریدنے میں بھی انہیں کوئی عار نہیں جنہیں پڑھنے کا نہ ان کے پاس وقت ہے اور نہ استعداد و لیاقت جو ہندی اور انگریزی دونوں زبانیں نہیں جانتے وہ بھی ان زبانوں کے اخبار و رسائل خریدتے ہیں۔ ’’بریں عقل و دانش بباید گریست‘‘ احساس کمتری کا یہ مرض ان اردو داں حضرات میں زیادہ تشویشناک ہے جو اردو

کے ذریعہ ہزاروں لاکھوں کما رہے ہیں اور چھوٹے بڑے اداروں میں درس و تدریس کے مبارک پیشے سے وابستہ ہیں۔

گزشتہ دو دہائیوں میں حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں نے اردو کے لئے کچھ عملی اقدامات بھی کئے ہیں۔ دہلی میں ترقی اردو بیورو اور صوبوں میں اردو اکیڈمیاں انہیں اقدامات کا حاصل ہیں۔ اردو کے ان اداروں کو رقموں کے ساتھ ساتھ خود مختاری بھی دی گئی ہے۔ اردو والے ان رقموں اور خود مختاری کا صحیح استعمال کرنے سے بھی عاجز اور معذور نظر آتے ہیں۔ جوتوں میں دال بٹنے کی خبریں ہر روز اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ ہر طرف خود غرضی، مفاد پرستی اور احباب و اقربانوازی کے چرچے عام ہیں۔ ایسے حالات میں اردو کی ترقی معلوم دراصل بڑا کام صرف رقموں سے نہیں اخلاص اور جذبے سے ہوتا ہے۔ یہ سب نہ ہو یا ان میں سے کچھ بھی نہ ہو تو ایک خزانہ بھی ناکافی ہے۔ اکیڈمیوں نے کچھ آنسو ضرور پونچھے ہیں۔ مگر اردو بولنے اور سمجھنے والوں میں اردو پڑھنے اور لکھنے کا شوق عام نہ کر سکیں۔ اتر پردیش میں اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی بات کہی گئی ہے۔ یہ ایک نیک فال ہے جب کسی زبان کا رشتہ روزی روٹی سے استوار ہوتا ہے تو اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات زیادہ روشن ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی کلی نہیں جزوی سچائی ہے۔ بد قسمتی سے اردو والوں میں ایسے بہت لوگ ہیں جن کا رشتہ بوسیلہ اردو روزی روٹی سے استوار ہے مگر ان کے گھروں میں اردو سے زیادہ وہ خود پھل پھول رہے ہیں۔ اردو کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ روزی روٹی کے ماسوا اس کا رشتہ دلوں سے بھی استوار ہو۔ اسکولوں اور گھروں میں اردو تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ جو صاحب حیثیت بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے ہیں، کوئی حرج نہیں، ضرور پڑھیں بس اتنی کوشش کی جائے کہ ان بچوں کو وہاں اردو پڑھنے کی سہولت حاصل ہو۔ اسکول میں ممکن نہ ہو تو گھر میں اردو پڑھانے کا انتظام کیا جائے تاکہ یہ بچے اپنی تہذیب سے منسلک رہیں۔ اردو والوں کو دوسری زبانیں بھی سیکھنا چاہئیں ہندی اردو کی بہن ہے اور وطن عزیز کی قومی زبان ہے اسے سیکھنا نہایت ضروری ہے۔ انگریزی بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے اسے بھی سیکھیں۔ ان کے علاوہ اپنے ذوق اور استعداد کے مطابق غیر ملکی زبانیں سیکھنے کی کوشش کریں مگر اردو کی قیمت پر یا اس کے بدلے میں نہیں، اردو کے ساتھ سیکھیں۔ آج اردو کے حق میں فضا نسبتاً سازگار ہے۔ حکومتوں کے دلوں میں نرم سیاسی

گوشے پیدا ہو رہے ہیں مگر افسوس کہ اردو کے مخلص اس کے شیدائی اور سچے طلبگار اردو کی شیرینی، فصاحت، اہمیت اور افادیت کے واقف کار، اس کے جاں نثار کم ہوتے جا رہے ہیں۔ باقی وہی لوگ ہیں جن کے بچے اردو سے ناواقف اور جن کے گھر اردو کی کتابوں اور رسالوں سے خالی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ اردو کے اساتذہ بھی اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتنے میں کسی سے پیچھے نہیں والدین کا یہ عالم ہے کہ بچوں کو اردو پڑھانے سے گریز کرتے ہیں۔ والدین پڑھانا چاہیں تو اساتذہ پڑھانے میں سنجیدہ نظر نہیں آتے۔ فی زمانہ صورت حال یہ ہے کہ ہر طبقہ اور ہر فرقہ اپنی اپنی تہذیب اور تاریخ کی بات کر رہا ہے اور اپنی چھوٹی چھوٹی بولیوں اور زبانوں کو زندہ رکھنے کی کوششوں میں مصروف ہے پھر کیا وجہ ہے کہ اردو بولنے والے اپنی شیریں پر کشش اور ادبی حسن سے مالا مال زندہ زبان کو باقی رکھنے کی ذمہ داری قبول کرنے سے کتراتے ہیں۔ یوں نہ ہو کہ اپنی پہچان کو دوسرے وجود میں ضم کر دیں اور پھر کوئی پہچاننے والا بھی نہ ملے۔ کیا اردو بولنے والے اپنے عبرت ناک انجام سے باخبر ہیں؟

بشکریہ (اداریہ)

ماہنامہ کتاب نما

فروری ۱۹۹۵ء

○

اردو کا پہلا سفر نامہ "عجائبات فرنگ"

"عجائبات فرنگ" از یوسف خاں کمبل پوش کی صرف یہی ایک خوبی نہیں کہ وہ اردو کا پہلا سفر نامہ ہے۔ پہلا سفر نامہ ہونا تو اس کی اضافی خصوصیت ہے اسے پہلا سفر نامہ ہونے کا شرف حاصل نہ ہوتا اور یہ کسی اور نمبر پر آتا تو بھی زبان و بیان کی بیباکی، بے ساختگی، وارفتگی اور حقیقت نگاری کی وجہ سے اس کی شہرت اور اہمیت میں کوئی فرق نہ آتا۔ بلا شبہ اس کی شہرت اتنی ہی ہوتی جتنی آج ہے۔ یہ سفر نامہ پہلی بار پنڈت دھرم نرائن کے زیر اہتمام دہلی کالج کے پریس مطبع العلوم سے ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا اور تحسین فراقی نے ۱۹۸۳ء میں از سر نو ترتیب دے کر ایک پر مغز مقدمے کے ساتھ مطبع اللہ والا پرنٹرز شاہراہ قائداعظم لاہور سے شائع کیا۔ فراقی لکھتے ہیں:

> "کمبل پوش کی "تاریخ یوسفی" یا "عجائبات فرنگ" اردو کا پہلا سفر نامہ ہی نہیں سفر نامے کا اہم ترین سنگ میل بھی ہے اور اس پر جدید سفر نامے کی اصطلاح کا اطلاق بھی بہت حد تک ہوتا ہے، جہاں تک سفر یورپ کا تعلق ہے اردو میں اب تک اس باب میں ۳۰۔ ۳۵ سفر نامے لکھے جا چکے ہیں، جن کا سلسلہ کمبل پوش سے عطاء الحق قاسمی تک پھیلا ہوا ہے لیکن "عجائبات فرنگ" ان میں اولیت کے اعتبار سے ہی نہیں بلکہ اسلوب اور لوازمے کے اعتبار سے بھی ایک بے مثال سفر نامہ ہے۔" ("مقدمہ عجائبات فرنگ" مرتب تحسین فراقی ص ۴۷)

کمبل پوش کا وطن حیدر آباد تھا ۱۸۲۸ء میں حیدر آباد چھوڑ کر وہ لکھنؤ آ گیا۔ لکھنؤ میں نصیر الدین حیدر کے دربار سے وابستہ ہوا اور یہیں سے نواب کی اجازت لے کر لندن کے لئے روانہ ہوا۔ "عجائبات فرنگ" کے آغاز میں اس نے "حال مولف" کے عنوان سے

اپنا تعارف ان الفاظ میں تحریر کرایا ہے:

"یہ فقیر بیچ ۱۸۲۸ء مطابق ۱۲۴۶ھ کے حیدر آباد وطن خاص اپنے کو چھوڑ کر عظیم آباد، ڈھاکہ، مچھلی بندر، مندراج، گورکھپور، نیپال، اکبر آباد، شاہجہاں آباد وغیرہ دیکھتا ہوا بیت السلطنت لکھنؤ میں پہنچا، یہاں بہ مددگاری نصیبے اور یاوری کپتان ممتاز خاں میکنس صاحب بہادر کی، ملازمت نصیر الدین حید، بادشاہ سے عزت پانے والا ہوا۔ شاہ سلیمان نے ایسی عنایت اور خاوندی میرے حال پُراختلال پر مبذول فرمائی کہ ہرگز نہیں تاب بیان اور یارائے گویائی۔ رسالہ خاص سلیمان میں عہدہ جماداری کا دیا۔ بعد چند روز کے صوبے داری اسی رسالے کی دے کر درماہہ ٹھہرایا۔ بندہ چین سے زندگی بسر کرتا اور شکرانہ منعم حقیقی کا بجالاتا۔ ناگہاں شوق تحصیل علم انگریزی کا دامن گیر ہوا، بہت محنت کر کے تھوڑے دنوں میں اسے حاصل کیا۔ بعد اس کے بیشتر کتابوں تواریخ کی سیر کرتا دیکھنے حال شہروں اور راہ و رسم ملکوں سے محظوظ ہوتا۔ ایک بارگی سن اٹھارہ سو چھتیس عیسوی میں میرا دل طلبگاری سیاحی جہاں خصوصاً ملک انگلستان ہوا۔ شاہ سلیمان جاہ سے اظہار کر کے رخصت دو برس کی مانگی۔ شاہ گردوں بارگاہ نے بصد عنایت و اکرام اجازت دی، عاجز تسلیمات بجالایا اور راہی منزل مقصود ہوا تھوڑے دنوں بعد دارالامارہ کلکتہ پہنچا، پانچ چھ مہینو وہاں کی سیر کرتا رہا، بعد ازاں جمعرات کے دن ۳۰ مارچ کے مہینے سن اٹھارہ سو سینتیس عیسوی میں جہاز پر سوار ہو کر بیت السلطنت انگلستان کو چلا، نام جہاز کا "ازابیلا" (Isabella) کپتان اس کا نام ڈیبڈ براں صاحب (David Brown) مع اپنی بی بی کے تھا۔" (عجائبات فرنگ" ص ۴۰۳)

کمبل پوش نے ۳۰ مارچ ۱۸۳۷ء کو بحری سفر کا آغاز کیا اور ۳۱ اگست ۱۸۳۷ء لندن سے ڈیڑھ سو کوس کے فاصلے پر "ازابیلا" جہاز سے اتر کر کرائے کی ایک کشتی میں لندن کی جانب روانہ ہوا، راہ میں جو کچھ دیکھتا اس پر کبھی حیران ہوتا اور کبھی قربان۔ حیرانی اور شوق کی یہ وارفتگی اس کے حرف حرف سے ٹپکتی ہے، مناظر کا حسن، واقعات کی تحیر خیزی، انوکھے مشاہدات اور نئے تجربات کمبل پوش کو مست و بے خود کر دیتے ہیں۔ تمام سفر میں وہ کہیں

بچوں اور نوجوانوں کی طرح خوش فعلیاں کرتا ہے اور کہیں وارفتہ ہو جاتا ہے، جو منظر دیکھتا ہے لپک اٹھتا ہے خود بھی منظر کا حصہ بن جاتا ہے۔ خوبصورت مناظر کے ساتھ، خوبصورت لوگ، خصوصاً حسین عورتیں اس کی بڑی کمزوری ہیں، جہاں اچھی صورت دکھائی دیتی ہے، وہیں پھسل پڑتا ہے اور اپنی اس کیفیت کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتا، ایسے ہی ایک موقع پر اس کا بیان ملاحظہ کیجئے:

ناگاہ ایک معشوقہ چودہ برس کی دیکھی، ایک دوکان پر بیٹھی پری صورت حور سیرت، چاند اس کو دیکھ کر شرمائے، سورج اس کے فراق میں دن بھر چکر کھائے، عجب حسن و جمال، بے مثال کہ بیان اس کا محال، گورے گورے گال، ہونٹ لعل لعل، دانتوں میں چمک، کمر میں لچک، شیریں ادا، دلربا، ابھری اس کی چھاتیاں، عاشقوں کو پھسلاتیاں۔ فرد

برس پندرہ یا کہ چودہ کا سن
جوانی کا عالم تماشے کے دن

"میں اس کے دیکھتے ہی بے ہوش ہو گیا اور نشۂ بادۂ صال اس کے سے مدہوش ہوا۔" ("عجائبات فرنگ" ص ۱۰۶)

ایک اور منظر ملاحظہ کیجئے۔ اس منظر میں کمبل پوش ایک گھوڑا گاڑی میں سفر کر رہا ہے اور آس پاس کے مناظر کو دیکھ کر نہایت مسرور شاداں ہے، جو منظر دیکھتا ہے خوش ہوتا ہے پھر اسے اپنے وطن کی یاد آتی ہے جہاں نہ ایسا حسن ہے، نہ جوانی، نہ بچپن ہے، نہ بڑھاپا، نہ زمین، نہ آسمان کچھ بھی نہیں یورپ کی ہر چیز کیسی پرُکشش ہے، کیسی جاذب نظر، جاذب توجہ ہے کہ بس دیکھتے ہی رہیے اور کمبل پوش ہر چیز کو دیکھتا ہے اور دیکھتا ہی رہتا ہے۔ اس نے اپنے جذبات و احساسات کو زبان دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ وہ جیسا محسوس کرتا ہے اس کا عکس کاغذ پر ہو بہو اتار دیتا ہے۔ گھوڑا گاڑی کے سفر میں، اپنے گرد و پیش کے مناظر اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"ہر گانو آباد، آدمیوں کو خوش سلیقہ پایا، کنواریاں خوبصورت اپنے اپنے کھیتوں میں بیٹھی اناج کاٹتیں، باوجود بے مقدوری کے بڑے بناؤ سنگار سے تھیں بلکہ بول چال و حسن و جمال میں امیر زادیوں ہندوستان سے بہتر معلوم ہوتیں، لڑکے پری زاد جابجا جمع ہو کر عقلمندوں کی طرح بیٹھے باتیں کرتے، لڑکپن میں وہ دانائی حاصل کی کہ ہندوستان کے بڈھوں میں

بھی نہیں ہوتی، کھیت غلوں سے اور میووں سے بھرے ہوئے، بالیاں دانوں سے پر، خوشہ پروین سے پرے سرے تراوت ان کی سے قطع جنت شرمندہ دانے ان کے موتیوں سے زیادہ تابندہ۔ دیکھنے اس سرزمین اور کھیتوں ارم تزئین سے ایسے خوشی حاصل ہوئی کہ سلطنت ہفت اقلیم کی ہاتھ آئی۔ گائے بھیڑ اور بیل ایسے موٹے کہ تھوڑی دور چلنے سے تھک جاتے، ہوا ایسی فرحت بخش کہ نیند آنے لگی۔" (عجائبات فرنگ" ص ۱۱۰)

ایک اور اقتباس ملاحظہ کیجئے، کیپ کینڈی کے بارے میں لکھتا ہے:

"عجب شہر ہے لڑکوں کنواروں، خوبصورتوں کو دیکھا کہ اوستاد کے سامنے امتیاز سے بیٹھے پڑھ رہے ہیں، خرد و بزرگ سے حسب مراتب ادب سے پیش آرہے ہیں۔ میں حیران ہوا کہ ہمارے وطن کے لڑکے اس سن میں نشست و برخاست کی تمیز نہیں رکھتے ہیں یہ کیا شے ہیں جو اس صغر سن میں باوجود حسن و جمال کے دانائی میں بڈھوں سے سبقت لے گئے ہیں۔ پریاں کوچہ و بازار میں کھڑیاں دل عاشقوں کا عوض ایک جھپکی آنکھ سے پھسلاتیاں۔" ("عجائبات فرنگ" ص ۱۰۴)

کمبل پوش حسن کا رسیا اور خوبصورتی کا دیوانہ ہے، بدصورتی اسے کسی صورت گوارا نہیں۔ خوبصورت عورتوں کو دیکھتے ہی فریفتہ ہو جاتا ہے۔ بدشکل عورتوں سے دور بھاگتا ہے۔ ان کی صحبت سے گریز کرتا ہے اور ساری احتیاط کے باوجود اگر کہیں پھنس جاتا ہے تو اس کی پریشانی لائق دید ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک موقع پر کمبل پوش کا ردعمل دیکھنے کے قابل ہے:

"سب طرح سے مجھ کو گاڑی میں آسائش تھی مگر آدھی راہ میں ایذا پہنچی اس لئے کہ کوچوان نے ایک عورت بدشکل کو میرے پاس بٹھلایا، پہاڑ سے موٹی تھی، صورت اس کی سے نفرت ہوتی، میں نے اپنے تئیں بہت بچایا تو بھی اس کے موٹاپے سے صدمہ پہنچا۔ خدا نے خیر کی کہ وہ آدھی راہ سے اوتر گئی۔" ("عجائبات فرنگ" ص ۱۱۰)

انگلستان میں اکثر مقامات پر کمبل پوش حد سے زیادہ مرعوب ہو جاتا ہے، اس کے لاشعور میں احساس غلامی اور شعور میں یہ تلخ حقیقت موجود ہے کہ وہ ہندوستان کے حکمرانوں کی سرزمین پر انہیں کی قوم کے درمیان سیر و سیاحت میں مصروف ہے، یہی وجہ ہے کہ اس

سچائی کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ اس دور میں ہندستان بہت پسماندہ، زوال پذیر اور جاہلیت کے دور سے گذر رہا تھا، جب کہ یورپ کی تہذیب، تمدن، معاشرت، ثقافت نیز سیاسی، سماجی ور اقتصادی زندگی ہندوستان سے بدرجہا بہتر تھی۔ یورپ کی سیاحت کرنے والے بیشتر ندستانی ضرورت سے زیادہ مرعوب اور احساس کمتری میں مبتلا نظر آتے ہیں، دوسروں کی بہ نسبت کمبل پوش کی مرعوبیت میں وار فتگی شوق کا عنصر زیادہ ہے۔ لندن میں ملکہ وکٹوریہ کے جلوس کا منظر دیکھ کر کمبل پوش کی حالت عجیب ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وئی ندیدہ بچہ خوش رنگ مٹھائیوں کو دیکھ کر للچاتا ہے اور بیک وقت سب پر قبضہ کرنے کی وشش کرتا ہے یا کوئی بچہ ایسے تماشے کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہو اٹھتا ہے، جو اس نے پہلے بھی نہ دیکھا ہو۔ کمبل پوش کبھی ایک ایسے دیہاتی کی مانند نظر آتا ہے جو کسی شہر میں پہلی رتبہ وارد ہوا ہے اور ہر چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے اور اس قدر حیران ہوتا ہے کہ سے اپنا بھی ہوش نہیں رہتا۔ جلوس میں ملکہ وکٹوریہ کو دیکھ کر کمبل پوش کا شوق دید اور اس ی حالت ملاحظہ کیجئے:

"ملکہ مہر سیما کوئن وکٹوریہ مع اپنی والدہ ماجدہ کے اس پر سوار تھیں چاند صورت، سورج طلعت دکھائی دیتیں، تخمیناً عمر میں اٹھارہ برس کی، مجمع شرم و جمال عفت بے شمار تھیں۔ میں نے صورت دیکھتے ہی دل میں دعا کی یا اللہ گاڑی ملکہ کی میرے پاس پہنچ کر ایک لحظہ ٹھہرے، خدا نے سن لی۔ جب گاڑی میرے سامنے آئی ایک ساعت رکی، چہرۂ نورانی ملکہ کا میں نے بغور دیکھا، نمونہ قدرت ایزدی کا پایا، آداب، تسلیمات بجالایا، نگاہ عنایت سے میری طرف دیکھ کر تبسم فرمایا۔ ان کی ماں نے بھی دیکھا۔ میں خوشی سے پھولوں نہ سمایا اور دل میں دعائیں دیتا رہا کہ اللہ اس سلطنت کو کبھی زوال نہ ہووے ہمیشہ زیادتی اور کمال ہوتا رہے، غرض قدم میمنت لزوم کلڈ ہال رشک گلزار ہوا اور وہ میدان کثرت فوج و سپاہ وردی پوش سے رشک لالہ زار ایک رسالہ سواروں مشکی گھوڑوں کا زرہ اور خود پہنے نظر آیا-- ہر ایک کی مونچھیں کھڑی کمال ہیبت اور شان سے ٹولیاں باندھے قدم باقدم برابر جاتا، تماشائیوں کو ان سے ہر گز صدمہ نہ پہنچتا، سوا اون کے بہت توزک سے اور فوج مسلح تھی دیکھنے سے اس کے بہت

ہیبت آتی الفقصہ فوج بادشاہی اور تماشائیوں کا ایسا اژدہام کہ بیان میں نہیں سماتا، سننے میں آیا کہ اس جلوس میمنت لزوم میں ڈیڑھ کروڑ روپیہ صرف ہوا ہر طرح کی چیزیں اور اسباب عجیب و غریب وہاں تھے، نہیں معلوم بایں افراط کہاں سے ہاتھ آئے ہر پری زاد فرنگ کے خوشی سے راہ میں آتے جاتے، ہر ادا سے اعجاز مسیحائی دکھاتے، مرد، رنڈیاں پہلو بہ پہلو جیسے جنت میں حور و غلمان نمودار، دوکان نانبائیوں کی نعمتوں سے بھری، فریفتہ ہوا جس کی نظر اس پر پڑی، لوگوں کی بول وچال و دیدار حسن و جمال مجھ کو خواب خیال معلوم ہوتا ورنہ بیداری میں ایسی کیفیت دیکھنا محال تھی، فی الواقعی جو دیکھا خیال ہی تھا کہ اب اس کا دیکھنا میسر نہیں آتا بلکہ جس سے وہ حال کہتا ہوں اعتبار نہیں کرتا، اگر اپنی آنکھوں سے دیکھے تو مانے۔" ("عجائبات فرنگ" ص۱۳۹، ۱۴۰)

کمبل پوش ان تمام حادثات وواقعات کا بیان بھی من و عن کر دیتا ہے جو اس کی رسوائی کا سبب ہوئے، اس نے واقعات کا انتخاب نہیں کیا بلکہ اس پر جو کچھ گذری اور جہاں جیسا محسوس کیا بیان کر دیا، یہی خوبی اس کے سفر نامے کو حقیقت آشنا بناتی ہے اور صداقت سے قریب تر کر دیتی ہے، سیر فرانس کے دوران ایک موقع پر اس کی درگت کا احوال ملاحظہ کیجئے:

"راہ میں دو رنڈیاں ایک خوبصورت دوسری کریہہ الہیئت ملیں۔ میری وضع خلاف اس شہر کے دیکھ کر ترک ترک کہتی تماشا دیکھتی پیچھے دوڑی آتیں۔ اک بار پانو پھسلا دونوں لڑکھڑا کر گریں۔ میں نے قریب جا کر زن جمیلہ کا تھ پکڑ کر اٹھایا، بد شکل کو ویسے ہی چھوڑا، وہ بڑی محنت سے اٹھ اپنی بولی میں کچھ کہنے لگی، مگر اس زبان میں مجھ کو کچھ آگاہی نہ تھی، آخر اوس نے ایک دھکا دیا، مجھ کو زمین پر گرایا، دوسری عورت خوبصورت نے جس کو میں نے اٹھایا تھا میری طرف ہو کر اس سے مقابلہ کیا۔ میں جان بچانی غنیمت سمجھا، وہاں سے بھاگا۔ لڑکے کیچڑ بھرے ہوئے کپڑے اور بیگانہ وضع دیکھ کر تالیاں دیتے میرے پیچھے دوڑتے آتے، بہ ہزار خرابی بھاگتے بھاگتے سرا میں پہنچا۔ میرا حال دیکھ کر سب ہمراہی ہنسنے لگے، میں سخت نادم اور شرمندہ ہوا، پانو میں چوٹ آئی تھی، اس سبب دو ایک دن قیام کیا"

(عجائبات فرنگ، ص ۱۵۴)

کمبل پوش ایک جذباتی اور کھلا ہوا انسان ہے، خوشی کے موقع پر خوش ہوتا ہے اور غم کے موقع پر رنجیدہ، اس کا دل ہمدردی کے جذبات سے لبریز رہتا ہے، کسی کو تکلیف میں دیکھ کر وہ بے چین ہو اٹھتا ہے۔ ظلم، وعدہ خلافی اور ناانصافی اسے بالکل پسند نہیں، یہی وجہ ہے کہ مصر کی ایک قدیم عمارت کی سیر کرتے ہوئے جب وہ قوم مملوک کیساتھ شاہی دغا و فریت کے واقعات سنتا ہے اور جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے سات سو جری بہادروں کو دھوکے سے قلعے میں بلوا کر قتل کروایا تھا تو اسے شدید رنج و قلق ہوتا ہے، وہ لکھتا ہے

> ''یہ حال سن کر میں نے بہت افسوس کیا کہ یہ امر دانائی، شجاعت سے دور ہے بہت سا، اول عنایت اور مہربانی سے بلانا پھر دغا بازی سے قتل کرنا خلاف، دیانت اور امانت کے ہے، جو شخص اپنے کہے پر قائم نہ رہے کتے سے وہ بدتر ہے، اس واسطے کہ کتا حق نمک ملحوظ رکھتا ہے۔ پس یہ شخص کتے سے بھی برا ہے۔ دنیا ناپائیدار ہے کسی کو یہاں قرار ہے، افسوس کہ اس پر بھی آدمی نہیں سمجھتے ہیں، ظلم و ستم پر آمادہ ہو قتل انسان کرتے ہیں، بالاتفاق ہر مذہب میں ثابت ہے کہ کوئی گناہ قتل نبی آدم سے نہیں زیادہ ہے، باوجود اس کے جس کو دیکھئے ءاز راہ نفسانیت خونریزی پر آمادہ ہے، انسان نمونہ قدرت کاملہ حق تعالیٰ کا ہے جو اس کو قتل کرتا ہے دونوں جہاں میں اوس کا منہ کالا ہے۔'' (''عجائبات فرنگ'' ص ۱۷۶)

قوم مملوک کے واقعات قتل نے کمبل پوش کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اس کے اندر کا عیش عشرت میں سرشار آدمی سو گیا اور انسان جاگ اٹھا، وہ انسان جس کے دل میں انسانیت کا درد اور آدمی کی توقیر کا جذبہ اور احساس بھرا ہوا تھا اس قدیم حادثے کی تصوراتی یاد نے اس کے دل دماغ میں ہلچل پیدا کر دی اور وہ بہت دیر تک خود کلامی کرتا رہا، کبھی ظالموں کو کوستا اور کبھی برا بھلا کہتا، اس کے بعد مصر ہی کے ایک اور واقعے نے اس کی طبیعت کو مزید مکدر کر دیا۔ بردہ فروشی کے مقام پر اس نے جو عبرت ناک مناظر دیکھے ان کا بیان بھی بڑا عبرت ناک ہے:

> ''بردہ فروش: لونڈیاں علانیہ بیچتے ہیں، خوف حاکم نہیں کرتے ہیں جو لونٹیاں خوبصورت کمسن دیکھتے ہیں ان کو علاحدہ ایک مکان میں پردہ نشین کرتے ہیں، جس خریدار کو صاحب عزت و ثروت جانتے ہیں اس

مکان میں لے جاکر دکھلاتے ہیں، باقی اور لونڈیاں سر بازار بٹھلا کر بیچتے ہیں لوگ دیکھ بھال کر مول لیتے ہیں۔ حال اون بیچاریوں کا اون ظالموں کے ہاتھ سے متغیر تھا، کسی کا بہ سبب فاقہ کشی کے بدن میں فقط چمڑہ رہا، کسی کا سارا بدن ننگا، بندہ کپڑے سپید انگریزی پہنے تھا اظہار خریداری لونڈی خوبصورت کا کیا بردہ فروشوں نے اندر مکان کے لے جاکر لونڈیاں خوبصورت دکھائیں، صورت شکل میں سب پری کی مانند تھیں مگر بہ سبب تکلیف دینے اون ظالموں کے روٹی کپڑے سے سوکھ کر پوست و استخواں رہیں، سب کی سب میری طرف دیکھ کر عاجزی سے اشارہ خریداری اپنے کا کرتیں۔ میں دیکھنے حال تکلیف اور مصیبت اون پریوں سے سخت رنجیدہ ہو کر باہر آیا۔ بخدا اگر مجھ کو مقدور ہوتا اون ستم گاروں ناخدا ترس سے سب کو مول لے کر آزاد کر دیتا۔" (عجائبات فرنگ، ص۱۷۶)

کمبل پوش اپنی فطرت سے آزادی پسند اور مزاج کے اعتبار سے درویش صفت تھا۔ بظاہر وہ ایک مسلمان تھا مگر اس کی فطری آزادی اور آزادہ روی نے اسے کسی بھی مروجہ مذہب کے ساتھ وابستہ نہیں رہنے دیا، اس نے ایک مذہب سلیمانی ایجاد کیا اور اپنے آپ کو اس کا پیروکار شمار کرنے لگا، اپنے اس نئے مذہب کو وہ حضرت سلیمان کا مذہب کہتا تھا، دوران سفر وہ اپنے آپ کو عاجز، فقیر اور خطاپوش کہہ کر متعارف کراتا۔ عالم حیرت میں کبھی جھکتا، کبھی زمین بوس ہوتا اور کبھی آداب و تسلیمات بجالاتا۔ حقیقت کو اس نے اپنے سفر نامے میں ایسی معصومیت اور سادگی سے بیان کیا ہے کہ ہر بات پر یقین آجاتا ہے۔ سفر کے دوران ایسے مواقع بھی آئے ہیں جب اس پر خدا کا خوف طاری ہو جاتا ہے مگر ایسے مذہب کا خوف یا دینداری اور خوف قیامت سے کوئی علاقہ نہیں۔ لندن میں وہ ایک آوارہ نظر، آزاد فکر سیلانی کی صورت ادھر ادھر گھومتا ہے اور ساری رنگینیوں اور دلآویزیوں سے پوری طرح لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ نسوانی حسن و جمال کو دیکھ کر وہ ریشہ خطمی ہو جاتا ہے اور اس کے اسلوب میں بلا کار چاؤ اور توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔

"ایک بار گی ایک رنڈی پری زاد نکلی، اس کے دیکھنے سے میری آنکھوں میں ٹھنڈک آئی، عجب صورت رکھتی تھی کہ چاند کو شرماتی، پردے سے نکل کر اوس میز پر آبیٹھی اور پانی کے پیالے سے ہاتھ بھگو کر ان بارہ

پیالوں کو بجاتے اون سے ایسی آواز نکلتی کہ دل کو بیتاب کرتی، اون کے سننے کے لئے سارا بدن کان ہو گیا اور صورت دیکھنے کے ہر عضو آنکھ بنا۔" ("عجائبات فرنگ" ص ۱۰۸)

اور اقتباس میں جزئیات نگاری، مرقع کشی اور تشبیہات و استعارات کا کمال دیکھیے۔

"راہ میں ایک عورت نوجوان مربئن پری زاد زعفرانی اطلس کے کپڑے پہنے ہوئے ملی عجب حسن و جمال درخشاں رکھتی تھی کہ دیدۂ خورشید نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھی، چہرہ اوس کا درمیان بالوں عنبریں کے یوں چمکتا جیسے کالی گھٹا سے نکلا۔ زیور خورشید طلائی بالوں میں گندھا عجب کیفیت دکھاتا، انداز اس کا معشوقانہ تھا، دل دیکھتے ہی لوٹ جاتا جدھر آنکھ اٹھا کر دیکھتی فتنہ برپا کرتی۔" ("عجائبات فرنگ" ص ۱۰۸)

انگریز اور انگریزی ملک انگلستان سے کمبل پوش کی حد سے زیادہ مرعوبیت اس کے ں کمتری کا ثبوت ہے۔ اپنی اور اپنے ملک ہندوستان کے کمتر ہونے کا یہ شدید احساس ل ان کمزور حکومتوں کی دین تھا جن سے نکل کر کمبل پوش انگلستان آیا تھا۔ تحسین نے کمبل پوش کی ان کمزوریوں کا پتہ لگانے کی کوشش کی ہے جو اس کے احساس کمتری دبی تھیں۔ تحسین فراقی عجائبات فرنگ کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

"انگریز کی علم دوستی، مستقبل شناسی اور ان کا حرکی نظریہ حیات کمبل پوش کو بار بار ہندستان کے لوگوں کی کاہلی اور تن آسانی، منافقت اور اس کے رئیسوں اور دولت مندوں کی عیش پرستی اور لہو و لعب مشغولیت کی یاد دلاتا ہے، وہ ان کی مرغ بازی، بیڑ بازی اور قمار بازی کی مذمت کرتا ہے اور ان کے گرد جمع ہونے والے خوشامدیوں کے گروہ پر طعن کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اصل میں اودھ کی حکومت کا وہ خود ملازم تھا اور شاہان اودھ کی بے اعتدالیاں اور عیش پروریاں پوری طرح اس کی نگاہ میں تھیں وہ ہندوستان کی غلامی کے اسباب انہیں بے اعتدالیوں اور وہاں کے حاکموں کے ظلم و استبداد میں تلاش کرتا ہے اور انگریز کی ہندستان میں حاکمیت کا سبب اس کی نیک طینتی کو قرار دیتا ہے جس کی وجہ سے بقول اس کے تائید الٰہی نے اس کا ساتھ دیا ہے۔" ("اردو ادب میں سفر نامہ" ص ۱۱۷)

انگریزوں کے سلسلے میں اس کی رائے سادہ لوحی اور ذہنی مرعوبیت کی علامت ہے۔ کمبل پوش میں سیاسی اور سماجی شعور کی بڑی کمی تھی، وہ انگریز کی سیاسی چالوں کو سمجھنے سے قاصر تھا انگریز حکومت کی پالیسی بھی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی یہ بات اس کی عقل میں نہیں آسکتی تھی کہ ہندستان کی معاشی بدحالی اور سماجی وسیاسی انتشار دراصل انگریزوں ہی کی سیاسی شطرنج کا نتیجہ تھی وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکا کہ لندن کی ترقی اور خوش حالی کی بنیاد ہندستان کے تنزل اور بدحالی پر رکھی گئی ہے۔ اس نے لندن کی سطحی چمک دمک کو چشم ظاہر بیں سے دیکھا اور ایک معصوم بچے کی طرح خوش و خرم اور ایک دیہاتی کی طرح حیرت زدہ ہو کر بات بات پر عش عش کرتا رہا۔ ڈاکٹر انور سدید کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ:

> ''یوسف خاں کمبل پوش کا سفر نامہ انیسویں صدی کے نصف اول کے انگلستان کو ایک ایسے اجنبی کی آنکھ سے دیکھتا ہے جس کی نظر پر پسماندگی کے سینکڑوں غلاف پڑے ہوئے ہیں چنانچہ تاریخ کی کتابوں میں پڑھے ہوئے واقعات کو وہ جب اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو متانت اور علمیت کا سہارا لیے بغیر وہ انہیں بیان کر ڈالتا ہے، اس کی کم علمی، آداب معاشرت سے عدم واقفیت اور بعض اوقات نادانی کی بنا پر بے حد مضحک صورت بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یوسف خاں اپنے وقائع کو صداقت سے محروم نہیں کرتا اور مشاہدات کو حقیقی انداز میں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ یوسف خاں کی یہ بے تکلفی اور بدیہہ نگاری اس سفر نامے کی گراں مایہ خصوصیت ہے اور اس کے باطن میں انگلستان کی تہذیبی، معاشرتی، مذہبی اور عالمی زندگی کی ایسی متحرک تصویریں موجود ہیں جن کے نقوش اب لندن کے عجائب خانوں میں ہی دیکھے جاسکتے ہیں۔'' (''مقدمہ، عجائبات فرنگ'' ص۸۶)

کمبل پوش کو اسلامی اخلاق و معاشرت سے کوئی سروکار نہ تھا لندن دیکھنے کے بعد تو اسے اسلامی طرز معاشرت میں اور زیادہ خامیاں نظر آنے لگیں۔ اب وہ ہر شئی کو لندن کی آنکھ سے دیکھتا ہے مثلاً پردے کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ

> ''میرے نزدیک یہ خیال بے جا ہے کہ پردہ نشینی باعث عفت کا ہے بلکہ جو عورت بالطبع عفیفہ اور صالح بنے اگر ہزاروں مردوں میں بیٹھے عصمت

اوس کی قائم رہے اور بد طینت عورت کوئی لاکھ پردے میں چھپائے وہ اپنی حرکات ناشائستہ سے باز نہ آئے۔ ولایت لندن میں ایک عورت حسینہ ناکتخدا، غیر مردوں کے ساتھ ایک بگھی میں بیٹھ کر جس ملک میں چاہے چلی جاوے ہر گز اوس سے کسی قسم کا فساد یا حرکت بد واقع نہ ہونے پائے اس لئے کہ مرد نیک کار ہیں اور عورتیں حیادار، پس کیوں کر امر نامناسب کا خیال آوے۔ یہاں پردہ نشینی میں کیا کیا خرابیاں ہوتی ہیں انجام کار ذلت اور رسوائیاں ہوتی ہیں۔ اگر یہاں کی عوتیں علم رکھتی ہوتیں اور بے پردہ باہر نکلتیں تو ہر گز ایسا فساد نہ ہوتا۔" (عجائبات فرنگ" ص ۷۴ ۲)

کمبل پوش کے مندرجہ بالا خیالات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ لندن کو اس نے صرف سطحی نظر سے دیکھا ہے، وہ وہاں کے شب و روز کے داخلی معاملات سے واقف نہ ہو سکا اس نے انگلستان کے مردوں کو نیک کار اور عورتوں کو حیادار کہا ہے، اگر ایسا ہو تو بہت اچھا ہے مگر شاید وہ یہ بھول گیا کہ وہ انگریزوں کی جنسی بے راہ روی پر اظہار تاسف کر چکا ہے اور شاید اسے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس نے ایک جگہ لکھا ہے:

"ولایت کے سب سامان اور باتیں اور رسمیں اچھی ہیں مگر بعض رسمیں خلاف آئین ہیں بہ نظر انصاف دیکھا چاہیے کہ مرد بہ ہزار محنت و مشقت وجہ معاش حاصل کرتا ہے دل و جان سے بی بی کی خاطر داری میں مشغول رہتا ہے، سخت حیف کہ وہ بی بی اور سے منفعت ہو لے، ننگ و ناموس شوہر برباد کرے، ہزاروں لعنت اس مرد ملعون پر کہ پرائی جورو سے مرتکب مباشرت ہو، منہ کالا اس عورت کا کہ غیر مرد سے مشغول لذت ہو۔" ("عجائبات فرنگ" ص ۱۲۶)

اسلوب کے اعتبار سے کمبل پوش کا سفر نامہ ایک ایسا بیانیہ ہے جس میں ناول اور افسانے کا سا لطف و جاذبیت ہے، نثر کہیں سادہ اور کہیں رنگین ہے، سلاست ہر جگہ پائی جاتی ہے، کہیں کہیں مسجع اور مقفع نثر سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ محاوروں اور ضرب الامثال کا خوبصورت استعمال ہے۔ نثر میں قاری کو مسحور کر لینے کی صلاحیت موجود ہے۔

"عجائبات فرنگ" پہلی بار ۱۸۴۷ھ میں پنڈت دھرم نارائن کے زیر اہتمام دہلی کالج کے مطبع العلوم سے "تاریخ یوسفی" کے نام سے شائع

ہوئی تھی۔ اس کتاب پر مصنف کا نام یوسف خان کمبل پوش حیدر آبادی درج ہے۔ تاریخ یوسفی ۲۹۷ صفحات پر مشتمل ہے اور صحت املا کے ساتھ لکھی گئی ہے، البتہ املا میں یاے مجہول اور یائے معروف کا لحاظ نہیں رکھا گیا، پرانی تراکیب افراط سے ہیں۔ ۱۸۷۳ء میں منشی نول کشور نے اس سفر نامے کو "عجائبات فرنگ" کے نام سے شائع کیا۔ کتاب کے نام کے تبدیلی کے ساتھ منصف کے نام میں سے صفت نسبتی یعنی حیدر آبادی حذف کردیا، اصل متن کے املا میں بھی اصلاح کی گئی۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا خیال ہے کہ نول کشور لکھنؤ جیسے نامی ادارے نے اصل متن کا چہرہ بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مطبع نول کشور نے ۱۸۹۸ء میں اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا اور اس میں بھی یہی صورت برقرار رہی۔ ("اردو سفر نامے کی مختصر تاریخ" ص ۳۱)

محمد اکرام چغتائی کی تحقیق کے مطابق یہ سفر نامہ فارسی میں بھی لکھا گیا تھا جس اصل متن ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور فارسی متن پر مصنف نام یوسف خاں گلیم پوش رقم ہے۔

("کچھ یوسف کمبل پوش کے بارے میں" مطبوعہ روز نامہ نوائے وقت، راولپنڈ ۲۸ر فروری ۱۹۸۴ء)

۱۹۸۳ء میں پاکستان کے تحسین فراقی اور مظفر عباس نے الگ الگ کتابوں کی ش میں اس سفر نامے کو نول کشوری ایڈیشن کی بنیاد پر ترتیب دیا اور تحقیقی مقدمات کے سا شائع کیا۔ مظفر عباس کی بہ نسبت تحسین فراقی کا مقدمہ نہایت مبسوط اور معلومات اف ہے۔ یوسف خان کمبل پوش کی افتاد طبع اور تبدیلی فکر سے متعلق تذکرۂ غوثیہ۔ (روا مرید خاص شاہ گل حسن، مرقومہ مولوی اسماعیل میرٹھی، طبع اول میرٹھ ۱۸۸۴ء، حض سید غوث علی شاہ قلندر پانی پتی ۱۸۰۴ء۔ ۱۸۸۰ء کے ملفوظات اور احوال و آثار سے م دستاویز) کو بھی ایک اہم ماخذ شمار کیا جاتا ہے۔

O

ایک البیلا نثر نگار: خواجہ حسن نظامی

(اپنے سفر ناموں کے آئینے میں)

مصور فطرت خواجہ حسن نظامی ایک بے مثل ادیب، بے باک صحافی اور صاحب طرز انشاپرداز تھے۔ صوفی المشرب ہونے کے باوصف ان کی سماجی زندگی میں غیر معمولی وسعت اور تنوع تھا۔ ان کے بے باک قلم نے کئی معرکہ آرائیوں میں حصہ لیا اور اپنے حریفوں کو کسی پہلو چین سے نہیں رہنے دیا۔ ان کے مسلک و عقائد سے بہتوں نے اختلاف کیا ہے۔ علامہ اقبال سے بھی چشمک رہی مگر ان کی خلاقانہ طبیعت اور منفرد انداز بیان نے سب سے داد و تحسین حاصل کی اور ہر شخص نے کھلے دل سے ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ ان کے مضامین میں برجستگی، روانی اور شوخی کے علاوہ تخیل پسندی، جزئیات نگاری، مرقع کشی اور موضوعات کی رنگارنگی وہ خصوصیات ہیں جو ان کی تحریر کو واضح طور پر دوسروں سے الگ کرتی ہیں اور ان کی منفرد پہچان بناتی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے کئی سفر کئے۔ ۱۹۰۷ء میں ہندوستان کے جنوب میں بمبئی، گجرات اور کاٹھیاواڑ گئے ۱۹۱۱ء میں حجاز مقدس کے علاوہ مصر و فلسطین، شام کی سیاحت کی۔ ۱۹۳۱ء میں افغانستان کا سفر اختیار کیا اور کابل، غزنی، قندھار، ہرات چشت اور بلخ وغیرہ کے تفصیلی حالات قلمبند کئے۔ دوران سفر فوٹو کھینچے، نقشے اتارے اور سفر ناموں کی شکل میں ہر سفر کی روداد قارئین کے سامنے پیش کردی، خواجہ حسن نظامی نے جس مقام کا سفر کیا اسے مکمل تفصیلات کے ساتھ روز نامچے کے طور پر محفوظ کر لیا پھر اسی روز نامچے کو تاریخی ترتیب کے ساتھ سفر نامے کی شکل میں شائع کر دیا۔ ان کے سفر ناموں کی ایک خوبی یہ ہے کہ بظاہر غیر ضروری اور غیر اہم نظر آنے والی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان کی نظر سے

اوجھل نہ ہو سکی۔ جزئیات نویسی، جذبات نگاری اور مرقع کشی کا جوہر جو قدرت نے انہیں عطا کیا تھا سفر نامہ نگاری میں بڑا کام آیا، اس کے علاوہ سیاحت کا تجربہ، مزاج کی جزرسی، تفصیل پسندی اور تجزیہ نگاری نے وہ کمال دکھائے کہ تمام سفر صفحۂ قرطاس پر اس طرح سمیٹ لیا جیسے کوئی چلتی پھرتی زندگی کی فلم بندی کر لیتا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا سب سے پہلا سفر نامہ "سفر نامہ ہندوستان" ہے اس سفر نامے میں خواجہ صاحب زیادہ کھلے نہیں ہیں۔ ناسازئی طبع کے باعث مزاج میں شگفتگی اور شادابی بھی نظر نہیں آتی۔ سفر نامے کا بیشتر حصہ ملاقاتوں اور مزارات پر حاضریوں کی تفصیل میں صرف ہوا ہے۔ ملاقاتوں میں بھی عقائد و مسالک کی بحثیں شامل ہیں اس وجہ سے طبیعت میں وہ روانی پیدا نہ ہو سکی جو ان کی منفرد پہچان ہے۔ لب و لہجے میں شوخی اور شگفتگی کی جگہ اداسی اور بے کیفی جھلکتی ہے۔ اس سفر نامے کی یہ اہمیت ہے کہ یہ ان کا پہلا سفر نامہ ہے ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

"شنبہ ۱۷ راگست ۱۹۰۷ء دو بجے منصور شاہ صاحب ملنے آئے اور تشریف لے گئے۔ ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ ۴ بجے مارکیٹ گئے وہاں حسب وعدہ منصور شاہ صاحب موجود تھے، ان کو ہمراہ لے کر ٹرام میں نواب محسن الملک کے پاس گئے ملاقات ہوئی۔ اب ان کا مزاج اچھا ہے۔ نواب نصر اللہ کے پاس جانے والے تھے۔ جب وہ چلے گئے نواب سید سردار علی مالک وائسن افیکس ہوٹل سے باتیں ہونے لگیں سردار صاحب نے شاہی زمانے کے شہروں کے فوٹو دکھائے۔ یہ اعلیٰ درجے کی قدردانی ہے کہ اپنی پرانی یادگاروں کو یوں بچایا۔ باتوں میں چشتیت اور قادریت کی بحث آگئی۔ وہ حضرت غوث الاعظم کو مختار کل بیان کرتے تھے کہ بغیر ان کے حکم کے کوئی شخص درجہ ولایت نہیں پا سکتا۔ ہم سے داد لیتے تھے یا یوں کہنا چاہئے کہ ہمارا عقیدہ معلوم کرنے کی چھیڑ تھی۔ ہم نے صاف کہا کہ یہ نفسانیت کے جھگڑے ہیں، بزرگوں کی باتوں کی ہمیں کیا خبر، مگر جب انہوں نے اصرار سے دریافت کیا تو جواب دیدیا گیا کہ ہم کو حضرت غوث الاعظم کے اس مرتبے سے انکار ہے۔ اس کے بعد سرسید کی نجات کی بحث چھڑی، ان

کے خیال میں سید صاحب دوزخ میں ہیں۔ ہم نے اس خیال پر کھلم کھلا ملامت کی۔ سردار صاحب اس جواب سے کبیدہ ہوتے ہوں گے۔ بات سچی کہنا چاہئے۔" (سفر نامہ ہندوستان)

خواجہ صاحب نے دہلی کی رہنمائی کے لئے بھی ایک سفر نامہ ،،سیر دہلی" کے عنوان سے تصنیف کیا جو اپریل ۱۹۲۷ء میں پانچویں مرتبہ شائع ہوا۔ کتاب کے دیباچے میں وجہ تصنیف یوں بیان کرتے ہیں۔

"یوں تو انگریزی اور اردو میں بہت سی کتابیں سیر دہلی کی رہنمائی کے لئے لکھی گئی ہیں مگر ایسی کوئی کتاب نہیں جس کو مسافر ہاتھ میں لے کر سیر کرنے نکلے تو پھر کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ اس واسطے میں یہ چھوٹا سا رسالہ رہنمائے سیر دہلی اپنے شہر کے مہمانوں کی خاطر لکھے دیتا ہوں جو سچ مچ رہنما کا کام دے گا اور دہلی آنے والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ کیا کیا چیزیں اس شہر میں دیکھنے کی ہیں اور کون کون لوگ ملنے کے قابل ہیں اور کیا کیا سوغاتیں ایسی ہیں جو دہلی میں بکتی ہیں اور پرانی دہلی میں کون کون سی عمارتیں سیر کے لائق ہیں۔" (سیر دہلی)

"سیر دہلی" کو سفر نامہ کہنے میں ناقدین فن کو تامل ہوگا یہ ایک رہنما یا گائڈ بک کے طور پر لکھی ہوئی کتاب ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اعتبار سے یہ کتاب سفر نامے کے فن پر پوری بھی نہیں اترتی۔ خود خواجہ صاحب نے بھی اسے "رہنمائے سیر دہلی" کہا ہے لیکن اس میں تمام دہلی خصوصاً قدیم دہلی کو جس انداز سے دیکھا اور دکھایا گیا ہے وہ بغیر سفر کے ممکن نہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ قدیم انداز کے روایتی سفر ناموں کے مقاصد میں معلومات بہم پہنچانا سفر نامہ نگاروں کا خاص مقصد تھا۔ زیر بحث کتاب سے بھی اس مقصد کی تکمیل ہوتی ہے اس وجہ سے "سیر دہلی" کو قدیم انداز کے سفر ناموں کی فہرست میں شامل کرنا کچھ ایسا بے جا نہیں ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا سب سے اہم سفر نامہ "سفر نامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز ہے" یہ سفر نامہ ان کے مزاج اور ان کی تحریر کے مزاج دونوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس میں مختلف ممالک کے اہم مقامات اور اہم شخصیات کی تصاویر بھی شامل ہیں۔ تکنیک کے لحاظ

سے یہ سفر نامہ بھی خواجہ صاحب کے دوسرے سفر ناموں کی طرح ڈائری کے انداز میں لکھا گیا ہے اور تمام واقعات تاریخ وار درج کیئے گئے ہیں۔ اس طریقہ کار سے واقعات کی اصلیت، پس منظر، موقع و محل، زمانہ اور وقت کا صحیح اندازہ اور ادراک ہو جاتا ہے۔ اس طریقے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ واقعات کے متعلق خواہ مخواہ کی قیاس آرائی اور ظن و گمان کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ حج بیت اللہ شریف اور بلادِ اسلامیہ کا سفر ہر مسلمان کی طرح خواجہ صاحب کے بھی دل و جان کا سفر تھا انہوں نے پہلے بھی فریضہ حج ادا کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ بمبئی تک پہنچ بھی گئے تھے مگر، بوجوہ دہلی واپس آنا پڑا۔ اس ناکامی پر ملول و افسردہ تھے۔ "سفر نامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز" کے آغاز میں لکھتے ہیں۔

> "وہ دن جو کل پرسوں آنکھوں کے سامنے تھے کیسے غم آلود گزرے۔ بس دل ہی جانتا ہے۔ کشش حجاز نے بمبئی تک کھینچا مگر گردش ایام نے دامن پکڑ لیا نامراد دہلی واپس آیا۔ اب پھر ولولوں میں موج اٹھی اور زیارت حجاز کا تصور لہریں لینے لگا۔" (سفر نامہ مصر و فلسطین و شام حجاز)

اور جب حجاز مقدس پہنچے اور حضور پاک کے روضے کی زیارت ہوئی تو کیفیت ہی دوسری تھی۔ روضہ مقدس کے سامنے کھڑے ہیں اور یہ الفاظ زبان پر ہیں۔

> "خوش نصیب ہیں یہ آنکھیں جو آپ کے روضۂ اطہر کو دیکھ رہی ہیں۔ نصیب والا ہے یہ ہاتھ جو اس نورانی جالی کو تھامے ہوئے ہے اور زبان کی عزت پر تو جس قدر رشک کیا جائے کم ہے کہ وہ اس زندہ اور زندہ کرنے والے وجود سے کلام کر رہی ہے جس کے آگے سارے جہان کی زبانیں گنگ ہیں۔" (سفر نامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز)

مدینہ منورہ کی گلیاں دیکھ کر خواجہ صاحب وارفتہ ہو جاتے ہیں اور اپنے جذبات و تاثرات کو ان الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں جو ان کا مخصوص انداز ہے۔

> "پھول کی کلی مدینے کی گلی، دونوں تنگ دہن ہیں۔ ترکی حکومت کی بے پروائی سے صفائی بہت کم مگر مجھ کو ان گلیوں کا چپہ چپہ لندن و پیرس کی شاہراہوں سے بڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ یہ وہی راستے ہیں جہاں مولائے کائنات چلتے پھرتے تھے۔ یہ وہی راستے ہیں جو ایک گزرنے والے کی غیبی

خوشبو سے مہکا کرتے تھے، درودیوار بدل گئے ہیں عمارات کی ہیئت میں فرق آگیا ہے لیکن جگہ وہی مشتاقوں کے دل میں رہنے والی ہے۔"

(سفر نامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز)

حضرت بلالؓ کے مزار مبارک پر پہنچتے ہیں تو خواجہ حسن نظامی کا قلم پھر اپنی اصلی آب و تاب کے ساتھ جاگ اٹھتا ہے۔ محبت سے سرشار ہو کر والہانہ انداز میں کبھی مکالمہ کرتے ہیں۔ کبھی خود کلامی اور کبھی حضرت بلالؓ کو اپنے خاص انداز تخاطب میں پکارتے ہیں۔

"اٹھو بلالؓ، اٹھو بلالؓ، بابا جان تک لے چلو۔ جاگو بلالؓ، جاگو بلالؓ اذان کا وقت آگیا میں تمہاری چادر کھینچ لوں گا۔ میں تمہارے پاؤں میں گدگدیاں کروں گا۔ اب تمہارا سونا دشوار ہے۔ آنکھیں کھولو۔ تمہارے "کسی" کا نواسہ تم کو آواز دیتا ہے۔ اسکا ہاتھ پکڑو اور اس گھر تک پہنچا دو جہاں پچھلی رات نور کے تڑکے آواز دیا کرتے تھے۔"

(سفر نامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز)

خواجہ حسن نظامی ایک صوفی ہیں اس لئے مزارات اور مرقدوں سے متعلق حالات و واقعات ان کے سفر نامے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ممالک اسلامیہ کے طرز معاشرت، سیاسی و سماجی حالات، رسم و رواج اخلاق و عادات اور تعلیم و تربیت پر بھی بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے اور جا بجا واقعات، اشیا اور افراد کا موازنہ اور تجزیہ بھی کیا گیا ہے مثلاً فرعون مصر کی ممی کے بارے میں تازہ تحقیق کا احوال بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"ابتدا میں فرعون کی لاش کا صحیح حال معلوم نہ ہو سکا تھا۔ مسٹر بورد نے حروف تابوت پڑھ کر قیاس لگایا تھا کہ مرنے والا خوتیانتو بادشاہ ہے مگر مسٹر جروں کو اس بیان میں شک تھا۔ آخر پانچ چھ یوروپین فاضلوں کی موجودگی میں یہ تابوت کھولا گیا تو کفن کی عبارت سے ثابت ہوا کہ منفتاح ابن رسیس ثانی کی لاش ہے جو موسیٰؑ اور ان کی قوم کے خروج کے دام میں بحر قلزم کے اندر ڈوب کر مر گیا۔ سکندر کے زمانے کی تاریخوں سے منفتاح بن رسیس ثانی کا پورا حال معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ فرعون تھا جس

کو حضرت موسیٰ سے مقابلہ پیش آیا۔"

(سفر نامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز)

مصر کے حمام کا ذکر ہر سیاح نے کیا ہے اور اکثر نے اس کی صفائی ستھرائی کی بہت تعریف کی ہے البتہ اس بے حیائی پر کہ بیشتر جوان بوڑھے اس میں برہنہ ہو کر نہاتے ہیں تقریباً تمام بیرونی سیاح معترض ہیں۔ خواجہ حسن نظامی کے تاثرات بھی ملاحظہ فرمایئے۔

"حمام گو بہت وسیع مگر اس قدر غلیظ اور متعفن کہ خدا کی پناہ، کپڑے اتار اور تہبند باندھ اندر کے درجے میں گیا وہاں متعدد ننگے دھڑ ننگے ہاتھی دانت کے موٹے موٹے کھلونے (مصری) بیٹھے تھے۔ میرے تن زار اور جسم لاغر دیکھ کر زور زور سے دعائیں مانگنے لگے کہ خدا اس مرض لاغری سے بچائے مجھے ان کی باتیں ناگوار ہوئیں اس پر حمام کی بو، گرمی کی شدت سے دم گھٹنے لگا۔ ہر چیز میلی، حمام اندر سے بھی تمام میلا۔ نہاتے وقت یہ لوگ بالکل برہنہ ہو جاتے ہیں چنانچہ کئی بوڑھے جوان حمامیوں کے آگے پڑے تھے اور مجھ کو غیرت کے مارے پسینہ چلا آتا تھا۔ جب میری نوبت آئی اور حمامی نے حسب عادت مالش کے وقت میری تہبند کو بھی دور کرنا چاہا مگر میں نے اس کو ڈانٹا اور جلدی فارغ ہو کر باہر آیا۔ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری نے تین قرش اجرت لکھی ہے مگر حمامی نے اجنبی سمجھ کر مصری غریب دہی کے قاعدے کے مطابق دس قرش لے لئے۔"

(سفر نامہ مصر و فلسطین و شام و حجاز)

خواجہ حسن نظامی نے معاشرے کی کمزوریوں اور خامیوں پر کھل کر تنقید کی ہے۔ وہ کسی برائی سے سمجھوتہ نہیں کرتے اور ہر خامی کا برملا اظہار کر دیتے ہیں۔ ان کا سفر حجاز احترام و عقیدت کے جذبات سے لبریز ہے اور تمام سفر میں ان کا اصلاحی اور مبلغانہ مزاج جاگتا رہتا ہے انہوں نے ہر جگہ خرابات سے عبرت اور مزارات سے عقیدت کا سبق یاد دلایا ہے۔

"سفر نامہ افغانستان" خواجہ حسن نظامی کے اس سفر کا حاصل ہے جو ۱۵ر ستمبر ۱۹۳۱ء کو شروع اور ۴ر اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اختتام پذیر ہوا۔ بظاہر یہ بیس یوم کا سفر تھا مگر خواجہ صاحب نے اس قلیل مدت میں افغانستان کی تاریخ و جغرافیہ، معاشرت، مذہبیت، عقائد، اقتصادی حالات

اور خاص طور پر روحانی تاریخ یکجا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے اس سفر کے ساتھ بغرض افادیت شاہ افغانستان غازی محمد نادر شاہ کے سفر نامے کے اردو ترجمے کا خلاصہ بھی شامل کر دیا ہے۔ خواجہ صاحب کے سفر افغانستان کے مقاصد میں یوں تو کئی عوامل کار فرما ہیں مگر خاص مقصد بزرگوں کے مزارات پر حاضری تھا لکھتے ہیں۔

> "میرے سفر افغانستان کے خاص مقاصد میں ایک مقصد تو بلخ میں حضرت علیؓ کے مزار کی زیارت سے مشرف ہونا تھا دوسرے اپنے سلسلہ چشتیہ کے مرکز و منبع چشت شریف کو دیکھنا اور سلسلے کے بانی حضرات کے مزارات کی زیارت کرنی تھی۔"

(سفرنامہ افغانستان)

خواجہ حسن نظامی کا ۱۱۲ صفحات پر مشتمل یہ سفر نامہ افغانستان کا بھرپور تعارف کراتا ہے۔ افغانستانی قوم کا مزاج ان کے عادات و اطوار، اخلاق و معاملات اور عقائد وغیرہ کا مفصل ذکر کرتے ہوئے خواجہ صاحب نے نہایت بے لاگ تبصرہ بھی کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

> "کابل میں تجربہ ہوا تھا غزنی میں بھی یہی دیکھا کہ یورپ والوں کی طرح افغان بھی صبح دیر سے بیدار ہوتے ہیں ان میں جو نماز کے پابند ہیں وہ بھی صبح کی نماز پڑھ کر سو جاتے ہیں اور آٹھ بجے تک سوتے رہتے ہیں۔ اگر افغان یورپ والوں کی طرح دن کو چست اور مستعد اور متحرک نظر آتے تو میں ان کو معاف کر سکتا تھا لیکن افغانوں میں باوجود اس کے کہ افغانستان ٹھنڈا ملک ہے چستی اور پھرتی اور زیادہ کام کرنے کی امنگ نہیں دیکھی یہ قوم محض ایک اونگھتی ہوئی قوم معلوم ہوتی ہے۔"

(سفرنامہ افغانستان)

ایک اور اقتباس دیکھئے جس میں کابل اور غزنی کا موازنہ کیا ہے

> "ان قبائل کے نوجوان لڑکے ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے کانوں کے پاس چھوٹی چھوٹی زلفیں لٹکائے راہگیروں کا تماشہ دیکھتے نظر آتے ہیں۔ کابل میں یہ تندرستیاں کہیں نظر نہ آتی تھیں۔ وہاں جس کو دیکھوں چہرہ زرد، آنکھوں میں حلقے، جسم ناتواں یہاں (غزنی میں) جس کو دیکھتا ہوں خوب

گورا رنگ جس پر خون کی سرخی ایسی جیسے سفید سیب پر لال رنگ، ان بچوں کی آنکھوں میں حسن بھی ہے اور چمک بھی اور شوخی بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے ایاز اور دوسرے خوبصورت لڑکوں کو قدرت نے ان جنگلوں میں اب تک بچا رکھا ہے۔"

(سفر نامہ افغانستان)

غزنی کے بازاروں کا حال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"جگہ جگہ پانی کی صراحیاں اور لمبی لمبی چوڑی چوڑی روٹیاں بک رہی تھیں اور اس پر روٹیوں کا ڈھیر لگا دیتے ہیں۔ روٹی ڈیڑھ دو فٹ لمبی اور ایک فٹ چوڑی ہوتی ہے۔ ایک طرف سے گول اور دوسری طرف سے نوک دار جیسے ہمارے یہاں ایک روٹی پکتی ہے جسے گاؤزبان کہتے ہیں۔ اس روٹی میں سوراخ بھی ہوتے ہیں اور روٹی کے اوپر بعض لوگ تل لگاتے ہیں اور بعض کلونجی کے دانے۔ افغانستان میں روٹی کسی گھر میں نہیں پکتی۔ سب لوگ بازار سے روٹی خرید لیتے ہیں اور چھری سے کاٹ کر کھاتے ہیں جب بازار میں روٹی والے دس پانچ روٹیاں بغل میں دبا کر بیچنے نکلتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ادھوڑی کے چمڑے کسی کی بغل میں دبے ہوں۔

(سفر نامہ افغانستان)

افغانستان کے بازار میں خواجہ صاحب پر جو کچھ بیتی اس کا احوال بھی انہیں کی زبانی سنئے۔

"بازار کے اندر داخل ہوا تو ایک دیہاتی مسلمان نے جس کا سینہ کارتوسوں کی پیٹیوں سے چمک رہا تھا اور ہاتھ میں ایک لمبی بندوق بھی تھی، قریب آکر پوچھا "تو سید ہستی" میں نے کہا "بلے سید ہستم لیکن نیم مقتول و نیم مجروح" اس نے جھک کر میری داڑھی پکڑ لی اور زور سے کھینچ کر اسے چوما۔ یہ بوسہ دیکھتے ہی دکانوں سے مسلمان اٹھ اٹھ کر دوڑے اور بازار کے خریدار بھی آگئے۔ کوئی میرے کرتے کے دامن کو چومتا تھا۔ کوئی سر کے بالوں کو، کوئی ہاتھوں کو، کوئی پیروں کو اور ہر ایک میرے آگے کمر جھکا کر کہتا تھا کہ اس پر ہاتھ مارو اور پھر کہتا تھا "یک دعا بکن" مکے مارتے مارتے

میرا ہاتھ دکھنے لگا۔ دعا آدھے منٹ کی مانگتا تھا لیکن دعا کرانے والے اتنے زیادہ تھے کہ میں پریشان ہوگیا اور ان میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا تھا۔ لمبے لمبے قد، لال لال چہرے، بڑی بڑی اُلجھی ہوئی ڈاڑھیاں میلے میلے کپڑے گھیر دار شلواریں، سب کے پاس ہتھیار، سب کے سینوں پر کارتوس، بازار پٹے ہوئے، شام کا وقت دن بھر کی تکان مجھے ایسی وحشت ہوئی کہ میں جلدی سے ہاتھ چھڑا کر آگے چلا آگے کیا چلا بلکہ دوڑا پیچھے پیچھے اعتقاد کی یورش۔ بدقت تمام قیام گاہ پر گیا۔"

(سفر نامہ افغانستان)

خواجہ حسن نظامی نے اپنے سفر نامہ افغانستان کے ساتھ غازی سلطان محمد نادر شاہ جدار افغانستان کا جو سفر نامہ شامل کیا ہے اس کی بابت رقم طراز ہیں۔

"میں نے اعلیٰ حضرت غازی محمد نادر شاہ کے اس سفر نامے کو بہت غور سے کئی بار پڑھا اور بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کتاب ایک ایسے شخص نے لکھی ہے جس نے اس وقت تک یورپ کا سفر نہیں کیا تھا اور وہ یورپ کے طرز تحریر اور طریقہ فراہمی معلومات عامہ سے واقف نہ تھا مگر اس نے اس سفر نامے میں کسی جزو کل کو باقی نہیں چھوڑا۔ ہر چیز قلمبند کر دی۔"

خواجہ صاحب نے غازی محمد نادر شاہ کے سفر نامے کی بہت تعریف کی ہے خصوصاً ں بات کو کافی سراہا ہے کہ غازی نادر شاہ نے اپنے سفر نامے میں "ہر چیز قلمبند کر دی اور کسی زو و کل کو باقی نہیں چھوڑا"۔ حقیقت میں غازی محمد نادر شاہ کا سفر نامہ اس تعریف کے مستحق ی ہے لیکن یہ تمام خصائص جو خواجہ صاحب کو غازی محمد نادر شاہ کے سفر نامے میں نظر آتے ں خود ان کے سفر ناموں میں بھی موجود ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ فقیر منش خواجہ صاحب ا ترجیحات، شاہ افغانستان کی ترجیحات سے مختلف ہیں۔

○

”تواریخ عجیب“ موسوم بہ ”کالا پانی“

”تواریخ عجیب“ جو اردو ادب میں ”کالا پانی“ کے نام سے زیادہ مشہور ہے جزائر انڈمان میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کے اٹھارہ سالہ سفر حیات کا لرزہ خیز احوال ہے سادہ سلیس عوامی زبان میں خود نوشت سوانح کے انداز میں لکھا ہوا یہ ایک ایسا سفر نامہ ہے جو ایک طرف انگریزوں کے ظلم و جبر کا پردہ فاش کرتا ہے تو دوسری جانب جزائر انڈمان کی تقریباً ایکسو پچیس سالہ قدیم زندگی کے نشیب و فراز سے واقف کرانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ۱۸۵۷ء کی جدو جہد آزادی، انگریزوں کی ذہنیت اور ذہنی کیفیت، ہندوستانیوں کے طرز فکر و طرز عمل سے لے کر جزائر کالاپانی کے پر صعوبت حالات و واقعات کا پورا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی ہندوستان کے لئے خاص ااہمیت کی حامل ہے بظاہر یہ تحریک ایک ناکام بغاوت ثابت ہوئی اور انگریزوں نے کچھ اپنی شاطرانہ سیاسی چالوں اور کچھ وطن فروشوں کی مدد سے اسے پوری طرح کچل دیا لیکن ہندوستانیوں کے دلوں میں لگی ہوئی آزادی کی آگ کو نہیں بجھا سکے۔ اس ناکام تحریک آزادی سے اہل وطن نے کافی سبق حاصل کیا۔ انہیں اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا احساس ہوا۔ انگریزوں کی اصل تصویر پہچاننے میں مدد ملی۔ اتحاد و اتفاق کی اہمیت واضح ہوئی اور ان جذبات سے آشنا ہوئے جو آزادی کے متوالوں میں آتش شوق کو تیز تر کرنے کا وسیلہ بنتے ہیں۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری کا سفر نامہ ”کالاپانی“ انگریزوں کی داستان ظلم و ستم کا ایک طویل سیاہ باب ہے، اس باب کا سلسلہ معرکہ امبیلا سے ملتا ہے۔ ۱۸۶۳ء کے اس معرکے میں مجاہدین نے دین کی عظمت، وطن کی آزادی اور انسان کی سربلندی کے لئے عزم و استقلال، بہادری اور جانبازی کا وہ مظاہرہ کیا کہ ایک وقت انگریز حکومت بھی گھبرا گئی اور اس کے حوصلے پست ہو گئے مگر چند وطن دشمن غداروں کی مخبری اور مجاہدین کی تنگ دامانی کی وجہ

سے پانسہ پلٹ گیا اور مجاہدین کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی دوران انگریزوں کو مجاہدین کی طاقت اور کمک پہنچانے کے ٹھکانوں کا علم ہو گیا۔ ان ٹھکانوں میں ایک مضبوط ٹھکانہ مولوی جعفر محمد تھانیسری کا گھر تھا۔ گھر کی تلاشی لی گئی۔ محمد جعفر تھانیسری احتیاطاً گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے، مگر انہیں علی گڑھ سے گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری سے قبل گھر کی تلاشی کے دوران مولوی صاحب کی بوڑھی والدہ، برادر خورد محمد سعید اور گھر کے دیگر افراد کو قید کر کے انہیں اذیتیں پہنچائی گئیں اور پردہ نشیں خواتین کی بے عزتی کی گئی مولوی جعفر تھانیسری کے گھر کے علاوہ شہر کے سیکڑوں گھروں کی تلاشی ہوئی اور پچاسوں مرد و عورت گرفتار کیے گئے۔ مولوی جعفر تھانیسری کی گرفتاری کے بعد ان کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ انہیں کی زبانی سنئے لکھتے ہیں۔

> "دوسرے دن فجر کے وقت پارسن صاحب۔ معہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولس اور ڈپٹی کمشنر انبالہ میری کوٹھری میں آئے اور مجھ سے کہا تم اس مقدمے کا سب حال بتا دو، تمہارے واسطے بہتر ہو گا۔" (کالا پانی)

مولوی صاحب کے انکار پر پہلے انہیں دھمکایا پھر مارنا شروع کیا۔ اور بقول مولوی صاحب۔

> "جب میری مار حد کو پہنچی اور میں گر پڑا اور میں نے کچھ نہ بتایا تو وہ سب کے سب اس دن مایوس ہو کر چلے گئے۔" (کالا پانی)

اگلے روز یہ لوگ پھر آئے اور پہلے تو ریاکارانہ انداز میں چاپلوسی کرتے رہے لیکن جب مولوی صاحب اس دن بھی ٹس سے مس نہ ہوئے اور انہوں نے کچھ نہ بتایا تو لکھتے ہیں۔

> "میں کہاں تک لکھوں آٹھ بجے فجر سے آٹھ بجے رات تک مجھ پر اس قدر مار پیٹ ہوئی کہ شاید کسی پر ہوئی ہو لیکن بفضل الٰہی میں سب سہار گیا مگر اپنے رب سے یہ دعا کرتا جاتا تھا کہ یہی وقت امتحان کا ہے تو مجھ کو اس وقت ثابت قدم رکھیو۔" (کالا پانی)

اس میں شک نہیں کے مولوی محمد جعفر تھانیسری ایک جرأت مند، بہادر اور غیر معمولی قوت ارادی کے مالک انسان تھے۔ خدا پر انہیں پختہ اور غیر متزلزل بھروسہ تھا ان کے اس خود نوشت سوانحی سفر نامے میں یقین و ایمان کا جابجا ثبوت ملتا ہے۔

معرکہ امبیلا کے بعد انبالہ کا مشہور مقدمہ ۱۸۶۴ء میں شروع ہوا جس میں گیارہ اشخاص مجرم قرار دئے گئے ان گیارہ میں سے چھ افراد آزمائش کی اس گھڑی میں ثابت قدم نہ نکلے اور سرکاری گواہ بن کر رہا ہو گئے۔ بقیہ پانچ اصحاب نے ایمان و استقامت کا پورا پورا

ثبوت دیا ان کے پائے استقلال کو ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ بعد از سزا ایک مجاہد قاضی میاں جان نے جیل میں وفات پائی اور ایک دوسرے مجاہد مولوی یحیی علی انڈمان پہنچ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ باقی تین حضرات میاں عبدالغفور، مولوی عبدالرحیم اور صاحب تواریخ عجیب، مولوی محمد جعفر تھانیسری اپنی عمر عزیز کے سترہ برس اور دس ماہ جزائر انڈمان کے مصایب و آلام میں گزار کر وطن واپس آئے۔ یہ حضرات ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو جزائر انڈمان پہنچے تھے اور ۹ نومبر ۱۸۸۳ء کو رہائی نصیب ہوئی۔

مولوی محمد جعفر موضع تھانیسر ضلع انبالہ (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ ابھی بچے ہی تھے کہ ان کے والد میاں جیون کا انتقال ہو گیا۔ والدہ کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت ہوئی۔ ان کی والدہ تعلیم یافتہ تو نہیں تھیں مگر نہایت مذہبی اور راسخ العقیدہ خاتون تھیں۔ ان کی تربیت کے فیض سے محمد جعفر میں قرآن و حدیث کا شغف پیدا ہو گیا اور بچپن ہی سے بشمول تہجد نماز کے عادی ہو گئے۔ محمد جعفر تھانیسری کی تعلیم کا آغاز اگرچہ تاخیر سے ہوا لیکن ذہین و ذکی ہونے کی وجہ سے انہوں نے بہت جلد مروجہ علوم میں دسترس حاصل کر لی۔

اس دور میں سید احمد شہید کی تحریک تجدید و احیائے دین کا بڑا زور تھا۔ یہ تحریک ولی اللہی تحریک کے زیر اثر پروان چڑھی تھی اسی سے تحریک جہاد کا چشمہ پھوٹا اور اسی کو انگریزوں نے وہابی تحریک کا نام دیکر معصوم اور ناواقف مسلمانوں میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری اسی تحریک جہاد کے رکن عظیم اور بڑے رازدار تھے۔ ان کا گھر مجاہدین کی ایک بڑی پناہ گاہ تھا۔ سرحد کو روپیہ، اسلحہ اور تازہ دم سپاہ انہیں کے توسط سے پہنچتے اور رازدارانہ خط و کتابت بھی انہیں کے ذریعے ہوتی۔ یہی وہ اسباب تھے جن کے نتیجے میں انہیں کالا پانی کی سزا ہوئی۔

انبالہ کا مقدمہ ۲ مئی ۱۸۶۴ء کو فیصل ہوا۔ اس مقدمے کے فیصلے میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کو اولاً پھانسی کی سزا سنائی گئی فیصلہ سناتے ہوئے انگریز جج نے جو الفاظ کہے ان سے خصوصاً آخری جملے سے انگریزوں کی اذیت پسند ذہنیت کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کالا پانی کی تحریر کے مطابق جج نے کہا "تم بہت عقلمند، ذی علم اور قانون داں ہو اور اپنے شہر کے نمبردار اور رئیس ہو، تم نے اپنی ساری عقلمندی اور قانون دانی کو سرکار کی مخالفت میں خرچ کیا۔ تمہارے ذریعے سے آمدنی اور روپیہ سرکار کے دشمنوں کو جاتا تھا تم نے سوائے انکار کچھ جبلتاً بھی خیر خواہی سرکار کا دم نہیں بھرا اور باوجود فہمائش اس کے ثابت کرانے میں کچھ کوشش نہ کی اس واسطے تم کو پھانسی دی جائے گی۔ اور آخر میں یہ کلمہ بھی فرمایا کہ "میں تم

کو پھانسی پر لٹکتا ہوا دیکھ کر خوش ہوں گا۔" (کالا پانی)

پھانسی کی سزا کچھ روز کے بعد حبس دوام بہ عبور دریائے شور میں تبدیل ہو گئی اور محمد جعفر تھانیسری کو جزائر انڈمان بھیج دیا گیا۔ انڈمان سے واپسی پر جب ان کے دوستوں نے حالات سفر اور جزائر انڈمان کی حالت و کیفیت کے باب میں کچھ پوچھنا چاہا تو انہوں نے بالتفصیل اپنے حالات سفر قلمبند کئے۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری کا سفر، سفر شوق نہ تھا۔ وہ ایک سیاسی قیدی کی حیثیت سے بطور سزا کالا پانی بھیجے گئے تھے مگر انہوں نے اس سزا کو ایک الوالعزم و عالی ہمت مجاہد کی طرح قبول کیا اور قید کے دوران زندگی کو زندہ لوگوں کی طرح گزارا یہی وجہ ہے کہ پہلے انہوں نے اپنے اہل و عیال کو وطن سے انڈمان بلانے کی کوشش کی مگر جب اس کوشش میں ناکام ہو گئے تو وہیں دوسری اور دوسری بیوی کے انتقال کے بعد تیسری شادی کی۔ تیسری بیوی سے دس اولادیں ہوئیں جن میں سے آٹھ زندہ رہیں جنہیں رہائی کے بعد وہ اپنے ساتھ وطن لے آئے۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اپنے قیام کے دوران جزائر انڈمان کو ہر پہلو اور ہر زاویئے سے بغور دیکھا ہے اور اپنی یادداشت کے وسیلے سے اس علاقے کے باشندوں کی سماجی نفسیات، معاشرتی رجحانات، مذہبی عقائد اور افتاد طبع پر معروضی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ان کا اسلوب نگارش سادہ بیانیہ اور تصنع سے پاک ہے۔

ایک مقام پر علاقائی باشندوں کے قدو قامت اور حلیے کی نقشہ کشی اس انداز سے کرتے ہیں کہ ایک قلمی تصویر بن جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

> "یہ لوگ چار فٹ سے پانچ فٹ چار انچ تک اونچے، مثل حبشیوں کے سیاہ فام، گول سر، آنکھیں ابھری ہوئی، سر پر بھیڑ کے سے بال مگر نہایت مضبوط اور قوی ہوتے ہیں۔ ان کی جزائر انڈومان میں بارہ ذاتیں ہیں۔ ایک ذات کی زبان دوسری قوم سے بہت کم ملتی ہے یہ جنگلی اس بات کے قائل ہیں کہ خدا آسمان پر رہتا ہے ... "

ایک جگہ مقامی آبادی کے دیوتا "چاناپالک" کی زوجہ اور اس کے معتقدین کے عقائد کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "مسماۃ "چاناپالک" ایک اس کی جورو بھی ہے اور اس کی جورو کو بھی فنا نہیں اور نہ ہی وہ کسی سے پیدا ہوئی مگر اس کا درجہ خدا (دیوتا) سے کم ہے۔ اس کا

کام ہے کہ سمندر میں مچھلیاں پیدا کرے، وہی مچھلیوں کو آسمان سے گراتی ہے۔ یہ لوگ شیطان کے بھی قائل ہیں کہ سب برے کام شیطان کراتا ہے۔ یہ لوگ فرشتوں کے بھی قائل ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مرد و عورت دونوں جنس سے ہیں اور جنگل میں رہتے ہیں۔" (کالا پانی)

مولوی جعفر تھانیسری جب ان لوگوں کی معلومات عامہ یا تہذیب و معاشرت کا ذکر کرتے ہیں تو مدھیہ پردیش کے علاقے چھتیس گڑھ کے بھیلوں کی معاشرتی زندگی سے گہری مماثلت اور مشابہت معلوم ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

"یہ لوگ دو سے زیادہ گنتی نہیں جانتے۔ جب کوئی چیز دو سے زیادہ گنتے ہیں تو انگلیوں پر اشارہ کرتے ہیں۔ یہ لوگ ننگے مادر زاد پھرتے ہیں۔ ان کے گھر جا کر دیکھو تو سوائے میاں بیوی کے اور کچھ جائداد اور ملکیت نہیں۔ تیر و کمان ان کی اصل جائداد اور جان ہے" (کالا پانی)

ایک اور مقام پر مختلف ذاتوں کے سماجی اختلاط کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یہاں مسلمان مرد خواہ کسی ذات کا ہو ہر مسلمان عورت سے بلا روک ٹوک شادی کر لیتا ہے۔ اسی طرح ہندوؤں میں بھی ہندو ہونا کافی ہے۔ ایک ذات کا ہونا ضروری نہیں برہمنوں کے گھروں میں پاسیں اور جاٹوں کے گھروں میں برہمنیاں موجود ہیں۔" (کالا پانی)

ان اقتباسات سے مولوی محمد جعفر تھانیسری کی باریک بینی اور سماجی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے گہرے تجربات اور وسیع مشاہدے کو نہایت خلوص و ایمانداری کے ساتھ بے کم و کاست بیان کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیف "تواریخ عجیب" مولوی صاحب کے ذاتی حالات اور جزائر انڈیمان کی تہذیب و معاشرت کا ایک ایسا مرقع بن گئی ہے کہ اس میں خود نوشت سوانح حیات اور سفر نامہ دونوں یک جان و دو قالب نظر آتے ہیں انہیں خصوصیات کی وجہ سے "تواریخ عجیب" موسوم بہ "کالا پانی" جزائر انڈیمان سے متعلق ایک ایسی اہم تاریخی اور سماجی دستاویز بن گئی ہے جسے فراموش نہیں کیا جانا چاہئے۔

O

شبلی نعمانی کا سفر نامہ روم و مصر و شام

علامہ شبلی نعمانی نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں اسلامی ممالک کا سفر کیا تھا۔ سفر سے واپسی پر بزرگوں اور دوستوں کے اصرار پر حالات سفر قلمبند کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس طرح اردو ادب میں ایک وقیع سفر نامے کا اضافہ ہوا۔ علامہ شبلی اپنے سفر کے واقعات سپرد قلم کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ”میں نے قسطنطنیہ وغیرہ کا جو سفر کیا وہ محض ایک طالب علمانہ سفر تھا اور چونکہ نہ یہ کوئی غیر معمولی امر تھا نہ واقعات سفر میں چنداں ندرت تھی۔ سفر نامہ لکھنے کا میرا ارادہ نہ تھا لیکن وہاں سے واپس آکر جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا سب سفر نامے کے متقاضی تھے۔ میں نے خیال کیا چونکہ ایک مدت سے ہماری جماعت میں سیر و سیاحت کا طریقہ بند ہے اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح حالات سے بالکل اطلاع نہیں حاصل ہوتی۔ لوگوں کا یہ تقاضا کچھ بے جا نہیں۔ مجھ کو خود اپنی حالت یاد آئی کہ سفر سے پہلے قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا یہ وہ اسباب تھے جنہوں نے مجھ کو ان اوراق پریشان کی ترتیب پر آمادہ کیا ورنہ ایسے عاجلانہ اور معمولی سفر کے حالات قلمبند کرنے اور ان کو سفر نامہ یا کتاب الرحلتہ کا لقب دینا تنگ نظری سے خالی نہ تھا۔“
>
> (سفر نامہ روم و مصر و شام)

یہ شبلی کی عالی ظرفی اور عالمانہ وسعت نظر تھی کہ انہوں نے دور دراز ملکوں کے سفر کو معمولی اور طالب علمانہ سفر کہہ کر اپنے عجز و انکسار کا اظہار کیا ورنہ یہ اتنے قیمتی تجربات

کا آئینہ دار ہے کہ اگر سفر نامے کی صورت میں ان واقعات سے تعارف نہ ہوا ہوتا تو اردو ادب ایک بہتر سفر نامے سے محروم رہ جاتا۔ اس وقت تک ترکستان اور مصر وغیرہ کے صحیح حالات سے واقفیت کا کوئی اور معتبر ذریعہ بھی موجود نہ تھا۔ شبلی نے اس کمی کو بھی پورا کر دیا، دنیائے اردو کو شبلی کے ان بزرگوں اور دوستوں کا شکر گزار ہونا چاہئے جن کے اصرار پر یہ بیش قیمت اور پر از معلومات کتاب وجود میں آئی۔

شبلی نعمانی کا یہ سفر خالص علمی نوعیت کا تھا، انہیں تحقیق ادب اور تاریخ اسلام سے خصوصی دلچسپی تھی۔ مسلمانوں کی تاریخ کا انہوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا تھا۔ اسی مطالعہ کے دوران انہیں یورپ کی ان ریشہ دوانیوں کا علم ہوا جو مسلمانوں اور ممالک اسلامیہ کو بدنام کرنے کی حکمت عملی کے طور پر جاری وساری تھیں۔ یورپ کے مورخین مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا شکار تھے انہوں نے اسلامی تاریخ میں قطع و برید کر کے مسلمانوں کے ماضی کو کچھ ایسے منفی انداز میں پیش کیا کہ غلط تاثر اور نفرت انگیز تصور قائم ہونے لگا خصوصاً ترکوں کے سلسلے میں یورپ کے مورخین نے بہت زیادہ زہر افشانی کی، یہاں تک کہ مغرب کے غیر جانبدار اور نیک دل سمجھے جانے والے مورخین بھی تنگ نظری، تعصب اور جانب داری کا شکار ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ شبلی لکھتے ہیں۔

> ''یورپ کے مورخین کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس وجہ سے ان میں متعصب، نیک دل، ظاہر بیں، دقیق النظر ہر درجے اور ہر طبقے کے لوگ ہیں لیکن ترکوں کے ذکر میں وہ اختلاف مدارج بالکل زائل ہو جاتا ہے اور ہر ساز سے وہی ایک صدا نکلتی ہے مثلاً آج کل کے سچے سے سچے یورپین مصنف کی راست بازی یہ ہے کہ وہ ترکی حکومت کے ذکر میں قرضے کی گراں باری، صنائع اور فنون کا بقدر کافی نہ ہونا، اضلاع میں تعلیم کی عدم وسعت، آلات واسلحہ میں یورپ کی احتیاج ان تمام امور کو بالکل راست راست لکھتا ہے لیکن جو اصلاحیں حال میں ہوئی ہیں ان کے ذکر سے اس طرح دامن بچاتا ہے گویا اصلاح کا سرے سے وجود ہی نہیں۔''

(''سفر نامہ روم ومصر وشام'')

ان اسباب کی روشنی میں شبلی کا یہ سفر نیک فال ثابت ہوا۔ ان کے سفر نامے نے

ممالک اسلامیہ کے صحیح خدو خال پہچاننے میں بڑی مدد کی۔ شبلی کی سیاحت کے مقاصد محدود ہونے کے باوجود دور س نتائج کے حامل تھے۔ غیر مسلم مورخین کی متعصبانہ اور تنگ نظرانہ روش نے انہیں فکر مند کر دیا تھا۔ مسلمانوں کے بارے میں منفی تشہیر کا اثر زائل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی زندگی کا وہ رخ بھی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے جو مغربی تاریخ نویس، سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جان بوجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں چنانچہ شبلی نے اسلام کی جلیل القدر ہستیوں کی سوانح عمریاں لکھنے کا فیصلہ کیا اور اس سلسلے میں ضروری مآخذات تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کرنے لگے۔ اس کوشش کے دوران انہیں بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ اسلامی تاریخ اور دنیائے اسلام کی قد آور شخصیتوں پر قابل اعتبار کام کرنے کے لئے ہندوستانی مواد ناکافی ہے۔ مطلوبہ مواد کی تنگ دامانی کے احساس نے شبلی کو اس خیال کی جانب متوجہ کیا کہ ممالک اسلامیہ کے کتب خانے ان کے مقصد کی تکمیل میں مدد و معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسی خیال کے زیر اثر انہوں نے رخت سفر باندھا اور ناسازی طبع کے باوجود طویل مسافت پر نکل کھڑے ہوئے سفر نامے کے آغاز میں لکھتے ہیں۔

> ”جس زمانے میں مجھ کو ہیروز آف اسلام کا خیال پیدا ہوا اسی وقت یہ خیال بھی آیا کہ ہمارے ملک میں جس قدر تاریخی سرمایہ موجود ہے وہ اس مقصد کے لئے کسی طرح کافی نہیں ہو سکتا۔ یہی خیال تھا کہ جس نے اول اول اس سفر کی تحریک دل میں پیدا کی۔ یہ یقین تھا کہ مصر و روم میں اسلامی تصنیفات کا جو بقیہ رہ گیا ہے ان سے ایک ایسا سلسلہ تصنیف ضرور تیار ہو سکتا ہے۔“
>
> (سفر نامہ روم و مصر و شام)

اس خیال کے باوجود سفر کے اسباب پیدا نہ ہو سکے اور نامساعد حالات نے شبلی کو مایوس کر دیا۔ ایک دن اچانک خبر ملی کہ مدرستہ العلوم میں فلسفے کے پروفیسر مسٹر آرنلڈ ولایت جانے والے ہیں۔ آرنلڈ شبلی کے استاد بھی تھے اور دوست بھی، ان کے ارادۂ سفر نے شبلی کے پست حوصلوں کو پھر بلند کیا اور عزم و ارادہ نے کروٹ لیکر پھر بیدار ہونے کا اعلان کر دیا۔

شبلی نے یوں اس سفر میں بنیادی مقاصد سفر کی تکمیل کے لئے علمی کاموں کی جانب ہی زیادہ توجہ اور وقت صرف کیا۔ قسطنطنیہ، بیروت بیت المقدس اور قاہرہ میں ہر قابل ذکر دار العلوم، مدرسہ، دار الاقامہ کتب خانہ اور درس تدریس و تعلیم و تعلم کے تمام

شعبوں کو بغور دیکھا۔ قابل دید مقامات اور مشہور عمارات کو بھی قریب سے دیکھنے اور جاننے کی کوشش کرتے رہے مگر صرف انہیں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مشہور اخبارات و رسائل کا تجزیہ کیا پاشاؤں اور ارباب اقتدار سے ملاقاتیں کیں اور عربوں اور ترکوں کے اخلاق و عادات کے بارے میں وسیع معلومات تفصیل کے ساتھ جمع کر کے ان تمام چیزوں کو اجاگر کر دیا جنہیں متعصب نے مورخین نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

شبلی نے رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ کے اپنے اس سفر میں جہاز کے واقعات بھی تفصیل سے لکھے ہیں۔ جب ان کا جہاز بمبئی سے روانہ ہو کر سمندر کے سینے کو چیرتا ہوا آگے بڑھتا ہے تو ان کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ متلی اور سر میں درد کی وجہ سے طبیعت میں سخت بے کیفی اور اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اور دو دن غشی کی حالت میں گزرتے ہیں لیکن پھر رفتہ رفتہ طبیعت بحال ہونے لگتی ہے اور مزاج معمول پر آجاتا ہے یہاں تک کہ سفر میں لطف آنے لگتا ہے اور نشاط کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد پیش آنے والے تمام سمندری واقعات شبلی مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ اس متعصب اسپینی عیسائی کا قصہ بھی سناتے ہیں جو مسٹر آرنلڈ کے عربی پڑھنے پر بہت جلتا تھا اور عربی کو اونٹوں کی زبان کہہ کر تحقیر آمیز انداز میں نہایت برے لہجے کے ساتھ عربی حروف کو ادا کرتا تھا۔ شبلی کو اس کی ان حرکتوں سے بڑا رنج ہوتا مگر غریب الوطنی کی مجبوری میں خاموشی اور برداشت کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ شبلی کو عربی زبان اور عربوں سے جذباتی لگاؤ تھا۔ یہ محبت اور جذباتی لگاؤ یوں تو ہر مسلمان کی میراث ہے اور ہر دل میں پایا جاتا ہے لیکن شبلی عربی زبان کے عالم بھی تھے اس لیے وہ اس زبان کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف تھے اسی طرح انہیں عربوں سے بھی بڑی محبت تھی جس قوم میں آقائے نامدار مبعوث ہوئے وہ یقیناً عزت و محبت کی مستحق ہے عربوں سے شبلی کی محبت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب ان کا جہاز عدن کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو سمالی قوم کے بہت سے لڑکے ڈونگیوں میں سوار ہو کر جہاز کے قریب آگئے اور جہاز والوں سے کچھ پانے کے لئے نہایت مبتذل اور بے ہودہ حرکتیں کرنے لگے۔ جہاز کے مسافر دونی چونی سمندر میں پھینک دیتے تو وہ فوراً غوطہ لگا کر انہیں نکال لاتے۔ مسافر یہ تماشا دیکھ کر محظوظ ہوتے رہے لیکن شبلی افسردہ ہو گئے۔ عرب قوم کی یہ حالت دیکھ کر ان کا دل بھر آیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بعد میں جب یہ

معلوم ہوا کہ سالی قوم عرب نہیں تب جی کا بوجھ ہلکا ہوا۔

ابتدائی دو چار دنوں کے علاوہ شبلی اس سفر میں صحت مند اور خوش و خرم نظر آتے ہیں البتہ جہاں کوئی بے اصولی ناانصافی اور جانبداری دیکھتے ہیں یا کوئی بات ان کی مرضی مزاج اسلامی اصول و روایات کے منافی نظر آتی ہے۔ اسلامی تہذیب و اخلاق کا زوال دکھائی دیتا ہے تو انہیں گہرا صدمہ پہنچتا ہے اور وہ اپنی تکلیف کا برملا اظہار کر دیتے ہیں۔ دوران سفر پیش آنے والی سفری صعوبتوں کی انہوں نے قطعی پرواہ نہیں کی اور ایک سچے سیاح کی طرح ہر پریشانی کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ اسی کے ساتھ مناظر سفر کی تمام تفصیلات کو ذہن میں محفوظ کر لیا اس خوبی نے ان کے سفر نامے کو معلومات کا بیش بہا خزانہ بنا دیا۔ عمارتوں کا حال ہو یا افراد کا ذکر، قابل دید مقامات کی سیر ہو یا دارالعلوم کے قواعد و ضوابط، انہوں نے ہر چیز کو زبان عطا کر دی ہے۔ قسطنطنیہ کی عمارتوں کا ذکر ایک مقام پر اس طرح کرتے ہیں:

"یہاں کی عمارتیں ہندوستانی عمارتوں سے بالکل جدا وضع کی ہیں مکانات عموماً سہ مزلہ چو منزلہ ہیں۔ صحن مطلق نہیں ہوتا۔ عمارتیں تمام لکڑی کی ہیں۔ بڑے بڑے امرا اور بادشاہوں کے محل بھی لکڑی ہی کے ہیں اور یہی سبب ہے کہ یہاں اکثر آگ لگتی ہے، کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ خالی نہیں جاتا کہ دو چار گھر آگ سے جل کر تباہ نہ ہوں اور کبھی کبھی تو محلے کے محلے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔ آگ بجھانے کے لئے سلطنت کی طرف سے نہایت اہتمام ہے کئی سو آدمی خاص اس کام پر مقرر ہیں، ایک نہایت بلند مینارہ بنا ہوا ہے جس پر چند ملازم ہر وقت ..جود رہتے ہیں کہ جس وقت کہیں آگ لگتی دیکھیں فوراً خبر کریں، اس قسم کے اور بھی چھوٹے چھوٹے منارے جابجا بنے ہوئے ہیں جس وقت کہیں آگ لگتی ہے فوراً توپیں سر ہوتی ہیں اور شہر کے ہر حصے سے آگ بجھانے والے ملازم تمام آلات کے ساتھ موقع پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کو حکم ہے کہ بے تحاشہ دوڑتے جائیں یہاں تک کہ اگر کوئی راہ چلتا ان کی جھپٹ میں آکر پس جائے تو کچھ الزام نہیں۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ پتھر کی عمارتیں کیوں نہیں بنتیں، معلوم ہوا کہ سردی کے موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور

تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے۔"

(سفر نامہ روم و مصر و شام)

قسطنطنیہ کی آب و ہوا اور پھلوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"آب و ہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے۔ جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے۔ گرمیوں کا موسم جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا اس قدر خوشگوار ہے کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ ہمارے یہاں کے امراشملہ اور نینی تال کے بجائے قسطنطنیہ کا سفر کیوں نہیں کرتے۔ پانی پہاڑ سے آتا ہے اور نہایت ہاضم اور خوشگوار ہوتا ہے۔ ہر قسم کے میوے کثرت سے ہیں اور خصوصاً انگور و خربوزہ بے مثل ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے خربوزے لطافت میں تو شاید بڑھ کر ہوں لیکن شیرینی میں یہاں کے خربوزوں کی برابری نہیں کر سکتے۔ امرود جس کو اہل عرب "انجاس" کہتے ہیں عجیب مخروطی شکل کے ہوتے ہیں۔ رنگ میں تو نہیں لیکن صورت میں گاجروں سے مشابہ، مگر نہایت شیریں اور لذیذ سیب کابل کے سیب سے بڑے اور زیادہ شیریں۔ ایک میوہ یہاں ہوتا ہے جس کو "مشمش" کہتے ہیں اور ہمارے یہاں کی جامن سے کچھ مشابہ ہے۔ ہر قسم کے میوے نہایت ارزاں ہیں۔ انگور ۲ سیر تک آتے ہیں۔ سیب نہایت عمدہ پیسے کے دو۔"

(سفر نامہ روم و مصر و شام صفحہ ۳۴)

شبلی کے سفر نامے کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر اگر کوئی شخص اس عہد کے روم و مصر و شام میں قدم رکھتا تو اسے ہر چیز مانوس جانی پہچانی سی معلوم ہوتی۔ معلومات کا ایک ذخیرہ ہے جو نہایت خوبی کے ساتھ قاری کے دل و دماغ میں منتقل ہو جاتا ہے۔ باشندگان قسطنطنیہ کی وضع قطع ملاحظہ کیجئے۔ اور دیکھئے کہ یہ تہذیب یورپ سے کس قدر نزدیک ہے۔

"لباس اور وضع بالکل یورپین ہے۔ ظاہری ہیئت سے کسی شخص کا مسلمان یا عیسائی ہونا معلوم نہیں ہو سکتا۔ لال ٹوپی جو ترکوں کا امتیازی نشان ہو سکتا تھا۔ عیسائی اور یہودی سبھی استعمال کرتے ہیں اور اس وجہ سے دونوں

قوموں میں امتیاز کا کوئی ذریعہ نہیں تعجب یہ ہے کہ یہاں مذہبی گروہ یعنی علما اور مدرسین بھی یورپ کے اثر سے نہیں بچے، ان کے پائجاموں میں پتلون کی طرح بٹن ہوتے ہیں، صرف یہ فرق ہے کہ اوپر گھیر ہوتا ہے اور خوبصورتی کے ساتھ چینٹس ہوتی ہیں۔ کرتہ اور اچکن کے بجائے صرف واسکوٹ ہوتا ہے۔ واسکوٹ کے اوپر عبا پہنتے ہیں اور یہی امتیازی علامت ہے جو ان کو اور گروہ کے آدمیوں سے الگ کرتی ہے۔ اس میں یورپ کا یہ اثر ہے کہ عبا کے تکمے نہیں لگاتے اور سامنے سے واسکوٹ کھلا رہتا ہے۔ ترکی ٹوپی عموماً یہ لوگ بھی استعمال کرتے ہیں لیکن اس پر سفید کپڑے کی ایک دھجی لپیٹ لیتے ہیں جس کو عربی میں ''لفہ' کہتے ہیں اور وہ اہل علم کی خاص علامت خیال کی جاتی ہے۔''

(سفر نامہ روم و مصر و شام)

شبلی نے ہر چیز کا اس قدر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ کسی دار العلوم، مدرسہ یا بورڈنگ کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس میں داخلے کی شرائط، تعلیم کا طریقہ، نصاب تعلیم، فیسیں دارالاقامہ کی زندگی، قیام وطعام کے اصول وضوابط، کھیل کود، لباس کتابیں، معیار تعلیم اور تعلیم کے اختتام پر حاصل ہونے والی ملازمت تک تمام معمولات و معاملات کا بھرپور تعارف کرا دیتے ہیں۔ جب وہ ترکی کے اقامتی تعلیمی اداروں کے بورڈنگ کا ذکر کرتے ہیں تو ان کے نظم و ضبط کو دیکھ کر رشک آتا ہے اور اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ آج سے سو سال قبل ترکی میں بورڈنگ سسٹم نے کیونکر اتنی ترقی کر لی تھی جبکہ ایسی بہت سی چیزیں ہمارے ہوسٹلوں میں آج تک رائج نہ ہوسکیں قسطنطنیہ میں مکتب حربیہ اور دوسرے کالجوں کے طلبا کھانے کی میز پر جس خوش اسلوبی، صفائی اور تہذیب و شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں وہ قابل تعریف ہی نہیں قابل تقلید بھی ہے۔ مکتب حربیہ میں ڈائننگ ہال کا ایک منظر دیکھئے۔

''جب ہم کمرے کے اندر داخل ہوئے تو تمام لڑکے میز پر بیٹھ چکے تھے۔ ہال نہایت وسیع اور خوبصورت اور چھت پر طلائی کام تھا۔ دو تین قسم کے کھانے تھے اور ترکی طریقے کے مطابق چار چار لڑکوں کے بیچ میں ایک قاب تھی،

چھری کانٹے نہ تھے صرف چمچے تھے لیکن لڑکے کھاتے اس خوش سلیقگی سے
تھے کہ نہ کسی کا ہاتھ بھرتا تھا نہ میز کی چادر پر کہیں دھبہ پڑ سکتا تھا۔"

(سفر نامہ روم و مصر و شام)

شبلی ان لڑکوں کی خوش سلیقگی دیکھ کر یہاں بہت خوش نظر آتے ہیں لیکن جب مصر میں، جامعہ ازہر، کے طالب علموں کو بازار میں لائن لگا کر روٹی حاصل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انہیں شدید تکلیف پہنچتی ہے اور وہ برملا کہہ اٹھتے ہیں۔

"مجھ کو اپنے تمام سفر میں جس قدر جامعہ ازہر کے حالات سے مسلمانوں کی بدبختی کا یقین ہوا کسی چیز سے نہیں ہوا۔ ایک ایسا دارالعلوم جس میں دنیا کے ہر حصے کے مسلمان جمع ہوں جس کا سالانہ خرچ دو تین لاکھ سے کم نہ ہو، جس کے طلبا کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو اس کی تعلیم و تربیت سے کیا کچھ امید ہو سکتی ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ بجائے فائدہ پہنچانے کے لاکھوں مسلمانوں کو برباد کر چکا ہے اور کرتا جاتا ہے۔ تربیت و معاشرت کا جو طریقہ ہے اور جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں اس سے حوصلہ مندی، بلند نظری جوش و ہمت غرض تمام شریفانہ او صاف کا استیصال ہو جاتا ہے۔"

(سفر نامہ روم و مصر و شام)

دراصل تعلیم سے متعلق شبلی کا زاویہ نظر یہ تھا کہ مسلمان طلبا کو جدید مغربی علوم وافکار سے ضرور استفادہ کرنا چاہئے مگر یہ کام مشرقی تعلیم و تہذیب کے عوض نہیں ان کے اشتراک سے ہونا چاہئے، ان کے نزدیک مغرب کے علوم جدیدہ اور مشرق کی روایتی تعلیم و تربیت دونوں ہی کا حصول ازبس ضروری ہے مسلمان مشرقی علوم سے ناواقف و ناآشنا ہو گا تو اسلامی روح کی حفاظت نہیں کر سکتا وہ لکھتے ہیں۔

"میرا یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبے تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی بے شبہ مشرقی تعلیم کی موجودہ اسکیم جو ہے وہ نہایت ابتر اور غیر

ضروری ہے لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔"

(سفر نامہ روم و مصر و شام)

شبلی نے اپنے سفر اور سفر نامہ لکھنے کے مقاصد کو ابتدا ہی میں واضح کر دیا ہے اور صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اس سفر کا مقصد اسلامی ممالک کو دیکھنے کی خواہش کے علاوہ ہیروز آف دی اسلام کے لئے مواد فراہم کرنا تھا۔ وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے۔ ترکی شامی اور مصری کتب خانوں سے انہیں اپنے مطلب کا خاصا مواد مل گیا۔ "الفاروق" کے لئے مواد تلاش کرتے ہوئے انہیں عربی کے بہت سارے نایاب اور کم یاب رسائل، کتب اور مخطوطات دیکھنے کا موقع ملا جن کا مطالعہ کرتے ہوئے انہوں نے اعتراف کیا کہ یہ کتابیں کسی اور لائبریری میں نہیں دیکھیں۔ اس طرح شبلی نے علم کی پیاس بجھانے کے لئے سفر کی صعوبتیں برداشت کیں، اور اردو زبان کو نایاب کتابوں سے سرافراز کیا روم و مصر و شام کے علمی خزانوں سے اکتساب فیض کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی ملکوں کی سیر کرنا بھی شبلی کا مقصود سفر تھا حالانکہ ایک غلام ملک کا باشندہ ہونے کی وجہ سے ان کی کچھ مجبوریاں بھی تھیں مگر وہ اسلامی ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کی معاشرت، تہذیب، تمدن طرز فکر اور طرز زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے خواہش مند تھے تاکہ اپنے وطن کے لوگوں خصوصاً مسلمانوں کو اسلامی ملکوں کی زندگی سے واقف کرا سکیں۔ وہ مسلمانوں کو اسلاف کے کارنامے یاد لا کر ان میں سربلندی حوصلہ مندی اور احساس تفاخر پیدا کرنا چاہتے تھے مگر افسوس کہ شبلی مسلم ممالک سے جو امیدیں باندھ کر گئے تھے وہ پوری نہ ہو سکیں۔ شبلی ان ممالک اسلامیہ کو علم و فضل، تعلیم و تربیت، نظم و ضبط اخلاق آداب اور شعائر اسلامی کی جن منزلوں پر دیکھنا چاہتے تھے وہاں دور دور تک ان کا پتہ نہ تھا۔ ان ملکوں پر اگرچہ مسلمانوں کی حکومت تھی مگر تہذیب و تربیت اور فکر و نظر میں یورپ کے تابع فرمان ہوتے جا رہے تھے شبلی نے ہر جگہ مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا ماتم کیا ہے۔ مشرقی تعلیم کی اسلامی روح جسے شبلی تلاش کرتے ہیں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔ لیکن دل و دماغ پر فرانس اور انگلستان کا قبضہ ہے مسلمانوں کی معاشی حالت بھی مقابلتاً کمزور ہے شبلی نے سیاسی حالات پر اگرچہ براہ راست روشنی نہیں ڈالی مگر ان کے سفر نامے سے

مسلمانوں کی مختلف معاشی اور معاشرتی کمزوریوں اور مسلم ممالک کی سیاسی صورت حال کے غیر مستحکم اور کمزور ہونے کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے البتہ ان تمام مایوس کن حالات کے باوجود ایک یہ احساس کہ ترکی اور مصر میں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں ایک مسلم کو فخر و مسرت کے جذبات سے ہم کنار کرنے کے لئے کافی تھا یہ خیال کہ وہ جن لوگوں کے درمیان میں ہے مسلمان ہیں اور جس سرزمین پر چلتا پھرتا ہے مملکت اسلامیہ کی سرزمین ہے مسلمان کے لئے فطری طور پر اطمنان بخش ہوتا ہے۔ یہی خیال شبلی کے لئے بھی طمانیت قلب کا وسیلہ تھا قسطنطنیہ سے واپسی پر شیخ طاہر مغربی سے ملاقات کی غرض سے شبلی نے بیروت میں قیام کیا۔ بیروت علمی ترقی کے اعتبار سے شام کا ایک اہم مرکز تھا۔ شبلی یہاں بھی اپنے مقصد علمی سے غافل نہیں ہوئے۔ جب تک قیام کیا کتابوں کے متلاشی رہے۔ شبلی بیروت کی ترقی سے بہت متاثر ہیں۔ مگر کچھ ذہنی تحفظات کے ساتھ لکھتے ہیں۔

> "بیروت میں علمی ترقی اگرچہ تھوڑے زمانے سے شروع ہوئی لیکن جس تیزی سے یہ شہر ترقی کر رہا ہے اور ترقی کی بلندی پر جس حد تک آج پہنچ چکا ہے اس کے لحاظ سے تمام ممالک اسلامیہ میں قسطنطنیہ کے سوا کوئی شہر اس کا ہمسر نہیں ہے اور بعض خصوصیتوں میں تو اس کو قسطنطنیہ پر ترجیح ہے۔"
>
> (سفر نامہ روم و مصر و شام)

ایک جگہ بیروت کے تعلیمی اداروں کا جائزہ لیتے ہوئے طلبا کے معیار و مقدار کا تجزیہ کرتے ہیں۔

> "مسلمان طالب علموں کی تعداد فی نفسہٖ کم ہے لیکن یہ امر اور بھی زیادہ افسوس کے قابل ہے کہ اس تعداد میں بھی زیادہ تر ادنی درجے کی تعلیم والے شامل ہیں ورنہ اعلی تعلیم کے لحاظ سے ان کی تعداد اس قدر کم ہے کہ گویا کچھ بھی نہیں۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ یہ شہر اسلامی حکومت کا مرکز اور مسلمانوں اور عیسائیوں میں یہاں حاکم و محکوم کی نسبت ہے تاہم تہذیب و تمدن میں مسلمانوں کو عیسائیوں سے کچھ نسبت نہیں"
>
> (سفر نامہ روم و مصر و شام)

شبلی نے اسلامی ممالک کو اجنبی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ معلوم ہوتا ہے وہ ہر مقام

کو چشم تصور میں پہلے ہی دیکھ چکے تھے اور اب پہچاننے کی کوشش کی کر رہے تھے۔ کہیں کسی ایسی چیز کو تلاش کرتے نظر آتے ہیں جو انہوں نے پہلے کبھی دیکھی تھی مگر اب نظر نہیں آتی۔ کبھی کسی چیز کو دیکھ کر ایک دم کھل اٹھتے ہیں، مسرت سے ان کا چہرہ تمتمانے لگتا ہے۔ کہیں افسردگی چھا جاتی ہے۔ کہیں فخر سے سینہ تن جاتا ہے کہیں مایوسی کے سائے گہرے ہو جاتے ہیں لیکن مایوسی اور افسردگی کی کیفیت بہر حال عارضی ہوتی ہے۔ خوش ہونے کے مواقع زیادہ ہیں۔ ترکوں کے حالات پیش کرتے ہوئے شبلی زیادہ شاداں و فرحاں نظر آتے ہیں ان کے قلم نے قسطنطنیہ کے در و دیوار اور ترکوں کی طرز معاشرت زبان و بیان، عادات و اطوار، اخلاق و معاملات، تعلیم و تربیت، خوش خلقی، فیاضی اور مہمان نوازی کی ایسی دلآویز تصویر کشی کی ہے کہ پوری قوم آنکھوں کے آگے چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ اسلامی ملک ہونے کی وجہ سے قسطنطنیہ کے مسلمانوں سے ان کا جذباتی رشتہ ہے وہاں کی ہر چیز انہیں اچھی لگنا چاہتی ہے اور شبلی دل کھول کر تعریف بھی کرتے ہیں جہاں خامیاں ہیں اور بہت زیادہ ہیں شبلی ان کے اظہار میں بھی کوئی رعایت نہیں کرتے ہاں افسوس ضرور کرتے ہیں۔ دوسری قوموں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا بڑے دکھ بھرے انداز میں ذکر کرتے ہیں انہیں علم و فن سے مسلمانوں کی بے رغبتی پر نہایت ملال رہتا ہے۔ بیروت ہی کے بیان میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> "علم یہاں ذریعہ دولت نہیں تاہم اس علاقہ میں کثرت سے اہل علم اور مصنفین پیدا ہوئے اور اب بھی موجود ہیں۔ خاص لبنان کے علماؤ شعرا کے حال میں ایک مستقل کتاب لکھی گئی ہے لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ یہ تمام علمی ترقی اور تصنیف و تالیف جو کچھ ہے عیسائیوں کے ساتھ مخصوص ہے، مسلمان ان چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے۔"
>
> (سفرنامہ روم و مصر و شام)

مندرجہ بالا اقتباس شبلی کی غیرت قومی کا آئینہ دار ہے۔ ایک اسلامی ملک میں مسلمانوں کی اس عبرتناک تعلیمی غفلت اور پسماندگی پر شبلی ایک غیور مسلمان کی حیثیت سے افسوس ندامت اور شرمندگی محسوس کرتے ہیں اور یہ ندامت اور افسوس مسلمانوں سے ان کی ذہنی وابستگی کا گہرا ثبوت ہے۔

شبلی نے جس دور میں ترکی کا سفر کیا ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور انگریز حکومت کے تعلقات ترکی کے ساتھ اچھے نہیں تھے لیکن شبلی نے ترکی کے خلاف یہودی اور عیسائی مورخین کی پیدا کردہ بہت سی غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کا پردہ فاش کردیا اور ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں ترکوں کی محبت کو پھر سے زندہ کردیا۔ ترکوں کے تمدنی حالات اور طرز معاشرت کو شبلی نے اس خوبی سے بیان کیا کہ ان کی اہمیت اور عظمت رفتہ کی یاد تازہ ہو گئی۔ انہوں نے اپنے جذبات و تاثرات کو چھپانے کی کہیں کوشش نہیں کی، جہاں جیسا محسوس کیا بیان کردیا شبلی ترکوں کی طرز حیات سے خوش ہوتے ہیں تو ان کی شائستگی اور خوش سلیقگی خوش خلقی اور فیاضی کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ترکوں کے اخلاق نہایت وسیع اور فیاضانہ ہیں غرور و نخوت ترفع اور کم بینی ان میں نام کو نہیں ہے۔ امیر و غریب، مزدور و عہدیدار جاہل و عالم ہر درجے کے لوگوں سے مجھ کو سابقہ پڑا لیکن خوش اخلاقی اور فیاض طبعی میں گویا سب ایک ہی مکتب کے شاگرد اور ایک ہی سانچے کے ڈھلے ہوئے تھے۔"

(سفر نامہ روم و مصر و شام)

مگر جب یورپین تہذیب کی بے راہ روی اور مسلمانوں میں تعلیم سے بے رغبتی سے ناخوش اور دل برداشتہ ہوتے ہیں تو اپنی ناراضگی اور تکلیف کا برملا اظہار کردیتے ہیں۔ جس کی کئی مثالیں اس مضمون میں موجود ہیں۔

زبان و بیان کے لحاظ سے علامہ شبلی کا ایک بڑا کمال یہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں اس خوبی سے کہہ گزرتے ہیں کہ ہر بات قاری کے دل و دماغ میں بیٹھ جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح جیسے وہ پڑھ نہیں رہا بلکہ ہر منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے شبلی کے عام انداز بیان میں رنگینی اور شگفتگی ہے لیکن سفر نامہ سادہ سلیس سنجیدہ اور متین بیانیہ انداز میں لکھا گیا ہے جزئیات نگاری اور مرقع کشی کا یہ عالم کہ پڑھنے والا (بشرطیکہ موضوع سے واقفیت اور دلچسپی رکھتا ہو) تحریر کے ساتھ معنی کی طرح بہا چلا جاتا ہے مگر سحر زدہ ہو کر نہیں ہوش و حواس کے ساتھ۔ زبان و بیان کا یہ انداز سفر نامے کے علمی اور ادبی وقار میں مزید اضافہ کرتا ہے۔

○

بھوپال اور "بھوپال ادب کے آئینے میں"

انتظار کے ایک طویل ذہنی سفر کے بعد بھوپال کو آخر اپنی مٹی کا بنا ہوا ایک ایسا شخص مل ہی گیا جس نے اس کی ادبی حیثیت اور اہمیت کو منکشف کرنے اور کرتے رہنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر محمد نعمان خاں کی تازہ کتاب "بھوپال ادب کے آئینے میں" شہر غزل بھوپال کے اسی دیرینہ خواب کی تعبیر نو کی صورت میں منظر عام پر آئی ہے۔

ان تمہیدی کلمات کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ بھوپال پر تاحال کسی نے کچھ لکھا ہی نہ تھا یا جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بے وقعت اور کم معیار ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جھیلوں اور گھاٹیوں کے اس خوبصورت شہر پر لکھی ہوئی مختلف اور متفرق تحریروں کو یکجا کیا جائے تو ایک ایسا دفتر تیار ہو سکتا ہے جس سے کئی کتابیں عالم وجود میں آجائیں گی مگر جہاں تک بھوپال کے اردو ادب کا تعلق ہے یہ انفرادی کاوشیں ہنوز غیر مربوط اور منتشر اوراق کی صورت میں یہاں وہاں بکھری پڑی ہیں جنہیں کسی نے یکجا کرنے کی آج تک سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ غیر بھوپالی مشاہیر اردو کے بھوپال سے تعلق کے حوالے سے کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے۔ اول الذکر مضامین کا غالب حصہ سرسری طور پر لکھی ہوئی غیر تحقیق شدہ تحریروں یا ذاتی قسم کی پسند و ناپسند کے جذباتی اظہار پر محیط ہے اس سلسلے کی پہلی مبسوط اور مربوط کاوش کے لئے پروفیسر سلیم حامد مرحوم کا نام نامی بھوپال کی ادبی تاریخ میں یادگار رہے گا اس میں شک نہیں کہ ان کی کتاب نے بھوپال کے ادب کو مجتمع کرنے میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی۔ انکی کتاب حوالے کی کتاب ہے مگر بھوپال کے ادب کو مجتمع کرنے میں انہوں نے جس مبالغہ آمیزی اور مروت نگاری سے کام لیا ہے اس کی وجہ سے یہ کتاب ادب سے زیادہ ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع بن گئی ہے اور اس قدر رطب و یابس کا شکار ہو گئی ہے کہ اس آئینہ خانے میں کم و بیش سبھی کے

چہرے ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ کچھ اور مضامین بھی ہیں جن میں استاد محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کا نام بہت اہم ہے ان مضامین میں تحقیق کے مطالبات کو پورا کرنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے لیکن ان مضامین کے خالق دسنوی صاحب جیسا کہ نام سے بھی ظاہر ہے دسنہ (بہار) کے رہنے والے ہیں۔ ہر چند کہ انہوں نے بھوپال کو اپنا وطن بنالیا ہے اور مستقلاً یہیں قیام پذیر ہوگئے ہیں مگر ان کے خمیر میں بہر حال اپنے وطن کی فطری بو باس ہے۔

ڈاکٹر محمد نعمان خاں کا خمیر چونکہ بھوپال ہی کی مٹی سے اٹھا ہے اس لئے یہی وہ پہلے شخص نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنے وطن کے اردو ادب کو ہر زاویے سے جانچنے اور پرکھنے کی سنجیدہ اور مسلسل کوشش کا پراعتماد آغاز کیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے معیاری اردو رسائل و جرائد میں ان کے کئی مضامین شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی تحریر میں تحقیق کی بردباری بھی ہے اور عرق ریزی بھی۔ غیر ضروری باتوں سے احتراز کرتے ہیں اور صرف عبارت میں وزن پیدا کرنے والے واقعات و دلائل سے سروکار رکھتے ہیں۔ الفاظ کا غیر ضروری استعمال بھی انہیں پسند نہیں۔ تحقیق و تنقید کی زبان میں یہ شیوۂ احتیاط ان کی فہم و فراست کے ماسوا اعتبار کی راہ سے بھی ان کے حق میں مفید ثابت ہو رہا ہے۔ بھوپال اور اردو ادب کے تعلق سے انہوں نے جو مضامین سپرد قلم کئے ہیں ان میں اگر راجہ بھرتری۔ نواب جہانگیر محمد خاں دولہ نواب یار محمد خاں شوکت حکیم اصغر حسین خاں اصغر اور سہا مجددی جیسے بھوپال سے براہ راست تعلق رکھنے والے بلند پایہ ادیب و شاعر موجود ہیں تو اس سرزمین سے بالواسطہ طور پر گہرے روابط اور تعلق خاطر رکھنے والے دانشور اور سرسید اقبال اور شبلی جیسے عالمی شہرت یافتہ مفکرین بھی شامل ہیں۔ موضوعات کی رنگارنگی میں یک رنگی کی صورت یہ ہے کہ ان ناموران علم و ادب کی زندگی کے انہیں پہلوؤں کو فوکس کیا گیا ہے جن کا تعلق بھوپال سے ہے۔

''بھوپال ادب کے آئینے میں'' ڈیڑھ سو صفحات کی کتاب ہے جسے مکتبہ جامعہ نے اپنی روایت کے مطابق نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے لئے مصنف کو مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کا جزوی مالی تعاون بھی حاصل ہے محمد نعمان خان نے اپنی اس کتاب میں صرف دس مضامین شامل کئے ہیں حالانکہ ان کے پاس ابھی

تقریباً اتنے ہی مضامین (اس تحقیقی مقالے کے علاوہ جس پر برکت اللہ یونورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے) اور موجود ہیں اور ان کا قلم مضامین نو کے انبار لگانے میں مصروف ہے۔ حسن اتفاق سے محمد نعمان خاں کے تحقیقی مقالے کا موضوع بھی وہی بھوپال ہے جو ان کے مضامین میں بکھر کر یکجا ہو رہا ہے فی الحال وہ اپنے وطن کا حق فرض کفایہ کے طور پر ادا کر رہے ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب ادا کر رہے ہیں۔ بھوپال کی ریاست ہر زمانے میں منتخب روزگار کی ریاست رہی ہے۔ اس کے جغرافیائی محل وقوع نے جہاں اسے قدرت کی فیاضیوں سے مالا مال کر کے جنت نظیر بنا دیا ہے وہیں تاریخی اعتبار سے بھی اس کی آبادیوں کا مادی اور علمی تمول نا قابل فراموش ہے اس سرزمین نے جب مسلم فرماں رواؤں کو اپنی عظمت کا نگہبان اور امین مقرر کیا تو اس کے علمی ادبی اور تعلیمی سرمائے میں قابل لحاظ اضافہ ہوا۔ آج دنیا میں خواتین کے حقوق کا بڑا شہرہ ہے۔ خواتین کو بعض حکومتوں کی سربراہی سونپ کر یہ سمجھا جا رہا ہے گویا یہ سب عہد حاضر کا کارنامہ ہے جبکہ آج سے بہت پہلے سلطنت بھوپال میں کئی خواتین سربراہ سلطنت ہوئیں اور انہوں نے اپنے عہد حکومت میں ترقی و کامرانی کی ایسی روشن نظیریں قائم کیں کہ آج کے نام نہاد ترقی یافتہ دور میں بھی ان کی مثالیں مشکل سے ملیں گی۔ ان مطلق العنان حکمران خواتین کا عہد بھوپال کا عہد زرین کہا جاتا ہے۔ ان بلند حوصلہ وسیع القلب اور روشن خیال خواتین حکمرانوں کی علم دوستی کا یہ عالم تھا کہ متحدہ ہندوستان میں کسی اہم علمی۔ ادبی۔ سیاسی اور سماجی شخصیت کا نام یاد کیجئے کسی نہ کسی واسطے سے اسے آپ بھوپال میں پائیں گے۔ نواب صدیق حسن خاں کو تو بھوپال نے وہ داد علم دی کہ والی ریاست نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ نے ان سے عقد فرما لیا اور ایک وہی کیا شبلی جب سیرۃ النبی کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں بھوپال یاد آ جاتا ہے۔ علیہ حضرت نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ کی تعریف و توصیف میں شبلی کا مشہور قطعہ بہتوں کو یاد ہوگا۔ اپنے پیش رو فرماں روایان بھوپال کی علمی روایات کو آخری فرماں روا نواب حمید اللہ خاں نے نہ صرف باقی رکھا بلکہ وسعت بھی دی۔ مولانا محمد علی جوہر جامعہ چھوڑ کر نکلتے ہیں تو سیدھے اپنے داماد شعیب قریشی کے پاس بھوپال پہنچتے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی ایک زمانے میں یہیں قیام فرما نظر آتے ہیں سر سید کے پوتے سر راس مسعود علی گڑھ سے نالاں ہوتے ہیں تو بھوپال آ جاتے ہیں اور بھوپال میں انہیں وہ عزت اور سکون ملتا ہے جو ان کی زندگی کا

حاصل ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری بھوپال میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں سید سلیمان ندوی
تو یہاں کے مفتی اور قاضی ہیں اور سلیمانیہ مسجد آج بھی ان کی یادگار کے طور پر بھوپال میں
موجود ہے۔ جہاں تک اقبال کا تعلق ہے موجودہ ہندوستان میں کوئی اور شہر ایسا نہیں جو
بھوپال سے زیادہ اقبال کی میزبانی کا دعویدار ہو، "ریاض منزل" اور "شیش محل" آج بھی ان
کی یاد میں سرشار نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد نعمان خاں نے اپنی کتاب میں اسی بھوپال کو اردو ادب کے آئینے میں
دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں
نے نہایت اہم موضوعات پر داد تحقیق دی ہے۔ کتاب کا پہلا مضمون "بھوپال ایک تصویر دو
رخ" اس اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں جہاں بھوپال کی خوبیوں کا بیان ہے وہیں اس کی
خامیوں اور کمزوریوں پر بھی بے لاگ تبصرہ کیا گیا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس سے
تعلق خاطر ہوتا ہے اسکی خامیوں سے صرف نظر کر دیتا ہے۔ محمد نعمان خاں نے بھوپال سے
تعلق کے باوجود دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرنے کی سعی کی ہے۔

ریاست بھوپال کا پہلا صاحب دیوان فرماں روا نواب جہانگیر محمد خاں دولہ محمد نعمان
خاں کے ان تحقیقی کارناموں میں سے ہے جسے ادبیات بھوپال میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اسی
قبیل کے مضامین میں "بھوپال کا پہلا اردو تذکرہ ۔ تذکرہ فرح بخش" "بھوپال کا پہلا اردو
اخبار "عمدۃ الاخبار" بھوپال کا ایک اہم اور منفرد تذکرہ شبستان عالمگیری" دیوان غالب
کی ایک نادر شرح مطالب الغالب اور سہا مجددی" اور "مکاتیب رشید احمد صدیقی اور تخلص
بھوپالی" جیسے تحقیقی شہ پارے شامل ہیں مصنف کا خون خشک کرنے والے باقی ماندہ مضامین
مثلاً "بھوپال میں اردو افسانہ آزادی کے بعد" "بھوپال میں اردو نظم آزادی کے بعد
"مدھیہ پردیش میں اردو صحافت۔ ایک جائزہ" وغیرہ بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔ ثانی الذ
تجزیاتی مضامین اس معیار کے نہیں جو اول الذکر مضامین میں قائم کیا گیا ہے۔ اس عمل
اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار کا مزاج تنقید کی بہ نسبت تحقیق سے زیادہ گہری مناسبت
مطابقت رکھتا ہے۔ تحقیق کے دشوار گزار مراحل کو انہوں نے نسبتاً زیادہ آسانی اور
ریزی سے سرانجام دیا ہے۔ دوسری قسم کے مضامین کا تعلق عصری ادب سے ہے او
عصروں پر کچھ لکھنے لکھانے میں بڑی ذہنی اذیتوں اور کلفتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ

خون خشک کر دینے والا کام ہے اس راہ میں کئی ایسی دشواریاں آتی ہیں جن سے عہدہ بر آ ہونا بے مروتوں کے لئے بھی آسان نہیں پھر محمد نعمان خاں تو بڑے بامروت، اور شریف النفس انسان ہیں۔ شرافت اور مروت کے انہیں کمزور پہلوؤں کی وجہ سے شاید انہوں نے بھوپال کے ایک اہم بلکہ سر فہرست موضوع پر لکھنے سے گریز کیا ہے۔ بھوپال کو ''شہر غزل'' کہا جاتا ہے بھوپال کے کل شعری سرمائے کا نوے پنچانوے فیصد حصہ غزلوں پر مشتمل ہے مگر اس کتاب میں غزل کے تعلق سے ایک بھی مضمون نہیں ہے گمان غالب ہے کہ محمد نعمان خاں اس کتاب کی پذیرائی سے اعتماد حاصل کر کے نئے حوصلے اور نئی توانائی کے ساتھ اس میدان میں نمودار ہوں گے اس خوش گمانی کو یوں تقویت ملتی ہے کہ ان کے تحقیقی مقالے میں سارے غزل گو ''غزل در بغل'' موجود ہیں انکا کہنا ہے کہ یہ موضوع چونکہ زیادہ طویل ہے اس لئے ایک مختصر سے مضمون میں اس کی وسعتوں کا احاطہ ممکن نہیں ایک مضمون اس موضوع کے بے شمار مطالبات کا حق ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اس لئے وہ اسے ایک طویل مقالے کی شکل دیکر علیحدہ کتابی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ کتاب کا نام بھی اپنی اولین کتاب کے نام کی مناسبت سے ''بھوپال غزل کے آئینے میں'' رکھ لیا ہے، جب بات یہاں تک آن پہنچی ہے تو ہمیں مان لینا چاہئے کہ وہ اس موضوع پر لکھیں گے اور خوب دل لگا کر لکھیں گے مروتوں کا بھی لحاظ کریں گے اور کلام کا بھی شعرا سے دوستی اور تعلقات بھی نبھائیں گے اور تنقید سے رشتہ بھی نہیں توڑیں گے۔ بہر حال اگلی کتاب ہی ان کا اصل امتحان ہوگی اور شہر غزل بھوپال کو شاید اسی امتحان کا انتظار ہے۔

○

جائزے

انداز گفتگو کیا ہے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

جدید اردو تنقید میں شمس الرحمٰن فاروقی کا نام سند کا درجہ رکھتا ہے۔ ڈھائی تین دہائیوں پر پھیلا ہوا ان کا تنقیدی سرمایہ، سیکڑوں صفحات پر مشتمل فکر انگیز تحریریں ذہانت سے بھرا پرا گہرا تنقیدی شعور، نتیجہ خیز وسیع مطالعہ، اعلا ادبی ذوق اور علمی بصیرت وہ امتیازات ہیں جو انہیں معتبر و مستند بنانے میں ممد معاون ہیں۔ ان کے مشہور ادبی ماہنامے "شب خون" نے اردو دنیا میں نئے ادب کو روشناس کرانے اور فروغ پذیر بنانے میں نمایاں اور اہم کردار ادا کیا ہے۔ نئے ادب کی کم و بیش دو نسلوں کو بنانے بگاڑنے کا سہرا اسی پرچے کے سر ہے۔

گزشتہ تین برسوں میں فاروقی صاحب کی پے در پے چار کتابیں بشمول "انداز گفتگو کیا ہے" شائع ہوئیں اور حق یہ ہے کہ ان کتابوں نے جن میں "شعر شعور انگیز" اور "تفہیم غالب" کے نام خصوصیت کیساتھ قابل ذکر ہیں اردو ادب کے سرمایہ میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب نے بڑی اچھی اور سچی بات کہی ہے کہ "شمس الرحمٰن فاروقی ہمارے ان ادیبوں میں سے ہیں کہ جن کی کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو وہ ایک ادبی واقعہ ہوتا ہے۔" گویا تین سال میں چار ادبی واقعے ہوئے۔ حالانکہ یہ چار کتابیں صرف تین سال کا مواد نہیں، فاروقی صاحب کی طویل فکری اور عملی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان چاروں کتابوں میں (ایک تو خیر انتخاب ہے) تین کا بنیادی موضوع اگرچہ تنقید ہے اور فاروقی صاحب بھی ایک ناقد کی حیثیت سے زیادہ پہچانے جاتے ہیں مگر مزاج کی تخلیق

پسندی کا اثر دیکھئے کہ تین میں سے دو کتابوں ("شعر شعور انگیز" اور "انداز گفتگو کیا ہے") کے نام میر و غالب کے اشعار سے مستعار ہیں۔ صرف ایک کتاب کا نام "تفہیم غالب" ہے، حالانکہ تینوں کتابوں کے موضوعات تنقید و تفہیم سے تعلق رکھتے ہیں۔

فاروقی صاحب کے تنقیدی مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ حقیقت بہت جلد آشکارہ ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اردو ادب کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور وہ دوسروں سے مختلف ہو کر سوچتے ہیں۔ اردو شعریات میں نئی وسعتیں اور نئے زوایے تلاش کرتے ہوئے انہوں نے فکر و فن کی ہر سطح پر بہت زیادہ غور و خوض کیا ہے۔ غور و خوض کے مراحل میں مختلف زبانوں کے ادب کا مطالعہ ان کی بھرپور معاونت کرتا ہے وہ اپنے وسیع مطالعہ کی تیز روشنی کا فوکس شعر کے ہر لفظ پر اس خوبی سے مرتکز کرتے ہیں کہ تمام شعری صفات دمک اٹھتی ہیں۔ یہی ان کا وہ تنقیدی اور تشریحی رویہ ہے جو ابتدأ نامانوس اور اجنبی تھا۔ مگر اب سب سے زیادہ قابل اعتبار ہے۔

"انداز گفتگو کیا ہے" کا پہلا مضمون "اردو غزل کی روایت اور اقبال" ہے اس مضمون کے دوسرے صفحے پر غالب کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فاروقی صاحب لکھتے ہیں۔

"غالب کی غزل میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اردو غزل کی روایت میں موجود نہ تھیں اب غالب نے ان کو غزل میں استعمال کر لیا تو وہ باتیں بھی غزل کی روایت کا حصہ بن گئیں۔"

خود فاروقی صاحب کا بھی یہی معاملہ ہے یعنی ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اردو تنقید میں موجود نہ تھیں اب فاروقی صاحب نے ان کو تنقید میں استعمال کر لیا تو وہ باتیں بھی تنقید کی روایت کا حصہ بن گئیں۔ زیر نظر کتاب "انداز گفتگو کیا ہے" بھی فاروقی صاحب کی قائم کردہ روایت کی امین ہے۔

دو سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کل پندرہ مضامین شامل ہیں جن کے بارے میں فاروقی صاحب پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

"گزشتہ دس بارہ برس میں جو مضامین میں نے لکھے ہیں ان میں بہت سے ایسے ہیں جن میں کلاسیکی غزل کی شعریات، اس کی روایت، نئی شاعری سے اس روایت کا تعلق اور بیسویں صدی کے بعض اہم شعراء میں اس روایت کا اظہار یا عدم اظہار جیسے موضوعات پر گفتگو

ہے۔زیر نظر کتاب میں ایک سب مضامین ایک خاص ترتیب سے جمع کر دیے گئے ہیں۔"
اس کتاب ــ مشمولات میں جو ایک خاص ترتیب سے جمع کر دئے گئے ہیں۔
سبھی کا موضوع شاعری ہے اور شاعری میں بھی ایک کو چھوڑ کر سارے مضامین غزل اور غزل گو شعرا سے تعلق رکھتے ہیں۔ فاروقی صاحب نے جن شعرا کا انتخاب کیا ہے ان میں فہرست کی ترتیب کے مطابق اقبال، غالب، فراق (دو مضامین) میر، ذوق، دبیر، فیض، خلیل الرحمٰن اعظمی، منیب الرحمٰن عزیز قیسی، زیب غوری اور مصور سبزواری شامل ہیں۔ آخر کے دو مضامین "کلاسیکی غزل کی شعریات کا خاکہ" اور "سادگی، اصلیت اور جوش" بھی موضوع کے اعتبار سے غزل ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

تنقید میں فاروقی صاحب کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سہل پسند یا نقال نہیں انہوں نے اردو شعر و ادب کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے مختلف شارحین سے متعدد ناقدین تک سب کے خیالات سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد علم و دانش کی روشنی میں اپنے فکری نتائج کو پرکھا ہے پھر بطرز استدلال پیش کیا ہے۔ دوسری زبانوں کے ادب نے ان کی نظر میں وسعت اور ذہن میں کشادگی پیدا کی ہے اپنے وسیع مطالعہ کے توسط سے تنقید ہو یا تشریح وہ ہمیشہ دور کی کوڑی لانے کی کوشش کرتے ہیں اور عام طور پر اشعار کی ساری تہیں منور کر کے تمام گرہیں کھول کر قاری کو حیرت و مسرت سے ہم کنار کر دیتے ہیں مگر کہیں کہیں مفہوم کے تعاقب میں اتنی دور بھی نکل جاتے ہیں کہ متعلقہ شعر ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے مگر یہ صورت عام نہیں۔ عام یہ ہے کہ وہ ایسے اشعار میں بھی جہان معنی تلاش کر لیتے ہیں جن سے دوسرے ناقدین یا شارحین سرسری گزر گئے ہیں۔ انہوں نے بہت سے قدیم و جدید شعرا خصوصاً میر و غالب کو از سر نو سمجھنے اور سمجھانے کی نہایت کامیاب کوشش کی ہے۔

"انداز گفتگو کیا ہے" "مکتبہ جامعہ" کی کتاب ہے اور مکتبہ جامعہ کا نام حسن طباعت کی ضمانت خیال کیا جاتا ہے اس لئے یہ حصہ موضوع گفتگو نہیں البتہ حیرت اس بات پر ہے کہ طباعت کی تمام خوبیوں کے باوصف قیمت صرف =/۷۵ روپے ہے۔ دور حاضر میں کتابوں کی حوصلہ شکن قیمتوں کے درمیان زیر تبصرہ کتاب کی قیمت سکون کا اک سانس معلوم ہوتی ہے۔

ماہنامہ "آج کل" (جذبی نمبر)

مدیر اعلیٰ محبوب الرحمٰن فاروقی

"آج کل" کے مدیر اعلا محبوب الرحمٰن فاروقی نے جب سے دوبارہ ادارت سنبھالی ہے اس پرچے کا مزاج ہی بدل گیا ہے۔ عام سے عام شمارہ بھی کچھ ایسی تخلیقات لے کر آتا ہے کہ خوش ذوق قاری کی تسکین کا سامان ہو جاتا ہے۔ اب قاری اس پرچے کا انتظار کرنے لگا ہے۔ یہ عام شمارے کی بات ہے۔ خصوصی شمارے بہر زاویہ خصوصی ہوتے ہیں۔ ان کے ظاہر کی جاذبیت ضخامت، باطن کی معنویت اور نفاست، ترتیب کی خوش سلیقگی اور توازن اور مضامین کے انتخاب کی معروضیت اور غیر جانب داری اپنا تعارف آپ ہیں۔

شخصی نمبروں میں اختر الایمان کے بعد اگست ۹۴ء کا خصوصی شمارہ "جذبی نمبر" ہے جو اس وقت میرے سامنے ہے۔ اس نمبر کے سرورق پر جذبی صاحب کی اسی بیاسی سالہ تصویر چھپی ہے ان کی آنکھوں میں فکر کی گہرائی اور ہونٹوں پر معنی خیز تبسم ہے۔ معلوم ہوتا ہے "کشتی ثابت و سالم بھی ہے" اور "ساحل کی تمنائی بھی" سرورق کے دوسرے صفحہ پر جذبی صاحب کی ۴۷ سالہ پرانی تحریر "ترقی پسند ادب" "آج کل" کی فائل سے نقل کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"سب سے پہلے تو ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ترقی پسند ادب کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمان سے ٹپک پڑی ہو۔ ہمارا ادب ہزاروں سال سے ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا آج ترقی پسند ادب کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ہم اس نئے ادب کو پرانے ادب سے الگ کرنا چاہیں بھی تو نہیں کر سکتے۔" (یکم اپریل ۴۷ء)

ایک اور مقام پر ترقی پسند ادیبوں پر سخت تنقید کرنے کہ بعد لکھتے ہیں۔

"ہمارے بہت سے ترقی پسند ادیب سنبھل گئے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر بھی وسیع ہوتا جارہا ہے اور کچھ ادبی خوبیاں بھی ان کے یہاں نظر آنے گی ہیں۔ گر گر کر سنبھلنے اور سنبھل سنبھل کر گرنے اور آگے بڑھنے کا نام ہی ترقی ہے۔"

دوسرے صفحے پر اداریہ ہے جس میں جذبی صاحب کو خراج عقیدت پیش کیا گیا

ہے "اقبال سان" پر مبارک باد دی گئی ہے اور یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ "یہ نمبر" "آج کل" قرض کی صورت میں جذبی صاحب کو ان کی بیاسی ویں سال گرہ پر اس دعا کے ساتھ پیش کر رہا ہے کہ "تم سلامت رہو ہزار برس۔"

صفحہ نمبر ۳ پر جو غزل بخط شاعر شامل اشاعت ہے اس کا مطلع ہے ۔

کارگہ حیات پر جب بھی مری نظر گئی موج سی درد و فکر کی سر سے مرے گزر گئی

اس غزل کے بعد اگلے ہی صفحہ پر پھر ایک قدیم مگر اہم تحریر شامل ہے یہ تحریر ڈاکٹر اعجاز حسین مرحوم کی ہے۔ اعجاز صاحب نے چالیس سال پرانے جذبی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے۔

"ان کی صورت اور سیرت کے سرسری مطالعہ سے میں یہ سمجھ رہا تھا کہ ان کے کلام میں درد ضرور ہو گا۔ مزاح یا خوش حالی کے اشارے شاید ہی کہیں مل جائیں۔ جذبی صاحب کا سر بڑا بھی نہ تھا اور اس پر بال بہت تھوڑے سے تھے۔ چہرہ جوش یا اقبال کے چہرے کی طرح شاہانہ نہ تھا اس لئے میں سوچتا تھا کہ ان کے کلام میں فلسفیانہ انداز بیان یا زور و شور بھی نہ ہو گا جس لہجے سے وہ گفتگو کر رہے تھے اور باتوں کو جو کروٹ دے رہے تھے اس سے کچھ ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ شعر میں درد ضرور ہو گا مگر بہا لے جانے والا سیلاب نہ ہو گا۔ تھوڑے سے تکلف کے بعد انہوں نے جو اشعار سنائے ان سے میری ناقص رائے کو اور بھی پختگی کا موقع ملا۔"

اعجاز حسین صاحب کی دوربین و قیافہ شناس رائے کے بعد شمس کنول صاحب کا انٹرویو "شدت جذبات کے شاعر جذبی" اس نمبر کی جان ہے۔ اس انٹرویو میں مختصر مگر جامع انداز اختیار کرتے ہوئے صرف وہی سوالات پوچھے گئے ہیں جن سے شاعر کے فکر و فن اور نظریہ فکر و فن پر روشنی پڑتی ہے۔ کہیں کہیں زندگی کے نشیب و فراز پر بھی بات چیت کی گئی۔ سوانحی اشارے اور شخصیت سے متعلق باقی معلومات شمس کنول صاحب براہ راست فراہم کرتے ہیں اکثر انٹرویو لینے والے اپنے سوالات کی تمہید میں غیر ضروری اور غیر متعلق باتوں کو اتنا طول دیتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی اور کا نہیں خود اپنا تعارف کرانا چاہتے ہیں۔ سوالات کی زبان بھی لچھے دار پر تکلف اور رنگین ہوتی ہے۔ شمس کنول صاحب نے

اس روایت سے انحراف کیا ہے مکتبہ جامعہ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں صاحب کا خیال ہے اردو ادب میں ایسے منفرد انٹرویو بہت کم پڑھنے میں آتے ہیں۔

مذکورہ بالا تحریریں اور اس خوب صورت انٹرویو کے علاوہ خلیل الرحمٰن اعظمی اور شوکت تھانوی کے تنقیدی اور تاثراتی اقتباسات اور مسعود علی بیگ صاحب کا منتخب کردہ کلام جذبی بس یہی چیزیں اس نمبر کو باوقار بنانے کے لئے کافی تھیں مگر مدیر آج کل نے صرف انہیں پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کئی اور لاجواب مضامین شامل کر کے جذبی نمبر کو ایک وقیع دستاویز بنادیا۔ ہر مکتبہ فکر کے نئے اور پرانے مگر نمائندہ لکھنے والوں کے رشحات قسم نے اس نمبر کے معیار و اعتبار میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے موضوعات اور اسمائے گرامی اس طرح ہیں۔

جذبی شخص اور شاعر (ڈاکٹر قمر رئیس) جذبی چند تاثرات (زبیر رضوی) دیکھو تو وہ حریف شب تار کیا ہوئے (پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی) ایک کم سخن، کم گو کم آمیز شاعر (پروفیسر شارب ردولوی) جذبی کی فن کاری (فضیل جعفری) جذبی کا شعری سفر (پروفیسر عبدالقوی دسنوی) جذبی اپنے فکر و فن کی دنیا میں (ڈاکٹر سید عبدالباری) جذبی کا ذہنی پس منظر (ابن فرید) جذبی کی شاعری (سراج اجملی) جذبی ایک ناقد ایک محقق (ڈاکٹر مظہر حسین)

امید ہے کہ ''آج کل'' کا یہ جذبی نمبر بھی اختر الایمان نمبر کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور جی چاہتا ہے کہ نمبروں کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔

دستک اس دروازے پر

مصنف: وزیر آغا

''میری یہ کتاب محض ہلکی سی ایک دستک ہے جو میں نے عظیم اسرار یا Mystry کے دروازے پر دی ہے۔ میں زندگی بھر وقفے وقفے سے یہ دستک دیتا آیا ہوں اور دوسری طرف سے اس کے جواب میں کبھی تو مستقل سناٹا اور کبھی واضح دستک مجھے بھی سنائی دی ہے۔''

''میری یہ کتاب ایک مکالمہ ہے'' اور ''میری دستک نے بند دروازے کے

دوسری جانب کی دستک ہی کو متحرک نہیں کیا بلکہ میری سماعت کو بھی متحرک کر دیا ہے۔"
میں پہلے سوچتا تھا کہ دروازے پر دستک صرف باہر سے دی جاسکتی ہے۔ اب کھلا کہ دستک اندر سے بھی دی جاسکتی ہے۔"

مندرجہ بالا اقتباسات ڈاکٹر وزیر آغا کی تازہ کتاب "دستک اس دروازے پر" سے اخذ کئے ہیں۔ وزیر آغا کو اردو والے جتنے حوالوں سے پہچانتے ہیں ان میں سب سے واضح اور وقیع حوالہ "اوراق" ہے، اوراق بلا شبہ ایک ایسا ادبی جریدہ ہے کہ اس کی اشاعت کے تسلسل کی تو بات ہی الگ ہے، کوئی اس جیسے دو چار شمارے ہی نکال کر خاموشی اختیار کر لے تو بھی اسکی خدمات یاد رکھی جائیں گی۔ مزید یہ کہ وزیر آغا نے صرف "اوراق" ہی پر اکتفا نہیں کیا جدید اردو ادب کو حرف و صوت اور سمت و رفتار دینے میں بھی ان کی خدمات غیر معمولی ہیں لیکن یہ کتاب جس کا ابھی اوپر ذکر آیا ہے ذرا مختلف قسم کی ہے اور اس کے وزیر آغا بھی کچھ الگ الگ سے ہیں۔ نام اور سرورق کی معنی خیزی سے نظموں اور مکالموں کی مفہوم ریزی تک سارا کھیل جاذب توجہ ہے۔ ٹائیٹل پر ایٹم اور پھول کی تصویر ہے اور پیش لفظ "طلوع" کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے۔ "طلوع" کے بعد نظم اور نظم کے بعد ابواب کی جگہ ایام نے لی ہے۔ پہلا باب "پہلا دن" ہے اور آخری باب "نواں دن" ہر دن سے پہلے ایک نظم ہے۔ اس طرح ۱۸۴ صفحات کی اس کتاب میں نثر و نظم کی تقسیم مساوی ہے۔ ہر دن یعنی ہر باب میں صرف دو کردار ہیں ایک "میں" اور دوسرا "تو" اور یہی دونوں کردار ہر روز مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ہیں، دونوں کی گفتگو کا انداز برادرانہ اور دوستانہ ہونے کے ساتھ ساتھ کہیں فلسفیانہ اور کہیں صوفیانہ ہے مگر زبان سمجھنے سمجھانے والی ہے معنی و مفہوم کے چھوٹے بڑے دریا پار کرنے کے لئے مثالوں کے پل تعمیر ہیں، جن کے ذریعے کرداروں کے مافی الضمیر تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ مکالمے معنی خیز اور دلچسپ ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ نو عدد نظمیں جو اس کتاب میں شامل ہیں اور شمولیت کی ترتیب کے اعتبار سے جن کے عنوانات دستک، عجیب ہے یہ سلسلہ، ازال سے ابد تک " سمندر اگر میرے اندر گرے، نشر گاہ، مراجعت ناموجود کے بھاری در پر، بکراں وسعتوں میں تنہا، جب آنکھ کھلی میری،) مکالموں کے ساتھ ہی اپنے اسرار منکشف کرتی ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دونوں (نظمیں اور مکالمے) ایک دوسرے کے زائیدہ ہیں۔ یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ نے حسب معمول سلیقے سے چھاپی ہے۔

ڈاکٹر مشیر الحق (شخصیت اور فکری بصیرت)

مرتب: شاہ عبدالسلام

مشیر الحق میموریل کمیٹی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی زیر نظر کتاب "ڈاکٹر مشیر الحق، شخصیت اور فکری بصیرت" کشمیر کے شہید وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحق کے علم و فضل کا شایان شان اعتراف اور ان کی شخصیت کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ مکتبہ جامعہ نے یہ کتاب پرکشش انداز میں شائع کی ہے۔

پروفیسر مشیر الحق اپنی شگفتہ مزاجی اور اکہرا بدنی کے باوجود پروقار شخصیت کے مالک تھے ان کے تبحر علمی اور بصیرت فکری کے سبھی معترف ہیں۔ جو علمائے کرام ان کے انداز فکر و نظر سے اختلاف رکھتے تھے وہ بھی ان کے خلوص نیت کے قائل تھے۔ ان کی شخصیت اعلا انسانی اقدار کا مجموعہ تھی ان کی ذات میں جو صفات عالیہ جمع تھیں وہ کسی ایک انسان میں مشکل سے یکجا ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے مقالہ نگاروں نے اگر ایک طرف ان کی نکتہ رسی، باریک بینی، بالغ نظری، معروضی اور مدلل انداز بیان اور اخلاقی جرات کا بار بار تذکرہ کیا ہے تو دوسری طرف یہ حضرات ان کی سلامت روی، شریف النفسی، دوست و دشمن نوازی خوش خلقی، سادہ مزاجی، علم، حلم، تواضع، انکسار اور رواداری کی تعریف و توصیف میں بھی رطب اللسان نظر آتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کی ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ معنوی اعتبار سے یہ ان موضوعاتی کتابوں سے قدرے مختلف ہے جو کسی نہ کسی کی مدح سرائی میں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مرتب نے اس کتاب کے مضامین کا انتخاب کرتے ہوئے جو معروضی اور بڑی حد تک غیر جانبدارانہ انداز اختیار کیا ہے اس نے اس کتاب کو ایک اہم دستاویز بنادیا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی تصور اور مقصود نظر تو بلاشبہہ مشیر الحق مرحوم کی شخصیت اور فکری بصیرت پر روشنی ڈالنا ہی ہے لیکن اس روشنی کے بعض زاویے اتنے مختلف، متضاد اور متصادم ہیں کہ مشیر صاحب کے ساتھ ساتھ فکر اسلامی پر بھی خاصا معلومات افزا مواد یکجا ہو گیا ہے۔ مرتب نے پروفیسر مشیر الحق کے ایک مطبوعہ مگر اہم مضمون "سیکولر ہندوستان میں شریعت کے نفاذ کا

مسئلہ "اور اس پر مولانا عبدالغفار ندوی کا اختلافی تبصرہ معہ جواب مکتوب الیہ پروفیسر مشیر الحق (دونوں غیر مطبوعہ نجی خط ہیں) شائع کر کے اس کتاب کی اہمیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ اس مضمون کی شمولیت سے مشیر صاحب کے طرز فکر اور طرز استدلال کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے۔ مولانا عبدالغفار ندوی صاحب کے خط کی اہمیت یہ ہے کہ ان کا خط فکر اسلامی کے تعلق سے ان علمی مباحث اور اختلافات و اعتراضات کی نمائندگی کرتا ہے جو طبقہ علما اور مشیر الحق مرحوم کے درمیان ادب واحترام اور تہذیب و شائستگی کے پاس و لحاظ کے ساتھ موجود تھے۔

کتاب کے موضوعات میں تنوع ہے۔ مشیر الحق مرحوم کی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مضمون نگاروں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر نثار احمد فاروقی، مولانا محمد مجیب اللہ ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، پروفیسر ریاض الرحمٰن شیروانی، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر اجتبا ندوی پروفیسر شعیب اعظمی، پروفیسر کبیر احمد جائسی، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر محمد راشد ندوی، پروفیسر ابوالکلام قاسمی، پروفیسر محمد سالم قدوائی پروفیسر احتشام حسین ندوی، پروفیسر زبیر احمد فاروقی، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، پروفیسر بدرالدین الحافظ، پروفیسر صغر امہدی، ڈاکٹر محسن عثمانی، ڈاکٹر سید عبدالباری، ڈاکٹر ظفر احمد، ڈاکٹر شمس الحق عثمانی، ڈاکٹر شمس تبریز خاں، عبداللطیف اعظمی، ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، شاہ محی الحق فاروقی، مولوی اقبال احمد ندوی، احتشام الدین صدیقی، ابو محمد شبلی، شہناز انجم اور ڈاکٹر شیث محمد اسمٰعیل جیسے علماء اور دانشوروں کے نام شامل ہیں۔

کتاب کی قیمت ۳۰۰ روپے ہے جو بظاہر بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر ۴۱۲ صفحات پر مشتمل اس وقیع کتاب میں فہرست مضامین اور لکھنے والوں کے اسمائے گرامی پر نظر ڈالتے ہی قیمت کا جواز سمجھ میں آ جاتا ہے۔

جہات و جستجو

مصنف ڈاکٹر مظفر حنفی

اعداد و شمار کے لحاظ سے یہ امر باعث اطمینان و مسرت ہے کہ اردو میں ادبی

کتابوں کا کام نہایت تیزی کے ساتھ ہو رہا ہے ہر سال سینکڑوں کی تعداد میں نئی کتابیں بازار میں آجاتی ہیں اشاعت کے اس سیل رواں میں اردو سے تعلق رکھنے والی اکیڈمیوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے جن کے مالی تعاون اور حوصلہ افزاانعامات نے لکھنے والوں کو طباعت کی جانب قدم اٹھانے پر آمادہ کیا ہے لیکن اس کا ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ان کتابوں میں اکثر کا معیار، مایوس کن ہوتا ہے جس کی ایک بڑی وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اردو دنیا میں شاعری کا چلن سب سے زیادہ ہے۔ ہر چار کتابوں میں سے تین ایسے شعری مجموعے ہوتے ہیں جن کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ لگالینا دشوار نہیں کہ "ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی" والا معاملہ ہے اس قسم کی شاعری کے لئے نہ تو ذہانت و علمیت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ مطالعہ و مشاہدہ میں سر کھپانا لازم ہے ایک زمانے میں موزوں طبع ہونا شرط اولین تھا سو اب وہ بھی نہیں رہا اس سہولت نے صاحب کتاب بننے کے دشوار گزار راستہ کو آسان بنادیا ہے اس کے بر عکس نثر لکھنا ٹیڑھی کھیر ہے اس راہ پر سنبھل کر چلنا پڑتا ہے بغیر مطالعہ کے ایک قدم اٹھانا دو بھر ہو جاتا ہے۔ خاصی ذمہ داری، عرق ریزی اور پتہ ماری کا کام ہے۔ چنانچہ اس جانب نظر اٹھانے کی فرصت اور دماغ کسے ہے۔

ان حالات میں ڈاکٹر مظفر حنفی جیسے سنجیدہ آزمودہ کار اور معتبر لکھنے والوں کی کتابوں کا منظر عام پر آتے رہنا تشنگان علم و ادب کے لئے ریگستان میں ٹھنڈے پانی کا چشمہ یا شجر سایہ کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کا بے باک قلم مختلف موضوعات پر مشتمل پچیس سے زائد کتابوں کی تصنیف و تالیف کے ساتھ اپنی فتوحات کی شاندار سلور جبلی منا رہا ہے جدید شاعری کی حیثیت سے آٹھ مجموعوں کے ذریعہ اپنی ایک انفرادی شناخت قائم کرنے کے بعد مظفر حنفی نے تحقیق و تنقید کے میدان میں نئی جہات کی جستجو اور دریافت میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل کی ہے۔ اردو ادب کی دنیا میں شاد عارفی کی عظمت کا اعتراف کرالینا انکا ایک بڑا کارنامہ تھا بعد ازاں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ نقد ریزے شائع ہوا اور اب مضامین کا زیر نظر مجموعہ "جہات و جستجو" اس سلسلے کی دوسری زرخیز مثال ہے۔

گیارہ مضامین پر مشتمل اس جاذب نظر کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے کے دو مضامین میں اردو زبان کی نازک ترین لیکن سخت جان صنف سخن غزل کی رفتار

و ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے دو مضامین کے ذریعہ اردو شاعری میں ہندوستان اور ہندوستانیت کی تلاش اس مضمون کا موضوع اصلی ہے جو بجائے خود دلچسپ ہونے کے علاوہ عہد نو کی ضرورت بھی ہے۔ ''جنگل کے مناظر اردو شاعری میں'' حصے کا آخری مضمون ہے۔

مظفر حنفی جو بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ان کے غزلوں کے طنزیہ اسلوب اور لب و لہجہ کی نشتریت سے سبھی واقف ہیں لیکن جہات و جستجو کی نمایاں تحریروں میں عالمانہ بردباری اور سنجیدہ شگفتگی کا احساس ہوتا ہے وہ شعر میں وضاحت اور نثر میں ابہام کے قائل نہیں اس لئے اپنی بات کو نہایت صفائی کے ساتھ بیان کرنا ان کا امتیازی وصف ہے اور یہی وصف ان کی تمام مضامین پر حاوی ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ علی الترتیب ادب اطفال اور تذکرہ آثار الشعراء پر محیط ہے کہانی والے حصے میں اردو کی نئی کہانی نے حال کو اسکے ماضی کا آئینہ دکھایا ہے۔ نئی کہانی کا ماضی ایسا تابناک ہے کہ اس پر اردو زبان اور کہانی دونوں فخر کر سکتے ہیں لیکن حال مایوس کن ہے آج کے افسانہ نگار نے اپنی تخلیق کو چیستاں بنادیا ہے اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں۔

اطفالی ادب اردو زبان کی ایک بہت بڑی کمزوری ہے پتہ نہیں اردو کے بڑے لکھنے والوں نے باستثنائے چند اس بے حد اہم موضوع سے کیوں اجتناب کیا ہے جبکہ یہ موضوع ہر بڑے مصنف اور شاعر کی توجہ کا مستحق ہے۔ ادب اطفال کے سلسلے میں ڈاکٹر مظفر حنفی کا مضمون اس لحاظ سے بھی ایک قابل قدر کاوش ہے کہ اس پر لکھنے والوں کا فقدان ہے۔

اس حصے کے آخری مضمون میں ''تذکرہ'' آثار الشعراء'' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ تذکرہ بھوپال کا ایک قدیم تذکرہ ہے۔ شعراء کے حالات زندگی اور نمونہ کلام پر مشتمل یہ تذکرہ مضمون نگار کے مطابق ۱۳۰۶ھ (مطابق۔ ۱۸۹۶ء) میں سید ممتاز علی المتخلص بہ حافظ نے ترتیب دیا تھا اور اس وقت کی حکمران ریاست بھوپال نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی خواہش کے مطابق منشی فدا علی فارغ نے اس پر نظر ثانی کی تھی اور یہ تذکرہ سرکاری مطبع شاہجہانی میں ۱۳۰۷ھ میں زیور طبع سے آراستہ ہوا تھا۔''

. مضمون نگار نے اپنے مضمون میں اس تذکرہ کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اس خواہش کا بھی اظہار کیا ہے کہ اس تذکرہ کو تدوین نو کے ساتھ شائع کرانا چاہئے۔ اور یہ کام اردو اکیڈمی آسانی کے ساتھ انجام دے سکتی ہے۔

"جہات و جستجو" کا تیسرا اور آخری حصہ شخصیات سے تعلق رکھتا ہے جس میں سب سے پہلے کیفی اعظمی کی شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنف نے انہیں فیض اور مخدوم کے بعد ترقی پسند تحریک کی تیسری بڑی آواز ثابت کرنے کی مخلصانہ کوشش کی ہے اگلے مضمون میں اعزاز افضل کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں "تنقید گزیدہ" شعرا کی صف میں شامل کیا ہے۔

تیسرے مضمون میں حسرت کی شخصیت کا گہری نظر سے مطالعہ کیا گیا ہے، اس حصے کے چوتھے مضمون میں جو مختلف النوع موضوعات پر مشتمل ہے اور "جہات و جستجو" کا آخری مضمون ہے ڈاکٹر عابد حسین کے طنز و مزاح پر مدلل انداز میں کھل کر بحث کی گئی ہے۔

ڈاکٹر عابد حسین جو ساری زندگی علم و ادب کے گیسو سنوارتے رہے نہایت خوش مزاج اور بذلہ سنج شخصیت کے مالک تھے ان کے کارناموں کی تفصیلات کے پیش نظر ہم انہیں علم و ادب کی "اکیڈمی" بھی کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ عابد صاحب کے ہلکے پھلکے طنز و مزاح کی شعری اور نثری تخلیقات کے مطالعہ سے ان کی خوش دلی اور خوش مذاقی کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے لیکن جن لوگوں نے ان کی سنجیدہ اور علمی تحریروں سے ہی اکتساب فیض کیا ہے وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ ان کے قلم نے کیا کیا گل کاریاں کی ہیں۔ مظفر حنفی نے نہایت خوبی کے ساتھ عابد صاحب کے اس رخ پر روشنی ڈالی ہے۔

مظفر حنفی کی نثر نگاری سے متعلق ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ ڈاکٹر مظفر حنفی بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہیں اور انہوں نے ادیبوں اور ادبی مسائل کو ایک تخلیق کار کی نظر سے دیکھا ہے۔" خود مظفر حنفی بھی اپنے آپ کو بنیادی طور پر ایک تخلیق کار ہی سمجھتے ہیں اور برملا اس کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

ایک بیباک تخلیق کار کی حیثیت سے ان کی عظمت مسلم ہے انہوں نے ناقدین پر اپنے اشعار میں بعض جگہ سخت چوٹیں بھی کی ہیں یہاں تک کہ تنقیدی مضامین لکھتے وقت بھی ان کا یہ تخلیق کار ان کے ساتھ رہتا ہے اور ان کے قلم کو کسی بھی قسم کی ناانصافی سے روکنے کے لئے پردہ دری کا کام کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اپنی تحریروں میں کسی بھی ناقد کی رائے سے اختلاف ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں ایسے موقع پر وہ کسی بھی قسم کی مصلحت، پردہ داری یا لحاظ کا دامن تھامنے کے بجائے جرات و اعتماد سے کام لیکر نہایت واضح، صاف اور مدلل انداز

میں اپنی بات کہتے ہیں کہیں کہیں ان کے دلائل میں تحقیق سے زیادہ تخلیق کا رنگ چھلک اٹھتا ہے جسے وہ اپنی تنقیدی بصیرت اور پراعتماد عبارت کے ذریعہ نبھانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں بحیثیت تنقید نگار ان کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی بھی تخلیق کا مطالعہ کرنے سے قبل پیشہ ور ناقدین کی طرح تخلیق کار کے بارے میں منفی رائے قائم نہیں کرتے بلکہ معروف اور غیر معروف کی پرواہ کئے بغیر ہر تخلیق کا معروضی انداز میں ہمدردی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے بعد کوئی رائے قائم کرتے ہیں۔"جہات و جستجو" کے مضامین میں بہت سے غیر معروف شعرا کے اشعار کی شمولیت اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے تنقید کی بے مروتی کے خلاف انہوں نے بارہا احتجاج کیا ہے۔ یہ احتجاج ان کے اشعار میں بھی ملتا ہے اور مضامین میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ دوسرے شعرا کے حق کے لئے انہوں نے اپنے قلم کو نہایت بے باکی کے ساتھ استعمال کیا ہے شاد عارفی کے سلسلے کی جنگ سے ادب کا ہر طالب علم واقف ہے۔ اس کے علاوہ زیر نظر کتاب کا ایک مضمون "ایک اور تنقید گزیدہ۔ اعزاز افضل جس کا عنوان ہی چیخ چیخ کر مضمون نگار کا مافی الضمیر ادا کر رہا ہے۔ ان تفصیلات کے پیش نظر ڈاکٹر مظفر حنفی کی گیارہ تحریروں کا مجموعہ "جہات و جستجو" ایک ایسی کتاب ہے جو اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر طالب علم کو مطالعہ کی ترغیب دیتی ہے۔!!

اقبال اور قرآن

مصنف: ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں پاکستان کے برگزیدہ عالم اور بزرگ مصنف ہیں۔ ان کے تبحر علمی کو دیکھ کر مولوی عبدالحق سید سلیمان ندوی اور مولانا حالؔی جیسی عظیم المرتبت ہستیوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ موصوف عربی و فارسی کے زبردست عالم ہیں۔ مذہب اسلام اور قرآن کریم کے مطالعے سے انہیں گہرا شغف ہے۔ ڈاکٹر اقبالؔ بھی قرآن شریف سے ایک جذباتی اور ذہنی تعلق رکھتے تھے۔ ذوق و شوق کی اسی یک رنگی نے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں اور ڈاکٹر اقبالؔ کو قریب تر کر دیا ہے "اقبال اور قرآن" اسی قربت کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی علمی اور قلمی فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ میدان

ادب میں تحقیق و تنقید کے علاوہ تاریخ و لغات وغیرہ بھی ان کے دائرہ کار میں شامل ہیں۔ فارسی پر اردو کا اثر، فارسی کے قدیم شعراء اردو سندھی لغت، ادبی جائزے، علمی نقوش، تحقیقی جائزے اور حالی کا ذہنی ارتقاان کی چند منتخب تصنیفات ہیں۔ ان کے علاوہ مذہبیات کے موضوع پر وقیع کتابیں موجود ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ کئی زبانوں پر قادر ہونے کے باوصف اردو سیدھی سادی سلیس اور صاف لکھتے ہیں۔ جو بات کہنی ہو۔ شائستہ متوازن اور سلجھے ہوئے پیرائے میں کہتے ہیں۔ بحث کا طریقہ سنجیدہ مدلل اور عالمانہ ہے۔ اخلاق و متانت کا دامن کسی لمحہ ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ تحریر میں شائستگی، صداقت اور خلوص ان کی ذات و صفات کے آئینہ دار ہیں۔ موضوع کوئی بھی ہو۔ صاف نظر آتا ہے کہ یہ تحریر کسی مذہبی شخصیت کے نوک قلم کا عکس ہے۔

"اقبال اور قرآن" ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی بہترین علمی اور ادبی کاوش ہے۔ تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کو "ادرہ ثقافت اسلامیہ لاہور" نے پروقار اور معیاری انداز میں اہتمام سے شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے بارے میں ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ انہیں قرآن کریم سے والہانہ عشق تھا اور کتاب الٰہی ہمیشہ ان کے مطالعے میں رہا کرتی تھی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ قرآن شریف پڑھتے وقت ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ قرآن کریم کا یہی تاثران کے کلام میں اثرپذیری کے جوہر دکھاتا ہے۔

"اقبال اور قرآن" میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے ایک طویل مقالہ سپرد قلم کیا ہے جس میں اقبال کا قرآن سے عشق اور قرآنی اسرار و رموز کو قالب شعر میں ڈھالنے کی خواہش پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد اقبال کے اشعار کا قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اس طرح تجزیہ کیا ہے کہ قرآن کریم کی آیت بحوالہ سورت معہ ترجمہ نقل کی گئی ہے۔ پھر اسی مفہوم میں اقبال کا شعر یا اشعار درج کیے گئے ہیں اس طرح یہ ثابت کیا ہے کہ کلام اقبال اپنی تمام تر شعری خصوصیات اور فنی لوازمات کی پاسداری کے ساتھ کلام اللہ کی تشریح و تفسیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار خلوص، صداقت اور تاثیر کا سرچشمہ ہیں۔

تحقیق و تجزیہ کی یہ کاوش جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی ادبیات اقبال میں ایک اہم اضافہ ہے اور ادب کے ہر طالب علم بالخصوص اقبال اور مذہب سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کے مطالعے میں رہنے کی مستحق ہے۔

نواب صدیق حسن خاں

مصنف و ناشر ۔ڈاکٹر رضیہ حامد

اردو زبان کی خاموش خدمت کرنے والی خواتین میں ڈاکٹر رضیہ حامد کا نام اب زیادہ عرصے تک چھپایا نہیں جاسکے گا۔ پچھلے دنوں مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے ان کے افسانوں کا مجموعہ "خالی خالی دامن" شائع کیا۔اسی کے ساتھ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش کے مالی تعاون سے زیر نظر کتاب کی اشاعت عمل میں آئی اور اب "معاون حج" تیار ہے۔ تضاد کی حد تک مختلف موضوعات سے ان کے شوق اور مطالعہ کی ہمہ جہتی کا اندازہ ہوتا ہے لیکن ہمیں ان کی دوسری کتابوں سے اس تبصرہ میں کچھ نہیں لینا۔ فی الحال ہماری بحث کا موضوع نواب صدیق حسن خاں ہیں۔

نواب صدیق خاں ایک عالم بے بدل تھے۔ عربی ادب میں ان کی فتوحات لامحدود ہیں۔ عربی زبان کے بہت سے ممالک میں آج بھی ان کی تصنیفات جامعات کے درس میں شامل ہیں۔ اہل عرب ان کی ادبی صلاحیتوں اور علمی لیاقتوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپال کی علم دوست رئیسہ نواب شاہجہاں بیگم کی نظر انتخاب کی بدولت ان کے شوہر اور شوہر ہونے کی وجہ سے نواب کے لقب سے ملقب ہوئے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے جو خود بھی بھوپال کے ایک اعلا خانوادہ سے تعلق رکھتی ہیں نواب صدیق حسن خاں پر تحقیقی کام کیا ہے جس پر انہیں بھوپال یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی اس کے بعد یہ تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے ان کی عرق ریزی اور شب و روز کی مسلسل کاوش کا بہترین ثمرہ ہے۔ایک طرف تو کتاب نام بذات خود طالبان علم کے لئے اپنے اندر بہت زیادہ کشش رکھتا ہے۔اس پر طرہ یہ کہ ا کا مقدمہ ایسی ہی زبردست شخصیت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے۔ اس طرح کتاب دو آتشہ ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر رضیہ حامد نے اس کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا باب تاریخی منظر سے متعلق ہے۔ جس میں تحریک ولی اللہی سے تفصیلی بحث کی گئی ہے، دوسرے میں نواب صاحب کے سلسلہ نسب اور خاندان کا ذکر ہے۔ تیسرا حالات زندگی اور

اخلاق کو محیط ہے۔ چوتھے باب میں نواب صدیق حسن خاں کے عہد سے قبل اور دوران قیام بھوپال کے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں باب دینی و علمی ترقیات پر مشتمل ہے۔ چھٹے باب میں نواب صاحب کی تصنیفات سے بحث کی گئی ہے جن کی تعداد رام بابو سکسینہ کے مطابق ڈیڑھ سو سے زائد ہے اور جو موضوعات کے اعتبار سے تاریخ، سوانح، قیافہ، کیمیا، نباتات ریاضی، ہیئت، تاریخ العلوم۔ نعت اور علم بدیع وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں کی کتابیں شامل ہیں مگر اکثریت عربی زبان میں لکھی ہوئی کتابوں کی ہے۔ ساتواں باب علمی، ادبی اور سیاسی رجحانات کا احاطہ کرتا ہے۔ آٹھویں باب میں نواب صاحب کی سیاسی، سماجی اور علمی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور نویں باب میں ان بلند پایہ اشخاص کا ذکر خیر ہے جو نواب صاحب سے تعلق خاطر رکھتے تھے۔ آخر میں ضمیمہ کے طور پر نواب صاحب کا حسب نسب، کتابوں کی فہرست، نوابین بھوپال کے شجرے اور کتابیات کی فہرست ہے۔ اس طرح یہ کتاب ایک ایسی تصنیف ہے جسے آئندہ نسلیں تحقیقی کام کرتے وقت ضرور یاد رکھیں گی۔ مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے بجا طور پر اس کتاب کو اپنے پہلے انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔

شاد عارفی: شخصیت اور فن

مصنف: ڈاکٹر مظفر حنفی

فن کار کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تخلیق کسی کی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتی اور صرف نقاد ہی نہیں تنقید کے غرور کو بھی چکنا چور کر دیتی ہے تا آنکہ تنقید کو اپنے اصولوں پر نظر ثانی کر کے اس میں ترمیم و تنسیخ کرنی لازمی ہو جاتی ہے۔ ناقد اپنی جھوٹی انا کو برقرار رکھنے کے لئے ان کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے تو خود اس کا وزن و وقار ڈانو اڈول ہو جاتا ہے۔ اسی قسم کے تخلیق کاروں میں شاد عارفی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ شاد عارفی کہنے کو تو ایک نام ہے لیکن عناصر اربعہ سے بنے اس انسان نے اپنے قلم رو میں ہزار جہان تازہ پیدا کئے ہیں۔ اس کے کمالات تخلیقی کا ایک بڑا وصف ہر عظیم فن کار کی طرح اسکی انفرادیت ہے جو کہیں بھی ہو اپنی پیشانی پر چمکیلی پہچان لگائے رکھتی ہے۔ غزل ہو کہ نظم،

مکتوب ہو کہ تنقید شاد اپنے لہجے کے تیور سے فوراً پہچان لئے جاتے ہیں۔

میر کے بعد زیادہ خلوص کا احساس شاد عارفی کے کلام میں ہوتا ہے میر و شاد دونوں کی زندگی غموں سے عبارت ہے۔ اگرچہ دونوں میں موضوعات سے لے کر شیوۂ گفتار تک بعد المشرقین ہے لیکن اپنی زندگی کے تجربات اور مشاہدات کو جس دیانت داری کے ساتھ میر نے اشعار میں ڈھالا ہے اسی طرح شاد نے بھی کوئی خیانت نہیں کی۔ میر نے اپنی ذات کو نشانہ بنایا۔ شاد نے ہر ذات کو۔ سنجیدہ اور گہرا طنز شاد کی شاعری کا طرہ امتیاز ہے اردو میں خالص طنز کی روایت عام نہیں اس کی جانب سے نثر و نظم دونوں میں شعوری کوشش کا فقدان رہا ہے۔ بد قسمتی سے اردو میں طنز کو مزاح سے الگ کر کے دیکھنے کی سنجیدہ تنقیدی یا تخلیقی کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ چنانچہ طنزیہ شاعری مستقلاً مزاحیہ انداز بیان کے دائرہ اختیار میں رہنے کی وجہ سے دوسرے درجے کی شاعری ہو کر رہ گئی اس کے برعکس انگریزی میں خالص طنز کی روایت مستحکم تھی اس وجہ سے اس کو وہی مقام حاصل ہوا جو معیاری ادب کے شایانِ شان تھا۔ اردو میں شاد عارفی وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے سنجیدہ اور خالص طنز کو اپنا فن بنایا اور اتنے خلوص سے اس پر محنت کی کہ غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کر دیا۔

یہ محض اتفاق نہیں کہ دلوں میں اتر جانے والے اشعار میں سے ۷۵ فی صد وہ ہیں جن میں طنز کا کوئی نہ کوئی پہلو مضمر ہو۔ طنز مؤثر شاعری کا ایک ایسا وصف ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

غالب کی طرح شاد کو بھی اپنے ''عندلیب گلشن نا آفریدہ'' ہونے کا احساس اور ہم عصروں سے شکایتیں رہیں۔ غالب اور شاد میں قدر مشترک یہ حسین اتفاق بھی ہے کہ غالب کو غالب کرنے کی پہلی باقاعدہ کوشش ان کے شاگرد مولانا حالی نے کی تھی اور شاد عارفی کا مخلصانہ تعارف ان کے شاگرد ڈاکٹر مظفر حنفی کے ذریعہ ہوا۔

زیر نظر کتاب ''شاد عارفی شخصیت اور فن'' مظفر حنفی کی اسی کوشش کا نتیجہ ہے اس سے پہلے بھی مظفر حنفی نے شاد پر لکھے گئے مختلف مضامین کو ترتیب دے کر ''ایک تھا شاعر'' میں جمع کر دیا تھا لیکن اس سے ان کی تسکین کا سامان فراہم نہ ہو سکا تو شاد پر پی ایچ ڈی کی راہ سے باقاعدہ تحقیقی کاوش کا آغاز کیا۔ یہ کاوش دوسرے تحقیقی کاموں کی طرح برائے ڈگری نہ تھی بلکہ اس میں شاد کی شخصیت اور فن کو ایک سچے محقق اور غیر جانب دار نقاد کی نگاہ

سے دیکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی ادبی دنیا میں خود بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور بحیثیت شاعر شاد کے لب و لہجے کے سچے امین تسلیم کئے جا چکے ہیں۔ اپنے استاد سے حاصل شدہ طنز کے ورثہ کو مظفر حنفی نے نہ صرف سنبھال کر رکھا بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ میرؔ کے والد نے اگر میرؔ کو عشق کی تلقین کی تھی تو شاد عارفی نے مظفر حنفی کو طنز کی ہدایت کی۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"زیادہ سے زیادہ طنز کو اپناؤ۔ گہرے زخم سماج اور سماجی بندھنوں کے دلوں میں لگاؤ۔ رستے ہوئے زخموں کو اور رساؤ! بات بنتی جائے گی صرف سنجیدہ شاعری محض وقت ضائع کر سکتی ہے، مفید نہیں اور ادب میں افادیت بڑی چیز ہے۔"

کتاب کے پیش لفظ میں پروفیسر مسعود حسین خاں نے شادؔ عارفی کی شخصیت پر اپنے مخصوص جامع انداز میں اظہار خیال کیا ہے ایک مقام پر مظفر حنفی کے کام کا اعتراف کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میرا خیال ہے اس مقالے کی اشاعت کے بعد اہل نقد و نظر دیکھیں گے کہ ابھی چند دہے قبل ہمارے درمیان سے جو سخنور خاموشی سے اٹھ گیا ہے۔ اس کی شخصیت اور فن کس قدر رتبہ دار تھے جو تمام عمر "دارالسرور" میں مقیم رہا لیکن اس کے نصیب میں لذت خمار بھی نہ آئی اس کی زندگی مسلسل دیوانے کا خواب رہی وہ ہمیشہ مر مر کر جیا کیا لیکن اپنی فن کارانہ انفرادیت کا سودا نہ کیا۔ نامساعد حالات کے نیش کو اس نے فن کے ذریعہ گوارا بنا لیا۔ اس کی غیور اور خود دار انفرادیت نے کبھی ان سے پیار کیا کبھی ان پر تلوار بن کر ٹوٹ پڑی۔ لیکن ہار نہ مانی اور مانی تو اس طرح کہ اس کی شکست کی آواز گلبانگ شعر بن گئی۔"

زیر نظر کتاب نو ابواب کو محیط ہے۔ اولین دو باب سماجی اور ادبی پس منظر" نیز سوانح حیات اور شخصیت پر روشنی ڈالتے ہیں جس میں شاد عارفی پروان چڑھے اور ان کی شخصیت کی تعمیر وارتقی ہوا انہوں نے ادب کی مختلف اصناف سخن میں بہ اعتبار مقدار و معیار جو اضافہ کیا ہے اس کا تجزیہ بعد کے پانچ ابواب میں ہے۔ بعد ازاں سابقہ مباحث سے اخذ کردہ نتائج کی روشنی میں شادؔ عارفی کے ادبی مقام کے تعین کی سعی کی گئی ہے۔ آخر میں فہرس تلامذہ شادؔ، ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کی فہرس اور ان کتب ورسائل کے اشارے بھی شامل کر دیئے گئے ہیں جن سے اس مقالے کی تکمیل میں استفادہ کیا گیا ہے۔

کم و بیش ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ڈیمائی سائز کی یہ کتاب اردو تحقیق کی دنیا میں ایک گراں قدر اضافہ ہے، جاذب نظر سرورق، صاف ستھری کتابت، دلکش طباعت اور نفیس کاغذی پیراہن کتاب کے وہ اوصاف ہیں جس کے پیش نظر چوبیس روپے اس کتاب کی بہت کم قیمت معلوم ہوتی ہے جسے ہر صاحب نظر مکتبہ جامعہ کی کسی بھی شاخ سے خرید سکتا ہے۔

موسم زرد گلابوں کا (شعری مجموعہ)

شاعر: شاہد میر

شاہد میرؔ کو شاعری ورثہ میں ملی ہے، اس کے والد میرؔ عرفانی سرونج کے مقبول شاعر تھے۔ دادا عاجزؔ میر بھی شاعری کرتے تھے لیکن جن کے فیض تربیت نے شاہد میر کی شعری صلاحیتوں کو جلا بخشی وہ اس کے نانا "فخر مالوہ" عرفان محمد خاں ناطقؔ مالوی کی ذات گرامی تھی۔ شاہد اپنے بچپن میں ترنم کے ساتھ نانا کی غزلیں مشاعروں میں سنا سنا کر دونوں کے لئے داد وصول کرتا تھا یہیں سے موسیقی اور شاعری کا شوق پروان چڑھا اور شاہد میرؔ کو خوش گلو و خوش فکر شاعر بنا گیا آج اردو زبان کے تقریباً ہر ادبی رسالے میں شائع ہونے والا یہ مقبول شاعر اپنا شعری مجموعہ "موسم زرد گلابوں کا" بازار میں لایا تو مجموعہ دیکھ کر غصہ آیا اور افسوس بھی ہوا، کتابت، طباعت، کاغذ، سرورق غرض کتاب کی اشاعت کا کوئی حصہ کوئی گوشہ اس کے شایان شان نہ تھا۔ یہی افسوس مجھے اپنے ایک دوسرے پسندیدہ شاعر ظفر صہبائی کا شعری مجموعہ "دھوپ کے پھول" دیکھ کر ہوا تھا۔ آج کے دور میں جب کہ اکیڈمیوں کی معاونت کا بازار گرم ہے۔ گئے گزرے شاعر بھی اچھی خاصی کتاب چھاپ لیتے ہیں۔ قاری کا مزاج "آفسیٹی" ہو گیا ہے نگاہیں جاذب نظر کتابوں کی متلاشی رہتی ہیں اور پھر شاہد میر تو بڑا پیارا شاعر ہے۔

آج کل شاعری میں روایت اور جدت کا سنگم تلاش کر لینا تنقید کا فیشن سا ہو گیا ہے لیکن کسی کو یہ سنگم دیکھنا ہی ہے تو شاہد میر کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ مترنم بحروں اور مشکل زمینوں میں احساسات کو چھو لینے والے اشعار شاہد کے مجموعے میں جابجا نظر آتے ہیں۔ جذبہ کی تیز آنچ کو شاہد حد سے تجاوز کرنے سے روکتا ہے اس کے کلام میں "یاسبان

عقل'' دل کو تنہا چھوڑ تا بھی ہے تو بے راہ روی کی اجازت نہیں دیتا۔ خیالات کی پاکیزگی۔ فکر کی بلندی، جذبے کی لطافت اس کے اشعار کی غذا ہیں، الفاظ کی خوش انتخابی اور ترتیب و تہذیب نے کلام میں چستی اور روانی کے ساتھ موسیقیت پیدا کردی ہے۔ تجربات و مشاہدات کی وسعت، نگہ کی بلندی، فکر کی گہرائی اور فن کی تازہ کاری نے اشعار کی دلنوازی میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں ؂

خوابوں کے انجم میں ہر اک شے حسین تھی
جاگے تو اپنے پانو کے نیچے زمین تھی

شکستہ حال اشک ریز دل فگار آدمی
ملاحظہ ہو یہ خدا کا شاہ کار آدمی

تو بڑی خوبیوں کا مالک ہے
کوئی خامی تلاش کر مجھ میں

تمہارے شہر کا یارو رواج کیسا ہے
کہ پوچھتا نہیں کوئی مزاج کیسا ہے

اک رات کا حصار ہے اب اس کے ارد گرد
جو دیکھتا نہ تھا کوئی منظر سوائے سبز

کوہ دبن دشت ودر میزبانی میں تھے
پاؤں لیکن ہمارے روانی میں تھے

دامن خزاں سے ہم نے چھڑا تو لیا مگر
پتوں کے ٹوٹنے کی صدا ساتھ ہو گئی

پہلے تو چھین لی مری آنکھوں کی روشنی
پھر آئینے کے سامنے لایا گیا مجھے

شبنم کے اشک سبزہ گل پر بکھر گئے
بھیگا ہوا ہے صبح کا اخبار جا بجا

کہتے ہیں ہر شاعر کو دوسروں کی بہ نسبت اپنے کلام میں زیادہ خوبیاں نظر آتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو ہم عصروں سے ممتاز اور اپنے اشعار کو ان کے اشعار سے بہتر سمجھتا ہے۔ مجھے شاہد میر کی شاعری پر ایسا گمان گزرتا ہے جیسے یہ اشعار میرے ہیں اور میں نے کہہ کر شاہد میر کو دیئے ہیں۔ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے تعاون سے شائع ہونے والی اس کتاب کو دیکھ کر اپنائیت کے اسی احساس نے مجھے طباعت کی شکایت پر مجبور کیا ورنہ یہ کتاب اس قابل ہے کہ اگر کوئی شخص نئی نسل کے دوچار شعری مجموعے پڑھنا چاہتا ہے تو اسے ''موسم زرد گلابوں کا'' بھی اپنے انتخاب میں شامل کرنا چاہیے۔

کشت فیض (مضامین کا مجموعہ)

مصنف ڈاکٹر سید واصف احمد

فیض احمد فیض اردو کے ان متقدر شعرا میں شمار کیئے جاتے ہیں جنہوں نے ہمارے ادب کو عالمی ادب کے روبرو سر بلند کیا ہے۔ ہر چند کہ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر اور وابستہ تھے مگر انہوں نے اپنے شعری رویے کو (بڑی حد تک) اس تحریک کی نام نہاد ادبی شرائط سے حیرت انگیز طور پر ناوابستہ رکھا۔ اس ناوابستگی نے ان کی شاعری کو وہ قوت اور مقبولیت عطا کردی کہ وہ منقسم ہندستان کے غیر منقسم شاعر کی حیثیت سے دونوں ملکوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئے۔ فن شعر میں انہوں نے یہ کمال دکھایا کہ کلاسیکی شاعری کے لفظوں میں تازہ روح پھونک دی پرانی تشبیہوں اور استعاروں کو نئی معنویت کاادراک ہوااور قدیم غنائی شاعری اپنی ساری غنائیت کے ساتھ عصری مسائل پر بے محابہ گفتگو کرنے لگی۔

فیض اس اعتبار سے بھی خوش نصیب ہیں کہ عوام نے زندگی بھران کی پذیرائی کی اور بعد از مرگ بھی انہیں یادرکھنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں آئی۔ انہیں پڑھنا، سننااور بہ زبان قلم یادرکھناادب سے تعلق اور دلچسپی رکھنے والوں کا آج بھی پسندیدہ عمل ہے۔ ”کشت فیض“ اسی عمل مسلسل کی ایک کڑی ہے۔

زیر نظر کتاب ڈاکٹر سید واصف احمد صاحب کے آٹھ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر سید واصف احمد نے اپنے مضامین کے وسیلے سے فیض کی شاعری کو مختلف زاویوں سے پرکھنے کی کوشش کی ہے اور اس کتاب کو مفید اور سودمند بنایا ہے جیسا کہ اپنے دیباچے میں رقم طراز ہیں:۔

”زیر مطالعہ کتاب میں فیض کی شاعری اور نظریہ پر چند مفید اور سودمند مضامین شامل ہیں حسب توفیق ہر موضوع پر میں نے بصیرت افروز نگاہ ڈالی ہے۔ فیض کی ذہنی ساخت، افتاد مزاج اور میلان طبیعت کا بھی تنقیدی جائزہ لیا ہے فیض کے نظریہ فن پر اختصاص سے عمیق و بسیط و بصیرت افروز روشنی ڈال کر اس کی داخلیت، خارجیت، افادیت، ہئیت اور اہمیت کو حتی المقدور اور دیانت داری سے رقم کرنے کی سعی کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ مطالعہ فیض کے سلسلے میں قارئین کی شدید ضرورت کو پورا کریگا۔“

تردید (شعری مجموعہ)

شاعر: محبوب راہی

"ثبات" کے بعد "محبوب راہی کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ مہاراشٹر اردو اکیڈمی کی مالی معاونت سے شائع ہوا ہے۔

محبوب راہی بے تحاشا اور بے حساب لکھنے والوں کی صف میں شامل ہیں کوئی رسالہ اٹھایئے مہاراشٹر کے اخبار کھولیے اور کچھ نہیں تو محبوب راہی کا خط ضرور پڑھنے کو مل جائے گا۔ انہوں نے شاید مظفر حنفی کا جھوٹا پانی پی لیا ہے جن پر وہ اپنا تحقیقی کام مکمل کر چکے ہیں۔

محبوب راہی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور خوب غزل کہتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ زود گو اور پر گو قسم کے غزل گویوں کے ہاں زود گوئی اور پر گوئی کے سوا باقی جو بچتا ہے وہ یوں ہی سا ہوتا ہے لیکن محبوب راہی کی غزلوں میں "یوں ہی سا" کے علاوہ بھی بہت کچھ موجود ہے۔ غزل کہتے کہتے وہ یکایک ایک دو ایسے اشعار کہہ جاتے ہیں کہ قاری پڑھتے پڑھتے رک کر انہیں دوبارہ اور سہ بارہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ خامیوں پر نظر رکھنے والی نگاہیں بھی یہ عمل کرتی ہیں مگر محبوب راہی کے اشعار کی خوبیاں قرأت ثانی اور ثالث پر اکساتی ہیں۔ مثلاً یک صاحب ذوق قاری کے لئے ان اشعار سے سرسری گزر جانا کتنا دشوار ہوگا۔

پیاس سے باطن کی چاروں جاں بلب
ابر تر، دریا، سمندر اور میں

جتنے دروغ گو تھے وفادار ہو گئے
سچ بولتا تھا اس لئے غدار میں ہی تھا

بڑے سکون سے یہ رات ہم پہ گزری ہے
نہ جانے صبح کا سورج کدھر سے نکلے گا

محبوب راہی نئے زمانے کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہیں ہر باشعور شاعر یہی کرتا ہے۔ وہی شاعری عصری آگہی کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جس کا خالق شعوری

اور لاشعوری طور پر اپنے عہد میں سانس لیتا ہے۔ محبوب راہی کے انداز کا تیکھا پن کہیں کہیں فکر کی آنچ اور جذبہ کی وار فتگی پر غالب آجاتا ہے۔ ان کے مزاج کی سادگی پیچ در پیچ سیاسی شعور سے میل نہیں کھاتی اس لئے وہ جس سے شاکی ہوتے ہیں اس پر طنز کا سیدھا وار کرتے ہیں۔ طنز، غصہ اور جھنجلاہٹ کے اظہار کا مرغوب اور موثر ذریعہ ہے۔ محبوب راہی کے اشعار میں اس ہتھیار کا استعمال منتقمانہ نہیں مخلصانہ ہوتا ہے۔

نئی نئی زمینوں میں ٹیڑھے ترچھے اشعار کی تخلیق کا شوق ابتداً شاد عارفی اور وراثتاً مظفر حنفی کا طرۂ امتیاز ہے۔ محبوب راہی اس وارثت میں اپنا حصہ لگانے کی کوشش میں مصروف ہیں ذرا یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

اس کے سپنوں کے آنچل میں چاند ستارے ٹانک رہے ہو
کیوں بھیا کاہے کو ایسی الٹی سیدھی ہانک رہے ہو

جب گلشن میں آگ لگی تھی تم بھی تو مسرور بہت تھے
اب کیوں کانٹے چبا رہے ہو اب کیوں مٹی پھانک رہے ہو

ان اشعار میں زبان و بیان کے رویوں میں تبدیلی کی وجہ سے صفائی اور روانی میں تھوڑی سی کمی ضرور آگئی ہے مگر تیور دہی ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے محبوب راہی کی غزل میں میرؔ اور غالبؔ کے انداز کا پتا لگایا ہے جس میں ایک طرف جذبہ کی دھیمی لے آواز کی خستگی اور لوچ میں منقلب ہو کر سامنے آتی ہے دوسری طرف فکر کی آنچ جذبہ کی وار فتگی میں ڈھل کر نمودار ہوتی ہے۔ وزیر آغا کے الفاظ میں ''محبوب راہی کو غالب کا انداز مرغوب ہے چنانچہ ان کے ہاں فکر کو پر عطا ہوئے ہیں اور جذبہ کو وار فتگی نصیب ہوئی ہے اور فکر اور جذبہ ایک دوسرے میں جذب ہونے کیلئے بے تاب نظر آتے ہیں۔ امید ہے کہ اگر محبوب راہی کے ہاں شعر کہنے کی لگن اسی طرح جوان رہی تو وہ غالب کی شعری روایت کو زندہ رکھنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔''

قدم بہ قدم

شاعر. حاجی انیس دہلوی

"قدم بہ قدم" حاجی انیس دہلوی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جسے رہبر آفسیٹ پرنٹر نے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔ حاجی انیس دہلوی بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں اور کئی ادبی معاشرتی فلمی اور جاسوسی رسائل کے بانی "سرپرست" ہیں۔ ان کی شخصیت کثیر الجہات ہے دہلی کی سیاسی اور سماجی زندگی سے لے کر دنیائے اردو کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں تک حاجی صاحب اپنی ایک مخصوص اور منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ انہیں اپنے وطن اور اپنی زبان اردو دونوں سے گہری محبت ہے۔ اردو کے تعلق سے انہوں نے بہت سے کام انجام دئے ہیں اور آج بھی جب کہ ان کی عمر ستر برس کی ہے جوانوں سے زیادہ کام کرتے نظر آتے ہیں ادب دوست خوش مزاج اصول پسند اور وضعدار انسان ہیں۔ اصول پسندی اور وضعداری جیسی متضاد خصوصیات کو حاجی صاحب جس خوش اسلوبی سے نبھاتے ہیں وہ انہیں کا حصہ ہے اردو زبان وادب سے انہیں صرف پیشہ وارانہ تعلق ہی نہیں قلبی لگاؤ بھی ہے اسی قلبی لگاؤ نے انہیں ایک حساس دل شاعر بنادیا ہے۔ زیر نظر شعری مجموعہ ان کے احساسات کا پہلا تعارف ہے۔

حاجی صاحب کی شاعری میں بڑی تازگی اور توانائی ہے۔ ان کا شعری رویہ اردو شاعری کی غزلیہ روایت کا تسلسل ہے ادب کی فکری سطح پر وہ عہد حاضر کی مصروف و مقابلہ جاتی زندگی کے مختلف اور متضاد رجحانات کی عکاسی کرتے ہیں۔ پامال زمینوں اور ازکار رفتہ موضوعات کے چمن میں نئے پھول کھلانا بڑا مشکل کام ہے مگر حاجی صاحب دوسرے مشکل کاموں کی طرح اسے بھی آسان کر دکھاتے ہیں چند اشعار بطور نمونہ درج ذیل ہیں۔

جو دل باندھے وہ جادو جانتا ہے
مرا محبوب اردو جانتا ہے
قدموں کو مری خاک وطن باندھے ہوئے ہے
بنجارے کو الفت کا چلن باندھے ہوئے ہے
بڑے حساس ہیں ظل الٰہی لوگ کہتے ہیں

کبھی کھڑکی سے لیکن جھانک کر باہر نہیں دیکھا
چمکنے لگے میری پلکوں پہ موتی
مری آنکھ شاید صدف بن رہی ہے
ذرا اس کو ڈھانے کی تدبیر سوچو
جو دیوار چاروں طرف بن رہی ہے
طاق میں بجھتے چراغوں کا دھواں رکھتا ہے
جسم بوڑھا ہی سہی دل تو جواں رکھتا ہے
انیس رہتا ہوں ہندوستان کے دل میں
خوشا نصیب کہ دلی بنی ہے گھر میرا

ایسی اچھی شاعری ''معنی خیز سرورق، جاذب نظر کتابت، روشن طباعت اور اس کے ساتھ دنیا بھر کی ادبی، ثقافتی، سیاسی، سماجی اور فلمی شخصیات کے ساتھ حاجی صاحب کی بے تکلف تصویروں نے مجموعے کو دامن گل فردوش بنادیا ہے۔

○

کتنے خوبصورت پھول

کہانی :جوزف زوبیل (ایک افریقی کہانی)

شاید ہی پہلے کبھی بسنت اتنی دیر سے آئی ہو۔ مئی کی پہلی تاریخ بھی آ گئی مگر وادی میں للّی کا ایک بھی پھول نہیں دکھائی دیا۔ بارش ابھی تک جاری تھی اور آسمان کا رنگ میلا بھورا ہو رہا تھا۔ سب لوگ کہہ رہے تھے کہ پھول بیچنے والوں کی قسمت کھل گئی ہے۔ جنگلوں میں ایک دو پھول والی چند ٹہنیاں جس کے ہاتھ بھی لگ گئیں وہ اس وقت ہزاروں فرانک کما رہا ہوگا۔

دراصل چاروں طرف پھولوں کے نام پر صرف پتیاں ہی بک رہی تھیں۔ پتیوں سے ڈھکی کوئی چھوٹی سی ٹہنی جس کے سرے پر ہرا پن لیے ہوئے ایک گانٹھ ہو، اس سے کچھ کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس بار بسنت آنے میں کتنی دیر ہوئی تھی۔

پھر بھی یہ ایک سچائی تھی کہ جنگل کی ساری کلیاں کھلنے کے قریب تھیں۔ سبھی چیزیں بالکل ہم لوگوں کی طرح بسنت کے لئے بے تاب تھیں اور اس میں کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ سورج کے دکھائی دیتے ہی موسم اس قدر سہانا ہو جائے گا۔ اتنا سہانا کہ لوگوں کو سرشار کر دے گا۔

''کیونکہ جب بھی ایسا ہوتا ہے بسنت جلدی آتی ہے۔'' نکڑوں پر پرچون کی دوکانوں پر کھڑی عورتیں آپس میں ایسا ہی کہتی تھیں۔ خلاف توقع اس اتوار کو موسم اتنا خوبصورت ہو گیا تھا۔

لنچ ہوتے ہی پورا شہر جنگل کی طرف امنڈ پڑا جہاں ہر ایک کار والے کو اپنی کار کھڑی کرنے کے لئے سایہ دار جگہ ڈھونڈنے میں خاصی دقت ہو رہی تھی۔ اکیلا آدمی بھی

اگر سائے میں لیٹ کر کچھ پڑھنا یا آرام کرنا چاہتا تو اسے بھی بھٹکنا پڑ رہا تھا۔ سارا شہر عاشقوں اور محبوباؤں یا نو بیاہتا جوڑوں کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔ بچوں کی گاڑیاں لئے دھوپ بھرے گرم موسم میں بھی کالا سوٹ پہننے والے اصل باشندے جنہیں سرکار نے احترام کے ساتھ عیسائی بنا دیا تھا، وہ بھی ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ خاندان میں کم سے کم ایک شخص ایسا تھا جو پیرس ہو آیا تھا اور بچے ماں باپ یا بوڑھے فولڈنگ ٹیبلوں کے گرد بیٹھ کر تاش کھیل رہے تھے یا پلاسٹک کی بوتلوں میں بھرے رنگین مشروب پیتے ہوئے بحث کر رہے تھے۔

کچھ لوگ اپنی کار میں ہی بیٹھ کر کسی فٹ بال میچ کی کمنٹری سن رہے تھے جو پارک دی پرنس میدان میں کھیلا جا رہا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو گیند کھیلنے میں لگے تھے۔ گھٹی چاند والے کچھ توندیل بوڑھے اپنے ناتی پوتوں کے ساتھ دوڑ رہے تھے اور گزری ہوی جوانی کو واپس لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ عورتیں انہیں مسکراتے ہوئے حیرت سے دیکھ رہیں تھیں۔

کھلی دھوپ میں ہنسنا کتنا اچھا لگ رہا تھا۔

کافی تعداد میں ہاف پینٹ یا جین پہنے وہ نوجوان لڑکے لڑکیاں بھی گھوم رہے تھے جو ہر اتوار ہر موسم میں جنگل میں ضرور آتے تھے۔

سال میں پہلی بار آئس کریم والا پھر اپنی چھوٹی سی گاڑی کے ساتھ نمودار ہو گیا تھا۔ بھیڑوں کی طرح دوڑتے ہوئے بچوں نے اسے گھیر لیا تھا اور بیس یا تیس سکنڈ میں وہ انہیں آئس کریم دیتا جا رہا تھا۔ آئس کریموں کے بھی کئی رنگ تھے۔ گلابی، پیلا، بھورا، دور سے دیکھنے سے لگتا تھا گویا بچوں کے ہاتھوں میں رنگین پھول ہوں۔

جنگل میں جہاں اوک اور سفیدے کے پیڑوں کے بیچ ہری گھاس تھی وہاں کچھ عورتیں اپنے رنگین اسکرٹ سنبھالتے ہوئے نیچے جھک کر ڈیزی فلاورز، چوپتیا گھاس کے پیلے پھول جمع کر رہی تھیں۔

ہرے میدان کو چیرتی ہوئی ایک سڑک گزر رہی تھی جسے آپ پار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ دونوں طرف سے کاروں کے آنے جانے کا اٹوٹ سلسلہ تھا اور ایسی حالت میں کنارے پر کھڑے ہو کر صرف یہ محسوس کر سکتے تھے جیسے کسی ندی کے ساحل پر کھڑے ہوں اور ندی کے درمیان سے گزرتی دو مخالف لہروں کو دیکھ رہے ہوں۔

کاروں کی تیز رفتار سے، کنارے پر کھڑی عورتوں کے اسکرٹ ہوا میں لہرا اٹھتے اور دھول سے بچنے کے لے مرد اپنی آنکھوں پر رومال رکھ لیتے۔ ایسے میں صرف وہی ایک تھا جو سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر کاروں کے نزدیک آنے پر پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے جھک جاتا تھا اور اپنا ہاتھ بڑھا دیتا تھا۔ کار جتنی تیز ہوتی وہ اتنا ہی آگے کی طرف جھک جاتا بلکہ ایک دو قدم بھی بڑھا دیتا اور اپنے ہاتھ اس طرح ہلاتا جیسے کار کو ہپناٹائز کر رہا ہو اور تعجب تھا کہ ہر بار کار وہاں تک آتے آتے دھیمی ہو جاتی جیسے کوئی چڑیا اڑتے اڑتے بیٹھنے جا رہی ہو اور وہ سفید پھول کے دو گچھے ہلاتا ہوا کار کی طرف دوڑ پڑتا۔

خوش گوار موسم کے آنے کا اندازہ اسے شاید پہلے ہو گیا تھا اور اس نے گھاٹی کے للّی کے ان تمام پودوں کے بارے میں سوچ لیا تھا جو پہلی مئی تک بھی نہیں کھلے تھے اور جن کے بارے میں لوگوں کا خیال تھا کہ "ایک یا دو ہفتے لگیں گے یا دھوپ ہوتے ہی کھل جائیں گے۔"

اس کے علاوہ وہ ہر موسم میں جنگلوں میں گھومتا رہتا، کبھی مشروم کی تلاش میں، کبھی نرگس کے پھولوں کے لئے تو کبھی سوکھی لکڑیوں کے لئے۔ اسی لئے اسے یہ بھی پتہ تھا کہ گھاٹی کے کس کونے میں للّی کے پھول جلد کھل جائیں گے۔

اسے سارے جنگل کے بارے میں پتہ تھا۔

اس لئے وہ تڑکے اٹھا، اس کے لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ وہ ڈینگ مارتا تھا کہ وہ کبھی سوتا ہی نہیں اور وہ اٹھ کر "ڈیبے ال" کی طرف چل پڑا جو للّی کے پھولوں سے پٹا پڑا تھا۔ ویسے ہی جیسے "نک کولیز" نرگس کے پھولوں سے۔ اسے سبھی لوگ جانتے تھے مگر اسے یقین تھا کہ اس سے پہلے وہاں کوئی نہیں پہنچ پائے گا کیوں کہ "ڈیبے ال" کی دوری بھی کافی تھی۔

اور جیسا کہ اسے امید تھی وادی للّی کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ پھولوں سے بھری ٹہنیاں اتنی زیادہ تھیں کہ بلا مبالغہ وہ ایک ایک ٹہنی کے بجائے ہنسیے سے کاٹ کر کئی گٹھر لا سکتا تھا۔ دھوپ نکلنے تک وہ پھول توڑتا رہا اور خوشی کے مارے بطخوں کی طرح پھدکتا رہا جیسا کہ اکثر بچے خوش ہونے پر کرتے ہیں۔ اس کی پیٹھ اور کندھے میں چوٹ لگ گئی اور جانگھیں ایسی دکھنے لگیں جیسے کسی نے انہیں ڈنڈے سے پیٹ دیا ہو۔ اسی لے وہ اچکتا

ہوا چل رہا تھا لیکن خدا گواہ ہے کہ پورے وقت وہ جنگل میں اکیلا رہا اور پیاس کے مارے زبان تالوے سے چپکنے لگی اسے اتنی پیاس لگی کہ اس نے اپنے آپ سے کہا"بو بنی ہو یا نہ ہو میں پہلے ہی ڈھابے پہ جا کر ایک گچھا شاخوں کے بدلے ڈھابے کی مالکن سے کچھ لے کر پیوں گا۔ مالکن کو اس سودے میں گھاٹا نہیں رہے گا۔"

میٹھی میٹھی خوشبو والے پھولوں سے لدی خوبصورت ٹہنیوں کو اس نے جتنے اچھے ڈھنگ سے سجایا تھا، اسے دیکھ کر وہ خود خوش ہو جاتا۔

کام ختم کرنے کے بعد سورج کی روشنی میں اپنی پھیلی ٹانگوں کے بیچ للّی کی شاخوں کو رکھ کر وہ بیٹھ گیا۔ ٹہنیوں کے سروں پر کھلے چھوٹے چھوٹے سفید پھول اسکے جوتوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس نے جوتوں پر نگاہ دوڑائی۔ وہ اتنے گندے لگ رہے تھے جیسے مٹی کے بنے ہوں اور کاڈرائی کے پینٹ کسی سوکھی کھال کی ہو۔ اس نے ایک ایک ٹہنی کو آہستہ آہستہ اپنی مٹھی میں رکھتے ہوئے کئی گچھے بنائے اور ایک دھاگے سے انہیں باندھتا گیا۔

''اب وہ گچھے اس لائق ہو گئے جنہیں ایک ایک فرینک میں بیچا جا سکتا ہے۔'' اس نے سوچا۔

اور سچ مچ یہ دھندا بڑا اچھا رہا۔ اس نے خاص طور سے یہی جگہ چنی تھی۔ آگے چل کر ایک موڑ تھا اور پھر پہاڑی۔ یہاں کاریں آسانی سے رک سکتی تھیں۔

ہاں کچھ کاریں تو ایسی تھیں جو اپنی دھواں دھار رفتار میں ہی اس کے قریب تک چلی آتیں۔ اور وہ ڈر کر سڑک کے ایک کنارے کود پڑتا۔ مگر اس کے دونوں ہاتھوں میں للّی کے گچھے دیکھ کر ان خوبصورت کاروں کی رفتار دھیمی پڑتی اور وہ دھیمے دھیمے اس کے قریب آتیں جیسے کوئی بھلا کتا مٹھائی کے قریب پہنچتا ہے۔

''اوہ! یہ کتنے خوبصورت ہیں۔'' ہر کار میں سے اسی طرح کی آواز آتی اور انہیں لگتا کہ ان کی قیمت ایک دم واجب ہے۔

''اوہ! بیوٹی فل" کار کی کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی خوبصورت لڑکیاں چیختیں۔

اور وہ بولتا۔

''میڈم اس کی خوشبو تو دیکھئے۔''

پھر وہ میڈم رکتیں۔ بڑی بڑی کالی لیسیز سے سجی خوبصورت پلکوں کو اوپر نیچے

جھپکاتیں، جو گندے ہاتھوں کے ذریعے انکے نازک خوبصورت چہرے کے لئے پیش کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی عورتیں وہ پھول لینے سے انکار کر دیتیں جو وہ انہیں خود دیتا تھا اور اسے کار کے نزدیک بلاتیں تاکہ اپنی پسند کا خوشہ چھانٹ سکیں۔

دو گچھے، تین گچھے اور کبھی کبھی ریز گاری رکھ لینے کے لئے کہا جاتا۔ پھر تیز رفتار سے وہ کار آگے بڑھ جاتی اور فوراً ہی دوسری کار آ پہنچتی۔

وہ مسکراتے ہوئے اپنے بیگ کو یوں سہلاتا جیسے کسی پالتو جانور کے روئیں پر ہاتھ پھیر رہا ہو اور دل میں سوچتا 'کاش ہر دم ایسا ہی ہوتا''۔

لیکن فوراً ہی وہ پھر اپنی جگہ پر آجاتا اور بانہیں ہوا میں پھیلا کر آگے جھکتا، ایک دم آگے بڑھتا پھر تیز رفتار سے آتی کار کے رکنے کے ساتھ قدم پیچھے لوٹا کر کار کی طرف بڑھتا، دراصل کار کو روکنا اتنا آسان کام نہیں تھا۔

کچھ دیر کے لئے اسے یہ ایک کھیل جیسا مزا دینے لگا اور وہ گننے لگا کہ اس نے اب تک کتنے داؤ جیتے۔

اس چکر میں وہ دیکھ ہی نہیں سکا کہ اس کے پیچھے کچھ دوری پر ایک گاڑی آکر کھڑی ہو گئی ہے۔ اک کالی گاڑی جو کسی جنگلی شہد کی مکھی کے رنگ کی طرح تھی اور جو سڑک کی دھول سے اٹی ہوئی تھی۔ گاڑی کے آگے ایک اونچا سا ایریل ہوا میں ادھر ادھر لہراتا ہوا چمک رہا تھا۔

گاڑی میں سے نیلی وردی، اونچی ٹوپی اور چمچماتے ہوئے چست بوٹ پہنے دو گارڈ کے سپاہی اترے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی کیس میں سے ایک دم نئے دو کھلونے باہر نکل آئے ہوں۔

اس نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔

اور دیکھ بھی لیتا تو کیا؟

اس بیچ اس نے اپنے پیچھے سے اچانک ایک آواز سنی ''کیوں بے تو یہاں کیا کر رہا ہے؟''

سچ بات کہیں تو اسے پولس سے کبھی ڈر لگا ہی نہیں۔ کیونکہ جیسا وہ سنتا آیا تھا، نہ تو اس نے کسی کا قتل کیا تھا اور نہ کبھی چوری ہی کی تھی۔

پھر بھی اسے لگا کہ پولس والے کا آنا یا اس طرح بولنا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔

دونوں ہاتھو میں للّی کے گچھے تھامے وہ پیچھے مڑا اور بولا ”میں؟“

”ہاں تو ہی۔“ ایک پولیس والے نے جواب دیا اور اس کے قریب آتے ہوئے چیخا۔

”میں پوچھ رہا ہوں کہ تو یہاں کیا کر رہا ہے؟“

”لیکن سارجنٹ میں تو میں۔“

”تیرا شناختی کارڈ کہاں ہے؟“

”لیکن میں کچھ کر نہیں رہا تھا سارجنٹ“

بجلی سے جھلسی ہوئی شاخوں کی مانند اس کی بانہیں اس کی بغل میں جھول گئیں او اسی وقت دونوں مٹھیوں میں کس کر پکڑے ہوئے للّی کے گچھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔

”میں کہتا ہوں اپنا کارڈ نکال۔“ پولس والا پھر چیخا۔

للّی کی ٹہنیوں کو تھیلے میں رکھتے ہوئے اس نے اپنی پرانی جیکٹ کے اندر ایک ہا ڈالا اور دوسرے سے بٹن کھولتا ہوا سڑی ہوئی پتیوں جیسا کوئی بنڈل نکالا جسے کھول کر کا ہاتھوں سے اس نے سارجنٹ کی طرف بڑھا دیا۔

ہونٹ چباتے ہوئے انہوں نے کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور اس میں کوئی ٔ نکالنے کی گنجائش تلاش کرتے رہے۔ دوسرا پولیس والا قریب آکر اپنے ساتھی کے کند جھکتے ہوئے کارڈ پڑھنے لگا اور پھر کالے چمڑے میں لپٹی موٹی ڈائری نکال لی۔

”لیکن میں کچھ کر نہیں رہا تھا۔ سر

”کہاں رہتا ہے؟“

پوچھتا ہوں کہاں رہتا ہے؟“

اس نے باربیکیو کی طرف انگلی اٹھائی جو دکھائی تو نہ دیتا تھا مگر کافی نزدیا مشکل سے دو کلو میٹر دور۔

”گاؤں میں کس کے یہاں؟“

”حضور اصل میں میں ان لوگوں کے لئے کام کرتا ہوں۔“

"اور ابھی تو کس کے لئے کام کر رہا ہے؟"

"سر۔ جاڑا ختم نہ ہونے سے ابھی کام شروع نہیں ہوا ہے لیکن کچھ لوگوں نے مجھے پہلے سے کام کے لئے کہہ رکھا ہے۔"

ڈائری کے ساتھ دھاگے میں بندھی ایک پینسل سے پولیس والا ڈائری میں کچھ لکھتا رہا اور بیچ بیچ میں اپنے ساتھی کے ہاتھ میں دبے کارڈ پر نگاہ ڈالتا رہا۔

"لیکن میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔"

"جنگل سے للّی کے پھول لا کر یہاں بیچنے کا تجھے کوئی حق نہیں ہے۔" ایک پولیس والے نے کہا۔

"مجھے کوئی حق نہیں۔ کیا مطلب؟ جنگل کی شاخیں تو سب کی ہیں۔"

دوسرا پولس والا، جو ابھی تک لکھ ہی رہا تھا اپنی پنسل اوپر اٹھاتا ہوا بولا "ایک دم درست۔ یہ سب کی ہیں، پر جب تو اسے توڑ کر بیچے گا تو لوگوں کے مال کی چوری کہی جائے گی۔ کیا تجھے یہ پتہ نہیں ہے؟"

اب تک کئی بچے اور کچھ بڑے بوڑھے اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ اور بھی چیختے ہوئے بولا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا ہے۔"

"کیا یہ بھی بتانا پڑے گا کہ راستے میں کاریں رکوا کر تو حادثے کی گنجائش پیدا کر رہا تھا۔" پولیس والے نے کہا۔ پھر کارڈ اسے واپس کر دیا۔

"میں قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے بالکل پتہ نہیں تھا کہ یہ غیر قانونی ہے۔ سر ابھی پچھلے ہفتے سب لوگ!"

"ہاں، لیکن للّی بیچنے کی چھوٹ صرف پہلی مئی کو ہے۔ نادان بننے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

سڑک کے دوسری جانب سے اس کے سارے ہاؤ بھاؤ، بولتے وقت جھکتے جانا اور پولیس کے سامنے چھاتی پیٹتا دیکھا جا سکتا تھا۔ پولیس والے نے اس کی جیب میں کارڈ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، ہم دیکھیں گے۔"

سارے لوگ اسے دیکھ رہے تھے۔ چٹانوں پر بیٹھے یا گھاس پر آدھے لیٹے لوگ یوں دیکھ رہے تھے جیسے ان کا اس سے کوئی خاص سروکار نہ ہو۔

کاروں کا پاگل کارواں گزرتا جا رہا تھا

اچانک لوگوں نے دیکھا کہ وہ سارے پھول بانٹ رہا ہے۔ ایک اس شخص کو تو دوسرا اس خاتون کو تو تیسرا اس لڑکے کو جو پھول لے کر تیزی سے بھاگا کچھ بچے اس کی طرف دوڑے جب کہ کچھ ایک دم جھپٹ ہی پڑے اور اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل پڑی۔

''ممی ڈیڈی یہ دیکھو۔''

سڑک کے پار جو لوگ کھڑے تھے وہ کاروں کی وجہ سے اس طرف نہیں آپار ہے تھے چار پانچ نے جانے کی تیاری کی پھر پیچھے ہٹ گئے۔ آخر ایک کار سے بچتے ہوئے سب اس کی طرح لپکے۔

ایک عورت اپنے بیٹے کو لگاتار آواز دے رہی تھی ''جیاں کلاو، اوہ! اے خدا!''

لیکن اب کافی دیر ہو چکی تھی۔

بیگ خالی ہو گیا تھا۔

اب وہ اپنے پیر پٹخ رہا تھا اور جھنجھلا رہا تھا۔ وہ اپنی ٹوپی ہوا میں اچھالتا۔ پھر پکڑ لیتا اور چاروں طرف اپنی باہیں پھینکتا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ابھی پھٹ پڑے گا۔

بچے حیرانی میں پیچھے ہٹ گئے۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ کہیں ناراض نہ ہو جائے۔ مگر ایک عورت اس کے قریب جا کر بولی۔

''تمہاری یہ للّی کی شاخیں سچ مچ بہت پیاری ہیں۔ میری بچی کو تم نے ایک گچھا دیا۔ اس کے لئے شکریہ!''

عورت نے اس کو یہ گچھا دکھایا جو اس کی انگلیوں کے بیچ میں دبا تھا۔ مگر اس نے کچھ دھیان نہیں دیا۔

''کیا آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے کہ میں نے کیا جرم کیا تھا؟'' وہ چیخ پڑا۔

''سنو! یہ لو'' عورت نے کہا۔ عورت کے ہاتھ میں سکہ دیکھ کر وہ ابل پڑا۔

'اپنا پیسہ اپنے پاس ہی رکھئے مادام۔ میں آوارہ ہوں لفنگا ہوں، جیسا کہ انہوں نے مجھے درج کر رکھا ہے۔ میرا کوئی خاندان نہیں ہے۔ مجھے پیٹ بھرنے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔''

''اوہ!'' عورت نے کہا ''اتنے پریشان مت ہو۔''

''مجھے گھریلو نوکر ہونے کا بھی حق نہیں۔'' وہ بولتا جارہا تھا ''میرے لئے صرف جیل میں ہی جگہ ہے۔''

اس کے غصے کے درمیان عورت نے کسی طرح سکہ اس کی جیکٹ کی جیب میں ڈال دیا اور للی کے پھولوں کو سونگھتے ہوئے واپس چلی گئی۔

پھر اپنے آپ ہی بڑ بڑاتا ہوا وہ تیزی سے لڑکھڑاتے قدموں سے سڑک کے کنارے سے بڑھا اور آخر میں گھاس پر جاکر گر پڑا، وہیں پڑا کروٹ بدلتا رہا اور دونوں ہتھیلیوں سے چہرے کو کس کر ڈھانپے رہا۔

وہ چیخ نہیں رہا تھا۔

وہ بار بار ادھر ادھر لوٹتا رہا۔ بیچ بیچ میں اس کے منہ سے ایسی کراہ نکلتی جیسے کوئی زخمی جانور مر رہا ہو یا کوئی آوارہ شرابی بے شرمی کے ساتھ لوٹ رہا ہو۔

لیکن اب کوئی اس کی طرف دھیان نہیں دے رہا تھا۔

○

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی مطبوعات

۱	اقبال آئینہ خانے میں (اقبال سیمینار کے مضامین کا مجموعہ)		پروفیسر آفاق احمد	40/
۲	سورج نما		محمد علی تاج	12/
۳	خاموش آواز (صفیہ اختر اور خدیجہ اختر کے نام خطوط)		خان نثار اختر	
۴	فاروق تصور	(مضامین)	کوثر چاندپوری	13/50
۵	کلام حامد	شاعری	حامد سعید خاں	12/
۶	لو آج ہم بھی	(مزاحیہ)	شفیقہ فرحت	12/
۷	شعاع فکر	شاعری	وکیل بھوپالی	13/
۸	نشاط فکر	شاعری	واصل انصاری	11/
۹	مدھیہ پردیش میں اردو ادب کے پچیس سال (نثر و نظم کا انتخاب)		اردو اکادمی	60/
۱۰	صدف	شاعری	خلیق رامپوری	12/50
۱۱	شب ریزے	شاعری	ڈاکٹر اختر قمی	13/
۱۲	نقوش دل	شاعری	ولی وارثی	17/
۱۳	تحقیق اور حاصل تحقیق مقالات		ڈاکٹر سید حامد حسین	14/
۱۴	اشعار نادر اثر	شاعری مثنی	پربھو نوزاشر	16/
۱۵	دیوان غالب جدید نسخہ حمیدیہ		مفتی محمد انوار الحق	32/
۱۶	کاغذ	شاعری	وحید پروار	15/
۱۷	جادوگری	افسانے	کوثر جہاں	14/
۱۸	شخصیات (سید محمود الحسینی کے خاکوں اور مضامین کا انتخاب)		صادق حسین صدیقی	19/
۱۹	ادان تکدو	شاعری	شوق ماہری	15/
۲۰	چراغ رہگذر	شاعری	امام مظفر شاداں گوالیاری	15/
۲۱	انوکھا مقامہ بچوں کے لیے کہانیاں		قاضی انصاری	9/
۲۲	نشید	شاعری	صادق اندوری	15/
۲۳	سحر نما	شاعری	عشرت قادری	15/
۲۴	دیوان منیر	شاعری	منیر بھوپالی	15/
۲۵	لمحوں کا سفر	افسانے	ڈاکٹر رضیہ حامد	15/
۲۶	یادوں کے چراغ	افسانے	اقبال جعفری	15/
۲۷	لمحات سہا	شاعری	مولانا سہا مجددی	18/
۲۸	نگاہ	شاعری	اختر سعید خاں	20/
۲۹	ہندی ڈرامے کا ارتقاء (تحقیق و تنقید) ویدک دور سے ۱۹۴۷ء		ابراہیم یوسف	21/
۳۰	کلام صابر	شاعری	فضل حسین صابر	17/
۳۱	متاع دیدہ تر	شاعری	نصیر پروار	15/
۳۲	موج غزل	شاعری	پنالال شری واستو نور	17/
۳۳	اب میں کیا کروں	مزاحیہ	مصطفیٰ تاج	17/
۳۴	دامن سنگ	شاعری	سردار دانش	18/
۳۵	برکت اللہ بھوپالی	سوانح	قاضی واجد الحسینی	28/
۳۶	ماریانت	افسانے	فرحت جہاں	15/
۳۷	حرف حرف آئینہ	شاعری	مختار شمیم	14/-
۳۸	نگارشات (انتخاب مضامین سید قمر الحسن)		آفاق احمد	15/
۳۹	حرم	ناول	وسیم بانو قدوائی	25/
۴۰	ترکش	شاعری	شکیل گوالیاری	15/
۴۱	نذرانۂ عقیدت (باتصویر) مرتبہ فضل تابش، محمد رئیس خاں، مظفر رئیس (اردو اور دیوناگری رسم الخط میں اندرا گاندھی پر اردو شعراء کا منظوم نذرانۂ عقیدت اور اندرا گاندھی کے خیالات)			100/-
۴۲	کرن	شاعری	خالد محی	17/
۴۳	لفظوں کا سفر	شاعری	کامل بہزادی	18/
۴۴	جاگتی رتوں کی فصل	شاعری	مرتضیٰ علی شاد	22/
۴۵	انبار	شاعری	وامق اندوری	17/
۴۶	موج رواں	شاعری	اویس کاوش	16/50
۴۷	تن معتہ	شاعری	ناطق مالوی	20/
۴۸	متاع قلم	شاعری	شمیم اشرفی صابر	17/
۴۹	نوناپ	شاعری	طلعیہ پرویز	16/
۵۰	گل صحرا	شاعری	حبیب ارشد راہی بالاگھاٹی	18/
۵۱	برکت اللہ بھوپالی (سوانح دیوناگری میں)		قاضی واجد الحسینی	60/
۵۲	میثاق	شاعری	قاضی حسن رضا	23/50
۵۳	ایاغ شاد	شاعری	لالتاپرشاد میرٹھی	30/
۵۴	تعمیر و فکر مدھیہ پردیش کے ۵۰ ہندی شعراء کا انتخاب (ترتیب و حواشی اظہر راہی، موہن ورما، فضل تابش، حیدر عباس رضوی)			58/
۵۵	پرشور خاموشی	افسانے	آفاق احمد	22/
۵۶	پریم چند شناسی (پریم چند صدی سیمینار کے مقالات) مرتبہ آفاق احمد			50/-
۵۷	تپش حیات	شاعری	کاشف الہاشمی اوجینی	40/
۵۸	روشنی سی تہ بہ تہ کالی ہے	شاعری	فضل تابش	60/
۵۹	افکار محبت	شاعری	ڈاکٹر محبت گلشن آبادی	50/
۶۰	نکات دانش	شاعری	دانش مالوی	80/
۶۱	تار نفس	شاعری	محمود بیگ ساز	50/
۶۲	روشنی، دھوپ، چاندنی	شاعری	اسد بھوپالی	50/-
۶۳	ذکر جمیل	خاکے	عارف عزیز	50/
۶۴	یاس سحر (عکسی ایڈیشن)	شاعری	سراج میر خاں سحر	50/

انتخاب کلام

غزلیں

نظمیں

نظمیں

چھ دسمبر

سنو! سنو! سب مرے عزیزو!
مرے رفیقو!
مرے وطن مادر وطن کے
عجیب لوگو!
غریب لوگو!
تمہیں مبارک ہو موت اپنی
کہ مر گئے ہو تو کتنے خوش ہو!؟
کہ اب تمہاری طرف تو نالیں نہیں اٹھیں گی
تمہارے اپنے محافظوں کی
نہیں جلیں گے مکاں تمہارے
تمہارے بچے یتیم ہوں گے نہ مائیں بیوہ
تمہاری بہنوں کی عصمتیں بھی نہیں لٹیں گی
نہ تم جیو گے نہ تم مرو گے!
کہ مر چکے ہو تو مطمئن ہو
تمہیں مبارک ہو موت اپنی!
مگر ہماری طرف تو دیکھو
ہماری حالت عجیب تر ہے
کہ ہم تو اب تک بھی جی رہے ہیں
_____ وہیں کھڑے ہیں
اعادہ ان سب کا جھیلنے کو
جو ہو چکا ہے تمہارے آگے
تمہارے پیچھے
پھر اس سے پہلے
پھر اس سے پہلے
مگر سنو سب مرے عزیزو!
کہ ہم جو زندہ ہیں اس لئے ہیں
کہ اپنی باری کے منتظر ہیں
سب اپنی باری کے منتظر ہیں
ہم اپنی باری کے منتظر ہیں
_____ وہ اپنی باری کے منتظر ہیں

صیّاد کے ہم نَفَس

(ایک دوست کے سانحۂ ارتحال پر)

چند دن پیشتر
گلشن دہر میں
خوبصورت حسیں، اک گل نازنیں
اپنے سینے میں خوشبو چھپائے ہوئے
رونق گلستاں کو بڑھائے ہوئے
جب وہ غنچہ ہی تھا
ایک دن یک بیک!
صبح کاذب کا روشن اندھیرا ہوا
گدگدایا نسیم سحر نے اسے
اس کو دھوکا ہوا
غنچہ، غنچہ ہی تھا
آ گئی تھی ہنسی،
کھِل گیا
اس کا کھلنا ذرا سا نہ دیکھا گیا
ساری خوشبو نکل کر پریشاں ہوئی
خیر ......
اس کو شبنم کے موتی ملے
اور پھر..
صبح صادق کی تاریک روشنی ہو گئی
چل دیے اس کے موتی اسے چھوڑ کر
کچھ شعاعوں نے گرما دیا تھا انہیں

اور پھر کیا ہوا؟
دست گل چیں بڑھا اور پھر کیا ہوا!!
پھول جھنجھلا گیا
پنکھڑی جھڑ گئی
اور وہ چلا اٹھا
ایک دو ہی نہیں سب کے سب
اس چمن میں ہیں صیاد کے ہم نفس

دوسرا رشتہ

وہ سوچتی تھی کسی وقت ماں سے کہہ دوں گی
کہ اونچے قد کا صحت مند جسم والا شخص
ہمارے گھر میں جو ہر روز آیا کرتا ہے
میں خواہشات کی دنیا میں اس کی محرم ہوں
خوشی سے ماں اسے فرزندگی میں لے لے گی
ہر آرزو کا مری احترام کرتی ہے

اور ایک رات یہی سوچ کر وہ خلوت میں
جو ماں سے ملنے کو پہنچی تو انکشاف ہوا
کہ جس کو ماں کا وہ بیٹا بنانے والی تھی
وہ شخص رشتے میں اب اس کا باپ لگتا ہے

فاصلہ

میں ایک مشرقی خاتون تھی قسم لے لو!
خود اپنے سائے سے ڈرتی تھی چونک جاتی تھی
وہ مجھ کو غیر مہذب کے نام سے اکثر
پکار کر مرے نشتر لگایا کرتے تھے
انہوں نے مجھ کو بہ اصرار چند مردوں سے
کسی وجہ سے وہ احباب جن کو کہتے تھے
ملایا ،بات کرائی، تکلفات اٹھے
بقول ان کے نئی روشنی ملی مجھ کو
اور آج جبکہ میں تہذیب کی امانت ہوں
ہر اک نظر میں ہوں روح رواں لطافت کی
ہر ایک شب نئی آغوش کی ضیافت ہوں
وہ مجھ سے لڑتے ہیں وہ مجھ سے روٹھ جاتے ہیں
کبھی کبھی مجھے ایسا گماں گزرتا ہے
کہ جس خیال پہ نازاں تھے وہ ہمیشہ سے
اب اس خیال کے آتے ہی ٹوٹ جاتے ہیں

معلم

میں کہ اک معلم ہوں
میں نے تم کو بخشا ہے
اک شعور بے پایاں
آگہی کے دریا میں
پیرنا سکھایا ہے
عقل کے مناروں سے
روشنی عطا کی ہے
میں کہ اک معلم ہوں
تم ہنوز گونگے تھے
تم ہنوز ننگے تھے
جنگلوں میں جھاڑوں میں
سخت جاں پہاڑوں میں
زندگی کی امیدیں
گرسنہ شکم خوردہ
آتش ستم گر کی
بندگی میں لاتے تھے
اور سعیٔ پیہم سے
تم کبھی اس آتش کو
بے ضرر پرندوں کے
خون سے بجھاتے تھے
اور یوں بھی ہوتا تھا
آتش شکم کو جب
بے ضرر پرندوں کے
خون سے بجھانے کی

جب تمہاری ہر کوشش
رائگاں چلی جاتی
اور سعیٔ لاحاصل
اک سوال سا بن کر
تم غریب لوگوں کے
سامنے چلی آتی
آہ! تم کہ تنگ آکر
اپنا گوشت کھا لیتے
یعنی اپنے ہی جیسے
غم نصیب انساں کی
بوٹیاں چبا لیتے
میں کہ اک معلم ہوں
آہ! تم کہ بے چارے
روشنی سے بے بہرہ
زندگی سے ناواقف
موت کی گپھاوں میں
شب پناہ غاروں میں
زندگی کی امیدیں
گرسنہ شکم خوردہ
آتشِ ستم گر کی
بندگی میں لاتے تھے
اور سعی پیہم سے
تم کبھی اس آتش کو
بے ضرر چرندوں کے
خون سے بجھاتے تھے
میں کہ اک معلم ہوں
میں کہ تم کو دنیا میں

موت کی گپھاؤں سے
زندگی میں لایا ہوں
اور میں تم کو دنیا کے
شب پناہ غاروں سے
روشنی میں لایا ہوں
میں کہ اک معلم ہوں
میں نے تم کو بخشا ہے
اک شعور بے پایاں
عقل کے مناروں سے
روشنی عطا کی ہے
آگہی کے دریا میں
تیرنا سکھایا ہے
اور تم کو حیواں سے
آدمی بنایا ہے
میں کہ اک معلم ہوں
تم ہنوز عریاں تھے
کب تمہیں میسر تھا
یہ لباس تن پوشی
میں نے تم کو پہنائے
صد ہزار پیراہن
تم ہنوز گونگے تھے
کب تمہیں سلیقے سے
بات کرنی آتی تھی
میں نے تم کو سکھلائے
گفتگو کے سارے فن
میں کہ اک معلم ہوں
میں کہ زندگانی سے

ناامید رہرو کو
منزل مقاصد تک
اپنے ساتھ لایا ہوں
اور اس طریقے پر
شعبہ ہائے دنیا میں
بار بار آیا ہوں
میں کہ اک معلم ہوں
آج تم مہذب ہو!
آج تم ہو شائستہ!
یہ بھی میری کوشش کا
لازمی نتیجہ ہے ـــــــ
میں کہ اک معلم ہوں
میں اگر نہیں ہوتا؟
میں اگر نہیں ہوتا!
جنگلوں کے پیڑوں کی
خشک چھال اور پتے
سب تمہارے جسموں کا
جزو بن گئے ہوتے
میں اگر نہیں ہوتا!
تو تمہاری اولادیں
نالیوں کے کیڑوں سی
زندگی بسر کرتیں
میں کہ اک معلم ہوں
میں وہ ہوں کہ دنیا میں
ایسا مرتبہ پایا ـــــــ
تھیں تمہاری اولادیں
اور میں باپ کہلایا

زندگی کیا ہے اگر موت اسے کہتے ہیں

بانی سیفیہ کالج، بھوپال ملّا سجاد حسین مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر

آج پھر رات گئے درد نے کروٹ بدلی
دل کے حساس دریچے سے ہوا کا جھونکا
میں نے سوچا تھا کہ لمحات کی رفتار لئے
شعلۂ آتش غم چھو کے گزر جائے گا
اور پھر موج صبا رات کی کالی چلمن
غیر محسوس سی جنبش سے بصد ناز و ادا
ایک جانب کو ہٹائے گی بقدر توفیق
تلخ یادوں کا دھواں دل کے نہاں خانوں سے
تیز پرواز پرندے سا گزر جائے گا
صبح نو باندھ کے آئے گی سنہری سہرا
اور طباشیر بکھیرے گی ________
________ مگر یوں نہ ہوا
میں نے سوچا تھا کہ جب شب کا فسوں ٹوٹے گا
خود بخود ذہن کے آنگن میں خیالوں کا مزاج
شاہ خاور کی تمازت سے پگھل جائے گا
ساز فطرت پہ فضاؤں میں خوش آواز طیور
اپنے نغمات اچھالیں گے ________
________ مگر یوں نہ ہوا
اس کے برعکس ہوا یوں کہ افق کا چہرہ
سرخ ہوتا گیا، ہوتا گیا، ہوتا ہی گیا
صبح کے زرد ستارے نے کیا مجھ کو سلام
تو یوں محسوس ہوا پیکر اخلاص کوئی
تعزیت کو کسی گھر آئے پس از مرگ عزیز
دل کو مانوس فضاؤں نے بہت کچھ چھیڑا
حسب معمول سحر آئی اجالے جاگے
پرچم خاور مشرق کھلا طائر چہکے
مگر ایسا نہ ہوا جیسا کہ اندازہ تھا
تلخ یادوں کا دھواں دل کے نہاں خانوں سے
تیز پرواز پرندے کی طرح اڑ نہ سکا
خود بہ خود ذہن کے آنگن میں خیالوں کا مزاج
شاہ خاور کی تمازت سے بدل بھی نہ سکا
صبح تو آئی مگر رات کی تقدیر لئے
سال دو سال کی سوئی ہوئی تصویر لئے
صاف ہوتے گئے تصویر کے دھندلائے نقوش
ذہن کی سطح پہ نورانی سا پیکر ابھرا
نرم، مشفق سے خدو خال، دمکتا چہرا
بولا احساس کہ یہ ہیں وہی سجاد حسین
منبع علم تھی کل ذاتِ گرامی جن کی
علم کی آج بھی پہچان ہے تحفہ ان کا
موت نے چھین لیا پیکر خاکی لیکن
وہ نئے دور کے سینے میں ابھی زندہ ہیں
بلکہ رخشندہ و تابندہ پائندہ ہیں

دل کی محفل میں سدا، صدر نشیں رہتے ہیں
زندگی کیا ہے اگر موت اسے کہتے ہیں

پتھر

آؤان سے ملو یہ پتھر ہیں!
آپ کے اس جہان کے پتھر
اونچی نیچی دکان کے پتھر
خام و پختہ مکان کے پتھر
آؤان سے ملو یہ پتھر ہیں!
یہ بھی پتھر ہے میل بن کر جو
آپ کو فاصلہ بتاتا ہے
کوئی رہرو ہو اس کے پاس آکر
دوری منزل کی جان جاتا ہے
آؤان سے ملو یہ پتھر ہیں!
ان سے ملیے کہ یہ بھی پتھر ہیں
مندروں کے دلوں میں رہتے ہیں
ان کے پیکر تراشنے والے
اپنا خالق انہیں کو کہتے ہیں
ان کے سر پر ہیں تاج ہیروں کے
اور زینت بدن کی سونا ہے
ان گنت ان کے چاہنے والے
عاجزی سے خلوص و منت سے
خوف سے آرزو سے حسرت سے
عاشقی سے نیاز و الفت سے
اور اک جذبہ عقیدت سے
شہروں قریوں سے دوڑے آتے ہیں
ان کے آگے جبیں جھکاتے ہیں

آؤان سے ملو یہ پتھر ہیں!
آؤاس سے ملو کہ یہ پتھر
سنگ مرمر کا نام رکھتا ہے
اس کے جسم حسین میں ڈھل کر
تاج اپنا مقام رکھتا ہے
آؤان سے ملو یہ پتھر ہیں!
یہ بھی پتھر ہے قیمتی پتھر
لوگ ہیرا اسی کو کہتے ہیں
اس سے بڑھتی ہے الفت محبوب
خوں کے دریا بھی اس سے بہتے ہیں
آؤان سے ملو یہ پتھر ہیں!
ایک پتھر ہے سنگ منبر بھی
واعظ و حافظ و فقیہہ و امام
اس پر اپنے قدم جماتے ہیں
خود تو ڈرتے ہیں حاکموں سے مگر
ہم کو اللہ سے ڈراتے ہیں
آؤان سے ملو یہ پتھر ہیں!
یہ بھی پتھر ہے جس کے ماتھے پر
سیکڑوں لوگ بوسہ دیتے ہیں
اور ہم سب بڑی عقیدت سے
سنگ اسود اسی کو کہتے ہیں
آؤان سے ملو یہ پتھر ہیں!
یہ وہ پتھر ہے آج عظمت کے
کتنے اعزاز اس نے پائے ہیں
چاند پر جا کے لوٹنے والے
چند پتھر ہی لے کے آئے ہیں

زاویے

مالوے کی حسین راتوں میں
سبز تالاب کے کنارے پر
میں نے گھنٹوں ٹھہر کے دیکھا ہے
ایک حسن و جمال کا منظر
میں نے دیکھا ہے گہرے پانی میں
شوخ بچپن، بھری جوانی میں
چاند اکثر نہانے آتا ہے
اور تاروں کو ساتھ لاتا ہے
چاند لگتا ہے کرشن ہو جیسے
اور تارے ہوں گوپیاں اس کی
کرشن کو میں نے جب جہاں پایا
گوپیوں ہی کے درمیاں پایا
چاند لگتا ہے ساقیِ محفل
اور تارے کہ رندو میکش ہیں
ساقی رندوں کو جام دیتا ہے
پی کے ہر رند مست رہتا ہے
چاند لگتا ہے راجہ اندر ہے
اور تارے حسین پریاں ہیں
پریاں اندر سبا میں رہتی تھیں
میری دادی یہ مجھ سے کہتی تھیں

چاند لگتا ہے ایک دلہن ہے
اور تارے سہیلیاں اس کی
اپنی سکھیوں کے بیچ، جھرمٹ میں
دلہن گٹھری بنی سی بیٹھی ہے
چاند لگتا ہے پھول کی مانند
اور تارے ہیں تتلیوں کی طرح
پھول کو جب جہاں بھی پاتی ہیں
تتلیاں اڑ کے پاس آتی ہیں
چاند لگتا ہے اک ٹرافی ہے
اور تارے ہیں کپس چاندی کے
جیت کر کوئی ٹیم ان سب کو
آسماں پر سجا کے آئی ہے
چاند لگتا ہے فلم کا ہیرو
اور تارے عوام ہیں سارے
ہیرو جس جس جگہ بھی جاتا ہے
اپنے شیدائیوں کو پاتا ہے
چاند لگتا ہے ایک دولہا ہے
جتنے تارے ہیں سب براتی ہیں
اور ان سب کے بیچ میں دولہا
اپنا سہرا اٹھائے بیٹھا ہے

چاند لگتا ہے اک طوائف ہے
اور تارے ہیں اس کے شیدائی
جب وہ محفل میں ناچ کرتی ہے
ساری محفل کی جانچ کرتی ہے
چاند لگتا ہے ایک پاگل ہے
اور تارے شریر لڑکے ہیں
پگلا راہوں سے جب گزرتا ہے
ایک جھنڈ اس کے ساتھ چلتا ہے
چاند لگتا ہے اجنبی لڑکی
اور تارے جوان لڑکے ہیں
لڑکی سہمی ڈری سی جاتی ہے
دیکھیں اب کیسی نوبت آتی ہے
چاند لگتا ہے شمع کی مانند
اور تارے ہیں جیسے پروانے
شمع روشن رہے گی ساری رات
اور پروانے بجھتے جائیں گے
چاند تاروں کی چند تصویریں
دوستوں کے حضور لایا ہوں
سوچ سکتا نہیں کوئی، خالدؔ!
میں بھی کیا کام کر کے آیا ہوں

تحفہ گلاب کا

ایک دوست کی شادی کے موقع پر

باندھا ہے کس نے سر پہ یہ سہرا گلاب کا
بدلا ہوا ہے صبح سے نقشہ گلاب کا
سہرے پہ اس طرح سے ہے قبضہ گلاب کا
جیسے ازل سے تھا یہی منشا گلاب کا
دعوا تھا اس غریب کو مجھ سا کوئی نہیں
محفل میں یہ غرور بھی ٹوٹا گلاب کا
جیسے کہ بزمِ ناز میں روشن ہو اک چراغ
سہرے کے درمیاں ہے وہ چہرا گلاب کا
ہر بد نظر کی خواہشِ دل گھٹ کے رہ گئی
بیٹھا ہوا ہے سہرے پہ پہرا گلاب کا
سہرے نے وہ مقام دیا ہے ان دنوں
بجنے لگا ہے شہر میں ڈنکا گلاب کا
اس گل بدن کے واسطے سہرے کا ذکر تھا
احباب لیکے آگئے تختہ گلاب کا
دولہا کی سمت جب کوئی حاسد نظر اٹھی
آنکھوں میں چبھ گیا وہیں کانٹا گلاب کا
سہرے میں اپنا نام لکھانے کا شوق تھا
گل بن گیا ہر ایک شگوفہ گلاب کا
دولہا ہے رنگ و نکہتِ گل میں بسا ہوا
سسرال سے ملا ہے وہ تحفہ گلاب کا
خالدؔ روش روش پہ بہاریں ہیں خیمہ زن
بھوپال اپنا ہو گیا خطہ گلاب کا

غزلیں

○

رنگ ورامش، زمزمے، گل ہائے تر ہوتے ہوئے
دل اکیلا اور اتنے ہم سفر ہوتے ہوئے

آنسوؤں سے سرد ہو جاتی ہے ہر سینے کی آگ
میرا دل آتش کدہ ہے چشم تر ہوتے ہوئے

دل کی دنیا میں اندھیرا ہو تو کچھ روشن نہیں
آنکھ، چشم سنگ ہے شمس و قمر ہوتے ہوئے

چشم آگے ایک چہرہ، پاؤں گو چکر میں ہیں
دربدر ہوتا نہیں دل، دربدر ہوتے ہوئے

حوصلہ ٹوٹا تو وہ عبرت کا منظر آگیا
اڑ نہیں پائے پرندے، بال و پر ہوتے ہوئے

نصف دنیا بھوک سے اور پیاس سے مغلوب ہے
دست و بازو، ذہن و دل، لعل و گہر ہوتے ہوئے

ہر کس و ناکس پہ کر لیتا ہے فوراً اعتبار
بے خبر کتنا ہے خالدؔ باخبر ہوتے ہوئے

○

راستہ پرخار، دلی دور ہے
سچ کہا ہے یار، دلی دور ہے

کام دلی کے سوا ہوتے نہیں
اور ناہنجار دلی دور ہے

اب کہیں پر بھی سکوں ملتا نہیں
آسماں قہار دلی دور ہے

پھونک دیتا ہے ہر اک کے کان میں
صبح کا اخبار دلی دور ہے

کل تلک کہتے ہیں دلی دور تھی
آج بھی سرکار دلی دور ہے

"صبح گزری شام ہونے آئی میر"
تیز کر رفتار دلی دور ہے

کون دلی سے مسیحا لائے گا
خالدؔ بیمار دلی دور ہے

○

وقتِ قیام دست قضا نے نہیں دیا
چلنے لگے تو ساتھ ہوا نے نہیں دیا

پہلے ہی مرحلے میں قلم ہو کے رہ گئے
دستِ ہنر کو ہاتھ دکھانے نہیں دیا

گرنا تو کیا برا تھا مگر اُس کو کیا کہیں
جو گر گیا تو اٹھنے اٹھانے نہیں دیا

اب ان کی کج روی سے شکایات ہیں ہمیں
ہم نے ہی ان کو راہ پہ آنے نہیں دیا

دو چار تو مکان ہیں دس بیس لاکھ نقد
اس سے زیادہ خوفِ خدا نے نہیں دیا

میں صرف ٹیلی فون کا احسان مند ہوں
ان کا پیام بادِ صبا نے نہیں دیا

اس یارِ شوخ چشم کا خالدؔ سے ارتباط
وہ راز ہے کہ جس کو چھپانے نہیں دیا

○

میں جب نرم رفتار چلنے لگا
وہ مانند تلوار چلنے لگا

ازل سے کسی شے میں گردش نہ تھی
چلا میں تو سنسار چلنے لگا

تبسم، تکلم، جواں ہو گئے
مبارک ہو گھر بار چلنے لگا

ہر اک شہ کی گردن پہ تلوار ہے
غلاموں کا دربار چلنے لگا

خدا رکھے امریکہ و روس کو
میاں اپنا اخبار چلنے لگا

ابھی دھوپ خالدؔ پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگا

○

کہیں روشن سیہ راتیں کرو ہو
کہیں اشکوں کی برساتیں کرو ہو

تمہارا گھر خدا آباد رکھے
حسینوں کی مداراتیں کرو ہو

ابھی کل تک تم اچھے بھلے تھے
یہ کس لہجے میں اب باتیں کرو ہو

تمہیں بھی ڈپلو میسی آ گئی ہے
رقیبوں سے ملاقاتیں کرو ہو

مرے گھر کی دھنک رنگی کہے ہے
کہ یہ تم ہو شراراتیں[1] کرو ہو

کسی بھی کام کے لائق نہیں تم
میاں خالد بہت باتیں کرو ہو

○

ہر اک فیصلہ اس نے بہتر کیا
مجھے آنکھ دی، تم کو منظر دیا

دلِ خون بستہ، منوّر کیا
تو آنکھوں کا صحرا سمندر کیا

لکیروں کو روشن ستارے دیے
ستاروں کو تیرہ مقدر کیا

وہیں ڈوبنے کا یقیں آ گیا
جہاں اس نے ہم کو شناور کیا

اُجالا نفی ہے جب اس نے کہا
اندھیرے میں تھے ہم نے باور کیا

---

[1] قافیہ خود ساختہ ہے۔

○

نہیں ہے اگر اِن میں بارش، ہوا
اٹھا بادلوں کی نمایش، ہوا

گہے برف سے گاہے آتش ہوا
تجھے کیا ہے دلی سے رنجش ہوا

شکستہ سفینہ، مسافر نڈھال
تلاطم، شبِ تار ،بارش، ہوا

میں گنجان شہروں کا مارا ہوا
نوازش، نوازش، نوازش، ہوا

ترے ساتھ چلنے کی عادت نہیں
ہماری نہ کر آزمائش ،ہوا

○

وہ شاخ شاخ نشیمن، بتا کہاں ہے تو
کہاں ہے وہ ترا گلشن بتا کہاں ہے تو

ہر ایک سمت ہیں پختہ بلند دیواریں
سنہری دھوپ کے آنگن بتا کہاں ہے تو

جو تو نہیں تو لہو سرد ہوتا جاتا ہے
مرے وجود کی دھڑکن بتا کہاں ہے تو

صدا وہ آج بھی کانوں میں گونج جاتی ہے
پکارتا ہے جو بچپن بتا کہاں ہے تو

یہ آگ کس نے لگائی یہ خون کس کا ہے
مرے وطن مرے گلشن بتا کہاں ہے تو

○

ہر کمند ہوس سے باہر ہے
طائرِ جاں قفس سے باہر ہے

"موت کا ایک دن معین ہے"
زندگی دسترس سے باہر ہے

قافلے میں ہم اس مقام پہ ہیں
جو صدائے جرس سے باہر ہے

کوئی شے گھر کی خوش نہیں آتی
وہ برس دو برس سے باہر ہے

جسم، ٹوٹا ہوا سا اک موتی
جیسے تارِ نفس سے باہر ہے

○

برائے تشنہ لب پانی نہیں ہے
سمندر کا کوئی ثانی نہیں ہے

ہمارا گھر بھی صحرا ہو گیا ہے
مگر غالبؔ سی ویرانی نہیں ہے

رگوں میں خون شوخی کر رہا ہے
ستارہ سی وہ پیشانی نہیں ہے

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شے کی فراوانی نہیں ہے

نظامِ جسم جمہوری ہے خالدؔ
کسی جذبے کی سلطانی نہیں ہے

○

یہ کس خیال کا محشر بپا سا رہتا ہے
تمہارا رنگ ادھر کچھ اڑا سا رہتا ہے

ہر ایک پھول کو چومے لبِ تصور سے
درونِ دل کوئی شیطان بھلا سا رہتا ہے

وہ مجھ کو ٹوٹ کے چاہنے لگا ہے کچھ دن سے
وہ کچھ دنوں سے برابر خفا سا رہتا ہے

وہ بے وفا ہے یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
کفِ خیال میں اک آئینہ سا رہتا ہے

خیالِ یار کوئی چور تو نہیں خالدؔ
مگر یہ دل میں ترے کیوں چھپا سا رہتا ہے

○

شاید کہ مر گیا مرے اندر کا آدمی
آنکھیں دکھا رہا ہے برابر کا آدمی

سورج، ستارے، کوہ و سمندر فلک زمیں ۔
سب ایک کر چکا ہے یہ گز بھر کا آدمی

آواز آئی پیچھے پلٹ کر تو دیکھئے
پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پتھر کا آدمی

اس گھر کا ٹیلی فون ابھی جاگ جائے گا
صاحب کو لے کے چل دیا دفتر کا آدمی

ذرّے سے کم بساط پہ سورج نگاہیاں
خالدؔ بھی اپنا ہے تو مقدرّ کا آدمی

ایک دوست کے انتقال پر

O

وہ سدا سے مل رہا تھا ٹوٹ کر
آج بچھڑا ہے تو بچھڑا ٹوٹ کر

جگمگا تا تھا تو کتنا دور تھا
بن گیا تقدیر تارا ٹوٹ کر

"ہر زماں پیش نظر ہشیار باش"
شاخ سے گرتا ہے پتہ ٹوٹ کر

ریت کی دیوار سے کیا فائدہ
عمر کا رہتا ہے رشتہ ٹوٹ کر

خالدؔ بینا کی بینائی گئی
گر گیا آنکھوں سے چشمہ ٹوٹ کر

O

زندگی کے لطف کی فرصت کہاں سے لائیں گے
وقت جب جینے کا آئے گا تو ہم مر جائیں گے

چاند کی دنیا میں کیا اندھیر ہے پتھر ملے
ہم نے سوچا تھا وہاں سے روشنی بھر لائیں گے

کوٹھیوں سے معذرت کے ساتھ! کیا معلوم تھا
دھوپ میں جھلسے ہوئے بھی آدمی کہلائیں گے

سوچتے ہیں سیکڑوں مالک بنالینے کے بعد
ایک دامن، سب کے آگے کس طرح پھیلائیں گے

گر یہی بے فرصتی قائم رہی تو دیکھنا
ایک دن سب اپنے گھر میں اجنبی بن جائیں گے

○

قطرہ قطرہ ہوا سمندر
انسانوں کا گھنا سمندر
آگ ہے منبع جو کچھ بھی ہو
شبنم، آنسو، گھٹا، سمندر
کتنی ندیاں کتنے دریا
پی کر پیاسا رہا سمندر
دل کی تپش سے آنکھیں بھیگیں
آگ میں پیدا ہوا سمندر
شبنم ہم کو نا کافی ہے
کہہ دو خالدؔ! کہا سمندر

○

ہر اک راہ ''سنگِ گراں آشنا''
نہیں ہیں ہمارے کہاں آشنا

زمینیں مرے پاؤں پکڑے رہیں
اُدھر ہوگئے آسماں، آشنا

ہر اک زخم پر دل نے آواز دی
مرے محترم، مہرباں، آشنا

کبھی آشنائی کی باتیں نہ کیں
ہمارے تھے خالدؔ میاں آشنا

○

آنکھوں میں دھوپ دل میں حرارت لہو کی تھی
آتش جوان تھا تو قیامت لہو کی تھی
زخمی ہوا بدن تو وطن یاد آگیا
اپنی گرہ میں ایک روایت لہو کی تھی
خنجر چلا کے مجھ پہ بہت غم زدہ ہوا
بھائی کے ہر سلوک میں شدت لہو کی تھی
کوہِ گراں کے سامنے تیشے کی کیا بساط
عہدِ جنوں میں ساری شرارت لہو کی تھی

○

ہر پھول جسم و جاں کے لئے خار تھا سو ہے
باغِ جہاں میں وہ جو اک آزار تھا سو ہے
آدم سے آج تک کی حکایات ایک ہیں
آغوشِ آرزو میں جو اک یار تھا سو ہے
مسجود ہر وجود کے قدموں میں گر گیا
شیطاں ہی ایک صاحب کردار تھا سو ہے
خالد میاں کے دعوے یہاں بھی غلط ہوئے
وہ بے وفا کہ مائلِ اغیار تھا سو ہے

انساں کے سر سے کبر کا پتھر اتار دے
بارِ الٰہ! اس کو زمیں پر اتار دے
کل پھر جھلستا دن مجھے در پیش ہے خدا
آنکھوں میں میری ظرف سمندر اتار دے
اس فرد سے پھر آج میں ہنس کر ملا کہ جو
موقع لگے تو پشت میں خنجر اتار دے
تھکنے لگے ہیں پاؤں مگر میر کارواں
پیچھے نہ رہ سکوں گا مرا سر اتار دے

وفا نہ دیکھی فقط بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہو ان کا جنہوں نے برائیاں دیکھیں

کسی نے زخم پہ میرے کب اعتبار کیا
جب ان کو دیکھ کے اُن کی کلائیاں دیکھیں

جو کام، کام تھے خالد تمام باقی ہیں
عزیز من تری باتیں سوائیاں دیکھیں

راتوں کا درد بہہ کے اب آنکھوں میں آگیا
یہ کون میرے جسم کے اندر سما گیا
دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
اک دستِ نازیاد کا شانہ دبا گیا
ان کا خیال آتے ہی اک روشنی ہوئی
اس روشنی میں ذہن کا کمرہ نہا گیا
ہر چہرہ اک سوال ہے یاروں کی بزم میں
شاید میں امتحان کے کمرے میں آگیا

شکوہ کروں کہ شکر کروں آسمان کا
سر پر نہیں گرا مرے چھپر مکان کا

مندر کی گھنٹیوں سے فضا گونجنے لگی
شاید ہوا ہے وقت سحر کی اذان کا

لڑکوں کو نقل کرنے سے ہے روکنا مجھے
پھر آگیا ہے وقت مرے امتحان کا

○

مقابلہ ہو تو سینے پہ وار کرتا ہے
وہ دشمنی بھی بڑی پر وقار کرتا ہے

میں جس خیال سے دامن کشیدہ رہتا ہوں
وہی خیال مرا انتظار کرتا ہے

جو ہو سکے تو اسے مجھ سے دور ہی رکھئے
وہ شخص مجھ پہ برا اعتبار کرتا ہے

○

خوبیٔ قسمت سے ہیں اتنے میسر آشنا
گھر کے سب شیشے ہوئے جاتے ہیں پتھر آشنا

اپنے ذہنوں میں بنا رکھی ہے دنیا مختلف
اور اس دنیا میں رہتے ہیں فلک پر آشنا

وقت کے ہاتھوں بدل جاتی ہے رسم دوستی
ہے کبھی شہ رگ کبھی شہ رگ پہ خنجر آشنا

○

ستارے چھونے کی خواہش جوان رہنے دے
ہمارے سر پہ ابھی آسمان رہنے دے

رفاقتوں کے نئے رنگ خوب ہیں لیکن
کہیں تو سرخ لہو کا نشان رہنے دے

میں تجھ سے بڑھ کے سیاسی شعور رکھتا ہوں
مری گلی میں یہ کچے مکان رہنے دے

○

سیلاب کی آمد پہ نہ حیرت ہے نہ ڈر ہے
خالدؔ کا تو دریا کی گزر گاہ میں گھر ہے

نے کوہ نہ دریا نہ بیاباں نہ خطر ہے
اے رہبر منزل یہ سفر ہے کہ حضر ہے

سوچا بھی نہ تھا زیست یوں بدنام کرے گی
ہموار سے رستوں پہ مجھے اذنِ سفر ہے

○

ساری کایا اور مایا پھینک دے
اپنے سر سے دھوپ سایہ پھینک دے

تیری لاٹھی دوسرے نے داب لی
سانپ تیرے ہاتھ آیا پھینک دے

گاؤں کا اک سیدھا سچا آدمی
شہر میں کیوں لادلایا پھینک دے

○

بھڑکتی آگ میں پیدا ہوا ہے
سمندر زندگی سے آشنا ہے

مرے دروازے پر یہ بھیڑ کیسی؟
کوئی آیا ہے یا کوئی گیا ہے؟

ذرا اس بے بسی پر غور کیجے
دل اوروں میں برائی ڈھونڈتا ہے

○

کفِ دست بلا ہے اور میں ہوں
سفینہ کہہ رہا ہے، اور میں ہوں

تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

تلاش ذات نے بھٹکا دیا ہے
اب اک ذہنی خلا ہے اور میں ہوں

○

شہ رگ پر تلوار رکھی ہے تیور میں سلطانی ہے
اپنی کلاہِ کج کے قرباں قاتل کو حیرانی ہے

گز بھر اونچی لہروں والے دریا کی گہرائی کیا
جس میں جتنا کم ہے پانی اتنا ہی طوفانی ہے

متفرق اشعار

میں اپنے گھر کے اندر چین سے ہوں
کسی شے کی فراوانی نہیں ہے

کام دلی کے سوا ہوتے نہیں
اور ناہنجار دلی دور ہے

شب کی اندھیری کوکھ سے نکلا مری طرح
سورج غریب کا بھی مکاں بے چراغ تھا

افراطِ حسن و زر نے بڑا کام کردیا
دونوں کا اپنے وقت میں کیا کیا دماغ تھا

میں کل طلوعِ سحر سے پہلے کسی گپھا میں اتر پڑوں گا
کہ روز روشن پہ روز روشن میں سنگ باری ہے آزمائش

ادھر ستارہ عروج پر ہے ادھر ستارہ زوال پر ہے
ادھر ہماری ہے آزمائش اُدھر تمہاری ہے آزمائش

میں اس مزار میں ہر شام دفن ہوتا ہوں
زمانے بھر کو جو بستر دکھائی دیتا ہے

وقت دیتا ہے سدا خواب کی الٹی تعبیر
زندگی ہے کہ ہر اک خواب سنہرا مانگے

دیکھی جب اس مکان کی کھڑکی کھلی ہوئی
اک دستِ نازِ یاد کا شانہ دبا گیا

نیا مہینہ فکروں کے ملبوس بدلنے آتا ہے
آ پھر اپنے ذہن کے اندر قرضوں کے عنوان لگا

بستر پہ ڈال دیتا ہوں ٹوٹا ہوا بدن
پھر کروٹوں سے جوڑتا رہتا ہوں رات بھر

روز اخبار ہم سے کہتا ہے
جھوٹ کو سچ کے باب میں رکھیئے

امنگیں، شوق، محرومی، امیدیں، وسوسے اور تم
گزشتہ ہلچلوں کے دل بڑے قصے سناتا ہے

قرض تھا اُس پر مرا حسن سلوک
یہ اُسی کا تیر ہونا چاہئے

خالدؔ نے شاید آئینہ دیکھا نہیں کبھی
دلی میں چاہتا ہے کہ اپنا مکان ہو

بجھ گئے غالباً امید کے سارے ہی چراغ
ابھی کچھ دیر ہوئی ایسا اندھیرا تو نہ تھا

تمہیں اک آئینہ ہے اور تم ہو
مجھے سب آئینہ ہے اور میں ہوں

"اسے روز ازل انکار کی جرات ہوئی کیونکر"
کہیں انسان تو بیٹھا نہ تھا شیطان کے اندر

ذرا سنبھال اسے ڈوب ڈوب جاتا ہوں
یہ تیری آنکھ کا قطرہ مجھے سمندر ہے

عشق دامن گیر ہونا چاہئے
پاؤں میں زنجیر ہونا چاہئے

اک ذرا تیز ہوئی تھی رفتار
ہم سفر چیخ اٹھا، آہستہ

سنو لوگ کترا کے چلنے لگے
مجھے زندگی کا ہنر آگیا

انگشت حنائی کا کبھی کھلنا غضب تھا
پروا نہیں گر آج کوئی سینہ کھلا ہے

ہم فضاؤں میں کچھ اونچا اڑ کر
بھول بیٹھے ہیں بسیرا اپنا

آگ ہے منبع جو کچھ بھی ہو
شبنم، آنسو، گھٹا، سمندر

جس میں خالی ہے کرائے کا مکان
اس گلی میں نہیں رہتا کوئی

ابھی دھوپ خالدؔ پہ آئی نہ تھی
کہ دیوار دیوار چلنے لگا

مانگتا ہے تو وجودِ ذاتِ باری کا ثبوت
کیا جہانِ رنگ و بو اے بے خبر کافی نہیں؟

نہ ہو سکے تری رحمت کی شان کے شایاں
مرے گناہوں کو یوں شرمسار ہونا تھا

بجز اک لذتِ تسکین باطل
کسے شہرت نے خالدؔ کیا دیا ہے

ہر شئے ہر ایک شئے کی طرح بے ثبات ہے
کچھ دن کے بعد تو بھی مجھے بھول جائے گا

وہ بھی ہیں سب قریب مگر دور دور ہیں
یاروں کی زندگی ہے ستاروں کی زندگی

پھولنے پھلنے سے ہر ڈالی نہیں جھکتی کہ آپ
سرو کی مانند ہیں، شاخِ ثمر ہوتے ہوئے

تھکنے لگے ہیں پاؤں مگر میر کارواں
پیچھے نہ رہ سکوں گا مرا سر اتار دے

With the rising of the sun
Morning came,
But night bitten
Bearing a dark picture
of days by gone.
The blurred picture
Became bright by and by
In the mind's eye,
Emerged a radiant figure—
Polite, doting, bright faced
Then,
A whisper
I heard
It is none but
Sajjad Hussain
Once, a reservoir of knowledge
Whose mark is
Still knowledge,
On whom'death laid his icy hand,
Who is still alive
In the bosom of the new age
With all his grandeur
And bright figure.
He still abides
in our hearts.
What is life, if we call it Death?

With the breaking of the spell of night
The mood too
Would melt away
By the shining 'eye of heaven'.
And golden throated birds
Would float their songs in the air—
Songs with the accompaniment of music of Nature.
—alas ! it never happened
On the contrary,
The horizon became crimson
and pale morning stars
Bade me farewell
Then,
I felt as if
Some Messiah had
Descended to pay condolence
On the death of some dear one.
Pleasant weather
Tried to win my heart.
As usual,
Dawn replaced darkness
The sun rose
And the birds tweetered
But nothing expected occured
The haze of bitter memories
From the heart
Could not vanish like a swift bird
Nor could the mood change

زندگی کیا ہے اگر موت اسے کہتے ہیں

What is life, if we call it Death?

(On the first Anniversary of the Late Mulla Sajjad Hussain, Founder Saifia College Bhopal)

By Dr Khalid Mahmood

Translated by A Naseeb Khan

To Night
Again the pang rushed forth
Though
Through the sensitive window of my heart
The gust of wind
Would pass in a moment
At high speed
and then—
Caressing the smouldering pain
The silent breeze
Would uncover
The inky cloak of night
Very fondly.
And the haze of bitter memories
Form the heart
Would vanish like a bird swift of feet
And the day break
Would scatter milk rays
—alas ! it never happenned.
I had thought

I provided you with numerous clothes
Tongue- tied as you were
Ignorant of what conversation meant
I taught you the art of speech.

I am a teacher

I set the dejected and forlorn souls
To the right path.
And for this noble cause
I came in the world again and again

I am a teacher

Now you are cultured,
You are refined.
This too is the fruit of my labour

I am a teacher

Had I not been sent to you
The barks and leaves of jungle trees
Would be your clothes
Had I not existed
Your children would be
Living the life of wriggling worms

I am a teacher

It is I who gained the status,
To be called the father of your children.

The flesh of your poor fellow creatures
Thus glutted your hunger!
I am a teacher
Alas! you poor fellows
Benighted,
Unaware of life
Lay in the caves of death
And sought refuge in dark hovels.
You pined for nothing save
Glutting your hunger.
And now then
You gorged yourself on
The blood of harmless animals
I am a teacher
I Brought you back to life
From the caverns of death
Freed you from ignorance
Brought you to enlightened world.
I am a teacher
I bestowed you profound knowledge
Enlightened you
With the beacon of intellect.
Taught you to drink from the river of knowledge.
Purged you of your savagery
And moulded you into man.
I am a teacher
Still naked as you were
Ignorant of what clothing meant

مُعَلِّم

Teacher

By Dr Khalid Mahmood

Translated by A Naseeb Khan

I am a teacher

I bestowed you profound knowledge

Taught you to drink from the river of knowledge

Enlightened you

With beacon of intellect

I am a teacher

Tongue - tied and naked

As you were

In the jungles, bushes and rocky mountains,

You pined for nothing save

Glutting your hunger

And now and then

You gorged yourself

On the blood of

Harmless birds.

But at times

You failed in this attempt.

Then,

This vain effort nagged you with a question

Alas! fed up with your failure

You devoured your own flesh–

We still exist
--Standing right there.
So, the same will happen again
The very same!
That happened with you
Before you, and after you
Before this, and before that
Listen!
Listen to me my People!
We who still exist
Wait for our turn, so does every one
We, for our turn
And they, for their turn.

وجود کا کرب (۶ر دسمبر)

Unceasing Pain

By Dr Khalid Mahmood

Translated by A Naseeb Khan

Listen!

Listen to me my people!

My friends!

My countrymen-

Strange and poor countrymen!

You are welcome to your death!

For you seem to be happy with it

Now, no gun will point at you.

The guns of your protectors

Nor will your houses be burnt down

Nor children orphaned

Nor wives widowed.

No more will your sisters be robbed of thier chastity

Neither shall you live, nor shall you die.

You are content because you are dead

You are welcome to your death!

--but look at us.

Our condition is piti